رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۵ جولائی سنہ ۱۹۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ایک مسلمان کیلئے قرآن پاک کے بعد سب سے بڑا سرمایۂ فخر اس کے رسول کے احوال پاک اور کلمات طیبات ہیں جنکے مجموعہ کا نام سیرۃ نبوی ہے، اردو میں اس وقت بالاتفاق سب کا مستند اور صحیح تر سیرۃ نبوی میں وہ کتاب ہے جس کو دار المصنفین نے شائع کیا ہے، والحمد للہ،

اب تک اس کتاب کے چار حصے شائع ہوچکے ہیں، اور تین حصے اور باقی ہیں،

سیرۃ النبی حصہ اول - از ولادت تا ختم سلسلہ غزوات، مع مقدمہ مشتمل بر نقد و فن سیرۃ و تاریخ عرب قبل بعثت، طبع دوم، ضخامت ۵۶۱ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible] تقطیع خورد،

سیرۃ النبی حصہ دوم از [illegible] تا [illegible] جس میں اقامت امن، تاسیس خلافت، اشاعت اسلام انتظامات مذہبی تکمیل شریعت، حجۃ الوداع، وفات و شمائل و اخلاق و عادات کی تفصیل اور ازواج و اولاد کا مختصر تبصرہ ہے، طبع اول تقطیع کلاں ضخامت ۳۵۱ صفحے، قیمت قسم اعلیٰ [illegible] طبع دوم، تقطیع خورد، ضخامت ۴۳۸ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible]

سیرۃ النبی حصہ سوم، جس کے مقدمہ میں نفس معجزہ کی حقیقت اور اس کے امکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ، علم کلام، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط بحث و تبصرہ ہے، اور اسکے بعد خصائص نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رؤیا، معراج اور شرح صدر کا بیان ہے، پھر وہ آیات و معجزات ہیں جنکا ذکر قرآن مجید میں ہے، بعد ازیں وہ ہیں، جو مستند روایات سے ثابت ہیں، پھر معجزوں کی نامعتبر روایات کی تنقید کا باب ہے، اور اس کے بعد وہ بشارات نبویہ ہیں جو صحف سابقہ میں موجود ہیں، اور جنکے حوالے قرآن مجید و حدیث میں مذکور ہیں، اور آخر میں خصائص محمدی کا باب ہے طبع اول تقطیع کلاں ضخامت ۵۹۶ صفحے قیمت باختلاف کاغذ [illegible] طبع دوم تقطیع خورد ضخامت [illegible] صفحے قیمت باختلاف کاغذ [illegible]

ایضاً جلد چہارم، منصب نبوت کی تشریح قبل اسلام عرب کے اخلاقی حالات، صبح سعادت کا طلوع، تبلیغ نبوی کے اصول، رسول اللہ صلعم کا پیغمبرانہ کام، اسلام اور اس کے عقائد پر تفصیلی اور حکیمانہ بحث، ضخامت [illegible] صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible] تقطیع کلاں،

ملنے کا پتہ:-

منیجر دار المصنفین شہر اعظم گڈہ،

جلد ۳۲	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	عدد ۱

مضامین

شذرات،	سید سلیمان ندوی،	۲ - ۴
اردو کیونکر پیدا ہوئی،	〃	۵ - ۱۷
وجود روح "روحانیین" کے نقطۂ نگاہ سے	جناب محمد اسعد صاحب انصاری بی اے علیگ	[illegible] - ۳۴
خسرو ماغ کے نقیب،	مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدانی الہ آبادی	۳۵ - ۴۸
نوآبادیاتی ممالک آصفیہ کی صنعت و تجارت	جناب محمد عوض صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۴۹ - ۵۴
بعض عنایت نامے،		
اسلام کے قرون وسطیٰ میں ساہوکاری کی ابتدا	〃	۵۵ - ۵۹
خلفائے عباسیہ کے چند آثار عراق میں،	〃	۶۰ - ۶۲
اخبار علمیہ	〃	۶۳ - ۶۶
یاد ہی،	حکیم سعید احمد صاحب آبادی،	۶۷ - ۶۸
خون جگر	حضرت جگر مراد آبادی	۶۸
اردو کے نئے رسالے اور اخبار	〃	۶۹ - ۷۲
مطبوعات جدیدہ،	〃	۷۳ - ۸۰

سرگذشت ادب ترکی، جس میں ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے، از مولوی سید ریاست علی

... ادیٹر معارف، ۲۰ کے ٹکٹ بھیجکر طلب کریں۔ "منیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

دین و دانش کی دنیا کا مہر انور ۳ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ رمئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا یعنی مولٰنا سید انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہند وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے دو برس کی علالت اور ضعف و نقاہت کے بعد، ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی، مرحوم کا وطن گو کشمیر تھا، مگر تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک مدینہ منورہ میں اقامت فرمائی، پھر واپس آکر استاد کی خواہش اور اصرار سے دار العلوم کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی، اور جبکو حضرت شیخ کے زمانہ جنگ میں ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک اس طرح انجام دیا کہ صبح سے لیکر دم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا، اور ہند اور بیرون ہند کے سینکڑوں تشنگان علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی،

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، انکی مثال اس سمندر کی سی تھی جسکی اوپر کی سطح ساکن، لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گران قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے، کہ مرتے دم تک علم و حرف کے اس شہید نے قال اللہ اور قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا،

۱۹ رجون کی صبح کو مشرقی ہند کے مرکزی شہر پٹنہ کے جسم سے روح نے مفارقت کی، سر فخر الدین وزیر تعلیم جو وہاں کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز مسلمان تھے ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی، ان چند مہینوں کے اندر اس شہر کے پرانے نئے تعلیم یافتہ اصحاب جو وہاں کی مجلس کی شمع بزم افروز تھے، ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے، سر علی امام کی پر سیاسی تدبر و قابلیت کا ماتم ہوا، حسن امام کے مرنے پر قانونی دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت اور انکی شرافت کا ماتم ہے، مرحوم نیکدل، متواضع، فیاض، مشرقیت پسند اور دیندار تھے، اسی لئے انکی وفات

صوبہ نے ماتم کیا، شہر کے سب سے بڑے میدان مین پورے شہر نے نماز جنازہ پڑھی، اور صوبہ کے سب سے مقدس مقام پھلواری شریف مین اپنے مرشدین کے مقبرہ مین جگہ پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی مغفرت کے پھول برسائے،

نظام دکن کی مجلس مین فرمانروایانِ اودھ کی بزم دوشین کا ایک ٹمٹماتا چراغ مدت سے جل رہا تھا، افسوس کہ وہ ۳۰ مئی ۱۹۳۳ء کی شب کو رونق دہر کی بیاسی بہارین دیکھکر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، مولنا علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نے بیاسی سال کی عمر مین وفات پائی، لکھنؤ وطن تھا، اخیر شاہ اودھ کے دربار کی خزان دیکھی تھی، مٹیا برج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسون کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود اخیر تک علمی کامون مین معروف و منہمک رہے، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے،

اس ماہ کے شذرات کا صفحہ وفات نامہ ہوا جاتا ہے، مگر احسان فراموشی ہوگی اگر ملک کے سب سے بوڑھے صحیفہ نگار مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار کا ماتم نہ کیا جائے، ۲۰ مئی کو انھون نے اس دار فانی کو الوداع کہا، وہ اردو کے سب سے پہلے روزانہ اخبار (پیسہ اخبار) کے اڈیٹر تھے، انھون نے صرف اپنی محنت و کوشش سے سرمایہ حاصل کیا، اور ملک مین تاریخ اور سیاحت نامون کے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا، اور خود بھی دو سفر کیے، اور سیاحت نامے لکھے، مگر افسوس کہ اب انکو وہ سفر پیش آیا ہے، جسکا سفرنامہ انسانون کے ہاتھ نہین فرشتون کے ہاتھ لکھتے ہین، اس اَن دیکھی منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، مرحوم نے ۷۴ برس کی عمر پائی،

اردو کے ایک اور کہنہ صاحب قلم استاد کی وفات پر دو آنسو بہانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ انکی انشا پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہل قلم رشک کرتے تھے، مگر افسوس کہ نوجوانون نے اسکو بھلا دیا، یہ خان بہادر ناصر علی مدیر صلائے عام دہلی تھے، مرحوم نے عمر کی چھیاسی بہارین دیکھکر ۱۲ جون کو دہلی مین وفات پائی، ان کے قلم مین جو نزاکت اور ان کے انشا مین جو لطافت تھی وہ اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر مین وہ ساری جگر کاوی ان ناقدرشناس انگریز افسرون کے لیے کرتے تھے، جو ہندوستانی کو امتحان کے لیے سیکھتے تھے، اور انکی یہ ادبی کوششین عام نگاہون سے چھپکر رہ گئی تھین، خدا اپنے دربار مین ہمارے اس بوڑھے صاحب قلم کی آبرو رکھے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

دین و دانش کی دنیا کا مہر انور ۳ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک مین ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا یعنی مولنا سید انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہند و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے دو برس کی علالت اور ضعف و نقاہت کے بعد، ۵۰ برس کی عمر مین وفات پائی، مرحوم کا وطن گو کشمیر تھا، مگر تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک مدینہ منورہ مین اقامت فرمائی، پھر واپس آکر استاد کی خواہش اور اصرار سے دار العلوم کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی، اور جسکو حضرت شیخ کے زمانۂ جنگ مین ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک اس طرح انجام دیا کہ چین سے لیکر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجین لیتا رہا، اور ہند اور بیرون ہند کے سینکڑون تشنگان علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی،

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، انکی مثال اس سمندر کی سی تھی جسکی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیون کے گران قیمت خزانون سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ مین اس عہد مین بے مثال تھے علومِ حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علومِ ادب مین بلند پایہ، معقولات مین ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند، اور زہد و تقوی مین کامل تھے، اللہ تعالی اپنی نوازشون کی جنت مین ان کا مقام اعلٰی کرے، کہ مرتے دم تک علم و حرفت کے اس شہید نے قال اللہ اور قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا،

۱۹ جون کی صبح کو مشرقی ہند کے مرکزی شہر پٹنہ کے جسم سے روح نے مفارقت کی، سر فخر الدین وزیر تعلیمات جو وہان کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز مسلمان تھے ۶۵ برس کی عمر مین وفات پائی، ان چند مہینون کے اندر اس شہر کے وہ پرانے نئے تعلیم یافتہ اصحاب جو وہان کی مجلس کی شمعِ بزم افروز تھے، ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، سر علی امام کی وفات پر سیاسی تدبر و قابلیت کا ماتم ہوا، حسن امام کے مرنے پر قانونی دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت پر انسانیت اور اسکی شرافت کا ماتم ہے، مرحوم نیکدل، متواضع، فیاض، مشرقیت پسند اور دیندار تھے، اسی لئے انکی وفات پر پورے

بہ نے ماتم کیا، شہر کے سب سے بڑے میدان مین پورے شہر نے نماز جنازہ پڑھی، اور صوبہ کے سب سے مقدس مقام پھلواری شریف مین اپنے مرشدین کے مقبرہ مین جگہ پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی مغفرت کے پھول برسائے،

نظام دکن کی مجلس مین فرمانروایانِ اودھ کی بزمِ دوشین کا ایک ٹمٹماتا چراغ مدت سے جل رہا تھا، افسوس کہ وہ ۳۰ مئی سنہ ۱۹۳۳ء کی شب کو رونق دہر کی بیاسی بہارین دیکھکر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، مولانا علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نے بیاسی سال کی عمر مین وفات پائی، لکھنؤ وطن تھا، اخیر شاہ اودھ کے دربار کی خزان دیکھی تھی، مٹیابرج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسون کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود اخیر تک علمی کامون مین مصروف و منہمک رہے، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے،

اس ماہ کے شذرات کا صفحہ وفات نامہ ہوا چاہتا ہے، مگر احسان فراموشی ہوگی اگر ملک کے سب سے بوڑھے صحیفہ نگار مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار کا ماتم نہ کیا جائے، ۲۸ مئی کو انھون نے اس دار فانی کو الوداع کہا، وہ اردو کے سب سے پہلے روزانہ اخبار (پیسہ اخبار) کے اڈیٹر تھے، انھون نے صرف اپنی محنت و کوشش سے سرمایہ حاصل کیا، اور ملک مین تاریخ اور سیاحت نامون کے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا، اور خود بھی دو سفر کئے، اور سیاحت نامے لکھے، مگر افسوس کہ اب انکو وہ سفر پیش آیا ہے، جسکا سفرنامہ انسانون کے ہاتھ نہین فرشتون کے ہاتھ لکھتے ہین، اس ان دیکھی منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، مرحوم نے ۷۴ برس کی عمر پائی،

اردو کے ایک اور کہنہ صاحب قلم استاد کی وفات پر دو آنسو بہانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ انکی انشا پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہل قلم رشک کرتے تھے، مگر افسوس کہ نوجوانون نے اسکو بھلا دیا، یہ خان بہادر میر ناصر علی مدیر صلائے عام دہلی تھے، مرحوم نے عمر کی چھیاسی بہارین دیکھکر ۱۲ جون کو دہلی مین وفات پائی، ان کے قلم مین جو نزاکت اور ان کے انشا مین جو لطافت تھی وہ اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر مین وہ ساری جگر کاوی ان ناقدر شناس انگریز افسرون کے لیے کرتے تھے، جو ہندوستانی کو امتحان کے لیے سیکھتے تھے، اور انکی یہ ادبی کوششین عام نگاہون سے چھپکر رہ گئی تھین، خدا اپنے دربار مین ہمارے اس بوڑھے صاحب قلم کی آبرو رکھے

لوگون کو یاد ہوگا کہ ٹرکی مین ہماری سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ کے ترجمہ کا کام شروع ہوا تھا، اور انکی متعدد جلدین ترکی مین ترجمہ ہو کر وہان مقبول ہو چکی ہین، لیکن ٹرکی مین دو برس سے جب سے عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف کو رواج دیا گیا، ادھر سے خاموشی رہی، خیال ہوا کہ شاید حروف کی تبدیلی سے خیالات مین بھی تبدیلی آگئی ہے، بارے اس ہفتہ مین قسطنطنیہ سے مترجم مذکور کا ایک عربی خط آیا، جس سے پہلے خیال کی غلطی دور ہوئی، امین موصوف نے سیرت کی جلد چہارم اور سیر الصحابہ کے حصص مہاجرین کی جلدین ترجمہ کی غرض سے طلب کی ہین، اسی خط مین وہ لکھتے ہین کہ سیر الصحابہ مین سے انصار، مہاجرین جلد اوّل اور صحابیات کا ترجمہ وہ تمام کر چکے، فالحمد للہ،

ہم نے ہندوستان مین عربی زبان کی ترقی و اشاعت کی غرض سے آج سے ایک سال پہلے الضیاء کے نام سے لکھنؤ سے جو ماہانہ عربی رسالہ نکلوایا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک سال کی عمر طے کر کے دوسرے سال مین قدم رکھا، ہندوستان کے دو سو شائقین نے اسکو خرید کر اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا، ساتھ ہی ہماری تحریک پر حسب ذیل اصحاب نے اس کے اجراء مین مالی امداد دیکر اسکی طبع و اشاعت کی مشکلات کو آسان کیا،

۱۔ نواب سر مزمل اللہ خان بہادر، بھیکن پور، علی گڈھ، — عہ/
۲۔ نواب صدریار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شروانی حبیب گنج علی گڈہ — صہ/
۳۔ مولنا ضیاء الحسن علوی ندوی، انسپکٹر مدارس عربیہ، الہ آباد، — صہ/
۴۔ مولنا عبد الباری ندوی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، — للعہ
۵۔ خاکسار سید سلیمان ندوی، — عہ/

اس ایک سال کے عرصہ مین اس رسالہ نے ہندوستان اور دیگر ممالک عربیہ مین جو عزت و منزلت حاصل کی، اور ہندوستان کے مسلمانون کے عربی ذوق کا جو ثبوت ہم پہنچا یا وہ ہماری توقع سے زیادہ ہے، ضرورت ہے کہ اس مقدس زبان کی اشاعت کے قدرشناس رسالہ کی دوسری منزل مین بھی ہمارا ہاتھ بٹائین،

مقالات

اردو کیونکر پیدا ہوئی،

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کیلئے لکھا گیا)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب سے ہم کو معلوم ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک مین کبھی ایک بولی نہین بولی گئی، درحقیقت یہ ملک ایک بر اعظم ہے، جسمین ہر زمانہ مین مختلف قومین، اور مختلف نسلین جو مختلف بولیان بولتی تھین، آباد تھین، آباد ہین، اور آباد رہینگی، دنیا کی زبانون کی تین مشہور اصلین، آریائی، تورانی اور سامی تینون یہان دوش بدوش ملی جلی ملتی ہین، ڈریویڈی زبانون کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبون کی دوسری زبانین آریائی ہین، اور عربی کی شمولیت سامی اثر کا نتیجہ ہے،

چند مشہور راجاؤن کے زمانون کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصہ پر حکمران رہے، اکثر ہندوستان کا یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے مختلف مستقل ریاستون کی صورت مین رہے، ان صوبون کی وسعت راجہ کی قوت اور فتوحات کے دائرہ کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ہر ریاست کی زبان اس کے صوبہ کی مقامی زبان تھی، اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اب جسقدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا، اسی حد تک اس زبان کا جغرافی دائرہ کبھی گھٹ جاتا، اور کبھی بڑھ جاتا،

مثلاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی، برج کی بھاشا، مگدھ کی زبان، اطراف دہلی کی ہریانی یہ چارون ہمسایہ ز
مگر ان کی حدین اپنی سلطنتون کی حدون سے وابستہ نظر آتی ہین، مگدھ (بہار) کی بودھ سلطنت جسکا دارالسلطنہ

پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا، جب ہندوستان پر چھاگئی، تو اسکی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بنگئی، اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لیکر دھاما پتنم کے کنارون تک ملتے ہین،

ہندوستان مین سندھ سے لیکر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیون اور عربون کے جہازون کا گذرگاہ رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جہازیون کے ساتھ ساتھ انکی زبانون کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے، خصوصاً سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جزء بنتا رہا، اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا، سندھ کے آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریہ کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جارہی ہے،

بہرحال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لیکر گجرات تک وسیع تھا، اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمہ کے قریب ساتوین صدی عیسوی مین فتح فارس کے بعد عربون نے بھی، ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے سندھ پر قبضہ کیا، اور ان کے جہازات خلیج فارس کے اُبلّہ، سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہون سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملیبار ہوکر چین تک جانے لگے ان جہازون کے چلانے والے، فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہون سے یہ گذرتے ہون وہان انکی زبانون کے کچھ لفظ مستعمل ہوجائین، اور وہان کی مقامی زبانون کے کچھ لفظ ان جہازیون کی زبانون پر چڑھ جائین، چنانچہ اسکی مثالین عرب سیاحون اور ملاحون کی زبانون مین ملتی ہین، چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازون کے ذریعہ ہندوستانی زبان، افریقہ، عرب، عراق اور مصر کے بندرگاہون تک پہنچ گئی ہے، اور خود مجھے عدن، جدہ، پورٹ سعید، مصوّع اور پورٹ سوڈان مین ہندوستانی بولنے والے ملاح اور دوکاندار ملے،

اس موقع پر سب سے پہلا بیان ہمارے سامنے ایک ایرانی آمیز عرب جہازران بزرگ بن شہریار کا ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہازران ابو محمد حسن نے بیان کیا کہ

"مین ۲۸۸ھ مین منصورہ (بھکر) مین تھا، وہان مجھ سے مستند بزرگون نے یہ بیان کیا کہ الرا داور کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا، اور جسکی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیرین کے بیچ مین تھی اور جسکا نام

مہردگ بن رائق (؟) تھا، اُسنے سنہ ۲۷۰ھ مین منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اسکو بتائے تو عبداللہ نے منصورہ مین ایک عراقی کو پایا جو بہت تیز طبع، اور خوش فہم تھا، اور شاعر تھا، اسنے ہندوستان مین نشو و نما پائی تھی، اور جو اہل ہند کی مختلف زبانون سے واقف تھا، اُسنے ایک قصیدہ لکھکر راجہ کو بھیجا، راجہ نے اسکو بلا بھیجا، اور اسکے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی زبان مین ترجمہ کیا۔[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کے سواحل مین بھی بہت سی مختلف زبانین تھین، اور وہ لوگ جنکی اصل زبان فارسی اور عربی تھی، وہ یہان کی زبانون کو سیکھتے اور بولتے تھے، اور ان مین یہ لیاقت رکھتے تھے کہ وہ ان مین شاعری کرسکتے تھے، اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کرسکتے تھے،

یہ ہندوستانی اور اسلامی زبانون کے باہمی اختلاط اور میل جول کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفرنامون اور تاریخون مین مذکور ہے، اس واقعہ کا زمانہ سنہ ۲۷۰ھ یعنی ۸۸۳ء ہے اور آج سے قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے کی بات ہے،

اس کے ۳۳ برس کے بعد مسعودی ہندوستان آتا ہے، وہ ۳۰۳ھ مین یہان آیا تھا، وہ ہندوستان کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے :-

"اس کے بعد ہند کے لوگون کے خیالات مختلف ہوگئے، اور مختلف گروہ پیدا ہوگئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کرلی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا اور قنوج پر دوسرا راجہ ہوا، اور کشمیر مین تیسرا راجہ تھا، اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے، (گجرات و کاٹھیاواڑ) بلہرا (ولبھ رائے) کی حکومت ہوئی، اور اب تک ہمارے زمانہ تک جو ۳۳۲ھ ہے، یہ راجہ اسی لقب سے ملقب ہے، اور ہند کی زمین بہت وسیع زمین ہے، خشکی، پہاڑ، اور دریا مین پھیلی ہے، ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوہ؟) سے ملتا ہے جو جزیرون کے بادشاہ "مہراج" کا دارالمملکت ہے، اور یہ ملک ہندوستان اور چین کے درمیان حدّ فاصل ہے، لیکن ہندوستان کیطرف منسوب ہے، اور دوسری طرف کوہستان سے متصل

---

[1] عجائب الہند، بزرگ بن شہریار ص۲ و ص۳، پیرس،

معارف نمبر ا جلد ۲۴

خراسان اور سندھ اور تبت تک ہی، اور ان (ہندوستانی) ریاستون مین باہم اختلاف اور لڑائیان ہین اور انکی زبانین الگ الگ ہین، اور ان کے مذہبی خیالات مختلف ہین، زیادہ تر لوگ تناسخ اور آواگون کے قائل ہین، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے[1]:

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال مین کہتا ہے:-

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے۔۔۔۔۔۔ اور مانگیر کی زبان جو بلہرا (وللبھ رائے) کا دارالسلطنت ہو کیری ہے، اور اس کے ساحلی شہرون جیسے چیمور، سوبارہ، اور تھانہ (موجودہ بمبئی کے پاس) کی زبان[2] لاری ہے۔"

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کوکن کی زبانون کی نسبت قدیم عربی شہادت ہے، اس کے بعد بغدادی سیاح اصطخری کا زمانہ ہے، جو ۳۴۰ھ مین آیا تھا، وہ کہتا ہے:-

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران والون کی زبان فارسی اور مکرانی ہے[3]۔"

بعینہ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفرنامہ مین ملتے ہین، اس کا زمانہ ۳۳۱ھ سے ۳۵۰ھ تک ہے، وہ کہتا ہے:-

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف مین عربی اور سندھی بولی جاتی ہے[4]۔"

۳۷۵ھ (۹۸۵ع) مین بشاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان کے حال مین لکھتا ہے:-

"اور فارسی زبان سمجھی جاتی ہے[5]:"

پھر دیبل یعنی ٹھٹھہ کے بندرگاہ کے حال مین لکھتا ہے،

"دیبل (ٹھٹھہ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چارون طرف سو گاؤن کے قریب ہین،

۱ مروج الذہب مسعودی ج اول ص ۱۶۲ (پیرس)، ۲ ایضاً ص ۳۸۲، ۳ سفرنامہ اصطخری ص ۱۷۷، لائیڈن، ۴ سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۳۲ لائیڈن، ۵ سفرنامہ بشاری معروف بہ احسن التقاسیم ص ۴۸۰، لائیڈن،

اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہین، سمندر کا پانی شہر کی دیوارون سے آکر لگتا ہے، یہ سب سوداگر ہین، اُن کی زبان سندھی اور عربی ہے ؎

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ مین ترتیب دی ہے، وہ سندھ کی زبانون کی نسبت جس کی وسعت مین اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے :۔

"یہ لوگ مختلف زبانون، اور مختلف مذہب والے ہین، اور ان کے لکھنے کے کئی خط ہین، مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ملک مین گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ اُن کے ہان دو سو خط کے قریب مستعمل ہین، مین نے (بغداد کے) قصر حکومت مین ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھے کہا گیا کہ یہ بودھ کی مورت ہے . . . . . اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا ؎"

اب وہ زمانہ آیا، جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا تپلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا، اور ہندوستان کی بولیون مین عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا، اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنین مین صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے، آمد و رفت، لڑائی بھڑائی، اور صلح و پیام کے لیے دونون قومون کی زبانون میں اختلاط کا موقع آگیا تھا، اس وقت لڑائیون کے ہزارون ہندو قیدی ؎، اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی افغانستان ترکستان مین گھر گھر پھیلے تھے، امیر سبکتگین کی فوج مین دوسری قومون کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے،

"و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شدا از ہندو و خلج و از ہر دستی ؎"

سلطان محمود کے دربار مین ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا، جو بچپن مین شیراز پہنچ گیا تھا، فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندوؤن کے ساتھ نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی،

"خطی نیکو بہندوی فارسی، و مدتے دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ، . . . . . و اورا دبیری و ترجمی کردی با ہندوان ؎"

؎ سفرنامۂ بشاری ص ۴۷۹، ؎ کتاب الفہرست مطبوعہ مصر ص ۳۴۶، ؎ قابوس نامہ (۴۷۵ھ) باب در رسم بندہ خریدن، ؎ تاریخ ... ص ۲۴۲، و ص ۵۰۰ کلکتہ، ؎ ایضاً ص ۵۰۳،

ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سبکتگین مین اپنے زمانہ یعنی سلطان مسعود (۴۲۱ھ تا ۴۳۳ھ) کے عہد مین اسی قسم کے ایک اور ہندو مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہے جسکا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا،

"ہم چنان بیربل بدیوان ما"[۱]

سلطان محمود کے دربار مین جہان عرب و عجم کے اہل علم تھے، وہان ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۳ھ مین جب سلطان کی شان مین ہندی مین شعر لکھکر بھیجا، اس موقع پر فرشتہ مین ہے:-

"نندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعری گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آنرا بفضلاے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفرین کردند"[۲]

یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہین ہوا تھا، اس زمانہ مین بھی سلطان کے دربار مین عرب و عجم اور ہند کے فضلا پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے، اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھین اور مزہ لین،

غزنوی بادشاہون کے زمانہ مین جب پنجاب غزنین کا صوبہ تھا، ہزارون لاکھون مسلمان جنکی زبان فارسی تھی، پنجاب مین بس گئے تھے، ظاہر ہے کہ ان مین اور عام اہل ہند مین بول چال اس طرح ہوگی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہون، اور چند روز مین یہ کیفیت ہوگئی کہ مسلمان ہندی مین، یا فارسی آمیز ہندی مین شاعری کرنے لگے، چنانچہ اس عہد کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان، المتوفی ۵۱۵ھ جو لاہور مین پیدا ہوا تھا، اور لاہور ہی مین رہتا تھا، اس نے ایک عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا دیوان یادگار چھوڑا،

یکے بتازی، و یکے بپارسی، و یکے بہندی" (لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص ۲۴۶، گب)

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا، یہانتک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی مین رہ پڑا تھا، اسمین امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ دان شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی، فارسی، ہندی مین علحدہ علحدہ بھی اور تینون زبانون کے مصرعون کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھون نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ مین اس پر فخر کیا ہے،

۱؎ تاریخ بیہقی ص ۵۰۰، کلکتہ، ۲؎ مطبوعہ نولکشور ص ۳۱، جلد اول،

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیوں کے نام لیے ہیں،
سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (گوڑ بنگالہ کا ایک حصہ) گجراتی، تلنگی، معبری (کرناٹکی جسکو کنڑی کہتے ہیں)
دہور سمندی (دھور سمندر کارومنڈل کا پایہ تخت تھا جو اس زمانہ میں نیا فتح ہوا تھا) اودھی، اور دہلوی،

یہی زبانیں تھوڑے تھوڑے فرق سے اب بھی موجود ہیں، امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں
بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں، ابوالفضل ہندوستان کی مستقل زبانوں کا ذکر
اس طرح کرتا ہے،

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شالی (جو سندھ، کابل
اور قندھار کے بیچ میں ہے) بلوچستانی، اور کشمیری،

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس ملک میں ہر زمانہ میں صوبہ دار بولیاں بولی جاتی
تھیں، اور اسمیں کوئی ایک عام اور مشترکہ بولی نہ تھی، اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدرتی طور سے
ایک زبان تیار ہو رہی تھی،

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی، ملک میں زبانوں کے اختلاف کا یہی حال
رہا، کہ ایک صوبہ کا رہنے والا، دوسرے صوبہ کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا،

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ملک جسمیں کم از کم تیرہ مستقل زبانیں بولی جاتی ہوں، اس کو ایک مملکت، ایک حکومت
اور ایک ملک کیونکر قرار دیا جا سکتا تھا، اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لیے ایک
متحدہ و مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی، یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا، اور اس
کو ترقی دی،

اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان، سندھ، گجرات، اودھ، دکن
پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے ملکر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی جنہیں خصوصیت کیساتھ ذکر کے

[1] آئین اکبری جلد سوم "زبانہا" ص ۵۴ نولکشور،

قابل، سندھی، گجراتی، دکھنی اور دہلوی ہین، جن صوبون کی بولیون کو الگ وجود نہین بخشا گیا، ان مین بھی یہ امتیاز نمایان
پڑتا ہے کہ انکی دو قسمین ہین، ایک مسلمانی اور ایک خالص دیسی، چنانچہ بنگالی، مرہٹی، کنڑی، تلنگی، ملیالم، ہر ایک مین
مسلمانی بولی خالص بولی سے الگ ہے، مسلمانی بنگالی، مسلمانی مرہٹی، مسلمانی تلنگی، خالص بنگالی، خالص مرہٹی اور
خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے، یہ امتیاز بھی ہے کہ مسلمان ان صوبہ دار بولیون مین عربی و فارسی لفظون کو ملا کر
بولتے ہین، اور ان صوبون کے اصل باشندے اُن کو خالص اور بے میل بولتے ہین،

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبہ کی مقامی بولیون مین مسلمانون کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا
ہونے لگی، مسلمانون اور ہندؤن کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا، سب سے پہلے ملتان سے لیکر ٹھٹھہ تک سندھ مین اور
پھر یہان سے گجرات اور کاٹھیا واڑ تک ہوا ہوگا، اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ مین فیروز
شاہ تغلق کے عہد مین سندھ مین ملتا ہے، سنہ مذکور مین سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والون
نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھکر کہا،

"برکت شیخ تھیا، اک مُوا، اک تھا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی، کہ ایک حملہ آور (سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ مین حملہ کیا تھا) مرگیا، اور دوسرا
(سلطان فیروز شاہ تغلق) ناکام رہا،

عبارت سے یہ آئینہ ہے کہ اس زمانہ (۷۶۲ھ) مین عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیون کا مجموعہ
جس کو آج آپ اردو کہتے ہین پیدا ہوچکا تھا، ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ
مختلف قومون کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا، اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا
تھا، اس زبان کی پیدائش کی، اور پیدائش کی نہ سہی، تو اس کے قیام، بقا، اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھکر یا گز
ایک اور ہے، مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمران ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے
ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جسکا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک مین کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترک زبان

موجود نہ تھی، لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ، ناخواندہ اور عوام کے لیے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت اور کاروبار میں کارآمد ہو، اور بعینہ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے،

اردو نام | زبانِ اردو کی تاریخ کے متعلق میرامن اور سر سید اور دوسرے پرانے بزرگون نے جو بیان سنایا تھا، وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے، اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابین لکھی گئی ہین جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گذار راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ہے، اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے، اور آج سے پانچسو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہین، اور تیموری بادشاہون سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابین مہیا کیگئی ہین، اور اب چہار درویش کے مصنف میرامن کے اس بیان کو، لوگ صرف بزرگون کی کہانی سمجھتے ہین،

"حقیقت اردو زبان کی بزرگون کی زبان سے یون سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤن کے نزدیک چوجگی ہے، انھین کے راجا پرجا قدیم سے وہان رہتے تھے، اور اپنی بھاکا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانون کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانون نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے مین اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر مین داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا، . . . . جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چارون طرف کے ملکون سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سنکر حضور مین آکر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکھٹے ہونے سے آپس مین لین دین، سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی،

جب حضرت شاہجہان صاحب قران نے قلعۂ مبارک، اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا . . .
. . . . . تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جدی ہے اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر

کہلاتا ہی اور وہان کے بازار کو اردوی معلی خطاب دیا؛

لیکن میرے نزدیک ان چند سطرون مین اردو کی جو تاریخ بیان کیگئی ہے، وہ اشخاص کے نامون کو چھوڑکر سرتاپا حقیقت ہے، آجکل بعض فاضلون نے "پنجاب مین اردو" اور بعض اہل دکن نے "دکن مین اردو"، اور بعض عزیزون نے "گجرات مین اردو" کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبہ کی مقامی بولی مین مسلمانون کی آمد ورفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے، ان سب کا نام "اردو" رکھا گیا ہے، حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکھنی، یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہئے، جیسا کہ اس عہد کے لوگون نے کہا ہے، یہ تغیرات جب ممتاز صوبون مین ہورہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی مین تو اور زیادہ ہوتے،

امیر خسرو اور ابو الفضل دونون نے "دہلوی زبان" کا الگ نام لیا ہے، عہد شاہجہانی مین جب یہان اردوئے معلی بنا، تو اس "زبانِ دہلی" یا زبانِ دہلوی" کا نام، "زبانِ اردوئے معلی" پڑگیا، چنانچہ لفظ اردو زبان کے معنی مین دہلی کے علاوہ کسی صوبہ کی زبان پر اطلاق نہین پایا ہے، میر تقی میر کی تحریری سند مین جب اسکا نام پہلی دفعہ آیا ہے، تو اصطلاح کے طور پر نہین، بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے، یعنی میر نے "اردو زبان" نہین کہا، بلکہ "اردو کی زبان" کہا ہے،

ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبانِ اردوے معلی بادشاہِ ہندوستان" (ذکر میر ص۲۳)

"بادشاہِ ہندوستان کے کیمپ یا پایہ تخت کی زبان"

اس کے بعد عام استعمال مین زبان اردو کے بجاے خود زبان کا نام اردو پڑگیا، اور پھر یہ اردوی معلّٰی سے نکل کر ملک مین ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی، جس اصول پر ہندوستان مین ہمیشہ راجدھانی کی بھاکا، تمام حدودِ سلطنت مین پھیلتی رہی ہے،

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطرون مین اسکو بار بار "نئی زبان" کہا ہے، مگر کیا حقیقت مین اسکو نئی زبان کہنا چاہئے؟ ہم جسکو آج اردو کہتے ہین، حقیقت مین وہ دہلی اور اطرافِ دہلی کی وہ پرانی

بولی ہے، جو وہان پہلے سے بولی جارہی تھی، اور جسمین زمانہ کے قاعدہ کے مطابق انقلاب، اتار چڑھاؤ، اور خرابی ہو ہو کر لفظون کی مناسب صورت بنگئی،

ہر زبان تین قسم کے لفظون سے بنتی ہے، اسم فعل، اور حرف، اس بولی مین جس کو اب اردو کہنے لگے ہین، فعل جتنے ہین وہ دہلوی ہندی کے ہین، حرف جتنے ہین ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہین، البتہ اسم مین آدمے اس ہندی کے، اور آدمے، عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ ہین، اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہین جن کے مسمّٰی ان باہر کے ملکون سے ہین، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی) پادری، الماری، وغیرہ،

اس لئے اردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) مین صرف دو فرق ہین، دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہگئی، لیکن اسی ہندی مین اس وقت کے نئے ضروریات کے بہت سے عربی، فارسی، اور ترکی کے وہ الفاظ آکر ملے، جنکے معنی اور مسمّٰی ان ملکون سے آئے تھے،

دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط مین، اور یہ اردو فارسی خط مین لکھی جانے لگی،

رفتہ رفتہ ایک اور فرق بھی پیدا ہوا کہ پرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے، زمانہ اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان مین ہلکاپن، خوبصورتی اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کیگئی، اسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظون مین بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیان کین،

اردو نے ہندی کے لفظون مین اس قسم کا جو تغیر کیا ہے، اسکی چند مثالین یہ ہین :-

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گنٹھ	گٹھ	جیو	جی
براہمنڑ	برہمن	شکتی	سکت
راونڑ	راون	رکھشا	رکھ
ووا ہ	بیاہ	پونچا	پہنچا

ہندی	اردو	ہندی	اردو
جیشٹھ	جیٹھ	کنتو	کیونکہ
ورش	برس (سال)	ائی	مان
پرنتو	پر (مگر)	سمے	سمان
اوچت	اچھا	دیش	دیس
سمبندھی	سمدھی	لکشن	لچھن
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناس (خراب)
وچار	بچار	اگنی	آگ
کشتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلامانس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا سانچ	سچ
ورشا رت	برسات	کٹمب	کٹم (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا
ہستی	ہاتھی	پانیں	پانی
بادر	بادل	دودھے	دہی
دُدّھ	دودھ یا دود	گھرت	گھی
نا	نہ	بھنت بھنت	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا، اور ہمیشہ آمد ورفت لگی رہتی تھی، اسلئے اس دہلوی ہندی میں سینکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رُل مل گئے، خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں

کی آمیزش زیادہ ہوئی،

کہین یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونون کے ہم معنی لفظون کو ایک جگہ کرکے بولنا شروع کیا، تاکہ دونون زبانون کے الگ الگ جاننے والے، ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لین، جیسے دھن دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق، ہنسی خوشی، بھائی برادر، رشتہ ناتہ، داغ دھبہ، دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رسم، کبھی فارسی لفظ مین ذرا ہندی پن پیدا کردیتے ہین جیسے جن، مجور یا مز دور یعنی مزدور، لونڈی باندی (بندی، بندہ بمعنی غلام)

ان دونون کو دو زبانون کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لئے یہ چاہئے کہ ان دونون کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنالین، جنکو دونون نباہ لیجائین،

تاریخ صقلیہ جلد اول

از مولوی سید ریاست علی ندوی، رفیق دار المصنفین، سب اڈیٹر معارف،

مسلمانون نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کیطرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنادیا اور تقریباً پانچ سو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہو کہ اسکی کوئی تاریخ اردو، انگریزی مین کیا عربی مین بھی موجود نہ تھی مصنف نے چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش اور تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدون مین اسکی تاریخ مرتب کی ہو جو اردو کیا مشرقی زبان مین سسلی کی سب سے پہلی اسلامی تاریخ ہی، اسکی پہلی جلد شائع ہوگئی ہو جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہو اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی اٹلی اور جزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام عہد بعہد کے دورون کا عروج، اسلامی حکومت کا خاتمہ اور صقلیہ اور جزائر صقلیہ مین مسلمانون کے مصائب اور جلا وطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہو، ضخامت مجموعی ۵۰۰ صفحے، علاوہ متعدد رنگین نقشہ جات، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، قیمت صرف للعہ

"منیجر"

"وجودِ روح" روحانیین کے نقطۂ نگاہ سے[1]

از جناب محمد اصغر صاحب، انصاری، بی اے بھوپال

ارباب سائنس اپنے حواس اور آلات اور غور و فکر کے ذریعہ سے اشیار کی اصل حقیقت کا پتہ چلانے کی سعی مین مشغول ہین، اور اس نتیجہ پر پہنچے ہین کہ ہماری یہ زمین جسپر ہم بستے ہین اس نظامِ شمسی مین چندان اہمیت نہین رکھتی، ہمارا یہ عالمِ مشہود اپنے اندر ایک لاانتہائیت رکھتا ہے، ان ارباب علم کو ایسی بیشمار دنیاؤن کا پتہ معلوم ہوگیا ہے جو اس فضائے بسیط مین پھیلی ہوئی ہین، جنکے مقابلہ مین ہمارا کرۂ خاکی یکسر ناقابلِ لحاظ ہے، اجرامِ سماوی کے متعلق یہ تخیل گو نسبتہ ایک جدید خیال ہے، لیکن اس نے انسانی افکار مین ایک انقلابِ عظیم برپا کردیا ہے، اس لئے یہ چندان تعجب خیز نہین ہے کہ ابتدائً اصحابِ غرض نے اس نظریہ کی مخالفت کی جنمین سے بعض کا تعلق مذہبی گروہ سے تھا اور بعض ایسے لوگ بھی شامل تھے جو محض اسلئے مخالف ہوگئے تھے کہ فہم سادہ کے نزدیک یہ بات لائقِ قبول نہ تھی کہ ہماری یہ زمین بھی منجملہ ان دیگر سیارون کے ایک سیارہ ہے جو اس فضا مین گردش کر رہے ہین، اب ہم رفتہ رفتہ اس جدید نظریہ کے عادی ہوگئے ہین لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اب بھی بہت ہی کم نفوس ایسے ہونگے جنپر یہ امر اچھی طرح واضح ہو کہ ہم اس کائناتِ خلقت کے بحرِ زخار مین ایک قطرہ سے زیادہ نہین ہین، اور اس لئے یہ دعوی کسقدر طفلانہ ہے کہ انسان جو چیونٹی کی طرح اس کرۂ ارضی پر رینگتا ہوا نظر آتا ہے، اور جسکی پیدائش کو ہنوز چند ہزار سال سے زیادہ عرصہ نہین گذرا، وہ اصل حقیقت کا شناسا ہے، ہم انسانون کی یہ توقع ہی بیجا ہے کہ ہم اس محدود علم و تجربہ کے باوجود "اس ذات" اور اس "مشیئت" کی بابت کوئی عرفان صحیح رکھ سکتے ہین جو اس "تمام مین ساری ہے"، ہم ہنوز غور کر رہے ہین، تاریکی مین ٹٹول رہے ہین، لیکن ہان یہ امید ضرور رکھتے ہین کہ تدریجاً حقیقت سے قریب تر ہوتے چلے جارہے ہے

---

[1] اس مقالہ کے ابتدائی حصص سر الیور لاج کی کتاب سے ماخوذ ہین،

ہین، غور کرو کہ باوصف فکر و ادراک کی اس نارسائی کے اگر ہم بحث و اختلاف کا غوغا بلند کرین تو یہ کہانتک ہمارے حالات کے مناسب ہوگا، اس کے قطعًا برخلاف ہمارا طرزِ عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ اس ہنگامۂ اقرار و انکار کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ اس لئے تعاون عمل کرین کہ اصل حقیقت کی بابت ہم سب کا علم وسیع تر ہو جائے اور ہمارا اصل مقام اور ہماری زندگی کا اصل مقصود ہم پر منکشف ہو جائے، لیکن خود اس اعتماد و یقین کے لئے کہ اس کائنات مین ہمارا وجود بھی یک گونہ اہمیت رکھتا ہے ہمکو قوت ایمانیہ کی ضرورت ہے، وہی قوت ایمانیہ جو ہماری تمام قوتون کی اصلی محرک ہے، جو تمام علمی اکتشافات کی اصل بنیاد اور فنون لطیفہ کے تمام کارنامون مین قدر و قیمت پیدا کرنے کی موجب ہے، اور مذہب کا اصلی مبنیٰ اور اس کے لئے بمنزلۂ قلب و روح ہے،

جب اس کائنات پر خالص سائنس کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی جاتی ہے تو ہمین شک نہین کہ سائنس مین کہین بھی خدا کا لفظ استعمال نہین کیا جاتا بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ ایسے آخری علل و اغراض تک پہنچنے سے اعراض کرتی رہتی ہے جو اس کے موضوع سے باہر ہون لیکن بہرحال اس نے بعض ایسی باتین ضرور بتلادی ہین جو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اہم و مفید ہین،

پہلی بات جو سائنس نے بلا کسی ادنیٰ شک و ریب کے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا مین زندگی بسر کر رہے ہین جو تمامتر قانون و نظم سے منسلک ہے، یعنی اس عالم کا ہر ذرہ ان مؤثرات کا تابع فرمان ہے جو اس پر عارض ہین، اس فطرت مادی مین کہین بھی کسی طرح کا تلون یا تفاوت نہین پایا جاتا، یہی سبب ہے کہ ہم معلول سے علت کا پتہ چلانے مین کوئی غلطی نہین کرتے، فطرت کا تمام کاروبار قطعًا مستقل اور یقینًا لائق اعتماد ہے، کہین بھی تم کو ادنیٰ ترین تبدل یا انحراف نظر نہ آئے گا، الغرض جہانتک اس کائنات کا مطالعہ ممکن ہو سکا ہے اور قوانینِ فطرت کو معلوم کر سکی ہے اس مین کہین بھی کوئی فتور یا تضاد نہین پایا جاتا، فطرت تمامتر نظم اور سب سے بالاتر ہے،

دوسری بات جو سائنس نے ہم کو بتائی ہے وہ یہ ہے، کہ گو اس کائنات کی بابت ہمارا علم ازمنۂ سابقہ

کے مقابلہ مین بہت زیادہ وسیع ہوگیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے تخیل وگمان سے بھی کہین زیادہ بڑھ گیا ہے، لیکن اس وسعتِ علم کے باوجود بھی ہم اس کائنات کی وسعت کا کوئی اندازہ نہین کرسکتے، اس فضائے بسیط کا ہرستارہ کم وبیش ہمارے اس آفتاب ہی کی طرح بڑا ہے، یہ کہکشان جسمین اربون کی تعداد مین ستارے پائے جاتے ہین، نظامِ سماوی مین ایک حقیر نقطہ سے زیادہ نہین ہے اور گو بذاتہ اس قدر طویل وعریض ہے کہ اس کے حجم کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، لیکن ہم کو اس سے زیادہ فاصلہ پر ایسی متعدد کہکشائین نظر آتی ہین جنمین سے بعض اتنی ہی بڑی ہین جیسی یہ ہماری کہکشان اگو یا وہ بذاتِ خود ایک کائنات معلوم ہوتی ہین اور اس ناپیدا کنار فضا مین اس قدر بعید فاصلہ پر واقع ہین، کہ خود یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ ہم کو ان کا علم کیونکر ہوا، محض بڑی بڑی دوربینون اور فوٹوگرافی کی انتہائی ترقیون کے باعث ہم کو ان مین سے اکثر کی جھلک معلوم ہوئی ہے، بہرحال ہم اس کا اندازہ تو کرسکتے ہین کہ سیارات وثوابت کی ان دنیاؤن سے جو روشنی چلکر بالواسطہ اب ہم تک پہنچ رہی ہے، اسکو چلے ہوئے بھی کڑوڑون برس ہوگئے ہین، تم تنہا اسی واقعہ سے اس کائنات کی وسعت ولاانتہائیت کا تصور کرو، کیا محض مادی نقطۂ نظر سے بھی یہ کائنات اور اس کائنات کی یہ پہنائی مرعوب کن نہین ہے؟ لیکن یہ بات یہین تک ختم نہین ہوجاتی بلکہ حیرت تو یہ ہے کہ کیمیا، اور طبعیات کے وہ قوانین جو اس کرۂ ارضی مین عمل پیرا ہین وہی قوانین طبعی اس تمام وسیع وعریض فضا مین بھی جس کا ابھی ذکر ہوا پورے پورے عامل ہین، وہی اجزائے لایتجزی جو یہان پائے جاتے ہین وہی اس تمام کائنات مادی مین پھیلے ہوئے ہین، اور یکسر ایک ہی قانون کے مطیع ومنقاد ہین، حرارت ونور کے انعکاس واشعاع کا جو عمل ہماری اس دنیا مین جاری ہے وہی عمل بعید ترین ثوابت اور سیارون مین بھی پایا جاتا ہے، الغرض سائنس کا فتویٰ یہ ہے کہ جو عمل طبعی یہان جاری ہو وہی تمام کائنات مین جاری ہے، کہین بھی ادنیٰ ترین تضاد وتخالف نہین ہے، سائنس کا یہ فتوی اگر کسی نتیجہ تک ہماری رہبری کرتا ہے وہ صرف ایک ہی ہے، یعنی یہ کہ تمام کائنات فی حد ذاتہ ایک ایسی وحدت تامہ ہے جس مین باہم کوئی تضاد وتنافر نہین ہے، وہ ایک ہی قانون ہے جو اس کل مین یکسان عامل ہے، پس اگر کوئی

ایسا وجود ہے جسکو ہم خدا کہکر پکارتے ہین، اور اگر وہ کارساز اور علیم ہے تو یقیناً وہ اس تمام کائنات کا علیم و کارساز ہے، ہماری دنیا کا خدا محض اسی دنیا کا خدا نہین ہے بلکہ تمام ارض و سموٰات کا خدا ہے اور یقیناً اسکی قدرت اس کائنات کے بعید ترین حدود پر بھی یکسان طور پر حاوی ہے، اور باوصف اس وسعت کے چھوٹی سی چھوٹی جزئیات بھی ایسی نہین جو اس کے علم و توجہ سے بے نیاز ہون، اس عظیم المرتبت ذاتِ واحد کی معرفت مین ہم خواہ کتنے ہی ناقص کیون نہ ہون لیکن ہمارا وجود، عالم مادی اور روحانیت کا یہ تمام نظام، الغرض ہر شے اسی سے ہے اور اسی کے لئے ہے، سائنس رفتہ رفتہ ہم کو اسی منزل کی طرف لیجا رہی ہے، مذہب کا منتہائے نظر بھی یہی ہے، اختلاف مقصود کا نہین صرف طریق عمل کا ہے،

"وجودِ روح کے امکانات"

سائنس کا محدود میدان عمل یہ یقین کہ ایک ذاتِ واحد کا وجود اس تمام موجودات کی علت یا مبدا ہے، ہمارے اس یقین مزید کا بھی موجب ہے کہ انسانی روح فنا پذیر نہین ہوتی ایک ایسی ذہین و ذکی مخلوق کا معرض وجود مین لانا جو "سچائی" کی ساعی اور "خیر" کی آرزومند اور "جمال" کی جویان ہو اور جسمین "یقین" "امید" اور "محبت" جیسے اعلیٰ صفات ودیعت کئے گئے ہون اور پھر ان تمام خوبیون کے بعد وہ بالآخر فنا کر دیجائے، یہ فنا اور یہ اختتام بھی ایسا ہو جس سے آیندہ کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوتا ہو، یہ صورت حال یقیناً قوتِ تخلیق کی انتہائی اضاعت اور ایک ایسی ستم ظریفی ہے جو ہرگز کسی ایسی ذات کی طرف عقلاً منسوب نہین کیجا سکتی جو لائق عظمت و عبادت قرار دی گئی ہو، چنانچہ مذاہب جو ہمیشہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہین وہ اس پر بھی مجبور تھے کہ بقائے انسانی کے مسئلہ کو بھی حق تسلیم کرین، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا سائنس کے طریق تحقیق کی بنا پر بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے یا نہین کہ انسان اس ظاہر ظہور کے اختتام کلی یعنی "موت" کے بعد بھی زندہ رہتا ہے یا نہین،

غیر متعین اور مبہم طور پر تو حیات بعد الموت کا عقیدہ ہمیشہ سے نسل انسانی کے سامنے رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ یقین ہماری جبلت مین داخل ہو گیا ہے، یہی باعث ہے کہ کسی نہ کسی شکل مین اس عقیدہ

کو ہر ملک وملت مین تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سائنس مین اب تک کبھی بھی اس خیال نے کوئی جڑ نہین پکڑی بلکہ اسکے برعکس ابتک یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ مسئلہ اپنے اندر ایسی نوعیت رکھتا ہے، جس سے وہ آرٹ یا مذہب سے تو متعلق ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے جسمانی تجربات کے ٹھوس واقعات کے مطابق نہین ہو سکتا،

اہل سائنس مین ہمیشہ سے ایک گروہ کا یہ خیال قائم رہا کہ جوہر حیات (یعنی روح) کا تمامتر وجود ہمارے دماغ وقلب اور دیگر اعضا کے صحیح فعل وعمل پر مبنی ہے، یہ اصحاب ہمارے افکار ذہنی اور تخیلات کو حواس ظاہری کا اس درجہ پابند ومقید باور کرتے ہین کہ ان کے نزدیک کسی ایسی حیات بخش قوت (یعنی روح) کا کوئی پتہ نہین ہے، جو اعضا، وجوارح سے جداگانہ کوئی مستقل بالذات وجود رکھتی ہو، یہ لوگ قوت شعور وادراک یا قوت استدلال کے منکر نہین ہین، ان قوا کو وہ خود کام مین لاتے رہتے ہین، لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ شعور، ادراک یا استدلال دراصل اس مستقل بالذات وجود کے باعث ظہور مین نہین آتے، جسکو عوام "روح" سے تعبیر کرتے ہین، بلکہ یہ مظاہر ہمارے جرم دماغ کے جسمانی فعل وانفعال کے سوا اور کچھ نہین ہین، وہ ان حدود سے باہر جانا نہین چاہتے جہان ان کی خوردبینین یا دیگر آلات کام مین نہ آسکین، اسی لئے وہ ان میدانون سے گریزان رہتے ہین جنکا تعلق تصوف یا اسرار مذاہب سے ہے، دوسرے لفظون مین یہ کہنا چاہئے کہ وہ ان مباحث مین نہین پڑنا چاہتے جنکا تعلق مابعد الطبعیات سے ہو جو کبھی بھی مشاہدۂ حواس مین نہین آسکتے، وہ صرف محسوس اور مشہود اور ایسی چیزون سے بحث کرتے ہین جو آنکھون سے دیکھی اور کانون سے سُنی اور ہاتھون سے چھوئی جاسکتی ہون، بعبارت مختصر ان کا دائرۂ عمل صرف طبعیات ہے، اور چونکہ خود طبعیات کی دنیا بھی کافی وسیع اور دلچسپ ہے اس لئے ان مین کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا کوئی میلان ہی پیدا نہین ہوتا، ان کا ادعا یہ ہے کہ کوئی روحانی یا نفسی وجود بغیر طبعی وکیمیاوی سلسلۂ اعمال کے بذاتہ کوئی معنی نہین رکھتا، ان آخر الذکر مظاہر کی جزوی تفصیلات کے افہام وتفہیم ہی تک ان کے تمام مساعی محدود رہتے ہین، وہ بزعم خود اجسام مادی کے سالمات ہی کے طریق کار کو کافی ووافی سمجھتے ہین، اور یہ باور کرتے ہین کہ جس چیز کو شعور یا زندگی کہا جاتا ہے وہ محض انھین اجسام

مادی کے عمل کیمیائی کا نتیجہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہین ہے،

بقائے روح یا ایک ایسی ہستی برتر کے وجود کے بارہ مین جو تمام کائنات کی ذمہ دار ہے ان کا خیال یہ ہے کہ یہ مسائل کسی دوسرے ہی شعبہ سے متعلق ہین اور گو وہ ان خیالات کی بھی کچھ نہ کچھ عزت کرتے ہین، کیونکہ بحیثیت انسان ہونے کے وہ اُن جذبات وحسیات سے متاثر ہوئے بغیر نہین رہ سکتے جو پوری انسانی جماعت پر عائل ہین، لیکن ان کے نزدیک اس قسم کے مذہبی تخیلات خالص سائنس کے نقطۂ نظر سے قطعاً بے معنی ہین اور اس کی صاف وجہ یہی ہے کہ یہ امور نہ تو احاطۂ حواس مین آتے ہین اور نہ کسی معمل مین انکی ناپ تول کیجا سکتی ہے، اور چونکہ "الہام" بھی علم طبیعی کے حدود مین نہین آتا اس لئے وہ اس سے بھی کوئی تعرض نہین کرتے،

بیشک اُنھون نے اپنے دائرۂ عمل کو محسوس ومشہود امور تک محدود کرنے مین اپنے کام کو بہت آسان کر لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس خاص صنف علم مین بڑی حد تک ترقی کرتے چلے جا رہے ہین، مادہ اور سادہ کے مختلف احوال ومظاہر کا ان کو بہت کچھ علم حاصل ہو گیا ہے جو محض غیر عضوی اجسام ہی تک محدود نہین ہے، بلکہ اجسام عضوی کو بھی دائرۂ تحقیق مین لے لیا گیا ہے، اس تمام فضاء کے اجرام سماویہ اور جواہرون کے متعلق ہمارا علم وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اور یہ طریق تحقیق واکتشاف اس درجہ کامیاب ہے کہ سائنس نہ صرف رائل سوسائٹی (ROYAL SOCIETY) کے بانیون بلکہ جماعتِ انسانی کی توقع سے بھی کہین زیادہ ترقی کر گئی ہے،

اس مین شک نہین کہ جہانتک مادیات کا تعلق ہے ان محققانِ فن نے انتہائی صبر ومحنت سے کام کیا ہے، اور یہ تمام تر سعی یقیناً دریافتِ حق کے لئے کی گئی ہے، خود یہ میدان اسقدر طویل وعریض اور ایسی بیشمار دلچسپیون کا مرکز ہے کہ ان اصحاب کو دوسری طرف نگاہ اٹھانیکی آرزو ہی پیدا نہین ہوتی، ہماری آیندہ نسلون کی پوری زندگی انھین محدود خطوط پر کائنات کے نوامیس کی جستجو اور دریافت مین صرف ہو جائیگی، دراصل اس عالم کا مادی رخ بھی ہوش ربا ہے، ہمارا علم مسلسل بڑھ رہا ہے اور کہین ختم ہوتا نظر نہین آتا، جس قدر ہم زیادہ جانتے جاتے ہین اتنا ہی زیادہ ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ہنوز بہت کچھ جاننا باقی ہے، گویا یون کہنا

چاہئے کہ اس مادی سمت مین بھی ایک طرح کی لاانتہائیت ہے، لیکن دوسری طرف کاروباری اصحاب، اربابِ فن وادب، اہلِ مذہب اور دیگر پیشہ ور جماعتون نے اپنی قابلیتون اور استعدادون کو دوسرے نہج پر تربیت دیا ہے ان کو سائنس کی تحقیقاتون کا بہت ہی کم علم ہے لیکن وہ ایسے عالم مین کام کرتے ہین جہان سائنس کے علاوہ دیگر انسانی اعتبارات مافوق نظر آتے ہین، جہان اس کائنات کا ایک دوسرا ہی رخ نمایان ہوتا ہے، ہماری مراد انسانی زندگی کے اس پہلو سے ہے جہان "یقین" "امید" اور "خیر" جیسے اعلیٰ مقاصد معرضِ بحث مین آتے ہین۔ لاریب یہ مقاصد اپنے اندر ایسے ہی حقائق اور اسی قدر دلچسپیان رکھتے ہین جیسے کہ سائنس کے مسائل،

بات دراصل یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے ہر شعبہ مین ناپیداکنار ہے، تم جس طرف بھی جاؤ جس شعبہ کی طرف بھی رخ کرو تمہاری ترقیون کی کوئی انتہا نہین ہے کشفِ حقائق کا سلسلہ کہین بھی ختم نہین ہوتا مگر ان نوامیسِ فطرت ہم پر یکبارگی آشکارا نہین کئے جاتے، اس حسن سرمدی کے چہرہ سے نقاب تدریجاً ہی اٹھ رہی ہے، کہ ہماری استعداد و ذوق کی رعایت کا تقاضا یہی ہے، اگر وہ جمالِ محجوب بیک وقت بے نقاب ہو جائے اور یہ جلوۂ ناتمام یکسر تمام ہو جائے تو پھر تفریق و امتیاز کی تمام ہنگامہ آرائیان، عشق و محبت کی تمام سوزشین، تحقیق و کاوش کی تمام تگ و دو ایک تعجب انگیز حیرت مین بدل جائینگی ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ اُن کے جلوہ نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

لیکن انسان مین ذوق علم و معرفت ودیعت کیا گیا ہے، اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ جہان وہ فطرت کو اس کے مختلف شعبون اور حالات مین دیکھنے کا طالب ہے وہان ایک چھپی ہوئی لیکن بہت زیادہ قوی یہ آرزو بھی کام کر رہی ہے کہ وہ حسنِ فطرت کو اپنے بسیط عالم مین یعنی تعینات کی حدود سے باہر دیکھے، ایک فلسفی بخلاف دیگر محققینِ علم و فن اسی آخرالذکر جذبہ کا مظہر ہے، اسکی تمامتر جد و جہد یہی ہے کہ حقیقت کے جتنے بھی شعبے اور شاخین ہو سکتی ہین ان سب کو یکجا کرے اور ان سب مین باہمی ایک ایسا ربط دریافت کرے جو ان مختلف

علوم وفنون کو بہ اعتبار حقیقت کے ایک بنا دینے والا ہو، ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لیے ہماری سعی کی ابتدا بہت سادگی سے ہوگی اور شروع مین ہم اپنے آپ کو بعض مخصوص نظائر اور بعض ایسے ہی مخصوص واقعات تک ہی محدود رکھنے پر مجبور ہونگے لیکن جون جون ہماری معلومات مین اضافہ ہوتا جائیگا اور ہم علوم وفنون کے باہمی ربط کی کڑیون کا پتہ چلاتے جائین گے تب یہ واضح ہوگا کہ کشف وتحقیق کے یہ مختلف راستے دراصل ایک ہی منزل تک لیجانے والے ہین یا ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہین،

ہم کو اپنے اندر واقعات کے احترام کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے، ایک منفرد واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حقیقت کیون نظر نہ آئے، لیکن یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جب اس نوع کے بہت سے واقعات معلوم ہو جائین گے اور ہم ان کو ایک مناسب ترتیب کیساتھ جمع کرلین گے تو یہی بے حقیقت واقعات ایک مستقل علم وفن بنجائین گے،

عالمِ ارواح کے وجود کے متعلق جو واقعات اور شہادتین اب فراہم ہوتی جارہی ہین، گو حیثیت علمی نقطۂ نظر سے ہنوز چندان اہم نہ ہون، لیکن ہم کو جلد بازی اور تعصب سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ صبر وتامل کیساتھ ایک فلسفیانہ وسیع النظری سے ان کی تنقیح وتدوین مین مشغول ہو جانا چاہئے، اور پھر ایک کھلے ہوے دل و دماغ کے ساتھ ظہورِ نتائج کا منتظر رہنا چاہئے،

بعض لوگ اس کے شاکی ہین کہ وہ واقعات جنپر ہم اپنے نتائج مبنی کرتے ہین، بیشتر کم وزن ہین، لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بظاہر بے وزن واقعات مین کیا اہمیت پیدا ہو جائیگی اگر ہم باقاعدہ ان کے مطالعہ مین مشغول ہون اور ان کے سمجھنے کی واقعی سعی کرین، ایک نشان پا یا دھوئین کا ایک دھبہ کس قدر بے حقیقت ہے، لیکن یہی چیز پولیس کے سراغرسان کے لیے بہت اہم ہو جاتی ہے،

"انجمن تحقیق روحانیات" ۱۸۸۲ء مین قائم ہوئی تھی تاکہ وہ اُن اَن گنت شہادتون اور واقعات کی جانچ اور تحقیق کرے جو سننے مین بہت آتے تھے لیکن کبھی ان کی علمی طور پر تحقیقات نہ کی گئی تھی، لیکن جب ان امور کی تنقیح کیگئی اور موانعات اور دقتون کے باوجود صبر واستقامت کیساتھ تجربات کا

سلسلہ جاری رکھا گیا تب ہمکو اپنی نئی قوتون اور نئی استعدادون کا پتہ چلا اور ان واقعات کی سچائی متحقق ہوئی جو اب تک تاریکی یا قصہ کہانیون کے گرد و غبار مین چھپے ہوئے تھے، بیشک ہم کو دھوکون اور فریبون سے سابقہ پڑا لیکن ہم اس سے دل شکستہ نہ ہوئے چنانچہ تدریجاً اہل علم مین یہ یقین پیدا ہو رہا ہے کہ وہ عقیدے جو تمام دنیا مین پھیلے ہوئے ہین گو توہمات سے ملو ہین لیکن دراصل حقائق پر بھی مبنی ہین، اس اصل حقیقت ہی کا پتہ چلانا ہمارا کام تھا اور جس طرح بہت سے آثارِ قدیمہ جو زیر زمین مدفون تھے، ہمارے زمانہ مین کھود کر نکال لئے گئے ہین، اسی طرح ان افسانہائے پارینہ کو جب عہد مظلم کے گرد و غبار سے پاک و صاف کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر بھی کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے، آئیے اس جگہ ہم بطور خلاصہ کے اُن نتائجِ تحقیق کو بیان کر دین جو روحانیین کو معلوم ہوئے ہین، ان مین سے ایک بنیادی اور متفق علیہ امر یہ ہے کہ عالمِ ارواح ایک حقیقت و واقعیت ہے، انسانی ہستی کے مختلف مدارج و مراتب ہین، انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، انسانی وجود کے ان مختلف مراتب و منازل مین باہم کوئی ناقابلِ گذر حد فاصل نہین ہے، اس لئے بعض شرائطِ مخصوص کے تحت مین ارواحِ موتیٰ سے تخاطب و مکالمت ممکن ہے،

وجودِ روح پر ایک تفصیلی بحث

فرانس کے مشہور فلسفی "ڈیکارٹس" کے تمام فلسفہ کی بنیاد اس کے اس مشہور قول پر ہے کہ چونکہ "مین غور کرتا ہون اس لیے مین موجود ہون یعنی دراصل غور و فکر ہی کی اہلیت وہ چیز ہے جس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہون کہ "مین" موجود ہون، لیکن سوال یہ ہے کہ اس "مین" کی اصل حقیقت کیا ہے، کیا میرے ہاتھ پاؤن، آنکھ، ناک، اور میرے جسم کے دیگر اعضا میرے وجود کی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہین، میرے ہاتھ کٹ جاتے ہین لیکن مین موجود ہون، آنکھون کی بینائی چلی گئی لیکن مین فنا نہین ہوا، پاؤن قطع کر دئیے گئے لیکن میرا وجود باقی ہے، ان امثال سے ظاہر ہے کہ ان اعضا کو منفرداً میرے وجود کی اصل حقیقت

ین کوئی دخل نہین ہے، اس موقع پر اطبا، اور اہل سائنس بڑھینگے اور کہینگے کہ تمھارے وجود کی اصل حقیقت
در اصل اس نظام عصبی مین پنہان ہے جس کا مرکز دماغ اور نخاع ہے یا پھر قلب مرکز حیات ہے، تمھارے دماغ
قلب کو اگر کوئی سخت اذیت پہنچ جائے تو پھر تم ختم ہو جاتے ہو، نہ تم غور کر سکتے ہو، نہ محبت و نفرت، نہ خدا کا
خوف ہی باقی رہتا ہے اور نہ مذہب کا جوش و وارفتگی یعنی تمھارے بلند سے بلند حیات و جذبات اور تمھارے
تخیل کی وسعت و کار فرمائی، تمھاری ساری حکمت و دانش، تمھارا پورا نظام اخلاق و عمل ایک دھوکا ہے اور کچھ
نہین، بہ الفاظ دیگر انسان عناصر کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس مین غور و فکر، شرم و حیا، محبت و نفرت، بینش بینی
ور حافظہ جیسے اوصاف پیدا ہو گئے ہین، جب یہ ترتیب عناصر بگڑ جاتی ہے تو تم بھی ختم ہو جاتے ہو، نہ کوئی
روح ہے جو آسمان پر چلی جائے اور نہ عذاب قبر ہے نہ سوال حشر ؎

زندگی کیا ہے عناصر مین ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھین اجزا کا پریشان ہونا

یہ خلاصہ ہے اس نظریہ کا جو انسانی وجود کے بارے مین مادیین پیش کرتے ہین، اس کے بالمقابل
ایک دوسری جماعت ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا جسم مادی اور نظام عصبی ہمارے وجود کی اصل حقیقت
نہین ہے، بلکہ یہ سب نشیمن اور گہوارہ ہین ایک دوسری اصل کا جس کو ہم روح سے تعبیر کرتے ہین اور اس
روح کی نوعیت جیسا کہ مادیین کہتے ہین یہ نہین ہے کہ وہ ہمارے دماغ اور نظام جسمانی کے بعض کیمیائی یا طبعی
عمل یا ردّ عمل کا نتیجہ ہے، بلکہ وہ ان سے مافوق ایک ایسی جنس ہے جو مادی نہین ہے اور اس سارے نظام
جسمانی عصبی پر بطور مدبر اور حکمران کے متصرف ہے،

انسانی وجود کی حقیقت کے بارہ مین یہ دو بالمقابل نظریات ہین جن پر ہمین غور کرنا ہے اور متقابل دلائل
کے وزن کی بنا پر یہ دیکھنا ہے کہ کونسا نظریہ اس قابل ہے کہ اسکو تسلیم کیا جائے،

لیکن قبل اس کے ہم مادی نظریہ کو تفصیلاً بیان کرین ان اخلاقی قوتون کو بھی بیان کر دینا ضروری

سمجھتے ہیں، جو اس مادی نظریہ کے بجنسہ تسلیم کر لینے سے لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں، اگر انسان اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض کیمیائی اسباب کی بنا پر رحم مادر میں کچھ عناصر باہم مرتب ہو گئے ہیں اور اوصاف حیات (مثلاً محبت، نفرت، غور و فکر، اخلاقی ذمہ داری کا احساس وغیرہ) نتیجہ ہیں اس کیمیائی عمل اور ردّ عمل کا جو ہمارے جرم دماغی میں غیر شعوری طور پر واقع ہوا ہے تو لازمی طور پر ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ تمامتر تابع ہوتے ہیں اسی کیمیائی یا طبعی عمل کے جو ہمارے دماغ یا نظام عصبی میں ابتداءً پیدا ہو چکا ہے، یعنی اس نظریہ کے تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح انسان میں غور و فکر اور حسیات و جذبات بذاتہا خود بخود رونما نہیں ہوئے اسی طرح ہمارے افعال کا ظہور بھی ہمارے اختیار و تصرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تابع ہوتے ہیں ہمارے افکار و حسیات و جذبات کے اور چونکہ خود غور و فکر، حسیات و جذبات بذاتہا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے بلکہ نتیجہ ہوتے ہیں بعض ان لامعلوم کیمیائی اعمال کا جو ہمارے جرم دماغی میں جسم کے بیرونی یا اندرونی مؤثرات کے باعث پیدا ہوتے رہتے ہیں، تو ان مقدمات سے صاف و صریح نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان اپنے افعال پر خود قادر نہیں ہے اسکا ارادہ کوئی مستقل شے نہیں ہے، اور اگر صورت حال یہی ہے جیسا کہ اس نظریۂ مادی کے بجنسہ قبول کر لینے سے مستنبط ہوتا ہے تو پھر ایک انسان کی اخلاقی ذمہ داری محض بے معنی ہے، تمہاری عدالتوں کا قیام تمہارے جیل اور تادیب گاہیں اور تمہارے وہ مدرسے جنمیں اخلاقی ذمہ داری کا درس دیا جاتا ہے سب بیکار ہو جاتے ہیں. تمہارا اصول سزا و جزا اور قانونی احتساب ایک ایسا ظلم ہے جسکو تم ایک ایسی مخلوق پر کرتے ہو جو اپنے اعمال کی مختار نہیں ہے، ایک شخص ایک گرم ملک اور ایک گرم رات میں بعض خاص قسم کی غذائیں استعمال کرتا ہے جس سے اسکے جسم کے اندر کچھ کیمیائی اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں اور یہی اعمال باعث ہوتے ہیں ایک مخصوص قسم کی رائے اور مخصوص قسم کے جذبات پیدا کرنے کا جنکی بنا پر ایک مجبور و معذور انسان قتل یا رہزنی کر لیتا ہے تو تم ساری پولیس اور تمام عدالتوں کو اسکے پیچھے لگا دیتے ہو، اسکو خطاکار قرار دیتے ہو، درآنحالیکہ لائق الزام انسان نہیں ہے بلکہ خود اسکا نظام وجود ہے، یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ایک حجت الزامی ہے اور گو بذاتہا بہت باوزن ہے لیکن مشککین روحانیت کی تسکین کا باعث نہیں ہے اس لئے اب ہم تفصیل کیساتھ انسانی وجود کے مادی نظریہ کو بیان کرنا چاہتے ہیں ،

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اہلِ سائنس اس عالم کی تکوین کا باعث ان ۹۰ یا ۹۲ عناصر کو سمجھتے تھے جو اس وقت تک دریافت ہوئے تھے' ان عناصر کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ کبھی معدوم یا فنا نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ بعض مخصوص خواص اور طبیعتیں رکھتے ہیں' اس دنیا میں جو کچھ بھی بشکل اجسام و اشیا ہم کو نظر آتا ہے وہ انھیں عناصر کی کیمیائی ترکیب کا حاصل ہے یعنی تمام چیزیں ایک یا دو یا زیادہ عناصر سے مرکب ہیں اور وہ عناصر ان میں ایک خاص نسبت سے ترکیب پائے ہوئے ہیں' جب یہ ترکیب کسی کیمیائی عمل سے ٹوٹ جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ چیز فنا ہو گئی' لیکن دراصل جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ اس چیز کے عناصر ترکیبی نے اپنے باہمی ربط کو چھوڑ دیا ہے' جس کے باعث وہ اپنی ابتدائی شکل و صورت میں باقی نہیں رہی' ورنہ دراصل عناصر ترکیبی معدوم نہیں ہوئے' بلکہ اس فضا میں کسی دوسری ترکیب یا حالت میں ضرور موجود ہیں' یہ بیان اپنی توضیح کے لیے ایک یا دو مثالوں کا محتاج ہے'

سوڈیم اور کلورین دو عناصر ہیں جنمیں سے کلورین (زہریلی) ایک گیس (ہوا) ہے جو بذاتہ سم ہے' اگر کافی مقدار میں انسان کے پھیپھڑوں میں پہنچ جائے تو انسان مرجائے' دوسرا عنصر سوڈیم (SODIUM) ایک طرح کی دھات ہے جو اگر جلد پر لگ جائے تو جلا دے' یہ دونوں عنصر جب کیمیائی ترکیب پا جاتے ہیں' تو کھانے کا نمک بنجاتا ہے' اسلئے کھانے کے نمک کی اصلیت یہ ہوئی کہ وہ سوڈیم اور کلورین کا ایک کیمیائی مرکب ہے' جب یہ ترکیب کسی دیگر کیمیائی عمل سے بگڑ جاتی ہے تو پھر نمک باقی نہیں رہتا' لیکن اس کے اجزائے ترکیبی یعنی سوڈیم اور کلورین فنا نہیں ہوتے'

پانی جو ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں خود دو عناصر سے مرکب ہے' ہائیڈروجن (جو معلوم گیسوں میں سب سے ہلکی گیس ہے) اور آکسیجن سے' یہ دونوں ہوائیں (GASES) جب کسی بڑے بھاری دباؤ کے باعث کیمیائی طور پر ملجاتی ہیں تو "پانی" بنجاتا ہے' اب پانی کی اصلیت یہ ہوئی کہ وہ دو عناصر مذکورہ سے ترکیب پائی ہوئی ایک چیز ہے'

ماحصل یہ ہوا کہ اہل سائنس کے نزدیک یہ تمام عالم اور اس عالم کی تمام اشیا انھیں عناصر سے ترکیب

پائی ہوئی ہین، یہ عناصر منفرد حالت مین اپنے مخصوص کیفیات اور طبیعتین رکھتے ہین لیکن ترکیب باہمی کے بعد ایک نئے سلسلۂ خواص کا باعث ہوتے ہین، عناصر کی باہمی ترکیبون مین جسقدر تنوع ہوتا ہے، اسی قدر نئی نئی چیزین نئے نئے خواص کیساتھ ظہور پذیر ہوتی رہتی ہین،

عناصر کی ترکیب باہمی کے متعلق یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا سائنس کے ابتدائی دور کی باتین ہین، جب تحقیق واکتشاف کی راہین کشادہ تر ہوئین تو معلوم ہوا کہ خود عناصر سالمات سے اور سالمات جوہرون سے ترکیب پائے ہوئے ہین، اسلئے تکوین عالم اور وجود اشیاء کا سبب یہ قرار پایا کہ ہر مادی شے مین، (ATOWS) جوہر ایک خاص نسبت اور ایک خاص نہج سے واقع ہوا ہے، یہی جوہر جب عمل کیمیادی وغیرہ سے اپنی ترتیب کو بدل لیتا ہے تو وہ چیز بظاہر فنا ہوکر دوسری صورت و شکل اختیار کر لیتی ہے،

عناصر کے غیر فانی ہونے کے ساتھ ہی جو امر اہل سائنس کو دریافت ہوا ہے وہ (ENERGY) توانائی کا وجود ہے یعنی اس بیجان مادہ مین جو چیز اصل مین عامل ہے وہ توانائی ہے، توانائی کی مقدار اس عالم مین کبھی کم و بیش نہین ہوتی لیکن یہ اپنی شکل اور مقام بدلتی رہتی ہے، ابھی اگر وہ کیمیائی جذب و کشش مین رونما ہے تو بار دگر بصورت برق ہویدا ہوتی ہے، لیکن اس تبدل و شکل پذیری مین وہ نہ کبھی کم ہوتی ہے اور نہ کبھی زیادہ

لیکن یہ عالم محض عناصر اور توانائی کی بناء پر مختلف شکلین اختیار نہین کر سکتا اور یہ جو اس دنیا مین مشاہدہ ہوتا ہے کہ کبھی پانی برس رہا ہے بادل اٹھ رہے ہین، بخارات مائیت مین اور مائیت ژالہ باری مین بدل رہی ہے زمین نباتی روئیدگی سے یکسر فرش مخملین بنی ہوئی ہے، کبھی گرمی ہے کبھی سردی ہے، الغرض یہ تمام حوادث و تغیرات محض عناصر اور توانائی کی بناء پر ظہور پذیر نہین ہو سکتے تھے جب تک ایک تیسری چیز نہ ہوتی جو ان عناصر کو ایک دوسرے سے ملا دیتی، یا پھر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی، وہ چیز ان علماء کے نزدیک "حرکت" ہے یعنی حرکت کے وجود کے باعث ایک عنصر دوسرے عنصر سے جذب و اتصال پاتا ہے، اس جذب و اتصال سے عناصر مین باہمی کیمیائی عمل ہوتا ہے، اس کیمیائی عمل سے توانائی اپنی شکل بدلتی ہے اور ایک شے

کر دوسری شئے مین تبدیل ہوتی ہے اور اس طرح یہ عالم مادی دائماً ایک حالت کون و فساد مین رہتا ہے،

اب اگر ان متذکرہ بالا بیانات کو یکجا کر لیا جائے تو اس عالم کے وجود کا سبب حسب تحقیق علمائے طبعیات یا قرار پاتا ہے، مختصراً یہ ہے کہ یہ تمام عالم، مادہ اور مادی عناصر اور ذرات و سالمات مین تقسیم ہے، ان عناصر کے بھی ترکیب و تحلیل سے تغیر کیمیاوی ہوتا ہے اور اس کیمیائی تبدیلی سے مختلف چیزین بنتی اور بگڑتی رہتی ہین، ان عناصر مختلفہ مین مخصوص خواص و کیفیات ہین اور ان کے باہمی اتصال و تحلیل سے جو جدید اشیاء ظہور پذیر ہوتی رہتی ہین ان مین بھی خواص پیدا ہوتے اور بدلتے رہتے ہین،

اس نظریہ کے مطابق دنیا مین کوئی چیز یا کوئی کیفیت یا حالت اس وقت تک پیدا نہین ہو سکتی جب تک پہلے عناصر مختلفہ مین کوئی کیمیائی تبدیلی واقع نہ ہو یعنی کسی کیفیت کے ظاہر ہونے سے پہلے عمل کیمیائی کا ہونا ضروری ہے،

علمائے سائنس نے اپنے اس متذکرہ نظریہ کی بنا پر جو اکتشافات کئے ہین اور اس کو جس حد تک کامل کر لیا ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہے، علوم طبعی کی رسائی بلاشبہہ اس عالم مادی کے عمیق ترین رازون تک ہو گئی ہے، اس کامیابی کا ایک قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سعی کیگئی کہ عالم طبعیات کے جملہ مظاہر و احوال کی توجیہ و تشریح سالمات کے اسی باہمی عمل و ردِ عمل کی بنا پر کیجائے، چنانچہ انیسوین صدی عیسوی کے تمام ترقی یافتہ علوم کی عمارتین انھین بنیادون پر استوار کیگئین اور علمائے علم الحیات نے چار و ناچار انہین خطوط پر اپنا کام شروع کیا اور یہ کوشش کیگئی کہ وہ قانون مادی جو غیر عضوی اجسام پر صادق آچکا ہے اسکو ذی حیات اجسام کی کیفیات و حالات پر منطبق کیا جائے، چنانچہ اسی نظریہ کے تحت مین یہ دعوی کیا گیا ہے کہ انسان کے جمیع نفسی اوصاف (شعور، جذبات و افعال) بھی سالمات کے اس عمل و ردِ عمل کا نتیجہ ہین جو دماغ کے اندر واقع ہوتا رہتا ہے، علم الحیات اپنی اس سعی مین ایک حد تک کامیاب معلوم ہو رہا ہے، توضیحِ بیان کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مبحث کو ذرا تفصیل کیساتھ بیان کیا جائے تاکہ فہم مطالب مین آیندہ کوئی الجھن پیدا نہ ہو، اور ہمارے مخالفین کے دلائل کا سارا زور اور وزن قارئین کے سامنے آجائے،

یہ امر تو بہر حال مسلم ہے کہ دماغی اوصاف کا مرکز ہمارا جرمِ دماغی ہے اور یہ جرم خود لاکھون خلایا CELLS سے مرکب ہو یہ خلایا ہی در اصل تمام نفسی اوصاف کا موجب ہین، خود ان کی ترکیب اور ساخت بیحد پیچیدہ ہے اور یہ باہم ایک دوسرے سے مربوط ہین، ہمارا دماغ، ہمارے نظامِ وجود کا ایک مرکزی دفتر ہے، جہان سے ہمارے سارے کام، ہمارے حسیات و جذبات اور ہماری فہم و ادراک کے جملہ وظائف انجام پاتے ہین، یہین سے غذا کے ہضم و تقسیم کا عمل ہوتا ہے، ہمارے احساسات کا ذریعہ، ہماری نقل و حرکت کا مبدا، ہمارے غور و فکر کا آلہ یہی دماغ ہے، لیکن سب سے زیادہ حیرتناک تو یہ امر ہے کہ علمائے علم الحیات نے ہمارے اس جرم مین وہ مراکز معلوم کر لئے ہین جو علٰحدہ علٰحدہ ہمارے جملہ نفسی اعمال کا مدار و منشا ہین، مثلاً ہم کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ بصارت کا مرکز سطحِ دماغی مین کہان واقع ہے، سماعت کا تعلق کس مرکز سے ہے، مختلف حرکات کی ابتدا کس نقطۂ دماغی سے ہوتی ہو، نطق کا تعلق کہان سے ہے، احساسات و فکر کس مرکز سے متعلق ہین، چنانچہ فتورِ دماغی کے مختلف حالات و اشکال مین یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ متعلقہ مرکزِ دماغی مین کوئی نہ کوئی فتور موجود تھا، فتورِ دماغی کے اسباب کو بالتشریح سمجھنے کے لیے ہم کو یہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ ہمارا جرمِ دماغی بذریعہ اعصاب ہمارے اعضاء و جوارح سے مربوط ہے، خود اعصاب دو قسمون پر منقسم ہین، ایک تو وہ اعصاب جنکو ہم اصطلاحاً اعصابِ حرکتی (MOTOR NERVES) کہتے ہین، دوسری قسم کے وہ اعصاب ہین جنھین اعصابِ حسّی کہا جاتا ہے، اعصابِ حسّی کا فعل یہ ہے کہ وہ جملہ تأثرات کو جو ہمارے آلاتِ حواس (آنکھ کان وغیرہ) مین مرتب ہوتے ہین، ہمارے مرکزِ دماغی تک پہنچاتے ہین اور اس طرح ہم کو اس مخصوص اثر کا علم و ادراک ہوتا ہے، ہم جو آوازین سنتے ہین تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ ہوا کے تھپیڑون نے ہمارے کان کی اندرونی ساخت کو متأثر کیا، اور یہ اثر بذریعہ اعصاب اُس مخصوص مرکزِ دماغی تک پہنچا جس کا تعلق سماعت سے ہے اور اگر وہ مرکزِ سماعت بیمار یا بیکار نہین ہے تو ہم آواز سنتے ہین، اسی طرح جب ہم ہاتھ یا پاؤن کی کوئی حرکت کرتے ہین تو یہ عمل اس طرح واقع ہوتا ہے کہ ہمارے اس مرکزِ دماغی مین جسکا تعلق کسی مخصوص حرکت سے ہے ایک تغیر

ونما ہوتا ہے، اور چونکہ یہ مرکز بذریعہ اعصاب اعضائے حرکت سے متعلق ہوتا ہے اس لیے مرکز دماغی کا فرمان بذریعہ اعصاب ہاتھ پاؤں تک پہنچتا ہے اور ہاتھ یا پاؤں حرکت کرنے لگتے ہیں، یہ مراکز باہم ایک دوسرے سے بذریعہ ان مراکز کے جنکا تعلق خیال وغیرہ سے ہے ملے ہوئے ہیں، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ایک تندرست آدمی کے تمام حرکات واحساسات عقل وشعور کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں لیکن فتور دماغی کی صورت میں یا اگر کوئی مرکز دماغی خراب ہو جاتا ہے، یا باہمی مراکز کا جو ربط ہے، وہ ٹوٹ جاتا ہے جسکی وجہ سے افعال کا صدور صحیح طور پر نہیں ہوتا، ایک مثال اسکی وضاحت کے لیے کافی ہوگی،

ایک دماغی بیماری ہے جس کو اصطلاحاً "بصری فتور نطقی گویائی" (VISUAL APHASIA) کہا جاتا ہے اس مرض میں ایسا شخص جو اس بیماری سے پہلے پڑھا لکھا تھا، کاغذ پر لکھے ہوئے حروف کو دیکھتا ہے لیکن ان کو پہچان نہیں سکتا یعنی کاغذ پر سیاہ نشانات اور انکی کشش کو تو ضرور دیکھتا ہے لیکن یہ پہچان اسکو نہیں ہوتی ہے کہ یہ کیا حروف ہیں، اس مرض کی وجہ یہ ثابت ہوئی ہے کہ مرکز بصری کا تعلق اس دماغی مرکز سے منقطع ہو جاتا ہے جسکا تعلق لکھے ہوئے حروف کی فہم و یادداشت سے ہے، یہ ایک مثال تھی ورنہ فن تشریح الاعضاء کی شہادت تو یہی ہے کہ جملہ وظائف دماغی کا تعلق کسی نہ کسی مرکز سے ہے، اودیہ کے اثرات، دیوانگی کے اسباب وعلل وغیرہ تمام شواہد اسی حقیقت کو ثابت کر رہے ہیں اور یہ نظائر اس کثرت سے ہیں کہ بعض علمائے علم الحیات کی تو یہاں تک رائے ہے کہ علم النفس بذاتہ کوئی علم وفن ہی نہیں ہے بلکہ وہ علم وظائف الاعضاء ہی کی ایک شاخ ہے،

اسی قسم کے تجربات علمی کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ نفس انسانی اور جرم دماغی دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں، ہمارا ہر خیال، ہر خواہش، ہر جذبہ نتیجہ ہوتا ہے ایک طرح کے عمل دماغی کا، ہماری تمام نفسی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہمارے دماغ میں ایک سلسلہ مادی اعمال کا جاری رہتا ہے جو خلایائے دماغی سے بگڑتے اور بنتے رہتے ہیں،

اس تمام تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی دماغ ایک ایسا ظرف ہی جو مختلف قسم کے مادی عناصر و سالمات سے مرکب

ہے اور یہ عناصر و سالمات وہی ہین جو ہمکو بیرونی دنیا مین ملتے ہین اور جذب و انتصال عمل کیمیائی اور حرکت کے انہین

قوانین کے تابع ہین جنکا ذکر ہم ابتدا ئ کر آئے ہین جب کبھی ہم سے کوئی وصف نفسی صادر ہوتا ہی اسکے ساتھ ہی ہمارے

دماغ کے اندر بھی ایک کیمیائی عمل واقع ہوتا ہے اور چونکہ اعمال کیمیائی اور اوصاف نفسی بالکل لازم و ملزم ہین اسلئے

یہ نتیجہ نکالنا بظاہر غیر صحیح بھی نہین معلوم ہوتا کہ ہمارے سارے مظاہر حیات کی حقیقت مادی اور محض مادی ہے

یہ ہے وہ مادی نظریہ جسکی بنا پر روح کے وجود کا انکار کیا جاتا ہے، اور دراصل اس نظریہ کا تعلق

محض انکار روح ہی سے نہین ہے، بلکہ اس کا ماحصل اور مقصد یہ ہے کہ اس کائنات مین سوا ے مادہ اور مادہ کے

مختلف حرکات و اشکال کے کچھ نہین ہے اور یہ توقع کیجاتی ہے کہ جون جون ہمارا علم "حرکت" اور مادہ کے

اوصاف کی بابتہ وسیع ہوتا چلا جائیگا، ہم اس نظریۂ مادی کو ظہور عالم کے ہر شعبہ پر منطبق کر سکینگے،

لیکن پچاس سال ہوے کہ اس خیال کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا اور تعجب ہے کہ یہ علم ہمکو جن ہاتھون مین

نظر آتا ہے وہ خود ان علمائے طبعیات ہی کے مقدس ہاتھ ہین، اب یہ حقیقت اُن پر واضح ہو ئی کہ صرف مادہ کے مظاہر

و شیون کا مطالعہ اس عالم کی حقیقت کے سمجھنے کیلئے قطعاً ناکافی ہے بلکہ بعض حالتون مین مغالطہ انگیز ہے، اسمین شک

نہین کہ ہم کو جو کچھ بھی نظر آتا ہی وہ مادہ ہی کی تغیر پذیری ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مادی مظاہر و احوال خود اپنے اندر

اولیت و تقدیم نہین رکھتے بلکہ خود کسی ایسے محرک کے نتائج و معلول ہین جو مادہ کے علاوہ ہے اور ہماری آنکھون اور حواس

سے محجوب ہی ابتدا ہی سے یہ سوال حل کرنے کے لائق ہے کہ اجسام مادی مین باہمی عمل کے واقع ہونے کا سبب واقعی

کیا ہے یعنی یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ اس عالم کے کون و فساد کا سبب سالمات یا جوہرون کا ایسا عمل ہی جس سے وہ اپنی

اس ترتیب مکانی کو بدل لیتے ہین جو مختلف اشیا مین عمل کیمیائی سے قبل پائی جاتی تھی، ہم کو از روے تحقیق

یہ بھی معلوم ہے کہ ان سالمات اور جوہرون کے درمیان بھی کچھ نہ کچھ خلا (SPACE) ضرور

موجود رہتا ہے اور اس خلا کے متعلق یہ نہین کہا جا سکتا کہ وہ مادہ سے بھرا ہوا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ وہ کیا

چیز ہے جو ان سالمات کو باہم ملاتی اور ان کے تعامل کا باعث ہوتی ہے، خود نیوٹن (NEWTON) کے سامنے بھی یہ سوال تھا جسکا جواب اُس نے یہ دیدیا تھا کہ بعض ایسی غیر معلوم قوتین ہین جو ان اجسام پر علٰحدہ سے عامل ہوتی ہین، یہ جواب ایک حد تک تسلی بخش تھا، اسلئے اسوقت اس مسئلہ پر مزید توجہ نہین کیگئی، لیکن اس سوال نے قدرتی طور پر ہماری توجہ ایک نئی حقیقت کی طرف منتقل کر دی یعنی خلا[1] کے وجود کی طرف، چنانچہ جدید تجربات نے اہل سائنس پر یہ واضح کر دیا کہ خلا بھی اپنے اندر خواص طبعی رکھتا ہے اور یہ جو اجسام مادی مین بواسطہ سالمات دجوہر عمل اور رد عمل نظر آتا ہے، وہ دراصل نتیجہ و معلول ہے اس حالت یا کیفیت کا جو ان اشیار کے مابین خلا مین اپنا کام کر رہی ہے یعنی مادی مظاہر ذرات شیون براہ راست اس کا نتیجہ نہین ہین کہ مادہ مین ذاتی خواص ہین اور اس کے باعث یہ مظاہر ظہور پذیر ہوئے ہین بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مادہ خود متبع ہے اس چیز یا قوت کا جسکی اصل حقیقت پر ہم مطلع نہین ہین لیکن وہ خلا مین موجود ضرور ہے،

انتقال نور اور اشعاع حرارت کے مسائل سے بھی اسی اصل کی تائید ہوتی ہے، نور یا روشنی مادہ کے ذریعہ سے منتقل نہین ہوتی ہے بلکہ بذریعہ خلا اپنا کام کرتی ہے، روشنی نہایت سرعت اور نہایت ہی آسانی کے ساتھ اس خالی فضا مین سے گذر جاتی ہے لیکن جونہی وہ اجسام مادی کے بالمقابل آتی ہے اسکی سرعت مین کمی آجاتی ہے، مادہ مین کچھ نہ کچھ کثافت کا ہونا یقینی ہے اور اسی کثافت کے باعث روشنی فنا ہو کر حرارت مین بدل جاتی ہے، حرارت شمسی جو سورج اور سیارون سے لکھوکھا میل کا سفر کرتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے اس فضا یا خلا ہی مین سے گذرتی ہے، اس طویل سفر مین وہ اپنی تمام توانائی (ENERGY) کو قائم رکھتی ہے لیکن ہمکو اسکا احساس و علم اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اجسام مادی پر اپنا عمل کرتی ہے، جب ہی ہمارے پردۂ چشم پر اسکا اثر ہوتا ہے، ہماری جلد کو متأثر کرتی ہے اور وہ کیمیائی عمل شروع ہو جاتے ہین جنسے ہم شناسا ہین، وہ خصوصاً سبز درختون پر اثر کرتی ہے اور اسی کے باعث یہ ساری نباتی بالیدگی در وئیدگی ہمکو نظر آتی ہے گویا یون کہا جائے کہ خلا کی اسی غیر معلوم قوت و توانائی نے لباس مادی اختیار کر لیا ہے، ایک درخت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اسی غیر معلوم قوت خلا کا ایک مادی مجسمہ ہے، ہم نباتی روئیدگی کو محض اپنے خشک اور تنگ مادی نظریہ کی بنا پر نہین سمجھ سکتے

[1] ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر یہ ظاہر نہ کر دیا جائے کہ "خلا" کیطرف سب سے پہلے یونانی حکما، ایپکورس (EPECURUS) وغیرہ نے بھی توجہ کی تھی،

جبتک ہم اس قوت کو پیش نظر نہ رکھین جو خلا یا فضا مین پائی جاتی ہے، اس قوت کا نام خواہ کچھ ہی کیون نہ رکھ لیا جائے لیکن جو چیز ہم کو محسوس ہوتی ہے وہ یہ قوتِ خلا یا فضا نہین ہے بلکہ وہ صرف مادّہ اور مادّی شیون و مظاہر ہین، ہمارے حواس تو صرف مادّہ اور مادّی اشیاء ہی کا ادراک کر سکتے ہین،

ماحصل اس تمام گذارش کا یہ ہوا کہ گو ابتداءً اہلِ سائنس بیجان مادّہ ہی کو اس تمام کائنات کا اصل اصول سمجھتے تھے لیکن جون جون اس حسن مستور کے چہرے سے نقاب اٹھتی جاتی ہے نئے نئے حقائق جلوہ گر ہو رہے ہین اور اب یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ خود مادہ اور مادہ کے یہ سالمات و جوہر وغیرہ یا انکا باہمی عمل بذاتہ بالکل بے اصل ہین، جبتک ایک تیسری چیز نہ ہو جسکی حقیقت تک تو اہلِ سائنس ابتک نہین پہنچے ہین لیکن اسکے وجود کا انکار بھی نہ کر سکے، اس چیز کو خواہ توانائی ENERGY خواہ حرکت MOTION خواہ قوت FORCE اور خواہ خواص فضائی (SPACE PROPERTIES) کہا جائے یا پھر اسی کو مذہبی اصطلاح مین امر سے تعبیر کیا جائے، الغرض اسکا نام کچھ ہی کیون نہ رکھ لو لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جسکا براہ راست ہم کو کوئی علم نہین ہوتا نہ تو ہم اسکا کوئی وزن کر سکتے ہین اور نہ اپنے آلات علمی کے ذریعہ اسکی کوئی پیمایش عمل مین لا سکتے ہین اور نہ ہمارے حواس ظاہری پر اسکا اثر ہوتا ہے لیکن ہان اہلِ علم اسکے وجود کے تسلیم کرنے پر مجبور ہین اور صرف استدلال و استخراج ہی کی بنا پر اسکے وجود کا اقرار کیا جاتا ہے، کیا اب بھی یہ صحیح نہین کہ علوم طبعی کی اس فلک بوس عمارت اہلِ علم کے کشف و تحقیق کی ناپیدا کنار وسعت رصدگاہون اور معملون کی اس ساری ہنگامہ آرائی کے باجود ہم جس نتیجہ پر پہنچے وہ صرف اسقدر ہے کہ اس عالم کی تمام بوقلمونیون کا باعث ایک ایسی قوت ہے جسکا ہم کو کوئی صحیح علم نہین ہے، ع

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اور کیا یہ واقعہ نہین ہے، کہ جتنا ہمارا علم اس کائنات کے بارہ مین وسیع ہوتا جاتا ہے اسیقدر ہمارا عجز بھی بڑھتا جاتا ہے اور کیا ان حالات مین ہمارے لیے یہ زیبا نہین ہے کہ ہم اس عالم کی اس لامعلوم قوت مدبرہ کے سامنے جسکو خواہ کسی نام سے پکارا جائے (فلہ الاسماء الحسنیٰ) اور وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً پر ایمان لاکر اپنے سر نیاز کو خم اور اپنے قلب کی تمام گہرائیون کیساتھ رب زدنی علما کی عاجزانہ درخواست مین مشغول ہو جائین،

(باقی)

خسرو باغ کے مقبرے

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی، الہ آباد

خسرو باغ (الہ آباد) کے پھاٹک مین داخل ہوتے ہی سامنے چار مقبرے نظر آئین گے، مگر ان تک پہنچنے مین تقریباً تین سو قدم کے قریب کا فاصلہ طے کرنا ہوگا،

ان کا منظر مجموعاً نہایت دلکش، دلآویز و نگہ فریب ہے، مسٹر نیویل[1] اور اور دیدہ ور اہل قلم کا قول ہے کہ یہ عمارات انتہا درجہ کی خوبصورت اور مغلون کے عہد مصوری و رنگ آمیزی کا بہترین نمونہ ہین، مسٹر اسٹیل ایک موقع پر لکھتے ہین[2] کہ "یہ مقبرے الہ آباد کے علاوہ آثار و صنادید قدیمہ مین بڑے نمود کی چیزین ہین"

اس فن کے ایک نوآموز و کم آشنا کی حیثیت سے مجھے بھی اس بارہ مین غور کرنے اور ان چیزون کو اپنی نظر و استعداد سے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے، ان مبصرین کی رائے سے کون اختلاف کر سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ خسرو باغ کا مقبرہ اکبر کے مقبرہ کا مقابلہ نہین کر سکتا، دونون عمارتین ایک ہی شخص کے حکم سے بنی ہین، مگر فرق یہ ہے کہ الہ آباد والا گنبد ان فرسودہ اور بوسیدہ ہڈیون کو آغوش مین لیے ہے جو باپ سے بگڑ کر ہمیشہ گرفتار بلا رہنے والے بیٹے، اور بھائی (شاہجہان) کے محسود بھائی کی تھین، جو برہان پور دکن سے اکھاڑ کر یہان لائی، اور دفن کیگئی تھین، سکندرہ کا بے مثل مقبرہ ایک نیک نام و عظیم الشان شہنشاہ کی دائمی دنیوی یادگار کے طور پر ہے جو اُس ہی جیسے اولوالعزم و منت شناس شہنشاہ نے بنوایا تھا، دادا اور پوتے مین جو قدرتی فرق ہوتا اور ہو سکتا ہے یہان بھی نمایان ہے،

مغلون[3] کے ابتدائی زمانہ کی تعمیرات مین، جسمین اکبر اور جہانگیر کے عہد کی عمارتین بھی داخل ہین بعض خصوصیات

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر صفحہ ۲۰۳، [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق صفحہ ۱۳۸، [3] مڈکن صاحب کی آگرہ ہینڈبک صفحہ ۲۹،

ہوتی تھین جو کچھ نہ کچھ ان مقبرون مین بھی پائی جاتی ہین، یعنی بلند اونچے گرونون پر ایرانی وضع کے گنبد، اس طرز کی عمارتین بیشتر کی بنی ہوئی عمارتون سے دو باتون مین بالخصوص ممتاز و متبائن پائی جاتی ہین (۱) اس امر کی صاف وصریح کوشش کہ ہندؤن کے مختلف منتخب طرز تعمیر و نیز مسلمانون کے مخصوص طریقے اور وضعین متحد و یکجا کردیجائین (۲) زیادہ کھلتے ہوئے رنگ دینا، اس کے لیے عام طور پر سفید سنگ مرمر زیادہ استعمال ہوتا تھا، پھر حسب موقع وضرورت بیشتر رنگین پتھرون کا افراط کے ساتھ خرچ اور کھپت، بے شبہہ بعض عمارتون کے متعلق محض اندرونی ساخت سے یہ تمیز (حاصل) کرلینا دشوار ہوتا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ چیزین جنکے مکانات و محلات مین موجود ہونے یا نہ ہونے سے بعض باتون کا فیصلہ یا امتیاز ہوسکتا ہے مقبرون اور روضون مین اکثر غائب ہوتی ہین، مثلاً لکڑی کا قطعاً استعمال مین نہ آنا، یا سیدھے سادے نمونہ کی محرابین کم بنانا، وغیرہ، مجھے اعتراف ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے بے مثل و بے نظیر نہین ہین، نہ ان مین ہمایون کے مقبرے (متصل دہلی) کی سی شان اور لطافت و نزاکت تعمیر و نقاشی پائی جاتی ہے، نہ مقبرۂ اعتماد الدولہ واقع آگرہ کی سی پرچین سازی اور منبت کاری، مقبرۂ شیخ سلیم چشتی، قصبہ فتحپور سیکری کی طرح سنگ مرمر پر باریک، نازک اور بے نظیر نقاشی و مشجر کاری نظر آتی ہے، نہ کوئی خاص قابل ذکر حسن وضع و تعمیر ہے، نہ مقبرۂ اکبر (سکندرہ) کی رفعت و عظمت اور ہیبت و جلالت پیدا کرنے والی شان نمایان ہے، تاہم چار مختلف الوضع عمارتون کا ایک سیدھی لائن مین نہ سہی، مگر ایک ہی محاذ مین بہ یک نظر، نظر آنا، ایک کیفیت خاص پیدا کردیتا اور عجیب دلکشی رکھتا ہے،

نامور فرگسن[۱] سلطان التمش کے روضہ واقع پرانی دہلی کو ہندوستان کا سب سے پرانا مقبرہ بتاتا اور لکھتا ہے کہ یہ مختصر تو ضرور ہے لیکن اسمین ہندؤن کی صنعت کے نفیس و بہترین نمونے جہانتک کہ اسلامی شعائر، خدائی عظمت اور شوکت کے مغائر و منافی نہ تھے مناسب حال و شایان شان صرف کردئے گئے ہین، جن سے یہ نہایت ذی خوبصورت و دلآویز ہوگیا ہے، راقم سطور بلکہ یقیناً ہر ہوشمند دیکھنے والا بہ یک نگہ کہہ سکتا ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے

[۱] ڈنکن صاحب کی آگرہ ہینڈبک، صفحہ ۲۰۰، [۲] ہندوستانی اور مشرقی تعمیر کی تاریخ۔ ۱۸۷۶ء،

بھی، اگرچہ مختصر ہیں، لیکن ان کی مجموعی کیفیت، مختلف وضع اور متنوع طرز عمارت ایک خاص قسم کی دلکشی اور جذب نظر اپنے اندر رکھتی ہے، اور ہر ایک میں کمال سادگی کے ساتھ ساتھ کمال فن و ہنر بھی نمودار ہے،

سب سے پہلے جس فرض شناس حکمران نے اپنے صوبہ کی عمارات قدیمہ کی طرف توجہ مبذول فرمائی، وہ ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر سر جان اسٹریچی تھے، اوّل اوّل ۱۸۷۶ء میں روضۂ ممتاز محل پر عنایت کی اور مرمت کرادی، پھر آگرہ اور الہ آباد کی دیگر بادشاہی یادگاروں پر نگاہ التفات ڈالی، خسرو باغ ان کے دارالحکومت میں ایک ممتاز مقام تھا اور پبلک کے کام کی چیز، بقدر ضرورت اسکی مرمت و درستی بھی کرادی، دلکش باغ اسوقت بھی اپنے گذرے ہوئے دنوں کی دستبرد اور امتداد زمانہ کی تاخت و تاراج کو ناقدری و حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، جو اپنی جوئیہائے شیرین یعنی میٹھے پانی کے حوضوں اور بڑے بڑے کنووں اور چشمۂ فیض باولی سے سارے شہر کو سیراب کر رہا تھا، جس کے سنہرے انداز چمن بندی و تناسب اجزا کی اسوقت بھی داد مل رہی تھی، جسکا ایک ایک پھول اور ایک ایک پتہ، جس کے مقبروں کا ہر ریختہ و شکستہ پتھر اپنے شاہانہ تکلفات اور نازک ترتیبات کا آئینہ دار تھا، عروس البلاد الہ آباد میں گرمی کی شدت و تابش اور بعض اوقات سردی کی افسردگی و انجماد بھی کائنات کی حسین و جمیل چیزوں کو مردہ کر دیتی ہے، مگر خسرو باغ کی معطر ہواؤں کے حیات بدامن جھونکے اس وقت بھی تازہ زندگی پھونک دیتے تھے،

دنیا بدل گئی ہے، وہ ہیں ہیں کہ اب تک اپنے مقام پر ہیں اپنے مکان پر ہیں،

اس کے چھبیس ستائیس برس بعد مغل اعظم کے صحیح جانشین اور ان کی عظمت و سطوت رفتہ کے وارث و قابض لارڈ کرزن آنجہانی نے دیرینہ سال عمارات کے ابقاء و پرداخت میں وہ سعی مفرط فرمائی جس کے لئے ہندوستان کے باشندے، بالخصوص احسان شناس مسلمان، ہمیشہ زیر بار منت و شکر گذار رہیں گے، سلطان بہار بیگم کے گنبد کا خالی کرادینا، اور اس کے عوض میں سوپرنٹنڈنٹ باغات الہ آباد کے لیے ایک قصر پر تکلف

---

[1] ہینڈ بک آگرہ و تاج۔ از مسٹر ہیول، صفحہ ۴۶، [2] و ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۲۰۳،

کرادینا اسی بلند حوصلہ امیر کا کام تھا جس کا ذکر مناسب موقع پر عنقریب آئیگا،

تم نے نگاہِ لطف سے رکھ لی ادب کی شرم   ورنہ لبون تک آہی چکا تھا گلا ابھی

مقبرون کی نگہداشت اور خسرو باغ کی آبیاری و آراستگی اس وقت حکومت کے دستِ کرم کی ممنون ہے[1]، باغ کے مصارف معقول نفع کے ساتھ خود اسکی پیداوار سے پورے ہوجاتے ہین، پھل پھول، پودون، ہر قسم کے درختون اور قلمون سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے، یہان[2] کے گلاب اور گلاب کی قلمین مشہور اور بڑی قدر کی چیزین ہین، الہ آبادی امرودون کی پودہ اس باغ کی قابل اعتبار اور اچھی سمجھی جاتی ہے، منتظمین نے تین[3] تین ایکڑ کے دو قطعے میوہ کے درختون اور پودہ کی پرورش گاہ اور پھل پھول کی بہار دکھانے کے لئے محفوظ رکھے ہین،

انگریزی پیمایش سے باغ کا کل رقبہ ۴۰٫۶۰ ایکڑ ہوتا ہے، انتظامی ضرورتون اور سہولت کارروائی کے لیے اسکی تقسیم دو حصون مین کردی گئی ہے، ایک قطعہ ۳٫۶۰ ایکڑ کا محکمۂ آثار قدیمہ یعنی[4] ارکیالوجی کل ڈیپارٹمنٹ کے نام سے ہے دوسرا سینتیس[3] ایکڑ زیر اہتمام و انتظام محکمۂ[5] زراعت ہے، عملی طور پر دونون قطعے اور انکی نگرانی محکمۂ زراعت کے ایک ذمہ دار افسر کے ہاتھ مین ہے، اور محکمۂ مذکور کی سالانہ رپورٹون مین دونون کے بقدر ضرورت حالات اور درستی و ترقی کی کیفیت مندرج و شائع ہوتی رہتی ہے، دونون ٹکڑون یعنی آرکیالوجی کل اور زراعتی کا تذکرہ جداگانہ حصون مین ہوتا ہے، آرکیالوجی[6] کل حصہ کی ترتیب جدید حال مین عمل مین آئی ہے اور دو ڈھائی سال ہوئے ختم ہوئی ہے، پرانی سڑک جو فاصل تھی دور کردی گئی، نئی سڑک ایک دلکش روش پر ہموار، اور سطح کے برابر نئی ترتیب کے مناسب حال بنائی گئی ہے، پائپ کی لاین نئی قائم کی گئی ہے، فوارے لگائے گئے ہین، تاریخی عمارات کے لیے موزون و مناسب ترصیع کی گئی ہے اور نہایت دلکش و دلآویز ماحول مہیا کردیا گیا ہے، پرانی باؤلی کے متصل دیوارون پر بیلین چڑھائی گئی ہین

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید - صفحہ ۲۰۳،
[2] رپورٹ باغات سرکاری بابتہ ۳۰-۱۹۲۹، صفحہ ۹
[3] " " " " ، صفحہ ۹
[4] " " " " ، صفحہ ۱۰
[5] " " " " ، صفحہ ۹
[6] رپورٹ انتظامی باغات سرکاری، صوبجات متحدہ، بابتہ ۲۹-۱۹۲۸، صفحہ ۱۰،

اس کے لانون کے خستہ حال ٹکڑون کی مرمت کردی گئی ہے، خسرو کے مرکزی مقبرہ کے گرد جو کبھی پھولون کی کیاریان تھین، ان مین اب سرسبز و شاداب سدا بہار پھولواڑی لگا دی گئی ہے، باغ کے گلگشت، نظارہ و تفریح سے حکام اور محکوم جماعتین دونون یکسان متمتع ہوتی ہین، اس محکمہ کی رپورٹ انتظامی[1] مین اس کا اندراج "تاریخی یادگارون کے باغ واقع خسرو باغ" کے نام سے کیا جاتا ہے،

زراعتی حصہ ۳۷ ایکڑ کا ہے، اسکا شمار[2] "پراونشیل گارڈنیس" کی مد مین ہوتا ہے، اس کی آراستگی دو سال آمدنی کا ابھی تذکرہ کرچکا ہون، اس کے لانون پر بھی نئی گھانس نئے قسم کی لگائی گئی ہی،

اس سبزہ زار یا ہرے بھرے گھانس کے لمبے چوڑے قطعات پر پہنچکر مجھ ایسے پریشان خیال سیلانی کا دھیان خود بخود ایک دوسری طرف منعطف ہوجاتا ہے، یہان دو اکبر گذرے ہین، ایک اکبر اعظم، دوسرا اکبر اکبر، اکبر اعظم نے اس شہر کی بنیاد ڈالی، بسایا، اور الٰہ آباس یا الٰہ آباد بنایا تھا، یہ تو تونگری و حشمت، دولت کی فراوانی اور شوکت و قوت سلطانی کا کرشمہ تھا، اس کو پونے چارسو برس ہوے، دوسرے یعنی اکبر اکبر نے اپنی سخن سنجی و شیرین کلامی اور ذہنی و دماغی کمال سے اسکی دائمی شہرت و بقا کی ضمانت فرمائی، یہ ہمارے آنکھون کے سامنے کی بات ہے، مرحوم اکبر جب اس جگہ پہنچا ہے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا،

لان ٹینس کے لیے بن گئے شاہی گلزار ساتھ سبزہ کے ہجوم گل و سوسن نہ رہا

سب سے پہلے جس یورپین سیاح کے قدم یہان آئے اور جس نے کم و بیش یہان کے حالات قلمبند کئے وہ پادری پیٹر منڈی ہین، انھون نے ۱۶۳۲ء مین اس مقام کو دیکھا تھا اور شاہزادہ خسرو کے مقبرے اور اسکی ترتیب و تزئین کا ذکر کیا ہے[3] انکے دوسو برس بعد ۱۸۲۵ء مین بشپ ہیبر تشریف لائے اور وہ باتین صفحات تاریخ پر چھوڑ گئے[4]، جنکا بتانے والا نہ اون سے پہلے کوئی گذرا تھا، نہ اُن کے بعد آیا، مشہور انگریزی صناع اور آرٹسٹ مسٹر ٹامس ڈانیال

[1] رپورٹ انتظامی باغات سرکاری صوبجات متحدہ بابتہ ۲۹، ۱۹۲۸ - صفحہ ۱۱، [2] ایضاً بابتہ ۳۰-۱۹۲۹ صفحہ ۹،

[3] سفرنامہ جلد دوم صفحہ ۱۰، [4] ہندوستان کے بالائی ممالک کلکتہ سے بمبئی تک کا روزنامچہ سیاحت مطبوعہ لندن ۱۸۲۸ء جلد اول صفحہ ۲۴۳،

ری صد مکو دستاتیں ہیں، جنھوں نے اپنے دوران سفر و سیاحت میں یہاں کی بعض[1] عمارتوں کے خریطے اور نقشے تیار کئے، یہ ۱۸۱۰ء میں یا اس کے قریب خوش رنگ شائع ہوئے تھے، اور آج بھی بڑے بڑے کتب خانوں اور امراء کے ایوانات تصور کی زیب و زینت ہیں، ادب و فضل کی دیوی، حسین و جمیل اشیاء کی شیدا، لفظوں میں تصویر کھینچ دینے والی فینی پارکس بھی یہاں[2] آئی تھی، اور "وانڈرنگس آف لے پلگرم"[3] میں بقدر قلیل حال لکھ گئی ہے،

فارسی میں سب سے پہلے جن صاحب نے خسرو باغ کے (مختصر سہی مگر) حالات قلمبند کئے وہ مسٹر بیل مؤلف مفتاح[4] التواریخ ہیں، پھر انگریزی میں جہانگیری سوانح کے سلسلہ میں ذی علم مستشرق بلاک مین صاحب کا دلچسپ آرٹیکل اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو میں نکلا، اس کے بعد مسٹر ایسٹ وک نے کتبوں کی طرف بھی توجہ فرمائی، اور ان کا منظوم و مقفّیٰ ترجمہ کر دیا، جو مرے صاحب کی ہینڈ بک صوبہ بنگالہ[5] میں موجود ہے، صاحب موصوف نے تحریر نہیں فرمایا کہ ان قطعات کی نقلیں ان کو کہاں سے دستیاب ہوئی تھیں مگر ترجمہ کی حالت اور اصل سے مطابقت کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بیل صاحب کی کتاب سے لئے گئے ہیں، سب سے آخر ہمارے زمانہ کے مشہور علم دوست مسٹر ہنری بیوریج نے اس طرف التفات فرمایا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء[6] میں ایک عالمانہ مقالہ شاہزادہ خسرو اور اس کے مدفن اور متصل کے مقبروں کی نسبت تحریر کیا، یہ لندن میں بیٹھ کر لکھا گیا تھا، اشعار و قطعات کی نقلیں ہندوستان سے سر رچارڈ برن کی معرفت حاصل کی گئی تھیں، سرمایہ علم و واقفیت کافی اور ذرائع آگاہی و صحت و قابل اطمینان نہ تھے اس لئے غلطیوں کا رہ جانا ناگزیر تھا، خود ان کو اعتراف تھا کہ ان قطعات (تاریخ) کی زبان کسی قدر مشکل ہے، اس وجہ سے اپنے ترجموں پر چنداں اعتماد و اعتبار بھی نہ تھا، اطمینان خاطر کے لیے ہمہ دان و ہمہ زبان سر چارلس لائل کو بھی دکھا لیا تھا، انھوں نے پوری توجہ اور قابل قدر اعانت فرمائی تھی، زبان و مفہوم

۱؎ امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ میں شاہ بیگم کے مقبرے، دیوار اور گنبدوں کا رنگین نقشہ وغیرہ، ۲؎ پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۸۰، ۳؎ دو جلدیں ۱۸۲۲ء سے ۱۸۲۳ء تک ۴؎ مطبوعہ ۱۸۲۹ء صفحات ۳۳۲ وغیرہ، ۵؎ وغیرہ، مطبوعہ ۱۸۸۲ء، صفحات ۲۶۲ و ۲۶۴، ۶؎ صفحات ۵۹۰ لغایتہ ۶۰۳،

کا جہانتک تعلق تھا، ترجمہ تو درست ہوگیا، مگر بیل صاحب اور سر رچارڈ برن کے کاتب کی غلطیون کا ازالہ کیسے ہوتا، دورِ حاضر کے عدیم النظیر فاضل اور میرے محسن مسٹر ڈیوہرسٹ نے جب ممدوح حسن اتفاق سے الہ آباد مین قیام گزین تھے ان پر نظر ڈالی اور سوسائٹی مذکور کے رسالہ جولائی ۱۹۰۵ء مین انکی تصحیح اور بحالت ضرورت جا بجا توضیح کردی، بعض غلطیان فاش تھین، محض ٹائپ کی، مثلاً سلی کی جگہ معلی۔ ان کے نقل یا بیان کرنے کی ضرورت نہین،

یادش بخیر، مسٹر طامس ولیم بیل سب سے پہلے مورخ ہین، جنھون نے اپنے زمانہ کی ایک رائج ملک زبان (فارسی) مین خسرو باغ اور اس کے مقابر کا ذکر مفتاح التواریخ مین لکھا اور اس کے بعد ایک اور کارآمد جامع اور مفید کتاب اورنیٹل بیاگرفی کل ڈکشنری تحریر فرمائی، جسمین مشاہیر شرق کے ضروری اور پُر از معلومات مآثر انگریزی مین لکھ دیے ہین، مسٹر بیوریج کو اس کمی کا احساس ہے کہ مسٹر کین نے بیل صاحب کی کتاب (ڈکشنری) کو ترجمہ اور ایڈٹ تو کیا مگر تاریخون کو چھوڑ دیا ہے، ان کو افسوس ہے کہ بیل صاحب کی کتاب پھر (۱۸۸۱ء کے بعد) طبع نہین ہوئی، مسٹر بیوریج کا خیال ہے کہ "مسٹر بیل یوریشین رہے ہونگے، اور ضرور فارسی کے بڑے فاضل ہون گے، مسٹر کین لکھتے ہین کہ یہ بہت بڑی عمر پاکر ۱۸۷۵ء کے موسم گرما مین بمقام آگرہ فوت ہوئے، جہان صدر بورڈ مال کے دفتر مین محض ایک کلارک کی حیثیت سے ملازم تھے، لیکن ڈھاکہ کے ٹیلر صاحب، بہار کے کرسچین صاحب اور مانشیر رایان (معروف بہ حاجی مصطفےٰ، مترجم سیر المتاخرین) کی طرح کتنے ایسے زندہ جاوید نام ملین گے جو بہت سی مستقل اور ہمیشہ رہنے والی کارآمد و مفید تالیفات چھوڑ گئے ہین، ان کے مقابلہ مین بہت سے بلند مرتبہ یورپین افسران کی کیا عزت ہو سکتی ہے، سر ہنری ایلیٹ صاحب کی تاریخ کا اختتام بیل

ف صفحات ۴۶، نعایت ۴۹، ۷ صفحات ۴۴۴ لغایتہ ۴۴۳، ۳ رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۶۰۳۔

۴ اورنیٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، مطبوعہ ۱۸۸۱ء۔ تمہید صفحہ اول ۵ یہ تینون صاحب مخلوط النسل تھے اور کسی بڑے عہدہ تک نہین پہنچے، مگر علمی و ادبی سرمایہ کثیر چھوڑ گئے ہین، سیر المتاخرین کے ترجمہ سے زیادہ اسکی تمہید اور شیرین زبان قابل مطالعہ و تحسین ہے، ایک یونانی فرانسیسی اور ایسی پیاری انگریزی،

صاحب کی تاریخ کے ذکر اور انکی قلمی اعانت کے اعتراف پر ہوا اور بالکل بجا ہوا ہے، امید ہے کہ ان کے مدفن کا پتہ اور علم ہوگا، اور اس پر پتھر بھی ہوگا، نامور فاضل (مسٹر ای بی) ایسٹ وک (صحابی) نے مرّے کی ہینڈبک مین کیتھرائن پیل کی قبر کا ذکر کیا ہے، جو اگست سنہ۱۸۵۵ء مین فوت ہوئی تھین۔

پروفیسر ڈوسن نے بھی اپنی تاریخ ہند کی آٹھوین جلد مین ان کا تذکرہ کیا[1] ہے،

مسٹر بیل کے اس تذکرہ پر بعض مغرب پرست حضرات چین بہ جبین ہونگے اور یہان شاید بے محل قرار دینگے۔ راقم ہیچمدان کے خیال مین کسی علمی یا ریخی تحریر کو محض پٹواری کی کھتونی نہ بنانا چاہیئے جسکی خانہ پُری بلا ازدیاد حرفے کافی ووافی سمجھی جائے اور خلاف ورزی مستوجب باز پرس متصور ہو، جس شخص نے اپنی جنبش قلم سے خسرو باغ کو صفحاتِ کاغذ پر حیاتِ تازہ بخشی کیا وہ اس قدر اعتناء و التفات کا بھی مستحق نہین جو نہ صرف خسرو باغ، نہ صرف الہ آباد، نہ صرف ہندوستان، بلکہ پورے مشرق براعظم ایشیا سے بھی کچھ زیادہ کا محسن وخدمتگذار ہے؟

افسوس ہے کہ ان مقبرون کے حالات تفصیل کے ساتھ درکنار، برائے نام بھی کسی پرانی کتاب مین نہین ملتے[2] مسٹر بیل نے جس قدر تحریر کئے ہین، اس سے کسی تشنۂ تحقیق وتجسس کی تسکین نہین ہوتی، ان کی مختصر تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہان چار روضے ہین جنپر عالیشان گنبد بنے ہین:-

(۱) چھوٹا سا، پچھم طرف، معلوم نہین کون دفن ہے، بعض کہتے ہین کہ بی بی تمبولن کا روضہ ہے،

(۲) عمارت سنگین، دو گنبد، مادر خسرو کا مزار ہے،

(۳) روضہ، وسط باغ مین، بڑے دروازے کے مقابل ہے، سلطان خسرو کی ہمشیر نے سنہ۱۰۳۴ مین اپنے دفن کے لیے یہ عمارت بنوائی تھی، کہین اور مرین، خالی ہے، شعر بہت سے لکھے ہین،

(۴) روضہ، سمت مشرق، مرقد خسرو،

گزیٹیر سابق کے ذی علم مؤلفین کی جماعت نے جو مسٹر اسٹیل، مسٹر فشر اور مسٹر (حال سر) جان پریسکوٹ

---

[1] تاریخ ہند خود اہل ہند مورخین کے قلم سے، مطبوعہ سنہ۱۸۷۷ء [2] مفتاح التواریخ، صفحات ۳۳۵ لغایتہ ۳۳۶،

ٹ پر مشتمل تھی صرف امور ذیل کے لکھنے پر قناعت کی،

(۱) اس راجپوت ملکہ کی قبر مع اسکی بیٹی اور بیٹے خسرو کے مقبرون کے خسرو باغ مین واقع ہے،

(۲) سڑک کی دوسری[2] طرف وہ مکان ہے جسمین سوپرنڈنٹ باغ کی بود و باش ہے، عام روایات کے مطابق

ی بیگم کا مکان کہلاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ وہی شاہزادی ہو جو فتحپور سیکری مین استامبولی بیگم کے نام سے یاد کیجاتی ہے

جدید گزیٹیرین کرنیل نیویل نے اسقدر[3] لکھا کہ "خسرو کی ماں "رانی" نے افیون کھائی، وہ اس باغ مین دفن ہے

جگہ خسرو اور اسکی بہن کے بھی مقبرے ہین، دوسرے موقع پر[4] اضافہ فرماتے ہین:-

۱- خسرو یہان کے چارون مقبرون مین سے بالکل اخیر پورب کے مقبرہ مین دفن ہے،

۲- دوسرا مقبرہ خسرو کی بہن کا ہے جو ۱۶۲۵ مین مری تھی، اسمین بہت سے کتبے ہین مگر اکثر اب شکستہ حالت مین ہین

۳- تیسرا خسرو کی ماں کا ہے،

۴- باغ کے عین وسط مین چوتھا مقبرہ ہے جو تمبولن کا کہلاتا ہے، کچھ عرصہ تک افسر منتظم باغ کا مسکن رہا

ا، ان صاحبون نے اور جو دو ایک باتین کام کی لکھی ہین وہ ہر مقبرہ کے جداگانہ حالات مین نقل کیجائین گی، ڈاکٹر ڈبلیو

بلیو ہنٹر، ڈائرکٹر جنرل امپیریل گزیٹیر آف انڈیا نے بھی صرف چند لفظون مین خسرو باغ کا تذکرہ ختم کر دیا ہے، لکھتے

ین[5] "یہ باغ اور روضہ شاہزادہ خسرو ریلوے اسٹیشن کے متصل ہے، مقبرہ پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج

کے طرز کی بنی ہے، اس کے اندر پھولون اور چڑیون کی تصویرین ہین، دو اور چھوٹے چھوٹے مقبرے اسکے متعلق ہین"

تاج کی نظیر شاید اسکی بے نظیر شہرت و نام کے سبب سے آپنے پیش کی ہے، ورنہ وہ تو سالہا دراز کے بعد بنا ہے

آپنے دیکھا گزیٹیر والون نے کس اختصار سے کام لیا ہے مفتاح التواریخ ہو یا کوئی ہینڈ بک یا گزیٹیر،

انکی تحریرون مین فرق محض طرز ادا کا ہے، بیل صاحب لکھتے تو دا ہنے طرف سے او فارسی مین ہین، مگر مغربی انداز پر

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۱۳، [2] ایضاً صفحہ ۱۶۵، [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۶۹ [4] ایضاً صفحہ ۲۴۳

[5] مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے صفحہ ۱۹۰، جلد اول، صفحہ ۱۰۲ پر بھی ذکر ہے مطبوعہ ۱۸۸۵ء،

پہلے بائین جانب نظر ڈالتے اور بائین سے شروع کرتے ہین، مسٹر اسٹیل باوجود اپنی مغربی و فرنگی جبلت و وضع کے پہلے داہنی سمت دیکھتے اور اسی طرف سے لکھنے لگتے ہین، کرنیل نیویل نے جو قلم اور تلوار دونون پر یکسان قدرت و قوت رکھتے ہین، اس ہم مین جادۂ کہن یعنی اسٹیل صاحب کی مختصر نگاری کی فرسودہ روش سے ہٹنا گوارا نہین فرمایا، ایک متبع یا مقلد کی طرح قدم بہ قدم چلے اور ایک ناقل کے طور پر انہین کے الفاظ کم و بیش دہرا دیئے ہین،

ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب "صنادید ہند" مین اتنا ہی لکھ کر خاموش ہوگئے کہ یہان خسرو، اسکی مان اور بہن کے مقبرے اور تمبولن بیگم کا مکان ہے"۔ اس تحریر مین نہ کوئی سلسلہ ہے نہ ترتیب، کوئی کیا کہہ سکیگا!

مسٹر بیوریج[۱]، ایسٹ وک صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہین کہ نور جہان کا بھی ایک خالی مقبرہ یا سینوٹاف[۲] خسرو باغ مین تھا،

ایک کارآمد و راحت رسان چیز اگلے زمانہ کی اہم اور ضروری تعمیرات مین داخل تھی اور یہان بھی موجود تھی، ایک شاندار "باؤلی" تھی، حال کے مورخین نے وطنی ہون یا مسافر، اس کے بارہ مین کچھ نہین لکھا، صرف پیٹر منڈی صاحب نے جو ۱۶۳۲ مین یہان آئے تھے تحریر[۳] فرمایا ہے:-

"خود باغ کے پاس ہی ایک خوبصورت باؤلی یا کنوان ہے، اس مین ایک سو بیس سے زیادہ سیڑھیان ہین، خوشنما شہ نشین اور محرابین ہین، چیو کے درخت ہین، گرمی مین رہنے کے لئے سردخانے اور ٹھنڈے مکان ہین، جو "فرسکو" یعنی ٹھنڈک اور سایہ مین تازہ تازہ ہوا کے پہنچنے کے لئے بنائے گئے ہین، اوپر سے نیچے تک پہنچنے کا راستہ اندر ہی اندر ہے، یہ راستہ، وسیع، کشادہ، آسان گزار اور خوب روشن ہے، حتی کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی نیچے چلا جاتا اور اپنے ہاتھ سے پانی پی لیتا ہے، ٹھیک اسی مقام کے اوپر جہانکہ پانی ہے ایک کنوئین کا اچھا سا منہ ہے

[۱] جلد دوم بابتہ ممالک مغربی و شمالی و اودھ، صفحہ ۱۳۰، [۲] جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۷، نوٹ ۲، [۳] خالی مقبرہ جو کسی شخص کی یادگار مین جو کہین اور دفن ہو، بنا دیا جائے، [۴] سفرنامہ پیٹر منڈی، جلد دوم صفحہ ۱۰۱- اور، مرے صاحب کی بنگالہ کی ہینڈ بک، صفحہ ۳۶۴، پروفیسر بنی پرشاد، کی تاریخ جہانگیر، صفحہ ۴۰۴،

سے لوگ اپنے برتنون، بیلون[؟] اور طریقون سے پانی کھینچ لیتے ہین ۔"

مسٹر ڈانیئل نے اپنے نقشہ[۱] مین ایک موقع رانی یا شاہ بیگم کے مقبرہ کے متصل پچھم کو دکھایا ہے جسمین بلند چبوترہ اور
یرہ بھی صاف نمایان ہین، بہت سے تماشائی، نیز حاجتمند مرد و عورت، پانی لیجانے کے مختلف برتنون اور ر
ن کیساتھ، کھڑے، بیٹھے چلتے پھرتے نظر آتے ہین، مگر یہ جگہ باؤلی کی نہین، بلکہ کنوئین کی معلوم ہوتی ہے۔ باؤلی
اس کے مقام پر تحریر کیا جائے گا،

پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس مین اس قدر لکھا[۲] ہے کہ "پرانا کنوان اور پانی کی نہرین
یان ایسی خوبصورت ہین کہ انکی تصویرین پیش کیجاتی ہین"

بیورج صاحب فرماتے ہین[۳] "کہا جاتا ہے کہ خسرو کے دو بیٹے بھی خسرو باغ مین دفن ہین ۔"

سلطان خسرو اور شاہ بیگم کے پہلوؤن مین متعدد چھوٹی بڑی قبرین موجود ہین، کوئی کتابہ نہین نہ کسی تاریخ
رہ ہے، اسلئے ان شاہزادون کے مرقد کا وثوق وصحت کیساتھ تعین کرنا اس وقت دشوار ہے، آجکل کے بعض
آسان پسند لوگون کا شیوہ بلا تحقیق و تلاش ہر بات مین دخل درمعقولات کرنا اور اپنی ہمہ دانی کے اظہار کے لئے
پھ لکھدینا ہے، میرے نزدیک یہ کوئی مستحسن اور پسندیدہ روش نہین، ورنہ یہ کہدینا سہل نیز قرین قیاس ہوتا کہ خسرو
بغلون مین جو لڑکے دفن ہین یہی شاہزادے ہین، کب مرے اور کس عمر مین، خسرو سے کتنے دن بعد، کیا نام
ح ان سوالات کا جواب شافی کون دیسکتا ہے؟

باغ کے اندر داخل ہونے کے بعد، بلکہ پھاٹک مین قدم رکھنے کے ساتھ ہی ان عمارات پر میری نگاہ دفعۃً
سلہ و ترتیب سے پڑی تھی حوالہ قلم کرتا ہون اور وہ کرنیل نیویل کی تحریر کے مطابق ہے،

داہنی طرف سے سڑک کے ایک جانب،

پہلا، خسرو کا مقبرہ، گنبددار، رفیع ووسیع، کو اڑ بھی ہین، بغلون مین دو لڑکے، پھر کچھ ہٹ کر سنگین حوض

---

[۱] بودہ امیرالدولہ گورنمنٹ لائبریری، لکھنو، [۲] صفحہ ۵۰ [۳] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۰،

ہشت پہل مع فوارہ، ویران وخشک، اسی لین مین،

دوسرا۔ خسرو کی بی بی کا، بلند گنبد، بیلی بیگم کہلاتی ہے، قبر کا نشان اوپر ہے، مسٹر بیلی اور گزیٹیر والے اسکو خسرو کی بہن، سلطان النسا یا سلطان بہار بیگم کا لکھتے ہین، اور یہی قرین قیاس و قابل قبول ہے،

پھر ویسا ہی ہشت پہل رنگین حوض اور فوارہ،

تیسرا شاہ بیگم کا سہ منزلہ مختصر قبہ اوپر ہے، بیگم کے داہنی طرف دو قبرین، بائین جانب دو پہلو کی صحن چبوترہ مین بھی قبرین، کواڑون سے محفوظ ہے،

ان مقبرون کے پیچھے حوض کی پشت پر قد آدم پردہ کی دیوار، جس سے کبھی پانی کے جھرنے اور آبشار روان رہے ہونگے،

دوسرے قطعے مین، پچھم طرف، اس قطار سے علحدہ، تمبولن یا تمبولن بیگم کا،

ان کی تیسری ترتیب تو قدرتی، یعنی تعمیر و زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے یہ ہونا چاہئے تھی،

(۱) شاہ بیگم - ۱۰۱۲ھ

(۲) خسرو - ۱۰۳۱ھ

(۳) سلطان بہار بیگم - ۱۰۴۴ھ

(۴) تمبولن کا - لامعلوم.

پہلی قبر بناتے وقت کس کو خیال ہوگا کہ یہان اور شاہزادے اور بیگمین بھی کبھی دفن ہونگی، بعد کی تعمیرات مین ہی سوء اتفاق سے کوئی سلسلہ و ترتیب ملحوظ نہ رکھا گیا، محض گنجایش پر نظر ڈالی گئی، جہان جگہ پائی آباد کر دیا،

باقی

رقعات عالمگیر

نواب امیر الممالک آصف الدولہ صلابت جنگ مرحوم

کے

بعض عنایت نامے

از جناب محمد غوث صاحب (عثمانیہ) حیدر آباد، دکن

حضرت ناصر جنگ شہید کی پیشگاہ سے جو عنایت نامے تنجاور کے راجہ پرتاب سنگھ کے نام صادر ہوئے تھے وہ گذشتہ مہینے میں پیش کئے جاچکے ہیں، اس وقت نواب صلابت جنگ مرحوم کے بعض عنایت ناموں کے متعلق کچھ لکھنا مقصود ہے،

فی الوقت حضرت مرحوم کے (۷) عنایت نامے پیش نظر ہیں، یہ بھی راجہ پرتاب سنگھ ہی کے نام ہیں، افسوس ہے کہ ان کے لفافے بھی تلف کر دیئے گئے ہیں، البتہ ان کی پشت پر اصل مہر چسپان کردی گئی ہے، دو عنایت ناموں کی پشت پر مرہٹی میں خلاصۂ عنایت نامہ درج ہے، اس سے عنایت ناموں کو تنجاور سے متعلق ہونے کی شہادت قوی تر ہو جاتی ہے،

یہ عنایت نامے بھی افشانی کاغذ پر ہیں، بعض خاص سے بھی مزین ہیں، ایک عنایت نامہ پر "شرح دستخط خاص" موجود ہے، "شہامت و جلادت دستگاہا" کے القاب استعمال فرمائے گئے ہیں، دو عنایت ناموں پر "صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴" کی مہر ثبت ہے اور باقی پر "آصف الدولہ ۱۱۶۵" کی مہریں ہیں۔

(۱)

تاریخی طور پر معلوم ہے کہ محرم ۱۱۶۴ھ میں قلعہ نصرت گڈہ جینچی پر از سر نو قبضہ کرنے کے لیے حضرت ناصر جنگ

شہید نے ارکاٹ سے کوچ فرمایا، اس کے بعد میدان قیچی مین جو معرکہ درپیش ہوا اسمین اعداء نے حضرت موصوف کو اپنی تفنگ کا نشانہ بنایا اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کے ساتھ ہی نواب مظفر جنگ کی حکمرانی کا پھر اعلان ہوا، نواب مظفر جنگ نے کرناٹک کے انتظامات سے فراغت حاصل کرکے جانب بلدہ فرخندہ نہاد عزم فرمایا، لیکن اثنائے راہ ہی مین ہمت بہادر خان کے ہاتھون سے نواب مظفر جنگ کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا، اب حضرت آصف جاہ اوّل کے ایک دوسرے فرزند نواب صلابت جنگ وارثِ مسند آصفی قرار پائے، اس زمانہ مین دہلی سے کوئی فرمان صادر ہوا، اس کے ضمن مین ذیل کا عنایت نامہ مرحمت ہوا، اس عنایت نامہ پر "صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴ کی مہر چسپان ہے" اور پشت پر خلاصۂ عنایت نامہ مرہٹی مین درج ہے، عنایت نامہ نے اسطرح نگارش پائی ہے:-

"درین زمان مسرت پیرا و اوان دولت افزا کہ افضال الٰہی شامل حال و امداد سماوی باعثِ حصولِ آمانی و آمال فرمان والاشان مرحمت عنوان مزین بخط اقدس اعلیٰ مرقوم قلم فرنگ بہ کمال تفقد و عنایت باخلعت دوشالہ ملبوس میمنت اختصاص از حضور پرنور شرف ورود بخشیدہ باعث وفور سرور و شکر سپاس حضرت رب غفور شد، حضرت تعالیٰ و تقدس مراحم خاقانی راکہ فی الحقیقۃ پرتو الطاف سبحانی است، بر جمیع فدویان و دولت خواہان مبارک و ہمایون و ظہور این مکارم ذریعہ ترقیات و جمعیت روز افزون سازد، زیادہ چہ نوشتہ شود۔"

(۲)

نواب صلابت جنگ مرحوم بعد مسند نشینی حیدرآباد فرخندہ بنیاد مین رونق افروز ہوئے، بعدازان جانب اورنگ آباد قصد فرمایا، اس زمانہ مین مرہٹون نے جو قوت پیدا کر لی تھی اس کا تذکرہ موجبِ تطویل ہے، مختصر یہ کہ بالاجی راؤ پسر باجی راؤ پیشوا نے احمد نگر پر قبضہ کرلیا تھا، اس کی تنبیہ کے لیے نواب صلابت جنگ مرحوم نے لشکر کو کوچ کا حکم فرمایا، سخت معرکون کے بعد لشکر آصفی فتحیاب ہوا، اس تقریب مین جو عنایت نامہ شرف صدور پایا

ٔہ ذیل مین نقل کیا جاتا ہے،

واضح ہو کہ یہ عنایت نامہ بھی جس کی پشت پر مرہٹی مین خلاصہ درج ہے بہ مہر" صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴"
جاری ہوا، بہرحال مضمون عنایت نامہ یہ ہے:۔

"الحمد للہ والمنۃ بالاجی ازقرار واقع سرجنگہاے مستوفی یافتہ بہ کمال عجز والحاح ناہج منہج قویم اطاعت وانقیاد گردید، وغاشیۂ اذعان وفرمان برداری رابردوش کشید لہذا ہم عنانی جنود مجندہ ہدایت الٰہی افواج ظفرامواج پاشنہ کوب متوجہ آن حدود[1] است وعنقریب نزول اجلال فرمودہ قاطبۂ ازغبار فتنہ وفساد مفسدان ومتمردان آن مرز وبوم را صفائے تمام می بخشد باوصف تاکیدات حضور درتقدیم وفاق واتفاق گورنڈور[2] بہادر ظفر جنگ جنرال بندیجیری[3] وشمس الدولہ بہادر مبارز جنگ[4] وااجتناب موفور از رفاقت محمد علی خان باغی[5] ظہور اعانت باغی مزبور ازان شہامت پناہ خلاف مرضی وبسیار بد واقع شدہ[6] بہر تقدیر مضیٰ مامضیٰ الحال بمجرد ورود این پروانہ عاطفت نشانہ ازین حرکت بے برکت احراز کلی ورزند، وسود وبہبود حال وقال خود را ملحوظ داشتہ ازین معنیٰ محرز باشند، وبحضور معروض دارند والا بہیچ وجہ نتیجہ نیک نخواہند یافت خیر شرط است، زیادہ چہ نوشتہ شود"

(۳)

نواب مظفر جنگ عازم بلدہ فرخندہ بنیاد ہوئے تو نواب حسین دوست خان نے صوبہ داری کرناٹک

[1] ملک کرناٹک مراد ہے، ۱۲ [2] لفظ گورنر کو اسیطرح اس زمانہ مین لکھا جاتا تھا، ۱۲ [3] ڈوپلے مراد ہے، [4] نواب حسین دوست خان چندا صاحب مراد ہین، [5] نواب والاجاہ بہادر مراد ہین، چونکہ نواب صلابت جنگ بہادر فرانسیسی اثر سے مسند آرا ہوئے تھے اور تاحال ان پر فرانسیسی اثر کافی طور سے موجود تھا، لہذا نواب والاجاہ بہادر کی مخالفت ظاہر ہے، نواب والاجاہ بہادر فرانسیسی اثر واقتدار کے بالکلیہ مخالف تھے ۱۲ [6] راجہ پرتاب سنگھ نے کرناٹک کے اُن ہنگامون مین جو نواب ناصر جنگ شہید کے بعد ظہور پذیر ہوئے نواب والاجاہ بہادر کا ساتھ دیا تھا بنا برآن یہ عتاب صادر ہوا۔ ۱۲

کاٹ سے کوچ فرمایا، اس کے بعد میدان قیچی مین جو معرکہ درپیش ہوا اسمین اعداء نے حضرت موصوف کو اپنی
نشانہ بنایا اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کے ساتھ ہی نواب مظفر جنگ کی حکمرانی
ن ہوا، نواب مظفر جنگ نے کرناٹک کے انتظامات سے فراغت حاصل کرکے جانب بلدہ فرخندہ نہاد عزم
، اثنائے راہ ہی مین ہمت بہادر خان کے ہاتھون سے نواب مظفر جنگ کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا، اب حضرت
، اوّل کے ایک دوسرے فرزند نواب صلابت جنگ وارث مسند آصفی قرار پائے، اس زمانہ مین دہلی
رمان صادر ہوا، اس کے ضمن مین ذیل کا عنایت نامہ مرحمت ہوا، اس عنایت نامہ پر "صلابت جنگ
ا" کی مہر چسپان ہے اور پشت پر خلاصۂ عنایت نامہ مرہٹی مین درج ہے، عنایت نامہ نے اسطرح
، پائی ہے :-

" درین زمان مسرت پیرا داوان دولت افزا کہ افضال الٰہی شامل حال و امداد سماوی باعث حصول امانی و آمال فرمان والاشان مرحمت عنوان مزین بخط اقدس اعلیٰ مرقوم قلم فرنگ بہ کمال تفقد و عنایت باخلعت دوشالہ ملبوس میمنت اختصاص از حضور پر نور شرف ورود بخشیدہ باعث وفور سرور و شکر سپاس حضرت رب غفور شد، حضرت تعالیٰ و تقدس مراحم خاقانی را کہ فی الحقیقہ پرتو الطاف سبحانی است، بر جمیع فدویان و دولت خواہان مبارک و ہمایون و ظہور این مکارم ذریعہ ترقیات و جمعیت روز افزون سازد، زیادہ چہ نوشتہ شود۔"

(۲)

نواب صلابت جنگ مرحوم بعد مسند نشینی حیدرآباد فرخندہ بنیاد مین رونق افروز ہوئے، بعد از ان جانب
د قصد فرمایا، اس زمانہ مین مرہٹون نے جو قوت پیدا کرلی تھی اس کا تذکرہ موجب تطویل ہے، مختصر یہ
پسر باجی راؤ پیشوا نے احمد نگر پر قبضہ کرلیا تھا، اس کی تنبیہ کے لیے نواب صلابت جنگ مرحوم نے لشکر کو
م فرمایا، سخت معرکون کے بعد لشکر آصفی فتحیاب ہوا، اس تقریب مین جو عنایت نامہ شرف صدور پایا

وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے،

واضح ہو کہ یہ عنایت نامہ بھی جس کی پشت پر مرہٹی میں خلاصہ درج ہے بہ مہر" صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴ء"

جاری ہوا، بہرحال مضمون عنایت نامہ یہ ہے:-

" الحمدللہ والمنۃ بالاجی از قرار واقع سرجنگہاے مستوفی یافتہ بہ کمال عجز و الحاح نا ہج منہج قویم اطاعت و انقیاد گردید، و غاشیہ اذعان و فرمان برداری را بر دوش کشید لہذا ہم عنانی جنود مجندہ ہدایت الٰہی افواج ظفر امواج پاشنہ کوب متوجہ آن صدود[1] است و عنقریب نزول اجلال فرخندہ قاطبۂ از غبار فتنہ و فساد مفسدان و متمردان آن مرز و بوم[2] اصفائے تمام می بخشد باوصف تاکیدات حضور در تقدیم دفاق و اتفاق گورنر[3] بہادر ظفر جنگ جنرال بندر پھلچری[4] و شمس الدولہ بہادر مبارز جنگ[5] داجتناب موفور از رفاقت محمد علی خان باغی[6] ظہور اعانت باغی مزبور از ان شہامت پناہ خلاف مرضی دلسیار بد واقع شدہ[7] بہر تقدیر مضی ما مضی الحال بمجرد ورود این پروانہ عاطفت نشانہ ازین حرکت بے برکت احتراز کلی ورزند، وسود و بہبود حال و مآل خود در ملحوظ داشتہ ازین معنی محرز باشند، و بحضور معروض دارند والا ہیچ وجہ نتیجہ نیک نخواہند یافت خیر شرط است. زیادہ چہ نوشتہ شود "

(۳۳)

نواب مظفر جنگ عازم بلدہ فرخندہ بنیاد ہوئے تو نواب حسین دوست خان نے صوبہ داری کرناٹک

---

[1] ملک کرناٹک مراد ہے، ۱۲ [2] لفظ گورنر کو اسیطرح اس زمانہ میں لکھا جاتا تھا، ۱۲ [3] ڈوپلے مراد ہے، [4] نواب حسین دوست خان چندا صاحب مراد ہیں، [5] نواب والاجاہ بہادر مراد ہیں، چونکہ نواب صلابت جنگ بہادر فرانسیسی اثر سے مسند آرا ہوئے تھے اور تا حال ان پر فرانسیسی اثر کافی طور سے موجود تھا، لہذا نواب والاجاہ بہادر کی مخالفت ظاہر ہے، نواب والاجاہ بہادر فرانسیسی اثر و اقتدار کے بالکلیہ مخالف تھے ۱۲ [6] راجہ پرتاب سنگھ نے کرناٹک کے اُن ہنگاموں میں جو نواب ناصر جنگ شہید کے بعد ظہور پذیر ہوئے نواب والاجاہ بہادر کا ساتھ دیا تھا بنا بران یہ عتاب صادر ہوا۔ ۱۲

کے لئے بڑی جد وجہد کی، نواب مظفر جنگ نے ان کو اس خدمت پر مامور کیا تھا، نواب والاجاہ بہادر حسب فرمان و مسلی
جو نواب ناصر جنگ شہید کی وساطت سے مرحمت ہوا تھا، خود کو اس خدمت کا مستحق خیال کرتے تھے، ان دونوں دعوی
دارون نے اپنی پوری قوت صرف کی، انجام کار نواب حسین دوست خان کو راجہ پرتاب سنگھ کے ایک جنرل ماناجی راو نے
دھوکہ دیکر شعبان ۱۱۶۵ھ مین قتل کر ڈالا، اس واقعہ کے بعد نواب صلابت جنگ مرحوم نے جو عنایت نامہ جاری فرمایا

"فوجداری و متصدی گری ارکاٹ وغیرہ کرناٹک پایان گھاٹ از انتقال شمس الدولہ حسین دوست خان
بہ شہامت و بسالت دستگاہ غلام مرتضیٰ خان بہادر[1] مقرر و مفوض شد کہ باتفاق و استصواب مہربان بلند
مکان گورنر بہادر جنرال ظفر جنگ[2] بسرانجام مہام انجا پردازند آن شہامت دستگاہ بموافقت و مرافقت
گورنر بہادر و غلام مرتضیٰ خان بہادر کوشند کہ موجب . . . . و ذریعہ بہبود آن جلادت
دستگاہ خواہد بود، زیادہ چہ نوشتہ شود"

متذکرہ بالا عنایت نامہ بہ مہر "آصف الدولہ ۱۱۶۵" نافذ ہوا"

(۴)

اسی ضمن مین ایک دوسرا عنایت نامہ بھی صادر ہوا، اس پر بھی "آصف الدولہ ۱۱۶۵" مہر چسپان ہے، عنایت نا
مضمون نے اس طرح نگارش اختیار کی ہے:-

"قبل ازین عنایت نامجات متواتر متضمن طلب حضور بہ انور الدین خان بہادر[3] ترسیل یافتہ حالا ہم بتاکید
تشدید نوشتہ شدہ یقین کہ مطابق حکم کاربند خواہد شد چون خدمت جلیل المرتبت ارکاٹ در ترچناپلی بعمو صاحب
مہربان گورنر بہادر ظفر جنگ[4] مقرر است درین ولا نیابت عمو صاحب معز الیہ بہ شہامت دستگاہ
غلام مرتضیٰ خان[5] تفویض یافتہ باید کہ آن جلادت دستگاہ باتفاق و استصلاح گورنر بہادر شریک خان

۱؎ غلام مرتضیٰ خان دیلور کے جاگیردار تھے، اور نواب حسین دوست خان کے خاندان سے ہی تھے۔ ۲؎ ڈوپلے مراد ہے، ۳
۳؎ نواب والاجاہ بہادر مراد ہین۔ ۴؎ ڈوپلے مراد ہے۔ ۵؎ جاگیردار دیلور،

مشارالیہ بودہ من خدمت وترددرا فدیہ توجہ خاطر شناسند، زیادہ چہ نوشتہ شود "

شرح دستخط خاص :۔ " تاکید اکید دانند "

نواب صلابت جنگ مرحوم کے مقابلہ مین حضرت آصف جاہ اول کے بڑے فرزند نواب غازی الدین خا

جنگ مرحوم مسند پدری کے آرزومند ہوئے، پیشگاہ حضرت بادشاہ احمد شاہ سے خلعت صوبہ داری دکن عنایت

ملہارجی ہولکر اور جی آپا سندھیہ نے ساتھ دیا، برہان پور مین پہنچکر بعض انتظامات بھی انجام پائے، قرب وجوار

وغیرہ نے حکم برداری اختیار کی، وہان سے جانب اورنگ آباد توجہ عمل مین آئی، یہان ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ مین پیا

آگیا، اس واقعہ کے بعد جو عنایت نامہ بہ مہر " آصف الدولہ ۱۱۶۵ھ " جاری ہوا وہ یہ ہے :۔

" سانحہ ناگزیر نواب صاحب و قبلہ فیروز جنگ مرحوم باعث ملال خاطر شد کہ بزرگ بودند و ذات ایشان

را از مغتنمات می دانستم الحال برائے تنبیہ و تادیب فرقہ واجب التفرقہ زیادہ . . . . . آمدیس منزل

بہ منزل توجہ عساکر فتح رہبر در پیش است بخاطر جمع بہ رفاقت انورالدین خان بہادر سرگرم شیوۂ زمینداری

و مالگذاری بودہ رہ نورد اطاعت و انقیاد باشند و این معنی را ذریعہ سود و بہبود حال و قال شناسند زیادہ

چہ نوشتہ شود "

(۶)

صاحب توزک آصفیہ کا بیان ہے کہ نواب غازی الدین فیروز جنگ مرحوم کے انتقال کے بعد نواب

جنگ مرحوم کے نام پیشگاہ بادشاہی سے فرمان استقلال شرف صدور لایا، اور خطاب آصف الدولہ مرحمت

اس ضمن مین جو عنایت نامہ بہ مہر آصف الدولہ ۱۱۶۵ھ صادر ہوا وہ یون ہے :۔

" درین ایام فیروزی انجام شقہ موشح بخط قدسی نمط متضمن مشکور گردیدن مساعی و ترددات

تنبیہ و تادیب بالاجی در پیش گاہ خلافت و جہان بانی و ظہور عنایات و تفضلات بے پایان

---

[1] غالباً نواب والا جاہ بہادر مراد ہین، [2] ص ۲۴۷

و شگفتگی گلشن ہمیشہ بہار خاطر ملکوت ناظر اقدس اعلیٰ بر شحات این لطیفہ روح افزا عنایت خطاب مستطاب آصف الدولہ و خلعت ملبوس خاص مع سرپیچ مرصع بورود مسعود مرحمت آمود سرمایہ فخر و مباہات و مبانی و آمال را استحکام تمام بخشید، مراتب مرقومہ از نقل آں کہ فرستادہ شد معلوم خواہد شد باید بر جادۂ صدق اعتقاد و برلوح عقیدت مستقیم بودہ نویسان حالات در و داد باشند و بادای زرہاے بکار ذمہ خود پرداز ند این معنی ذریعہ سود و بہبود خود شناسند زیادہ چہ نوشتہ شود"

اس عنایت نامہ سے واضح ہے کہ خطاب آصف الدولہ نواب غازی الدین خان فیروز جنگ مرحوم کے انتقال سے قبل مرحمت ہوا، چنانچہ نواب حسین دوست خان کے قتل کے بعد جو عنایت نامے نافذ فرمائے گئے اس پر "آصف الدولہ" کی مہر چسپاں ہے، نواب حسین دوست خان کا واقعہ نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے انتقال سے قبل وقوع ہوا ہے، بالاجی راؤ پر فتحیابی سے متعلقہ جو عنایت نامہ اس سے قبل نمبر ۲ پر نقل کیا گیا ہے، اس پر "صلابت جنگ بہادر" کی مہر چسپاں ہے، اس کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ خطاب "آصف الدولہ" عنایت ہوا، بہر حال توزک آصفیہ کا یہ بیان درست نہیں کہ "خطاب آصف الدولہ" بھی نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے انتقال کے بعد مرحمت ہوا،

(۷)

پیشگاہ بادشاہی سے کوئی اور فرمان عنایت ہوا، اس کے متعلق ذیل کا عنایت نامہ بہ مہر "آصف الدولہ" ۱۱۶۵ھ نافذ ہوا :-

"درین ایام عشرت آغاز فیروز انجام فرمان والا شان موشح بخط خاص تقدس اختصاص مشحون باصناف تفضلات و انواع تفقدات پرتو ورود افگندہ ساحت امانی و آمال را روشن ساخت دقائق عواطف بدر افزون روح افزاے والا از روے نقل آن کہ بجہت مزید سرور و ابتہاج خاطر ان شہامت دستگاہ سمت ترسیل پذیرفتہ، واضح و لائح خواہد گردید زیادہ چہ نوشتہ شود"،

تلخیص و تبصرہ

اسلام کے قرون وسطیٰ میں ساہوکاری کی ابتدا

عنوان بالا سے مضامین کا ایک سلسلہ جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں شروع ہوا ہے، جس کی پہلی قسط کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے:-

گذشتہ تیس چالیس سال کے اندر دسوین صدی عیسوی کی سلطنت عباسیہ سے متعلق چند ایسے ماخذ شائع ہو گئے ہین مثلاً تاریخ الوزراء ہلال الصابی، کتاب تجارب الامم مسکویہ اور نشوار المحاضرہ التنوخی جو اس عہد کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کے لیے حقیقۃً ایک خزینۂ معلومات ہین، ان تصانیف نے ہمارے سامنے بالکل ایک نئی دنیا کھول کر رکھ دی ہے، ان کتابون کے مصنف چونکہ خود حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار تھے اسلئے انھون نے خاص طور پر معاشی حالات اور ملکی نظم و نسق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور مالیات، نظام مالگذاری، انتظام زمینداری، عملۂ حکومت اور وزراء کے حالات نہایت وضاحت سے پیش کئے ہین، ان ماخذون مین مختلف ادارون، محکمون، اور دفترون کے نامون کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن ہم کو فوراً ہی یہ نہین معلوم ہو جاتا کہ کیونکر وہ تمام ادارے کام کرتے تھے یا یہ کہ حکومت کی اس مشین کی ہر کڑی سے متعلق کو نسا کام

اس پیچ در پیچ نظام حکومت کو سمجھنے کے لیے صرف ایک طریقہ ممکن ہے یعنی اصطلاحات سے ابتدا کیجائے اور علٰحدہ علٰحدہ ہر اصطلاح کے معنی متعین کئے جائین، یہی طریقہ بیت المال الخاصہ اور بیت المال العامہ کے معنی کی تعیین مین استعمال کیا گیا ہے اور اسی طریقہ سے مسلمانون کے مالی نظام کی تحقیق کی کوشش کی جائیگی،

نیز لفظ جہبذ کے سلسلہ مین یہود کی تاریخ کے ایک پہلو پر روشنی ڈالیجائیگی، ان کتابون مین معاشی اور مالی نظام کے بیان مین یہود کا ذکر بھی اکثر آیا ہے جو حکومت کے اعلیٰ عہدون پر مامور تھے اور جنکو سلطنت کے مالیات سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ایک مسلمان مورخ کے لیے ان کا ذکر کرنا ناگزیر تھا،

ہم جہبذ کے لفظ سے اپنی تحقیق کی ابتدا کرتے ہین، ایک عرب لغت نویس اس کے معنی یہ بتاتا ہے

"ایک ماہر مالیات جو پیچیدہ ترین معاملات مین تجربہ رکھتا ہو اور روپیہ کے کاروبار مین پوری طرح ماہر ہو"

جہبذ کا ذکر خلیفہ المنصور (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) کے زمانہ کے عرب ماخذون مین بھی آیا ہے لیکن جو لوگ خاص طور پر اس لقب سے ممتاز تھے وہ دسوین صدی عیسوی مین زیادہ نمایان ہوئے اسکا سبب غالبًا یہ ہو کہ اس صدی مین تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا، نوین صدی کے آخر مین سلطنت عباسیہ کے مالی نظام مین ایک تبدیلی واقع ہوئی، اسکا سبب جیسا کہ وان کریمر پہلے بیان کرچکا ہے، یہ ہوا کہ درہم نقرئی کے بجائے اب دینار طلائی معیاری سکہ قرار پایا، یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ آٹھوین اور نوین صدی کے فرد محصول مین مغربی صوبون کی آمدنی دنیار مین ظاہر کیگئی ہے اور مشرقی صوبون کی درہم مین، برخلاف اس کے دسوین صدی مین بجٹ کی تمام مدون کا حساب دینار مین دکھایا گیا ہے،

ان جدید حالات اور رائج الوقت سکون کے اختلاف اور انکی قیمتون کے اتار چڑھاؤ نے اس امر کی ضرورت پیدا کی کہ جو سکے بیت المال عامہ مین داخل ہون وہ معیاری سکون مین تبدیل کرکے داخل کئے جائین یہی کام جہبذ کو سپرد ہوا اور اسی وجہ سے جہبذ کا عہدہ ایک ضروری عہدہ قرار پایا، اس عہدہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان ماخذون مین مال الجہبذ کا ذکر اکثر آیا ہے، نیز ایک مخصوص دیوان الجہبذ کے قیام کا تذکرہ بیان ہے اور ان لوگون کا نام بار بار آیا ہے جو جہبذ کے لقب سے پکارے جاتے تھے، مال الجہبذ ایک قسم کا محصول ہی جو اس زمانہ کے مالیات مین کافی اہمیت رکھتا تھا، سنہ ۹۱۸-۱۹ء کے بجٹ مین یہ ایک مخصوص مد کے طور پر رکھا گیا تھا، دیوان الجہبذ کے قیام کا ذکر اول اول سنہ ۹۲۸ء مین آتا ہے، اس دیوان کا افسر اعلیٰ اسوقت یک

عیسائی ابراہیم بن ایوب تھا، قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج مین دیوان الجہبذ کا تفصیلی بیان موجود ہے، لیکن جہبذ کے کام سے واقفیت کا ذریعہ مال الجہبذ کی اصطلاح کا رائج ہونا اور دیوان الجہبذ کا قائم ہونا ہی نہین ہے بلکہ ہمارے ماخذون مین بھی ان لوگون کے نام اور ان کے کامون کے صحیح حالات موجود ہین جو جہبذ کے لقب سے پکارے جاتے تھے، مثلاً ان ماخذون مین حسب ذیل جہبذون کے نام دیئے ہوئے ہین:۔ ابراہیم بن احمد بن ادریس، ابراہیم بن یوحنا، ذکریا بن یوحنا، سہیل بن نذیر، اسرائیل بن صالح، نکوس بن اندونا وغیرہ وغیرہ،

خلیفہ المقتدر کے دربار مین جتنے جہبذ تھے ان مین سے کسی نے ان دو جہبذون کی سی اہمیت حاصل نہین کی جو الجہبذان الیہودیان کے لقب سے مشہور ہین اور جنکے نام یوسف بن فنیحاس، اور ہارون بن عمران ہین، یہان عہد عباسیہ کے یہودی عہدہ دارون کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، اس وقت اس سے بحث نہین کہ اسلامی حکومتون مین یہود اور دوسرے اہل ذمہ کو سرکاری عہدے کس حد تک دیئے جاتے تھے، عرب لٹریچر مین جو کچھ ادھر اُدھر ملتا ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اگرچہ اسلامی قانون اجانب مین غیر مسلمون کو حکومت کے عہدون پر مامور کرنے کی سختی سے ممانعت تھی تاہم اس ممانعت کی کبھی پوری پابندی نہین کیگئی، اس امر کی صریح تاریخی شہادت موجود ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے اہل ذمہ ہر زمانہ مین اسلامی حکومتون کے مختلف شعبون مین ملازم تھے، حقیقت یہ ہے کہ بعض شعبون کے لئے اہل ذمہ کی مخصوص لیاقت کو دیکھتے ہوئے خلفاء انھین اپنی ملازمتون مین داخل کرنے پر مجبور رہتے تھے، خلیفہ المقتدر کو بھی جس کے عہد حکومت سے ہمین اسوقت بحث ہے یہود و نصاریٰ کو حکومت کے بعض عہدون پر مقرر کرنا ہی پڑا، اسکے عہد سے قبل بھی سرکاری ملازمتون مین غیر مسلمون کی ایک تعداد ضرور رہی ہوگی کیونکہ اس نے اپنی حکومت کی ابتداہی مین اہل ذمہ کے مسئلہ ملازمت سے متعلق ایک قانون نافذ کیا اور ۲۹۰ھ مین ایک فرمان کے ذریعہ سے یہود اور نصاریٰ کو صرف طبیب اور جہبذ کے عہدون پر مقرر کئے جانے کی اجازت دی، عرب جغرافیہ دان مقدسی مصر و شام کے حالات کے سلسلہ مین لکھتا ہے:۔

"یہان اکثر جہابذہ، رنگساز، صیارفہ اور دباغ یہودی ہین، اکثر اطبا، اور کتبہ (محرر) عیسائی ہین"

دسوین صدی مین سلطنت عباسیہ کے یہود کے پیشون سے متعلق ہماری واقفیت کا ذریعہ ابتک مقدسی کی یہ شہادت اور المقتدر کا فرمان ہی تھا لیکن ہمارے جدید ماخذ نہ صرف ان بیانات کی تصدیق کرتے ہین بلکہ ان مین بہت کچھ اضافہ بھی کرتے ہین، خصوصًا ان ماخذون سے یوسف بن فینحاس اور ہارون ابن عمران کے حالات اور خلیفہ مقتدر کے دربار مین ان کے کارنامے تفصیل کیساتھ معلوم ہوتے ہین،

ان ماخذون مین ان دونون کا ذکر بار بار الجہبذان الیہودیان یا التجار کے نام سے آتا ہے اور ان مین سے ہر ایک کا ذکر جہبذ اہواز کے نام سے بھی آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق صوبہ اہواز کی مالیات سے بھی تھا، ان القاب ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلطنت عباسیہ کے محکمۂ مالیات مین کس درجہ اہمیت رکھتے تھے' ان کا ایک لقب جہابذۃ الحضرۃ (COURT BANKERS) بھی تھا جس سے انکی اعلیٰ حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، دونون کا ذکر ہمیشہ ساتھ ساتھ آتا ہے، سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داران کو ایک ہی فرد خیال کرتے تھے، وزیر سلطنت جب ان سے قرض لیتا تھا تو معاہدہ یوسف اور ہارون دونون کیساتھ بلکہ ان کے جانشینون (ومن قام مقامہما) کے ساتھ بھی ہوتا تھا، اسی طرح اگر وزیر انھین سزا کی دھمکی دیتا تو اس دھمکی مین دونون بلکہ ان کے ورثاء (وعلی ورثتہما) بھی شریک ہوتے،

ان بیانات سے کافی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ دونون نے ایک مشترک فرم قائم کرلی تھی، اس فرم مین یوسف اور ہارون کے علاوہ ممکن ہے اور لوگ بھی شریک رہے ہون، ہارون بن عمران کا ایک لڑکا اپنے باپ کیساتھ درباری جہبذ کے فرائض انجام دیتا تھا، اس مشترک فرم کے قیام کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ کے کثیر مطالبات کا پورا کرنا کسی ایک شخص کے اختیار سے باہر تھا، بہرحال جو سبب بھی رہا ہو یہ واقعہ ہے کہ خلیفہ مقتدر کے زمانہ مین ایک بنک قائم ہوگیا تھا جسے آجکل کی اصطلاح مین "یوسف ہارون، اینڈ کمپنی، ہیڈ آفس بغداد" کہہ سکتے ہین،

اس بنک کی اندرونی تنظیم آیندہ بیان کیجائیگی، اسوقت صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ یہودی ساہوکار کس زمانہ مین دربار خلافت سے تعلق رکھتے تھے، التنوخی کہتا ہے:- "دونون (یوسف اور ہارون) عبید اللہ بن یحیی الخاقانی کے زمانہ مین مقرر ہوئے تھے" لیکن یہ بیان عرب ماخذون مین دئے ہوے دوسرے واقعات اور تاریخون سے اسی وقت مطابق ہوسکتا ہے جب ہم عبید اللہ بن یحیی کے بجاے محمد بن عبید اللہ بن یحیی پڑھین، عبید اللہ ابن یحیی سنہ ۸۵۲ء سے سنہ ۸۶۰ء تک خلیفہ المتوکل کا اور سنہ ۸۶۷ء سے سنہ ۸۷۵ء تک خلیفہ معتمد کا وزیر تھا، لیکن اہل ذمہ کو سرکاری ملازمتون مین داخل کرنے کی نسبت ان دونون خلفاء کا جو طرز عمل تھا اس کے لحاظ سے امید نہین کہ ان کے زمانون مین یہود اعلی عہدون پر مقرر کئے گئے ہون، علاوہ برین خود ماخذون مین اس بیان کی تائید کے لیے کوئی شہادت موجود نہین ہے، برخلاف اسکے محمد بن عبید اللہ ابن یحیی المقتدر کے وزرا مین تھا اور وہ ٹھیک اسی زمانہ مین تھا جب ہم کو اول اول ان یہودیون کے حالات معلوم ہوتے ہین، گمان غالب یہ ہے کہ دربار مین ان دونون یہودیون کا تقرر اس وقت ہوا جب محمد بن عبید اللہ کی وزارت شروع ہوچکی تھی یعنی سنہ ۹۱۱ء اور سنہ ۹۱۲ء کے درمیان، واقعات بھی اس خیال کے مطابق ہین کیونکہ ان یہودیون سے پہلا معاملہ جو ہمارے ماخذون مین مذکور ہے سنہ ۹۰۸ء مین وزیر ابن الفرات کے ساتھ ہوا تھا اسکے بعد بھی اور خصوصاً سنہ ۹۱۳، ۹۱۶ء، سنہ ۹۲۱، سنہ ۹۲۳، اور سنہ ۹۲۴ء کے حالات مین ان کا ذکر بار بار آتا ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقرر کے بعد سے سنہ ۹۲۳ء تک یوسف اور ہارون کا تعلق دربار خلافت سے برابر قائم رہا، سنہ ۹۲۳ء کے بعد اس فرم کا کوئی ذکر ہمارے ماخذون مین نہین پایا جاتا جس کی وجہ یہ ہے کہ وزیر ابن الفرات جو ان کا مربی اور سرپرست تھا، سنہ ۹۲۴/۲۵ء مین برطرف کردیا گیا تھا، اگرچہ صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ "وہ دونون اپنی وفات تک برخاست نہین کئے گئے" لیکن یہ ممکن ہے کہ ان کی وفات بھی سنہ ۹۲۳ء ہی مین واقع ہوئی ہو، بہرحال ہر صورت مین المقتدر ہی کا زمانہ سلطنت عباسیہ مین ساہوکاری کی ابتدا کا زمانہ تھا،

"ع ز"

خلفائے عباسیہ کے چند آثار عراق مین،

خلفائے عباسیہ کے تمام تمدنی آثار جو ان کے دورِ حکومت مین، محلون، مسجدون، خانقاہون، مدرسون، مہمان خانون اور نہرون کی صورت مین قائم تھے مٹ گئے، البتہ عراق مین ان کے چند آثار اب بھی باقی ہین، جنکا تذکرہ جون ۱۹۳۲ء کے الہلال نے کیا ہے، ہم ناظرینِ معارف کی دلچسپی کے لیے اسکی تلخیص ذیل مین درج کرتے ہین،

جامع معتصم باللہ | معتصم نے یہ جامع مسجد سُرّمن رائے مین پانچ لاکھ دینار کے صرف سے تعمیر کی تھی اور اسکی دیوارون کے سامنے کے حصے مین شیشے جڑوا دیئے تھے، اس لئے ہر نمازی حالتِ نماز مین اپنے پیچھے سے آنے والے شخص کو دیکھ سکتا تھا، شیشون کے جڑنے کی جگہ اب بھی دیوارون مین موجود ہے، اور وہ دیکھنے والون کو علانیہ نظر آتی ہے، اسکا منارہ بھی ایک عجیب چیز ہے، اور عراق مین اسکو ملویہ کہتے ہین،

قصر ابی العباس احمد الناصر لدین اللہ | اس محل کا نام دار المسناۃ ہے، اور وہ بغداد کی مشرقی چار دیواری کے قریب شمالی جانب قائم کیا گیا تھا اور ابن جبیر نے اسکو دیکھا تھا ناصر لدین اللہ نے اس مین ایک کتبخانہ بھی قائم کیا تھا، جسکا ذکر قفطی نے بشر بن احمد بغدادی کے حال مین کیا ہے، اب اس کے چند حجرے اور ایوان باقی رہگئے ہین، لیکن انھی سے اسکی تعمیری شان و شوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

منارہ جامع المکتفی باللہ | یہ منارہ خود بنو عباس کے آثار مین شامل نہین ہے، البتہ ان کے دورِ خلافت کے ختم ہونے کے ۲۲ سال بعد انھی کی جامع مسجد مین بنایا گیا ہے، اور اس پر خط کوفی مین یہ عبارت لکھی ہوئی ہے،

"اباقاخان مین ہلاکو خان کے عہد حکومت مین علاء الدین عطاملک الجوینی الفارسی کی ولایت مین تعمیر کیا گیا"

۶۷۸ھ مین اسکی تعمیر آٹھ سال کی مدت مین ختم ہوئی،

معروف کرخی کی قبر کا منارہ | یہ منارہ فن تعمیر کا عجیب و غریب نمونہ ہے، اور اسکو ابو العباس الناصر لدین اللہ نے بنایا

ہے، چنانچہ اس کے ایک چھوٹے سے طاق مین یہ عبارت منقوش ہے،

"یہ منارہ ۶۱۲ھ مین تعمیر کیا گیا"

اور یہی ناصر لدین اللہ کی حکومت کا زمانہ ہے، کیونکہ وہ ۵۷۵ھ مین خلیفہ ہوا اور ۶۲۲ھ مین وفات پائی، علی بن اثیر نے لکھا ہے کہ "ناصر کے ولیعہد نے ۶۱۲ھ مین وفات پائی، اور معروف کرخی کی قبر کے پاس دفن کیا گیا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولیعہد کی وفات اور اس منارے کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی ہے، اور غالباً اس منارے کی تعمیر کا سبب بھی یہی ہے،

مسجد حظائر کا منارہ یہ منارہ بھی معروف کرخی کی قبر کے منارہ سے مشابہت رکھتا ہے، یہ مسجد اب جامع الخفافین کے نام سے مشہور ہے، اور دجلہ کے کنارے مدرسہ مستنصریہ کے نیچے واقع ہے، اس مسجد کو ناصر کی مان زمردخاتون نے بنوایا تھا اس لیے منارہ بھی اسی کا بنوایا ہوا ہے،

مدرسہ مستنصریہ اور اسکی گھڑی یہ مدرسہ اب بالکل ویران ہے، صرف اسکی دیوارین دجلہ کے کنارے کھڑی ہین، اس کے دروازے پر ایک منقوش تحریر تھی، لیکن اب وہ موجود نہین، ایک دیوار پر البتہ ایک تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی عمارت ۶۳۱ھ مین تکمیل کو پہنچی،

اس مدرسہ کی آبی گھڑی اس کے سامنے کے ہال مین تھی جو ۶۳۳ھ مین تعمیر ہوا، اور اس کے نیچے ایک سائبان تھا، جس مین طبیب بیٹھکر طلبہ کو درس دیتا تھا اور مریضون کا علاج کرتا تھا، اسی سائبان کی دیوار مین ایک دائرہ بنایا گیا تھا جسمین آسمان کی شکل بنائی گئی تھی، اور اس مین چھوٹے چھوٹے طاق تھے، جس مین چھوٹے چھوٹے دروازے بنائے گئے تھے، اس دائرے مین سونے کے دو باز سونے کی دو طشتون مین کھڑے کیے گئے تھے، اور اس کے پیچھے سیسے کے دو گولے تھے جو دیکھنے والے کو نظر نہین آتے تھے، ہر گھڑی کے گذرنے کے بعد دونون بازون کے منہ کھل جاتے تھے اور ان سے وہ دونون گولے گر پڑتے تھے، اور جب ایک گولہ گرتا تھا تو ان طاقون کا ایک دروازہ کھل جاتا تھا، اور جب دونون گولے دونون طشتون مین گر چکتے تھے تو اپنی اپنی

جگہ پر چلے جاتے تھے، اس کے بعد سورج کے نکلنے کے ساتھ اس مصنوعی آسمان مین سونے کے بہت سے سورج نکل آتے تھے اور حقیقی سورج کی گردش کے ساتھ گردش کرتے تھے اور اس کے ڈوبنے کے ساتھ ڈوب جاتے تھے، پھر جب رات ہوتی تھی تو اس روشنی سے جو سورج کے پیچھے ہوتی تھی، بہت سے چاند نکل آتے تھے اور جب ایک گھڑی پوری ہو جاتی تھی تو چاند کے دائرے مین وہ روشنی بھی پوری ہو جاتی تھی پھر رات کے ختم ہونے اور سورج کے نکلنے کے وقت تک دوسرے دائرے مین شروع ہوتی تھی،

"ع"

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلت کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین، بالخصوص خود عالمگیر کے انشا اور اسکی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط اور رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کیگئی ہے، ضخامت ، ۸۴ صفحے، قیمت ۱۲؎

"منیجر"

اخبار علمیہ

شیشے کی سڑک

لندن کے ایک نوجوان شخص نے چھ سال کی مسلسل کوشش اور متواتر ناکامیون کے بعد بالآخر ایسا شیشہ تیار کرلینے مین کامیابی حاصل کرلی ہے جس سے آیندہ سڑکین بنائی جاسکین گی، اس نوجوان کا نام جارج رکیٹس (GEORGE J. RICKETTS) ہے، موجودہ پتھر کی سڑکون مین جو خرابیان ہین ان کو پیش نظر رکھ کر رکیٹس ایسی سڑک بنانا چاہتا ہے جو ان سڑکون سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہو، چنانچہ اس کے لیے اس نے شیشہ کی چھوٹی چھوٹی سلیین تیار کی ہین، یہ سلیین پانچ پانچ انچ مربع ہین اور ان کی دبازت ڈیڑھ انچ ہے، ان کی تہ کا حصہ بقدر (½) انچ مجوف ہے، ان کی سطح دندانہ دار ہے جس کی وجہ سے پھسلنے کا خطرہ باقی نہین رہتا، بعض لوگون کا خیال ہے کہ یہ سلیین سڑک کی تعمیر کے لیے کافی مضبوط نہ ہونگی، لیکن ان کی مضبوطی کا امتحان کیا جاچکا ہے، ساڑھے تین سیر وزن کے ہتھوڑے سے ان کو توڑنے کی کوشش کیگئی، لیکن ان پر کوئی اثر نہین ہوا، موسم گرما کی شدت مین ان سلون کے پگھلنے کے متعلق بھی خطرہ ظاہر کیا گیا ہے، لیکن سب سے زیادہ نرم قسم کے شیشہ کا نقطۂ گداخت بھی (۱۶۰۰) درجہ فارن ہائٹ ہوتا ہے اور انگلستان کی گرمی عموماً (۹۵) اور (۱۰۰) درجہ کے درمیان ہوتی ہے، آجکل سڑکین موٹرون کے تیل گرنے سے بھی بہت خراب ہوتی رہتی ہین، لیکن تجربہ کرکے دیکھ لیا گیا ہے کہ ان شیشون پر تیل کا بھی کوئی اثر نہین ہوتا، سلون کی سطح ہیرے کی شکل کی بنائی گئی ہے، اور جب یہ ایک دوسرے سے ملاکر بچھادی جاتی ہین تو سڑک کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک متوازی خطوط قائم ہوجاتے ہین جنسے ہوکر کیچڑ اور پانی فوراً موریون مین پہنچ جاتا ہے، جن شیشون سے یہ سلیین تیار کی گئی ہین وہ بالکل معمولی شیشے ہین جو بیکار سمجھ کر پھینک دیے جاتے

ہین، مثلاً شراب کی پرانی بوتلین، مربون کے مرتبان اور دریچون کے پرانے شیشہ کے ٹکڑے، لیکن موجد نے ان سب کو اپنے طریقہ پر گلا کر اسقدر پائدار اور کارآمد بنا لیا ہے،

پڑھنے والا آلہ،

برلن کے ایک شخص نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ اگر اس مین ایک اخبار رکھدیا جائے تو وہ اسکو نہایت بلند آواز سے پڑھ سکتا ہے، اسلئے اس ایجاد سے اخبار بینی اور مطالعہ مین آنکھون پر مطلق زور نہین پڑتا، بلکہ ایک انسان چپ چاپ لیٹے لیٹے اس آلہ کی زبان سے اخبار و واقعات کو سُن سکتا ہے،

لکڑی کے آلے

اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسان عصر حجری مین صرف پتھر کے آلے استعمال کرتا تھا، لیکن علم الآثار کے ایک فرنچ عالم نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اس زمانے مین انسان لکڑی کے آلے بھی استعمال کرتا تھا، یعنی پہلے وہ لکڑی کے ہتھوڑے سے پتھر توڑتا تھا، پھر اس کو تیز کرکے اُس سے لکڑی کاٹتا تھا اور اس لکڑی سے ضروری آلات تیار کرتا تھا،

رنگ کے اندھے

تین فیصدی آدمی ایسے ہین جو مختلف رنگون کو دیکھکر ان مین تمیز نہین کرسکتے، طبی اصطلاح مین یہ لوگ رنگ کے اندھے کہے جاتے ہین، لیکن حال مین اطباء نے ایسے اشخاص کا پتہ چلایا ہے، جنکو ایک رنگ کے سوا دوسرا رنگ نظر نہین آتا، چنانچہ دس آدمی اس مرض مین مبتلا پائے گئے کہ ان کو خاکستری رنگ کے سوا دوسرا رنگ نظر نہین آتا تھا،

مارفیا کا قائم مقام

مارفیا کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اعصاب کو سُن کر دیتی ہے، جس سے انسان کو نیند آجاتی ہے، لیکن اس مین عیب یہ ہے کہ انسان اسکا عادی ہو جاتا ہے، لیکن حال مین ایک ڈاکٹر نے ایک ایسی جڑی دریافت کی ہے،

جو اعصاب کے سن کرنے مین تو مارفیا ہی کی خاصیت رکھتی ہے، لیکن انسان اسکا عادی نہین ہوتا،

نباتات کا طریقۂ علاج

نباتات کو جو روگ لگ جاتے ہین، اُن کے علاج سے اطبار عاجز تھے، سر دست انھون نے علاج کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ برقی رو سے ان جراثیم کو فنا کر دیتے ہین جو نباتات مین بیماریان پیدا کرتے ہین اگر یہ طریقہ علاج کامیاب ہو جائے تو نباتاتی امراض کا خاتمہ ہو سکتا ہے، لیکن اطبار کو یہ خوف ہے کہ برقی لہرین کہین ان جراثیم کو بھی فنا نہ کر دین جو نباتات کی زندگی اور نشو و نما کا ذریعہ ہین،

رنگ کا اثر صحت پر

صحت پر رنگون کا خاص اثر پڑتا ہے، چنانچہ امریکہ مین بہت سے شفاخانے قائم ہین، جو صرف ان امراض کا علاج کرتے ہین جو رنگون سے پیدا ہوتے ہین، دماغی امراض کے اطبار خصوصی کا خیال ہے کہ جو بچے سفید رنگ کے دیکھنے کے عادی ہوتے ہین ان کے جسم و دماغ ان بچون سے زیادہ صحیح ہوتے ہین جو سیاہ اور میلے رنگون کے دیکھنے کے خوگر ہوتے ہین، ان اطبار کا خیال ہے کہ اکثر مجنون وہی لوگ ہوتے ہین جو بچپن مین سیاہ رنگ دیکھنے کے عادی تھے،

عالمگیر گھڑی

سوئٹزرلینڈ کے ایک انجینیر نے ایک بڑی گھڑی بنائی ہے جو درحقیقت تیرہ گھڑیون کا مجموعہ ہے اس سے دنیا کے مختلف تیرہ صوبون کے اوقات معلوم ہو سکتے ہین،

چور پکڑنے والا آلہ

ایک فرانسیسی موجد نے ایک فوٹوگرافی کا ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو خزانون یا زیورات اور جواہرات کے صندوقون مین ایک مخفی مقام پر رکھدیا جاتا ہے اور جو شخص خزانہ یا ان صندوقون کو کھولتا ہے، خود بخود اُنکی تصویر کھینچ لیتا ہے، اس طریقہ سے جو لوگ چوری کرتے ہین، ان کی شناخت مین آسانی پیدا ہو گئی ہے،

ہوائی جہاز کی آواز میں کمی،

جو لوگ ہوائی جہازون مین سوار ہوتے ہین، وہ ان کی آواز سے سخت پریشان ہوتے ہین لیکن اب ایک جرمن انجینیر نے اس آواز کی شدت مین اسقدر کمی پیدا کردی ہے کہ کان اسکو برداشت کرسکتے ہین،

ہوا مین کتابت،

جب کوئی شخص کوئی فعل عبث کرتا ہے تو بطور تمسخر کے کہا جاتا ہے کہ وہ پانی یا ہوا پر لکھتا ہے یعنی ایک ایسا کام کرتا ہے، جس کا کوئی نتیجہ نہین، لیکن اب ایک ایسا برقی چراغ ایجاد کیا گیا ہے، جس سے فضا کے بادلون پر حروف لکھے جاسکتے ہین، چنانچہ انگلستان مین ایک کمپنی قائم ہوئی ہے، جو اس سے فائدہ اٹھا کر فضا مین تجارتی اعلانات اور سیاسی خبرین شائع کرنا چاہتی ہے،

نظر نہ آنے والی روشنائی،

حال مین یہ معلوم ہوا ہے کہ جنگ عظیم کے زمانہ مین جرمن اسیران جنگ اپنے خطوط مین ایک ایسی روشنائی استعمال کرتے تھے جو نظر نہین آتی تھی، اور اس طریقہ سے وہ پہلے معمولی کاغذ پر جنگ کے متعلق راز کی باتین، اور جاسوسانہ خبرین لکھتے تھے، پھر اسی تحریر کے اوپر معمولی باتین لکھدیتے تھے، اور سنسر ان کو پڑھ کر خط بھیجنے کی اجازت دیدیتا تھا، لیکن جب وہ خطوط جرمنی مین پہنچتے تھے تو اہل جرمن ان کو بعض شعاعون کی روشنی مین پڑھتے تھے، اور وہ مخفی تحریریں ان کو نظر آجاتی تھی،

"ع"

ادبیات

یادِ دہی

از حکیم الشعراء امجد حیدرآبادی،

موزون نہین گر نغمہ تو فریاد سہی
کچھ بھول گیا ہون مین یہی یاد سہی

جب زینتِ دنیا سے، مرا گھر بھر جائے
جب حرص وہوا کی مے سے، ساغر بھر جائے

احباب بھی ہون، لطف کا سامان بھی ہو
جب عطر بھی ہو، ڈلی بھی ہو، پان بھی ہو

دلچسپ فضا ہو، چاندنی رات بھی ہو
اک ماہ جبین کے ہاتھ مین ہات بھی ہو

جب ناچ بھی ہو، راگ بھی ہو، رنگ بھی ہو
روئی بھی ہو، چقماق بھی ہو، سنگ بھی ہو

جب اڑتے ہون قہقہے ہر اک تال کیساتھ
جب طبلے پہ پڑ رہے ہون قوال کے ہاتھ

جب ہر دل مردہ شادمان ہو جائے
جب گھر مرا، کشتِ زعفران ہو جائے

جب مجھکو جہان کے خزانے مل جائین
سارے عالم کے کارخانے مل جائین

جب ہو یہ خیال، "خاک پر کون چلے"
ہو سونے کی اینٹ میرے پاؤن کے تلے

قدمون کا نشان نقشِ تسخیر بنے
لون خاک بھی ہاتھ مین تو اکسیر بنے

جب پھولون کی سیج پر مجھے نیند نہ آئے
جب میرا دماغ عرشِ اعلیٰ بنجائے

کر دے اس وقت، باخبر اے مولا
بس یاد دلا دے اس قدر اے مولا

"بس اتنے ہی نشہ مین یہان چور ہے تو
اصلی ارام سے ابھی دور ہے تو"

۲

جب ٹوٹ پڑے پہاڑ غم کا سر پہ
باقی رہے جب نہ زور، زور و زر پہ

اس وقت، کہ رہنما ہی رہزن بنجائے
اس وقت، کہ خاص دوست دشمن بنجائے

تنکے کا غریق کو سہارا نہ ملے
ظلمت کدۂ دہر مین تارا نہ ملے

اعصاب، حصار کرب مین گھر جائین
اسوقت، کہ غم سے پتلیان پھر جائین

جب جل اٹھے غم سے تن کا ذرہ ذرہ
قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا

خونِ جگر

از حضرت جگر مراد آبادی

یون بھی مجھے تو حاصل آرامِ جان نہین ہے
اب تو جو مہربان ہے، دل مہربان نہین ہے

جو داستان ہے اپنی افسانہ ہے کسی کا
شاید مرے دہن مین میری زبان نہین ہے

جو کچھ مین دیکھتا ہون، میری نظر سے دیکھو
عین مشاہدہ ہے، وہم و گمان نہین ہے

ہان اے جمالِ جانان اک اور بھی تجلی
دنیا مری نظر مین ابتک جوان نہین ہے

شاید تری نظر سے کچھ راز دل سمجھ لون
کہتے ہین عشق جسکو میری زبان نہین ہے

غم نے بنا دیا ہی ماتم گسار سب کا
اب کسکو پوچھتے ہو، کوئی یہان نہین ہے

ہر لحظہ کہہ رہا ہے یہ انقلابِ فطرت
یعنی جہان ابھی تھی، دنیا وہان نہین ہے

تیرے کرم کے صدقے کرنے ستم بھی شامل
دل شادمان ہے لیکن غم شادمان نہین ہے

بالتقریظ والانتقاد

اردو کے نئے رسائل و اخبار

اردو کے نئے رسالوں اور اخباروں کے متعلق معارف کی یہ روش سالہا سال سے قائم ہے کہ وہ ہر چھ مہینے پر نئے رسالوں اور اخباروں کو یکجا طور پر ناظرین سے روشناس کرتا ہے، اور ہر مرتبہ ان نئے پرچوں کی تعداد اسقدر ہوتی ہے، کہ آٹھ دس صفحے انکی نذر ہو جاتے ہیں، اور یہ ظاہر نظر یا اردو زبان اور اردو صحافت کی ترقی کی ایک روشن دلیل ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان پر حقیقی مسرت کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، کہ اولاً تو ان میں بیشتر تعداد ایسے پرچون کی ہوتی ہے جنکا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ ادبی" ہیں، اور ادب کا مفہوم اس میں منحصر ہے کہ چند بے معنی اور لغو افسانے چھاپ دیئے جائیں، چند سطروں میں "ادب لطیف" لکھ دیا جائے جو غیر مربوط خیالات، مغلق ترکیبوں، اور بے ڈھنگے لفظوں کا مجموعہ ہو، اور جنمیں بے معنی اور غیر ضروری نقطے اور لمبی لکیریں دیدی گئی ہوں اسی طرح چند غزلیں اور نظمیں چھاپ دیجائیں، خواہ موزون ہوں یا نہ ہوں، تقطیع درست ہو یا نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسے رسالے اپنی زندگی کے کتنے دن پورے کر سکتے ہیں، وہ جلد ہی فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں، اور پھر جو زندہ بچ رہے، وہ سسکیاں لے لے کر اپنی زندگی کے دن پورے کرتے رہتے ہیں، چند دن مضمون نگار سے رسل و رسائل رکھ کر رسالہ جاری کئے رہے، بالآخر مضمون نگار بھی مضامین کہانتک بھیجیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اردو ہی کے پرانے رسالوں کے مضامین نقل کرنے پر اتر آتے ہیں، یہانتک کہ لوگ نہ صرف رسالوں کے پرانے فائلوں سے بلکہ مستقل مجلدات اور تصنیفات سے صفحے کے صفحے نقل کرکے اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں، سرقہ کے ان واردات کا یہ عالم ہے کہ اردو کے مشہور ارباب کمال کے مضامین بھی جنپر ہر لکھے پڑھے کی نگاہ بالعموم ہوتی ہے، دوسرے کے ناموں سے چھپ رہے ہیں۔ ہمارے بعض احباب نے رسائل کے ان واردات کا ایک نقشہ تیار کیا ہے، جو حد درجہ عبرت انگیز ہے

اردو صحافت کی یہ صورتِ حال، ہماری زبان کے دردمندون کے لیے لائقِ غور ہے، خصوصًا ہم ان علم دوست اور ادب نواز اصحاب سے جو کسی نئے رسالے کے نکالنے کے آرزومند ہون، یہ درخواست کرتے ہین کہ اس اقدام سے پہلے وہ خود اپنے دست و بازو کو تول لیا کرین کہ اس بوجھ کو کہان تک اٹھا سکتے ہین،

اس ششماہی مین بھی حسب معمول اسی تعداد مین پرچے نکلے ہین، لیکن اس مرتبہ یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ ان مین خالص "ادبی" پرچون کی تعداد بہت کم ہے، اکثر پرچے اپنا کوئی نہ کوئی مفید مقصد سامنے رکھکر نکلے ہین، اور جو ادبی پرچے ہین ان مین بعض ہندوستان کے ایسے دور دراز صوبون سے نکلے ہین، جنکا مقصد اردو کی واقعی خدمت ہے،

یہ سب نئے رسالے مختلف قسم کے مذہبی، اصلاحی، اقتصادی، تعلیمی، ادبی اور طبی ہین، جو بہ ترتیب درج ذیل ہین،

اصلاح لکھنؤ (ماہانہ) مرتبہ مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب، ندوی نگرامی، حجم ۴۰ صفحے، معارف سائز قیمت سالانہ ۲ روپیہ ۸ آنہ، بادشاہ باغ، لکھنؤ،

"اصلاح" لکھنؤ کا وہی دینی و تبلیغی و اصلاحی رسالہ ہے، جس کا ذکر کسی گذشتہ مہینہ کے شذرات مین آچکا ہے، یہ گذشتہ مہینہ سے شائع ہونا شروع ہوگیا ہے، اسکی سرپرستی حضرت الاستاذ مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولٰنا عبدالماجد صاحب دریابادی اڈیٹر سچ نے قبول فرمائی ہے، پہلے نمبر مین مولٰنا عبدالماجد صاحب بی اے دریابادی نے "ارادۂ اصلاح" کے عنوان سے اس کا افتتاحیہ لکھا ہے، ان کے علاوہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین، مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی نگرامی، مرتب رسالہ، اور جناب محمد احسن صاحب نگرامی ایڈوکیٹ رائے بریلی کے مذہبی مضامین ہین، اس کا سب سے دلچسپ باب قبولِ اسلام کا ہے، جس مین ہرماہ کے نئے اسلام قبول کرنے والون کی فہرست مع وجوہ قبول اسلام شائع ہوتی رہیگی، اس رسالہ کا اصل مقصد مسلمانون مین سعی اصلاح اور غیرون مین دعوتِ حق کا فرض انجام دینا ہے، امید ہے کہ دردمند مسلمان اس پرچہ کی خدمت اپنی سعادت

حاشیہ صفحہ ماقبل، [۱] مولٰنا شبلی کا مقالہ "موبدان مجوس ہندوستان مین" الندوہ مین چھپا تھا، اور "رسائل شبلی" مین موجود ہے، وہ لاہور کے رسالہ "یادگار" بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ء مین جناب احسان میان آفتاب احمد صدیقی کے نام سے شائع ہوا ہے، رسالہ یادگار اسی سال جنوری سے نکلا ہے اور رسائل کے پچھلے تبصرہ مین ان صفحات مین اس کا ذکر آیا تھا،

سمجھکر اس کو اپنے پاؤن پر کھڑے ہونے کا موقع دینگے،

ترجمان القرآن، حیدرآباد، دکن، (ماہانہ) اڈیٹر مولنا سید ابو الاعلی صاحب مودودی، ۲، صفحے، لکھائی چھپائی، کاغذ اور تقطیع معارف جیسی، قیمت سالانہ صہ، پتہ:- دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد دکن،

حیدرآباد، دکن مین مولوی ابو محمد صاحب مصلح بھسراہی کی کوششون سے ایک انجمن تحریک قرآن" قائم ہوئی ہے، جس کا مقصد تعلیمات قرآنی کو عام کرنا ہے، اس انجمن نے چند ماہ گذرے ایک ماہانہ رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا تھا جس کی حیثیت محض مختصر تبلیغی رسالہ کی تھی، اب وہی رسالہ دو مہینون سے نئے آب و تاب اور ظاہری و معنوی ترقی کیساتھ مولنا سید ابو الاعلی صاحب مودودی، مصنف الجہاد فی الاسلام کی ادارت مین نکلنے لگا ہے، اس کا مطمح نظر تعلیمات قرآنی کو احادیث و آثار کی روشنی مین رکھکر، دور حاضر کے اسلوب بیان مین پیش کرنا ہے، دور حاضر مین ہندوستان کے مختلف گوشون سے، "حسبنا کتاب اللہ" کی صدائین بلند ہو رہی ہین، اور حامل وحی کے اقوال و آثار اور اسکی شمع فیض کے پروانون کے بیانات اس لئے رد کئے جا رہے ہین کہ "مفکرین" کے غور و فکر اور عقل کی میزان پر وہ پورے نہین اترتے، حالانکہ وہی ارباب فکر اپنے دنیاوی معاملات مین تعزیرات کی دفعات کے سمجھنے مین اسکی شرحون سے کام لیتے ہین اور تعیین مفہوم مین عدالت عالیہ کے فیصلون سے نظیر لاتے ہین،

اس بے راہروی کو روکنے کے لیے ایک مستقل ترجمان کی ضرورت تھی، مسرت ہے کہ رسالہ ترجمان القرآن اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عالم وجود مین آیا ہے، اسوقت تک اس رسالہ کے دو نمبر چھپ چکے ہین، جو اپنے مضامین کی نوعیت، لب ولہجہ کی متانت، مباحث کی دقت، اور رائے کی اصابت مین اسی صراط مستقیم پر گامزن ہے، جسے اِنّ ہٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ، کہا گیا ہے، رسالہ کے مرتب نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ تعلیمات قرآنی یا دوسرے نقطون مین عقائد اسلامی کے متعلق جو شکوک و شبہات پیش کیے جائین گے، ان کے جوابات بھی درج ہونگے،

بشریٰ، مدراس (ماہانہ) اڈیٹر مولنا ابو الجلال ندوی، و مولنا عبد الرزاق (فاضل دیوبند)

حجم ۸۴ صفحے، قیمت سالانہ سے ر، مقام اشاعت نمبر ۱۳ کتابت خان اسٹریٹ، مونٹ روڈ، مدراس،

"بشریٰ" صوبہ مدراس کا واحد ماہانہ اردو رسالہ ہے، جو ماہ جنوری ۱۹۴۳ء سے نکلنا شروع ہوا ہے کارکنان رسالہ کے پیش نظر مدراس مین اسلام کی خدمت ہے، مضامین مذہبی، تاریخی اور علمی ہر قسم کے مفید اور دلچسپ ہوتے ہین اسیاسیات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے، مذہبی مضامین غور و فکر اور تلاش و تحقیق سے لکھے جاتے ہین، تاریخی مضامین کا معیار بھی کچھ پست نہین، مذہبی و معاشرتی اصلاح کا ذریعہ افسانون کو بھی بنایا ہے، خدا کرے کہ کارکنان رسالہ اسے ثبات قدمی سے جاری رکھ کر مدراس مین مذہب، معاشرت اور زبان کی مفید خدمات انجام دیتے رہین،

محدث، دہلی (ماہانہ) مدیر مولوی عبدالحلیم صاحب ناظم، حجم ۱۶ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اچھی

پتہ:۔ دارالحدیث، رحمانیہ، دہلی،

مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے کارکنون نے یہ مختصر رسالہ محض افادۂ علم کے لیے جاری کیا ہے، جسمین چھوٹے چھوٹے مذہبی، اصلاحی، اور تبلیغی مضامین درج ہوتے ہین، نیز مدرسہ کے کوائف بھی شائع ہوتے ہین، کارکنون نے رسالہ کی کوئی قیمت مقرر نہین کی ہے، صرف ۸ ر کے ٹکٹ ڈاک کے محصول کیلئے بھیجکر سال بھر تک رسالہ جاری کرایا جاسکتا ہے،

مالیات: پٹنہ، (ماہانہ) اڈیٹر جناب سید حفظ الرحمن صاحب، حجم ۴۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ

قیمت سالانہ سے ر، دفتر اشاعت دی پریمیر جنرل انشیورنس کمپنی لمیٹڈ، پٹنہ،

صوبہ بہار مین چند نوجوان ہمت اصحاب کی کوششون سے ایک بیمہ کمپنی "دی پریمیر جنرل انشیورنس کمپنی لمیٹڈ پٹنہ" کے نام سے قائم ہوئی ہے، رسالہ مالیات اسی کمپنی کا آرگن ہے، صوبہ بہار کے مخلص رہنما جناب قاضی احمد حسین صاحب سابق ام ال سی، رسالہ کے سرپرست اور اس کمپنی کے جنرل منیجر جناب سید محمد جلیل صاحب رسالہ کی پالیسی کے نگران ہین، رسالہ کا دائرۂ عمل "بینکنگ، تجارت اور بیمہ" کے مباحث ہین، اسکا پہلا پرچہ بابت ماہ اپریل ۱۹۴۳ء نظر سے گذرا، مضامین کی ترتیب اچھی ہے، اولاً "خیالات" کے عنوان سے مالی اور تجارتی مسائل پر نقد و نظر ہے، پھر بینک، بیمہ، تجارت، مالیات، اور بعض تجارتی کمپنیون، بنکون اور ایجنسیون کے طریق کار ان کے افادی پہلو، مضرات کے

امکانات، اور بعض بنکوں اور کمپنیوں کی تاریخ و سرگذشت پر مضامین ہین، مضامین سطحی اور اچھے دونون قسم کے ہین بعض مضامین مین تشنگی باقی رہگئی ہے، اسی طرح ضرورت ہے کہ رسالہ کو مذہبی مباحث سے بچایا جائے، اور کسی فرد یا جماعت پر نکتہ چینی کرنے مین اس کے حدود ایسے قائم رکھے جائین کہ پیرایۂ بیان دلآزار نہ ہو، اگرچہ اکثر مضامین کا انداز بیان شگفتہ ہے، لیکن بعض جگہ صحت زبان کی خامی ہے، اسی طرح لکھائی کی غلطیان بھی ہین، رسالہ مصور ہے، لیکن پہلے ہی پرچہ مین اپنی آپ تصویر چھاپنا کچھ موزون نہین معلوم ہوتا،

بہرحال یہ خردہ گیریان ہین، اور لائق اعتنا بھی نہ ہوتین، اگر ہمین ذاتی طور پر رسالہ کی ترقی کی آرزو نہ ہوتی کہ سرزمین بہار اردو صحافت کے لیے نہایت شور واقع ہوئی ہے، اور یہ ایک اچھا خاصہ ایسا معیاری رسالہ وہان سے نکل آیا ہے، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے یک گونہ اردو زبان مین منفرد ہے، ہمین جناب قاضی سید احمد حسین اور سید محمد جلیل صاحب کی توجہ اور ہمت سے توقع ہے کہ یہ رسالہ اپنا مستقل وجود قائم کرلیگا،

مدرس امروہہ (ماہانہ) مدیر جناب محمد نبی خانصاحب قادری، حجم ۳۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ

پتہ:۔ امروہہ، مرادآباد، یوپی،

مدرس، انجمن اصلاح مسلم مدرسین یوپی کی سرپرستی مین نکلا ہے، مختصر تاریخی اور ادبی مضامین کے علاوہ تعلیمی مسائل پر بھی مضامین ہوتے ہین، ایجوکیشنل کوڈ یوپی کا اردو ترجمہ اس رسالہ مین بالاقساط چھپ رہا ہے،

معصوم رنگون، (ماہانہ) نگراں جناب ایم۔ اے مائت صاحب، ایم اے، حجم ۳۲ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت سالانہ عہ پتہ: مکان نمبر ۶۷، گلی نمبر ۲، رنگون، (برما)

رسالہ معصوم ہندوستان کے اس دور دراز صوبہ سے نکلا ہے، جسے آجکل جغرافی و سیاسی وجوہ سے ہندوستان سے الگ کئے جانے کی کوششین بھی ہو رہی ہین، اور یہ دراصل زبان اردو کی مقبولیت کی ایک بڑی نشانی ہے، رسالہ چھوٹے بچون اور بچیون کے لیے ہے، اور انہی کے لائق مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہین، مضامین پر از معلومات اور سبق آموز ہوتے ہین، رسالہ ایک سال سے کامیابی کےساتھ جاری ہے،

زبان ہند کراچی (ماہانہ) اڈیٹر جناب ہرگوبند پرشاد نگم ایم اے، دہلوی، حجم ۵۰ صفحے، قیمت سالانہ ؎ ر

پتہ:- جونا مارکیٹ، کراچی، (سندھ)

"زبان ہند" سندھ کا غالباً واحد اردو رسالہ ہے، جو ایک باہمت ہندو اہل قلم کی ادارت میں اس مقصد
...د کیساتھ نکلا ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہے، اسلئے اسکو بلا تفریق مذہب و ملت سب میں
...ج کرنا چاہئے، اس کا پہلا نمبر بابت ماہ جنوری ۳۳ء سامنے ہے، اس میں جناب روشن صدیقی امروہوی نے
سندھ میں اردو" کو دکھایا ہے اور ولی، ضیاء الدین ضیا اور باقر تہید کے اشعار پیش کرکے اردو زبان کی تعمیر میں صوبہ سندھ
...حصہ کو نمایان کیا ہے، دوسرے مضامین بھی اچھے خاصے ہین، ضرورت ہے کہ اس رسالہ کو زندہ رکھا جائے کہ سندھ
...ن اردو کی مفید خدمت انجام پائے،

افسانہ لاہور (ماہانہ) حجم ۴۸ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت سالانہ ؏ ر پتہ:- پوسٹ بکس نمبرہ۲ لاہور

"افسانہ" اسم بامسمّی ہے، اس کے دو پرچے دیکھنے مین آئے، اسکو آنریبل کپتان سر سردار سکندر حیات خان کی سرپرستی
...ل ہے، شاید اسی مناسبت سے اس کے پہلے پرچہ مین ملک کے اکابر اور مشاہیر ادب کے بکثرت پیغامات افسانہ
...استقبال مین شائع ہوتے ہین، رسالے کے پہلے پرچہ کے مدیر جناب نذیر نیازی بی اے تھے، لیکن دوسرے پرچہ سے
...لی ادارت جناب ملک محمد اسلم خان ایم اے، (کیمبرج)، بیرسٹرایٹ لا، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی اور
...اب سید عابد علی صاحب عابد ایم اے کے ہاتھون مین آئی ہے، مضمون نگارون کی فہرست مین ملک کے اچھے افسانہ
...یس پریم چند وغیرہ شامل ہین، اور مضامین مین افسانے یا افسانون پر تنقیدین ہوتی ہین اور افسانون مین یورپ
...مشہور افسانہ نویسون کے افسانون کے ترجمے زیادہ ہوتے ہین، توقع کیجا سکتی ہے کہ اگر رسالہ جاری رہا، اور اسی
...رح اسکو قلمی معاونین ملتے رہے تو ایک کامیاب ادبی رسالہ ثابت ہوگا،

میخانہ، لکھنو (ماہانہ) اڈیٹر جناب اسد انصاری، حجم ۴۰ صفحے، قیمت سالانہ ؏ ر پتہ:- پارچہ والی گلی لکھنؤ

"میخانہ" کچھ دنون پہلے جاری ہو کر بند ہو گیا تھا، اب نئے اہتمام سے پھر نکلا ہے، یہ ایک ادبی رسالہ ہے جسمین

چند غزلین اور چند افسانے ہوتے ہین، "میخانہ" کو ایک مجذوب صفت کہنہ مشق شاعر خواجہ عزیز (سابق ڈپٹی کلکٹر، حال ڈپٹی انسپکٹر مدارس یوپی) کی امداد حاصل ہوگئی ہے، اکثر پرچہ مین ان کا کلام نظر آتا ہے،

اقبال وزیرآباد (ماہانہ) مدیر جناب تبسم قریشی حجم ۴۸ صفحے قیمت درج نہین، پتہ:۔ وزیرآباد (پنجاب)

"اقبال" ایک ادبی رسالہ ہے، جو ڈاکٹر سر اقبال کے اسم گرامی سے معنون اور جناب خان بہادر نواب احمد یار خان دولتانہ، ام ال سی، کی سرپرستی مین جاری ہوا ہے، افتتاحیہ مین جو "اشارات" کے نام سے ہے، سیاسی مباحث پر بھی راے زنی کیجاتی ہے، مضامین نظم و نثر اچھے خاصے ہین،

معیار: کلکتہ (ماہانہ مصور) اڈیٹر جناب ڈاکٹر فیض قادری، و جناب ابراہیم شاہ، ۱۰۰ صفحے، قیمت سالانہ عہ ر،

پتہ:۔ ۳ امرتلین، کلکتہ،

یہ بھی ایک ادبی رسالہ ہے، جو مشرقی ہند مین اردو رسالون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نکلا ہے، بنگال کے شعراء اور ارباب ادب اردو کا تذکرہ اس مین خصوصیت سے ہوگا، پہلے پرچہ مین بنگالی زبان کے مسلمان شاعر قاضی نذر الاسلام کے سوانح اور ترجمہ کلام درج ہے،

علم و عمل لاہور (ماہانہ) اڈیٹر جناب کوبراج ہرنام داس بی اے، ۵۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ ر، پتہ:۔ بالمقابل اڈہ تانگہ، لوہاری، لاہور،

یہ ایک ادبی اور معاشرتی اصلاح کا رسالہ ہے، رسالہ کو دلچسپ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے، بعض مضامین دلچسپ اور مفید ہین

جوہر مرادآباد (ماہانہ) اڈیٹر جناب فاضل چغتائی، ۳۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ ر، پتہ:۔ ادبی محل، مرادآباد،

مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار مین "جوہر" کے نام سے ایک رسالہ اس سے پہلے نکل چکا تھا، اب اسی نام سے یہ دوسرا رسالہ نکلا ہے، اس کا چھٹا نمبر بابت ماہ اپریل ۳۳ء سامنے ہے، مضامین سطحی قسم کے ادبی ہین، ایک مضمون مولنا محمد علی پر بھی ہے، اور ایک صفحہ پر انکی ایک غزل انھین کے ہاتھ کی تحریر کے عکس مین شائع ہوئی ہے،

حاذق، دہلی (ماہانہ) مدیر جناب حکیم سید محمد حسن صاحب رضوی، و جناب حکیم سید عطاء الرحمن صاحب، ۴۸ صفحے

قیمت سالانہ عہ پتہ :- قرول باغ، دہلی،

یہ ایک طبی رسالہ ہے جسکو طبیہ کالج دہلی کے بعض فارغ التحصیل طلبہ نے فن طب کی خدمت کیلئے نکالا ہے، رسالہ کو طبیہ کالج کے بعض سابق اساتذہ کی قلمی امداد بھی حاصل ہے، رسالہ کی ترتیب اچھی اور مضامین گو مختصر مگر پڑھنے کے لائق ہین، اطبا و غیر اطبا دونون فائدہ اٹھا سکتے ہین،

تبصرۃ الاطبا، لاہور (ماہانہ) حجم ۴۲ صفحے، قیمت سالانہ سے پتہ :- فلیمنگ روڈ، لاہور،

رسالہ تبصرۃ الاطبا، پانچ چھ اڈیٹرون کی ادارت مین نکلاہے، اوران مین سے ہر ایک کو ممتاز القاب و انتسابات مثلاً "بقراط زمان" "حکیم حاذق" "ممتاز الاطبا" "زبدۃ الحکما" وغیرہ سے یاد کیا گیا ہے، مضامین مین طب قدیم و جدید دونون کے معلومات ہین،

اس ششماہی مین ذیل کے چند نئے اخبارات ہمین موصول ہوئے،

دستور، دہلی، (مصور ہفتہ وار) اڈیٹر جناب آزاد دہلوی، ۳۰ صفحے قیمت سالانہ سے، فی پرچہ ۲ر پتہ :- کوچہ چیلان، دہلی،

"دستور" دہلی سے، دہلی کے ہفتہ وار اخبار ریاست کے طرز اور اُسی تقطیع اور ترتیب پر نکلا ہے، یہ اخبار اس حیثیت سے قابل قدر ہے کہ سیاسیات مین اسکی رائے آزادانہ ہے، اسلامی حقوق کی صحیح نمایندگی کیساتھ وطن کی حقیقی خدمت بھی اس کے مدنظر ہے، اسی طرح اسکے افسانون علمی و تعلیمی مضامین، نظمون غزلون اور معلومات کے صفحے بھی اچھے اور پڑھنے کے لائق ہوتے ہین، جو مختلف مستقل عنوانون سے شائع ہوتے ہین، اس سے اردو کی اسلامی صحافت مین ایک مفید اضافہ ہوا ہے،

خادم کلکتہ (ہفتہ وار مصور) اڈیٹر جناب میر حشمت علی افضلی، حجم ۱۲ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰ قیمت سالانہ ہے ۱۲ فی پرچہ ار، پتہ :- نمبر ۹ گنگا دھر بابو لین، کلکتہ،

"خادم" کو سیاسی اخبار کہنے کے بجائے، ہفتہ وار رسالہ کہنا زیادہ موزون ہوگا، جس نے دین و دنیا کو اپنے دو گوشون مین یکجا کرنا چاہا ہے، ایک طرف مذہب کا حامی، زبان اردو کا خادم، اردو کے شعر و ادب کا ناقد ہے، اور دوسری طرف فلم اسٹیج کا مبلغ ہے، اس مین انہی موضوعات پر مسلسل اور مختصر مضامین، شذرے، اور افسانے

نکلتے ہین،

صداقت، سری نگر، (ہفتہ مین دوبار) اڈیٹر جناب عبدالرحیم ایم اے، ال ال بی، حجم ۸ صفحے، تقطیع ۲۰×۲۶/۴
قیمت سالانہ للعہ، ہر پرچہ ۲ ر پتہ:- سری نگر کشمیر،

صداقت "مسلمانانِ کشمیر کا ترجمان ہے، اس نے اپنا مسلک یہ بتایا ہے کہ وہ "تحریک کشمیر کا سچا حامی حکومت کشمیر کا بہترین مشیر، اور برادرانِ وطن کا معاون و مددگار ہوگا، مسلمانون کے حقوق کی پاسبانی کرے گا اور کشمیر کی مختلف قومون مین یگانگی اور اتحاد پیدا کرنے کی بھی کوشش کریگا،

الواحد، بجنور (ہفتہ وار) اڈیٹر جناب عبدالوحید صاحب، حجم ۸ صفحے، تقطیع ۱۸×۲۲/۲ قیمت سالانہ سے، ہر پرچہ ار پتہ:- الوحید پریس، بجنور، یوپی،

الواحد کے اجراء کا مقصد غیر فرقہ وارانہ طور پر ملک کی خدمت کرنا بتایا گیا ہے، اس کا ایک نمبر دیکھنے مین آ خبرون کا انتخاب معقول ہے، اور بعض مضامین بھی دلچسپ ہین، "ر"

رسالہ ندیم گیا

ندیم مشرقی ہندوستان کا واحد اردو ادبی مصور رسالہ ہے جو اپنی گوناگون خصوصیات کے باعث ہندوستا مین بالعموم اور صوبہ بہار مین بالخصوص بے حد قبولیت حاصل کر رہا ہے،

ندیم ہر ماہ

۷۰ صفحات کے بہترین مضامین کیساتھ جسین بلند پایہ مقالات، اخلاقی افسانے، اور پرکیف نظمین اور پیٹ بل ڈالدینے والے **مزاحیہ مضامین** ہوتے ہین، اچھے کاغذ بہترین لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوتا ہے، اس کے ہر پرچہ مین متعدد دلکش تصاویر بھی ہوتی ہین، ان خوبیون کے باوجود قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ محصولڈاک ذمہ نمونہ کا پرچہ ۶ر کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیے، **ملنے کا پتہ**:- دفتر ندیم گیا (صوبہ بہار)

مطبوعات جدیدہ

طلسم زندگی، تصنیف جناب بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، حجم ۳۰۰ صفحے،

قیمت :- صہ، پتہ :- منیجر ہمایون، المنظر، ۲۳ لارنس روڈ، لاہور،

میان بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، ایک ایسے خوش مذاق مغربی تعلیم یافتہ ہین، جنھین اردو ادب کا پاکیزہ مذاق عطا ہوا ہے، موصوف اپنی گوناگون مصروفیتون کے باوجود اپنے ادبی رسالہ ہمایون کو ایک رفتار سے چلا رہے ہین، جس کی ہر اشاعت مین ان کے قلم کی کوئی نہ کوئی گلکاری ضرور ہوتی ہے، وہ اکثر چھوٹے چھوٹے جملون اور فقرون مین اپنے لطیف خیالات اور غور و فکر کے انمول موتی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہین "طلسم زندگی" انہی گلہاے رنگارنگ کا ایک خوشنما اور دلآویز گلدستہ ہے، جو اپنی ظاہری و معنوی دونون حیثیتون سے دلفریب اور قابل قدر ہے،

یہ مختصر مضامین اپنی اپنی مناسبت سے مختلف عنوانون "مناظر" "صداے روح" "آئینۂ دل"، "جد و جہد" "سرگوشیان" اور "خیالات پریشان" مین منسلک کر دیئے گئے ہین، اور گویا ان مین سے ہر عنوان "طلسم زندگی" کا ایک مفتاح باب ہے، جس کا آغاز ایک ایک رنگین اور منقش صفحہ سے ہوتا ہے، کتاب دبیز آرٹ پیپر پر اس اہتمام سے چھپی ہے کہ شاید سعی جستجو کے باوجود ساری کتاب مین ایک داغ اور دھبہ نظر نہ آئے، اسی طرح مضامین کی مناسبت سے تقریبًا ۲۰، ۲۲، رنگین تصویرین ہین، جنمین سے اکثر مشہور نقاشون اور مصورون کے کمالات کی ممنون ہین،

لیکن ہمارے نزدیک کتاب کی اس ظاہری زیبایش و آرایش سے زیادہ لائقِ ذکر ایک مغرب پسند کی مشرق نوازی ہے، قلم مغربی ہے، مگر زبانِ قلم سے جو بات نکلی ہے، وہ مشرق کے خیالات مین ڈوبی ہوئی ہے، انہی چند سطری مضمونون مین مشرقی خیالات کی ترجمانی، مشرقی تہذیب کی ستایش، مشرق کے اخلاق و موعظت کے حکیمانہ اصول، اور مشرقی تہذیب و تمدن کی دلپذیر تصویر کا جلوہ نظر آتا ہے، نمونہ کے لیے "چند بند" اور چند بند (جدید اڈیشن)

اور نئی اور پرانی دنیا" دیکھیے، اسی طرح فطرت انسانی کی صحیح مصوری اور معاشرت انسانی کی صحیح نقاشی" بڑے آدمی" "رشتہ دار" اور "خوش قسمت کون ہے" وغیرہ مین نظر آتی ہے، اور پھر مناظر "صدائے روح" "آئینۂ دل" اور "جدوجہد" وغیرہ مصنف کے تخیلات کی بلندی، جذبات کی مصوری، انسانی فطرت شناسی اور روح کی پاکیزگی کی آئینہ دار ہین، اور اگر خردہ گیری کیجائے، تو خامیان کہان نہین، لیکن ایک بے داغ، صاف ستھری چھپی ہوئی کتاب پر خردہ گیریون سے دھبے لگانا شاید ذوق و لطافت کے بھی خلاف ہو،

سیرت رسول اللہ، تالیف جناب سید نواب علی صاحب رضوی، ایم اے، ایجوکیشن ممبر اسٹیٹ کونسل حجم ۲۹۲ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ قیمت قسم اول ۳ روپے قسم ثانی ۲ روپے، دار المصنفین سے مل سکتی ہے،

اس کتاب کے مؤلف ہمارے نئے تعلیم یافتون مین، اردو سیرت کے سب سے پہلے مصنف ہین، اب جبکہ موصوف کے علم و تحقیق کا مرتبہ پہلے سے بہت بلند ہو چکا ہے "سیرت رسول اللہ" کے نام سے ایک اور کتاب لکھکر پیش کی ہے، اس کی تالیف مین مؤلف نے سیرت کے قدیم ماخذون کے علاوہ یورپ کے اہم مخالفینِ اسلام کی ان تصنیفات کو بھی سامنے رکھا ہے، جو سیرت پر اس وقت تک لکھی گئی ہین، اور پھر اس طور پر اپنی تالیف مرتب کی کہ مخالفین کے اعتراضات بغیر الجھے ہوئے دفع ہون، اور اصل حالات آئینہ ہو جائین، اور اس طرح آنحضرت صلعم کی سیرت کے تقریبًا تمام ابواب نقد و نظر کے ساتھ اجمالًا روشناس کر دیئے ہین، اور سیرت کے مسائل مہمہ کو غور و فکر اور استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے، لیکن ضرورت تھی کہ مؤلف موصوف اسے اردو مین لکھنے کے بجائے انگریزی زبان مین لکھتے کہ انگریزی زبان مین ایسی سیرتون کی زیادہ ضرورت ہے، البتہ اس کا افسوس ہے کہ مصنف نے مخالفین کے اعتراض کے خوف سے سیرت کی بعض ایسی روایتون سے انکار کرنا مناسب سمجھا ہے، جنکو اب تک صحیح سمجھا جاتا رہا ہے، اور ان کی کمزوریِ تحقیق سے اب تک ثابت نہین ہوئی ہے، اگر یہ کتاب اس عیب سے خالی ہوتی تو بہت خوب ہوتی۔

زندگی، از جناب ملا رموزی، حجم ۲۱۳ صفحے تقطیع چھوٹی، قیمت ۸/ پتہ:۔ جناب غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چار کمان، حیدرآباد، دکن،

جناب ملا رموزی مزاحیہ مضمون نگاری مین خاصی شہرت حاصل کرچکے ہین "زندگی" انہی کے چند فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے، جو اکثر رسالون مین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہین، ابتدا مین ملا صاحب نے ایک دیباچہ منسلک کیا ہے، جس مین اردو زبان مین ظرافت نگاری" پر تبصرہ کیا ہے، ملا صاحب اپنے مضامین مین علاوہ اس حصہ کے جو "در مدح خود میگویم" کا مصداق ہوتا ہے، ہنسی ہنسی مین بعض کام کی باتین کہہ جاتے ہین، خصوصاً ان کی نظر گھریلو زندگی اور مجلسی معاشرت دونون پر رہتی ہے، اور اس لحاظ سے ان کی تحریر سے معاشرتی اصلاح کی خدمت بھی انجام پاتی ہے،

روح جذبات، حجم ۲۰۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت عہ رتبہ:- جناب عشرت رحمانی، دفتر رسالہ نیرنگ دہلی،

جناب اکبر حیدری، اردو کے روشناس ادیب اور شاعر ہین، ان کی چند نظمون اور غزلون کا مجموعہ "روح جذبات" کے نام سے شائع ہوا ہے، اکبر حیدری کی شاعری مین تخیل آفرینیان ہین، اور وہ جو کچھ کہتے ہین اسے وہ اپنے عزم و یقین اور ترتیب و توازن کے ساتھ پیش کرتے ہین، طریقۂ ادا سلیس اور سادہ ہے، مغلق اور بے معنی فارسی ترکیبین نظر نہین آتین، اگر خردہ گیری کیجائے تو خامیان بھی نظر آئینگی، ہمارے نومشق اردو شعرا، اس مجموعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہین، اکبر حیدری کی شاعری پر مجموعہ کی ابتدا مین چند اہل قلم کی دو دو لفظون مین تقریظین ہین، اگر اس مجموعہ کو ان دو لفظی تقریظون سے معرا رکھا جاتا تو مناسب ہوتا،

نظام الفوائد، حصہ اول و دوم، از مولوی ابو الحسن محمد صابر صاحب اعظمی، مدرسہ مظہر العلوم بنارس حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۰۳، و ۱۸۹ صفحے، قیمت ہر ایک کی ۲، مولف سے مل سکتی ہے،

نظام الفوائد، فارسی قواعد کا رسالہ ہے، حصہ اول مین صرف کے مسائل ہین، اور آخر مین پورا آمدنامہ نقل کیا گیا ہے، اور دوسرے حصہ مین نحوی مسائل درج ہین، مسائل کو سلجھا کر بیان کیا گیا ہے، اور متعدد مثالون سے واضح کیا گیا ہے، زبان آسان اور طرز ادا سہل ہے، رسالہ بچون کے پڑھانے کے لائق ہے،

" ر"

جناب ملا رموزی مزاحیہ مضمون نگاری مین خاصی شہرت حاصل کیچکے ہین "زندگی" انہی کے چند فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے، جو اکثر رسالون مین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہین، ابتدا مین ملا صاحب نے ایک دیباچہ منسلک کیا ہے، جس مین اردو زبان مین ظرافت نگاری" پر تبصرہ کیا ہے، ملا صاحب اپنے مضامین مین علاوہ اس حصہ کے جو" در مدح خود میگویم" کا مصداق ہوتا ہے، ہنسی ہنسی مین بعض کام کی باتین کہہ جاتے ہین، خصوصاً ان کی نظر گھریلو زندگی اور مجلسی معاشرت دونون پر رہتی ہے، اور اس لحاظ سے ان کی تحریر سے معاشرتی اصلاح کی خدمت بھی انجام پاتی ہے،

روح جذبات، حجم ۶۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۸ مرتبہ:- جناب عشرت رحمانی، دفتر رسالہ نیرنگ دہلی،

جناب اکبر حیدری، اردو کے روشناس ادیب اور شاعر ہین، ان کی چند نظمون اور غزلون کا مجموعہ روح جذبات" کے نام سے شائع ہوا ہے، اکبر حیدری کی شاعری مین تخیل آفرینیان ہین، اور وہ جو کچھ کہتے ہین اسے وہ اپنے عزم و یقین اور ترتیب و توازن کے ساتھ پیش کرتے ہین، طریقۂ ادا سلیس اور سادہ ہے، مغلق اور بے معنی فارسی ترکیبین نظر نہین آتین، اگر خردہ گیری کیجائے تو خامیان بھی نظر آئینگی، ہمارے نومشق اردو شعرا، اس مجموعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہین، اکبر حیدری کی شاعری پر مجموعہ کی ابتدا مین چند اہل قلم کی دو دو لفظون مین تقریظین ہین، اگر اس مجموعہ کو ان دو لفظی تقریظون سے معرا رکھا جاتا تو مناسب ہوتا،

نظام الفوائد، حصہ اول و دوم، از مولوی ابو الحسن محمد صابر صاحب اعظمی، مدرسہ مظہر العلوم بنارس حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۰۳، ۱۰۹ صفحے، قیمت ہر ایک کی ۲، مولف سے مل سکتی ہے،

نظام الفوائد، فارسی قواعد کا رسالہ ہے، حصہ اول مین صرف کے مسائل ہین، اور آخر مین پورا آمدنامہ نقل کیا گیا ہے، اور دوسرے حصہ مین نحوی مسائل درج ہین، مسائل کو سلجھا کر بیان کیا گیا ہے، اور متعدد مثالون سے واضح کیا گیا ہے، زبان آسان اور طرز ادا سہل ہے، رسالہ بچون کے پڑھانے کے لائق ہے،

"ر"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جلد ۳۲ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۳ء | عدد ۲،

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۸۲-۸۴
لاہور کا ایک فلکی آلات ساز،	"	۸۵-۹۵
وجود روح روحانیین کے نقطۂ نگاہ سے،	جناب محمد اصغر صاحب انصاری بی اے بھوپال،	۹۶-۱۰۴
"تاریخ خطیب بغدادی"،	نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی،	۱۰۵-۱۲۴
خسرو باغ کے مقبرے،	مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی، الٰہ آباد،	۱۲۵-۱۳۲
۶۴۲ء میں اسکندریہ کی تباہی اور اوسکے چشمدید حالات،	مولینا حاجی معین الدین صاحب ندوی مہتمم تالیفات ریاست رامپور،	۱۳۳-۱۴۰
دیوان نظامی کے قلمی نسخے،	جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی،	۱۴۱-۱۴۳
کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟	"س"	۱۴۴-۱۴۶
اسلامی فن تعمیر	"ع"	۱۴۶-۱۴۸
کوہ نور،	"ع ز"	۱۴۸-۱۵۱
اخبار علمیہ،	"	۱۵۲-۱۵۵
سوز و ساز،	حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی،	۱۵۶-۱۵۷
دقائق حقائق،	جناب مرزا عزیز صاحب فیضانی دلداپوری،	۱۵۷
مطبوعات جدیدہ،	"س"	۱۵۸-۱۶۰

شذرات

گذشتہ شذرات میں بعض غلطیاں رہگئی ہیں، جنکی اصلاح مناسب ہوگی، ورنہ آگے چل کر وہ شاید تاریخ کی غلطیاں نہ بنجائیں، مولٰنا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر وفات کے وقت یاد سے ستاون برس لکھدی گئی تھی، مگر اُنکے رفقاے خاص سے یہ معلوم ہوا کہ انسٹھ برس تھی، اسی شذرہ کے آخر میں "علم وحرفت" چھپ گیا ہے، حالانکہ وہ "علم ومعرفت" ہے، امید ہے کہ ناظرین اسکو قلم سے درست کرلینگے،

منشی محبوب عالم مرحوم کے تذکرہ میں یہ لکھا گیا ہے کہ وہ اردو کے پہلے روزانہ اخبار کے بانی اور اڈیٹر تھے، اس سے مراد مسلمانوں میں تھی، یعنی اردو کے پہلے اسلامی روزانہ اخبار کے وہ بانی اور اڈیٹر تھے، اردو میں منشی نولکشور لکھنؤ کا اودھ اخبار اُن کے اخبار سے پہلے نکلا تھا، اور اب تک نکل رہا ہے،

اسدفعہ احباب کے اصرار پر جلسۂ سیرت کے موقع پر بڑودہ جانا پڑا، اعظمگڈھ سے ۲ جولائی کی شام کو نکل کر لکھنؤ اور دہلی میں بارہ گھنٹے ٹھہر کر ۴ جولائی کی رات کو ۹ بجے بڑودہ کے دارالریاست میں پہنچا، اسٹیشن پر ریاست کے نمایندہ مسٹر کلکر اور دوسرے مسلمان احباب نے خیر مقدم کیا، ریاست کے مہمان خانہ میں ٹھہرنے کی جگہ ملی، دوسرے دن ہز اکسیلنسی دیوان بہادر کے زیر صدارت بڑودہ کالج کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد ہوا، میں نے اور دوسرے مسلمان اور ہندو مرہٹہ مقرروں نے اپنے اپنے انداز میں سیرۃ نبوی کے موضوع پر تھوڑی تھوڑی تقریریں کیں، تیسرے دن جمعہ کے روز شہر کی جامع مسجد میں بعد نماز میری ایک اور تقریر ہوئی،

بڑودہ ہندوستان کی بڑی ترقی یافتہ ریاستوں میں ہے، آج سے ۲۲ برس پہلے جب میں نے حضرۃ الاستاذ مرحوم کے زیر سایہ دینی انجمن اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تھا، تو یہاں آیا تھا، اس وقت وہاں کے مشہور مسلمان رئیس نواب صدرالدین خاں مرحوم جنکے صاحبزادوں سے میرے عزیزانہ اور برادرانہ تعلقات تھے، اور ہیں، زندہ تھے، مرحوم نے اس وقت اردو کا سب سے بڑا کتبخانہ جمع کیا تھا، اور جامع مسجد مذکور کی تعمیر ختم ہو رہی تھی، اب وہ ان کا اردو کتبخانہ اسی جامع مسجد میں انکے صاحبزادوں نے منتقل کر دیا ہے، مگر افسوس کہ وہ مقفل پڑا رہتا ہے، اور کسی کو اس سے استفادہ کی توفیق نہیں ملتی،

ریاست بڑودہ کی آبادی جو ۲۰ لاکھ ہے جس میں پانچواں حصہ مسلمانوں کا ہے، خود شہر کی ایک لاکھ کی آبادی میں بیس ہزار مسلمان ہیں، الغرض یہاں ۲۰ فیصدی مسلمان آباد ہیں، تاہم آپکو یہ سنکر افسوس ہوگا کہ یہاں ایک بھی خاص مسلمانوں کا اسکول نہیں، مجھے بتایا گیا کہ یہاں ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ ہے جس سے اسوقت تک گیارہ سو لڑکے کامیاب ہو چکے ہیں، مگر ان میں مسلمان صرف آٹھ دس تھے جنمیں سے تین ریاست سے باہر کے تھے، یہی سبب ہے کہ ۲۰ فیصدی اسلامی آبادی ہونے کے باوجود ریاست کی ملازمت اور مناصب اور عہدوں میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں ہے، مسلمان اپنی غفلت کا الزام ریاست پر ڈالتے ہیں کہ وہ ہماری تعلیم کیطرف توجہ نہیں کرتی، ہمکو بڑودہ کے بیدار مغز مہاراجہ کیساتھ جو حسن ظن ہے، اسکی بنا پر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ خود انکی ریاست کی بے توجہی سے وہاں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ بڑودہ کی ریاست کی تعمیر میں مسلمان امیروں اور سپاہیوں کی تلواروں کو بھی دخل ہے،

اگر لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جاسکتا ہے، تو بڑودہ کو کتبخانوں اور مدرسوں کا ملک کہا جاسکتا ہے، ریاست کے پورے طول و عرض میں متحرک کتبخانوں، مکتبوں اور مدرسوں کا جال پھیلا ہے اور گجراتی کی ابتدائی تعلیم ہندو مسلمان سب کیلئے جبری ہے، شہر میں ایک عام کتبخانہ ہے، ایک خاص سنسکرت کا مشرقی کتبخانہ ہے، ایک متحرک کتبخانوں کا مرکزی کتبخانہ ہے، یہاں کے کتبخانوں کی عمارت، ترتیب اور تقسیم سب امریکی نظام پر ہے، اور حق یہ ہے کہ آج تک یہاں سے بہتر طریق پر کوئی کتبخانہ نظر نہیں آیا، سب سے بڑے کتبخانہ کی الماریاں منزل بہ منزل لوہے کی چھڑوں اور تختوں سے بنائی گئی ہیں اور ہر منزل کی چھت دبیز شیشہ کی بنی ہے، تاکہ نیچے کی منزل میں بھی روشنی پہنچ سکے، اور کتبخانہ آتش زنی سے محفوظ رہے، اس وقت ریاست کے مرکزی کتبخانہ کے ماتحت پینتالیس بڑے اور آٹھ سو کے قریب چھوٹے کتبخانے ہیں، اور تقریباً ہر سال چار لاکھ کتابیں پڑھی جاتی ہیں،

بڑودہ سے بھروچ، اور وہاں سے راندیر، راندیر سے سورت، وہاں سے انکلشور، انکلشور سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے سورت ہو کر دہلی اور لکھنؤ کے راستہ سے ۱۶ رجولائی کو اعظم گڈھ واپسی ہوئی، ہر جگہ ایک دو تقریریں کرنی پڑیں، بھروچ دریائے نربدا کے کنارے وہ مقام ہے جہاں ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں بحر عرب کی راہ سے نربدا میں داخل ہو کر مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ پہنچا تھا، اسکے ساحل پر پہنچکر تاریخ کا وہ مرقع آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور بے اختیار چند مصرعے موزوں ہوگئے،

راندیر گجرات کے دیندار تاجروں کا مرکزی وطن ہے، یہاں کی مسجدوں کی شان و شکوہ کو دیکھکر اُن سندباد بحری و بری تاجروں کے

قصے یاد آگئے جنکا الف لیلہ میں ذکر ہے، مسجدیں ہیں اور اکثر بڑی مسجدیں شروع سے آخر تک سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی موزوں ترکیب سے بنائی گئی ہ
جامع مسجد، مسجد قوۃ الاسلام اور مسجد جیار واڑ بہترین مسجدیں ہیں، اور اپنی صفائی اور ستھرائی میں ہندوستان بھر میں بے نظیر معلوم ہوئیں، پانچ ہزار
آبادی ہے، مگر اسکے اندر بہترین میونسپلٹی بہترین سڑکیں اور ہر جگہ سڑک پر برقی روشنی کا انتظام ہے، مسجدیں برقی پنکھوں سے راحت رساں اور برقی روشنی سے
منور ہیں، ان ظاہری سامانوں کیساتھ باطنی حیثیت سے بھی یہ مسجدیں نمازیوں سے آباد نظر آئیں، نوجوان مسلمانوں کی ایک خاص مجلس ہے
ارکان باہمت ہیں، محفل اسلام نام ایک مجلس ہے جسنے اردو، عربی، انگریزی اور گجراتی کا اچھا خاصہ کتبخانہ جمع کیا ہے، ایک گوشہ میں ایک پرانا مزار
جو حسب دستور ایک گنبد کے نیچے چادروں اور غلافوں میں لپٹا ہوا، مزوروں کے جھرمٹ میں ہے اور جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ کسی تابعی یا تبع تا
بھروچ اور سورت اور راندیر میں ایسی مسجدیں نظر آئیں جنکی تاریخیں پانچویں صدی کی بتائی جاتی ہیں، اور کہیں دروازوں پر لکھی دکھی ہیں
میں ایک عربی مدرسہ محمدیہ بھی موجود ہے، جس میں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اسمیں قدیم عربی کیساتھ جدید عربی بھی سکھائی جاتی ہے،

ڈابھیل سورت سے ایک دو اسٹیشن بعد ایک گاؤں ہے جہاں کے دو تاجر ملکر اس ستارہ کو جو دیوبند کے نظام شمسی سے چند سال پہلے ٹوٹا تھ
اٹھالائے ہیں، ہر قسم کی عمارتیں، مسجد، کتبخانہ، مہمان خانہ، دار الحدیث اور دار الطلبہ غرض سب کچھ چند مخیر تاجروں کی فیاضی سے بے منت غیرے
کے عرصہ میں بنکر تیار ہوگئی ہے، صرف مدرسہ کی خاطر بجلی کی روشنی کا خاص اہتمام ہے، مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولنا سراج احمد صاحب، مولنا
صاحب اور دوسرے فاضل علما درس میں مصروف ہیں، اور تین سو کے قریب طالب العلم ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے زیر تعلیم ہیں
اور اردو کے مکتب الگ ہیں، جائے وقوع گاؤں سے باہر میدان میں ہے، خوش فضا منظر، سکون کا مقام اور اسٹیشن سے جسکا نام مرولی ہے
پانچ میل دور ہے، گجرات کے خاص طالب العلم بھی یہاں آرہے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ انشاء اللہ یہ چند سال میں گجرات کا دار العلوم ہو جائیگا

اس دور دراز سفر کے ہر مقام میں جو پایہ تخت دہلی سے سینکڑوں میل دور ہے، یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ہماری پچھلی اسلامی حکومت کے دھندلے نشان اب بھی
سے نمایاں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کے وہ پچھلے خاندان آباد ہیں جنکو سلاطین دہلی نے جاگیریں دے دیکر ہر جگہ بسایا تھا، اور تعلیم و تدریس یا قضا یا ہدایت و رہنمائی کی
جا بجا آباد کیا تھا، وہ اب تک اسی طرح آباد ہیں، انہیں سے ہر خاندان میں قلمی کتبخانوں کا سرمایہ پرانے تمدن کی یادگاریں ہیں، اور وہ آبادی میں امتیاز خاص رکھ
اور قصبہ میں قاضیوں اور عالموں کے خاندان آباد ہیں، جو اب تک اپنی حیثیت کو سنبھالے ہوئے ہیں لیکن تا کے؟ ضرورت ہے کہ یہ لوگ اپنے ماحول کی ضرورتوں کو سمجھیں اور زمانہ کے تقاضوں کو

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر — مدت سے اسے دور زماں میٹ رہا ہے،

مقالات

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز

ناظرین کو یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے ہم نے اپنے شذرات مین جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیوبر کے ایک خط کا ذکر کیا تھا، جسمین موصوف نے اپنے ایک فلکی کرہ کے بنانے والے ضیاءالدین محمد کا حال دریافت کیا تھا، ذیل مین ہم پہلے موصوف کا خط درج کرتے ہین، اور اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ پتہ لگ سکا ہے، اسکو حوالۂ قلم کرتے ہین، اس سلسلہ مین اگر کوئی صاحب علم کچھ نئے معلومات پیش کرین گے تو ہمارے شکریہ کا باعث ہوگا

نقل خط ڈاکٹر فان کلیوبر

"جناب محترم — میرا قصد ہے کہ ایک عربی کرہ کے متعلق جو برلن کے عجائب خانہ مین ہے کچھ لکھون، اس کرہ پر ایک تحریر ہے جس مین بنانے والے کا نام تاریخ، اور مقام درج ہے، اس تحریر کا عکس اس خط کیساتھ آپ کی خدمت مین بھیجتا ہون،

چاہتا ہون کہ اس کے بنانے والے کے متعلق تفصیلات معلوم کرون، کہ یہ کون شخص ہو؟ کیا کوئی معروف مہندس یا منجم ہے؟ کہان کا رہنے والا ہے؟ اس کا زمانہ کیا تھا؟ آیا اس نے اور بھی ایسے کرے بنائے کیے مین؟ اس کا کوئی تعلق آپکے ملک کے رئیس جے سنگھ سوائی سے تو نہین تھا جو خود بڑا نجومی تھا؟

یہان جو کتابین مجھے مل سکین ان مین ان باتون کا پتہ نہ چل سکا لیکن بعض ہندوستانی دوستون نے بتلایا کہ اگر آپ کو لکھون تو ضرور کچھ سراغ لگ سکیگا، مین بہت ممنون ہونگا اگر آپ براہ کرم اپنی معلومات

سے مجھے مستفید فرمائیں، مجھے بڑی ہی خوشی ہوگی اور یقین ہے کہ ایشیائی تمدن سے ہماری محبت اور شغف میں اس سے اضافہ ہوگا، اپنی سیاحتوں میں میں خود بھی اس تمدن کا دلدادہ بن چکا ہوں،

آپ کا

فان کلیو بر،

ضیاء الدین محمد اسطرلابی ہمایونی لاہوری

اسطرلابی عربی علم ہیئت کی درسگاہوں میں جو آلات فلکی عام طور سے استعمال کئے جاتے تھے، ان میں سب سے مشہور کرہ اور اصطرلاب ہیں، ان میں سے کرہ کی ضرورت صرف تعلیم میں پیش آتی ہے، وہ روزمرہ کے استعمال کی چیز نہیں، مگر اصطرلاب سے چونکہ آفتاب کا ارتفاع اور دوسرے ستاروں کا اندازہ لگاتے ہیں، اسلیے یہ ہیئت اور فلکیات کے عالموں منجموں اور جوتشیوں کے روزانہ استعمال میں آتا ہے، اور اسلیے یہ زیادہ متداول ہے، اور اسی بنا پر آلات فلکی کے بنانے والوں کا لقب بھی متاخرین میں اسطرلابی مشہور ہوگیا ہے، کہ کرہ کی نسبت "کروی" شخصیت کے بجائے شکل کی نسبت میں اصطلاحاً مستعمل ہے، اس لیے وہ کاریگر اور صناع کے نام کے لیے غیر موزون قرار دیا گیا ہے، اور "اسطرلابی" چونکہ اصطلاح میں کسی شکل کا نام نہیں، نہ ہیئت کی کسی اور اصطلاح سے متصادم ہے، اس لئے اس آلہ کی طرف انتساب سے فلکی آلات کے بنانے والے کا لقب بنایا گیا ہے،

ہمایونی یہ ہمایونی ہمایون کی طرف نسبت ہے، جو آل تیمور کے سلسلہ میں ہندوستان کے تیموری فاتح بابر کا جانشین تھا، سلاطین آل تیمور کو علوم ہیئت سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ المتوفی ۸۵۳ھ نے سمرقند میں مشہور رصدخانہ قائم کیا، جس میں اس عہد کے مشہور علمائے ہیئت قاضی زادہ رومی، غیاث الدین جمشید اور علی بن محمد قوشجی نے تحقیقات کیں، اور اس میں جو زیچ لکھی گئی اس کا نام زیچ الغ بیگی رکھا گیا، بابر نے اپنی تزک میں اس رصدخانہ کے کھنڈروں کا ذکر کیا ہے،

بابر کا بیٹا ہمایون جس کے نام کی طرف اصطرلاب کی نسبت ہے، نجوم و ہیئت کے علوم کا ماہر و عالم تھا، ملا بدایونی

نے منتخب التواریخ مین جو ۱۰۰۴ھ کی تالیف ہے ہمایون کے حال مین لکھا ہے،

" در علوم نجوم و ہیئت وسائر علوم غریبہ بے نظیر" (جلد اول ص ۴۶۰ کلکتہ)

فرشتہ مین ہے،

" در علم ریاضی علم مہارت می افراشت، مدار صحبتش با علما و فضلا بود، و ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد" (جلد اول، مقالہ دوم ص ۲۴۲ نولکشور)

بادشاہ نے ہیئت کا یہ فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا جو ہیئت کے تمام فنون اور رصد بندی مین ماہر تھے، (ان کا حال بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۳۱ مطبوعہ کلکتہ مین لکھا ہے)

عراق و ایران کے قیام کے زمانہ مین حکمت و ہیئت کے علوم کے دو نامور عالم ایک وہی الیاس اردبیلی مذکور اور دوسرے شیخ ابو القاسم جرجانی بادشاہ کے ساتھ تھے اور اسوقت بھی جب بادشاہ ہندوستان کا تخت کھوکر آوارۂ غربت تھا ان دونون دانشورون سے قطب شیرازی المتوفی ۷۱۰ھ کی فاضلانہ کتاب درۃ التاج کا جو فارسی مین حکمت نظری و عملی پر مشتمل ہے، درس جاری تھا (مآثر رحیمی ص ۶۱۲ جلد ا کلکتہ و اکبرنامہ دفتر اول ص ۲۴۲ نولکشور)

اکبرنامہ مین ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، ہمایون ایران کے سفر کے دوران مین جب تبریز پہنچا تو بیگ محمد آختہ بیگی نام اپنے ایک نوکر سے کہا کہ یہ پرانا شہر ہے یہان "کرہ" تلاش کرو، "کرہ" فارسی مین گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہین، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لیکر خدمت شاہی مین حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابان کو دیکھکر ہنس پڑا، ابو الفضل نے اس واقعہ کو ان لفظون سے شروع کیا ہے،

"چون بہ تبریز نزول فرمودند از آنجا کہ توجہ اقدس باصطرلاب و کرہ وسائر آلات رصدی در جہ کمال داشت ...... (ص ۲۴۱ نولکشور)

خود بادشاہ علما کی طرح ہیئت و ریاضی کا درس دیتا تھا، بادشاہ کے مصاحب خاص نور الدین ترخان سفیدونی (المتوفی سنہ ۹۹۳ھ) نے جو اس فن کے ماہر تھے، بادشاہ ہی سے اس فن کا درس حاصل کیا تھا، بدایونی مین ہے،

"ملا نورالدین ترخان نوری سفیدونی جاگیردار سفیدون از توابع سندھ در علوم ہندسی و ریاضی و نجوم و حکمت ممتاز و از اجلۂ مصاحبان ہمراز پادشاہ مغفرت پناہ بود" جلد ۳ ص ۱۹۶)

مآثر الامراء (جلد اول ص ۴۲۹ کلکتہ) مین مولنا نورالدین ترخان کے حال مین ہے:

"مولانا بفضل وکمال وشجاعت وسخاوت اتصاف داشت، و بہ ہیئت و ہندسہ و اصطرلاب شوق مند بود . . . . . . وصحبتش با جنت آشیانی (ہمایون) کوک گشتہ از جملہ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی گردید . . . . گاہے پادشاہ ازو استفادۂ علوم میکرد، و گاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ درین فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود"

بادشاہ کو ہیئت و فلکیات سے جو ذوق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی امیر البحر جو سلطان سلیمان خان کی طرف سے گجرات کے بندر سے پرتگیزون کو نکالنے آیا تھا، اور جسکا جہاز تباہ ہوا، اور اس کو بالآخر خشکی کی راہ سے ہندوستان، ایران اور عراق کے راہ سے اپنے ملک کو واپس جانا پڑا، اس نے اپنے سفرنامہ مرآۃ الممالک مین ہمایون سے ملاقات کے سلسلہ مین اس کے نجوم و فلکیات کے شوق کا تذکرہ کیا ہے، ہمایون چاہتا تھا کہ ترکی امیر البحر جو خود بھی فلکیات کا ماہر تھا، وہ ہمایون کے پاس سے نہ جائے، مگر امیر البحر مذکور نے جانے پر اصرار کیا، اس پر بادشاہ نے اس شرط پر رخصت دی کہ

"برسات کے تین مہینون کے گذرنے کے بعد جنمین راستے ناقابل گذر ہوتے ہین، مین جا سکتا ہون، اس اثنا مین چاند اور سورج کے گرہنون کا حساب کرتا رہون، اور وہان کے نجومیون کو آفتاب کی گردش اور خط استوا کے نکات کے پڑھنے مین مدد دون . . . . مین کام مین مصروف ہو گیا اور نجومی مشاہدات ختم کئے" (باب ہشتم ترجمۂ مرآۃ الممالک پروفیسر ویمبری)

ہمایون کی بہن گلبدن بیگم جس نے ہمایون کے حال مین ہمایون نامہ لکھا ہے، اس مین ایک موقع پر مذکور ہے کہ ہمایون نے خود ایک شادی کے لیے اسطرلاب اٹھا کر ستارون کی گردش معلوم کر کے تاریخ سعید مقرر کی،

"غرضکہ بعد از چل روز در ماہ جمید الاول ۹۴۸ھ در مقام پاتر روز دوشنبہ نیم روز بود کہ اسطرلاب را

حضرت پادشاہ بدست مبارک خود گرفتہ اند وساعت سعد را اختیار کردہ" (ص۵۳ لندن)

ہمایون کو ریاضیات اور آلاتِ ریاضی سے اسقدر انس تھا کہ اس کے رفیق سپہ سالار بیرم خان خانخانان نے اسکی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اسمین اصطرلاب سے تشبیب کی ہے،

مطلع قصیدہ کہ درباب اصطرلاب گفتہ[۱]

آن چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار — آن مرکز میانہ شہابش کند گذار
با آنکہ می کند مہ و خور برابری — آمد بکان ز حلقۂ گوشان شہریار
نارد بچشم کوکبۂ آفتاب را — چون ہیچۂ لوائے شہنشاہِ نامدار
پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست — ہمچون نگین خاتم شاہِ جم اقتدار
برکف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی — تا بر قدوم اشرف شاہان کند نثار
شاہِ بلند قدر ہمایون کہ از شرف — بر درگہش سپہر نہد روی افتقار

اس قصیدہ مین چرخ، محور، مدار، بدر، شہاب، ماہ، خور (آفتاب) حلقہ، آفتاب، آسمان، زمین، شرف سپہر۔ اسی فن ہیئت اور اصطرلاب کے اصطلاحات ہین،

عام طور سے مشہور ہے کہ ہمایون کتبخانہ کے زینہ سے گرکر مرا تھا، واقعہ یہ ہے کہ پرانی دہلی مین شیرشاہ نے شیر منڈل کے نام سے ۹۴۸ھ مین بہت بلند سہ منزلہ ایک عمارت بنوائی تھی، اسکی تیسری منزل پر ایک برجی بنی ہے جو تمام عمارتون سے اونچی ہے[۲]، بادشاہ نے اس عمارت کو غالباً اسلیئے کتبخانہ بنا دیا تھا، کہ یہ اونچی عمارت اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام دے، جس شام کو وہ گرا ہے اُس شام کو خیال تھا کہ ستارۂ زہرہ طلوع ہوگا، بادشاہ وہان ریاضی دانون کیساتھ مباحث مین مصروف تھا، اور سر شام زہرہ کے طلوع کا انتظار تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ بیٹھکر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور زخمی ہوا، اور اس زخم سے جانبر نہ ہوا، اکبرنامہ مین ہے'

---

[۱] بدایونی ج ۱ ص ۱۹۲ کلکتہ [۲] آثار الصنادید سر سید مرحوم ص ۱۵ نامی کانپور،

وآخر ہاے روز بر بالاے بام کتبخانہ رفتہ . . . . . جمعے از ریاضی دانان راطلب فرمودند

دآن شب مظنہ طلوع زہرہ بودمی خواستند کہ ملاحظہ فرمائیند، الخ

اس بادشاہ کے تمام کام فلکیات اور نجوم کے اصول پر ہوتے تھے، دربار کے دنون مین کامون کی تقسیم بھی علم نجوم کی مناسبت سے تھی، غیاث الدین خوندمیر نے ہمایون نامہ مین اور ابوالفضل نے اکبرنامہ مین ان دنون کی تقسیم اور انکے مناسبات نجومی کی پوری تفصیل کی گئی ہے[۱]، دربار اور خیمہ و خرگاہ کی ترتیب بھی فلکیات ہی کے اصول سے ہوتی تھی، دربار کے لیے خیمے ایسے بنوائے تھے، جو یونانی ہیئت کے نودن آسمانون کی پوری نقل تھے، ہر آسمان مین جو ستارے ہین، ان کے نمونے اسین بنے تھے،

ہمایون کو اس قسم کے اختراعات سے بڑی دلچسپی تھی ایک "بساط نشاط" بنایا تھا اس بساط مین فلکی دوائر اور کرات عناصر بنائے تھے، پہلا جو فلک اطلس کی طرف منسوب تھا، سپید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کی مناسبت سے صندلی، پانچوان مریخ کے تعلق سے لال، چھٹا آفتاب کی مناسبت سے سنہرا، ساتوان زہرہ کے سبب سے سبز، اٹھوان عطارد کے تعلق سے سوسنی، نوان چاند کی مناسبت سے سپید، اس کے بعد اربعہ عناصر کے نقشے تھے، ان مین سے کرہ خاک مین ساتون اقلیمون کے نقشے تھے، نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ اہل نجوم نے خاص کیا ہے، اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، اسی طرح بارہ برجون کا ایک خیمہ بھی بنوایا تھا، کئی جگہ رصد خانون کے بنانے کا ارادہ کیا، اور بہت سے آلات رصد ترتیب دیئے تھے[۳]، انھیں آلات رصد میں سے ایک اصطرلاب بھی ہے،

مارچ و مئی ۱۹۰۹ء مین یعنی آج سے چوبیس پچیس برس پہلے الندوہ مین مین نے "مسلمان اور علم ہیئت" پر ایک مضمون لکھا تھا، اس مین سب سے پہلی دفعہ مین نے ضیاء الدین ہمایونی اصطرلابی کا ذکر کیا تھا، اس سلسلہ مین مین نے لکھا تھا،

"ہندوستان مین اصطرلاب کا رواج ہمایون نے دیا، ہمایون علم ہیئت مین نہایت ماہر تھا، اُسنے ایک

---

[۱] اکبرنامہ نولکشور ص ۳۹۹ و مآثر رحیمی جلد اول ص ۶۰۹، کلکتہ [۲] دیکھو الیٹ کی تاریخ ہند جلد ۵ ص ۱۱۶، [۳] اکبرنامہ دفتر اول،

خاص طرز کا اصطرلاب بنایا تھا جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں، چنانچہ ندوہ کے کتبخانہ میں جو ایک قدیم

اصطرلاب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے "عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الٰہداد اصطرلابی

ہمایونی لاہوری سنہ ۱۰۵۹ھ"[1]

افسوس ہے کہ میرے اس مضمون میں اس بیان کا حوالہ مذکور نہیں، اس وقت ہر چند میں نے اس کے حوالے

جابجا کتابوں میں تلاش کئے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی ہے، علامہ غلام حسین جونپوری الموجود ۱۲۵۰ھ نے جامع

بہادر خانی میں لکھا ہے، کہ "صناعان متاخرین" نے اصطرلاب میں یہ اصلاحیں کی ہیں[2]، کیا عجب کہ ان متاخرین سے

اسی ہمایونی اصطرلاب کی طرف اشارہ ہو،

ہمایوں کی خدمت میں جو صناع فلکیات کے یہ آلے اور نقشے اور کرے بناتے تھے، ان کے نام تاریخوں

میں جگہ نہیں پاسکے ہیں، صرف ایک مولنا مقصود ہروی کا نام آئین اکبری میں ہے کہ

"از پرستاران جنت آشیانی (ہمایون) بود . . . . اسطرلاب وکرہ وسطرے چند چنان برساخت

کہ کاردیدگان رابشگفت درآورد" (ج ا ص ۱۳۱ نولکشور)

ضیاء الدین اوراسکا خاندان ضیاء الدین اور اس کے خاندان کا کوئی پتہ ہم کو ابتک تاریخوں اور تذکروں سے نہیں چلا ہے،

لیکن ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے بنے ہوئے کروں اور اسطرلابوں پر اس کے نام ونسب کا جو سلسلہ

لکھا ملتا ہے، اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ضیاء الدین کا پردادا الٰہداد ہمایوں کے عہد کا صناع تھا، اور جو ہمایونی طرق

کے کرے اور اصطرلاب تیار کرتا تھا، ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے حسب ذیل مصنوعات کا پتہ ہم کو ملسکا ہے،

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک اصطرلاب کلکتہ میں قاضی عبید الباری[3] کے پاس ہے، اس اصطرلاب پر حسب ذیل کتبہ ہے،

۱- عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الٰہداد اصطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۳۲ھ"

---

[1] الندوہ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء ص ۲۴ [2] جامع بہادر خانی ص ۵۰۱ کلکتہ، [3] یہ کلکتہ کے ایک پرانے خاندان کی یادگار ہیں، ان کے

اصطرلاب کی اطلاع پروفیسر محفوظ الحق پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجی ہے،

اسی اصطرلاب کے دوسرے گوشہ پر ہے: "۲۱ سنہ جلوس جہانگیری"

اس کا بنایا ہوا ایک کرۂ فلکی بانکی پور کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، اس پر یہ عبارت درج ہے،

۲- "صنعۃ اقل العباد قائم محمد ابن عیسیٰ ابن اللہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی" سنہ ۱۰۴۳

کرہ کی دوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے،

"تمت این کرہ مکمل مشتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب ثوابت کہ جمیع ازان چہل و ہشت صورت مرصودہ نمودہ اند، اہل (؟) علما و حکما، تنجیم چنانچہ مرصو در رصد مرزا الغ بیگ است، و بر تقویم ہر کوکب ثابتہ سہ درجہ زیادہ کردہ ایم بحساب حکما و علما این فن تا این تاریخ سنہ ۱۰۴۶ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے، ہر کوکب کے پاس چاندی کی کیل ہے، اور ہر برج کی شکل بھی بنی ہوئی ہے، اور برجون کے پاس اس طرح سے جڑی ہین کہ انکی شکلین متوہم ہوجاتی ہین،

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین محمد کے بنائے ہوئے حسب ذیل کرون اور اصطرلابون کا حال ہم کو معلوم ہوا ہے جنکو ہم سنہ کی ترتیب سے نیچے درج کرتے ہین،

۱- اس کی بنائی ہوئی سب سے قدیم صنعت ایک فلکی کرہ ہے، جو اس وقت پھلواری ضلع پٹنہ مین مولوی یوسف صاحب رضوی کے پاس ہے، یہ کرہ خالص پیتل کا ہے، اور ہر ستارہ کے پاس چاندی کی ایک کیل گڑی ہے تین پاؤ پختہ وزن ہے، اس خاندان مین یہ کرہ سنہ ۱۲۳۸ھ سے چلا آرہا ہے، کرہ پر حسب ذیل عبارت[1] نقش ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ، ابن ملا اللہداد، اسطرلابی، ہمایونی لاہوری، فی سنہ ۱۰۵۸ھ"

۲- اس کے بعد اس کی بنائی ہوئی دوسری چیز ایک اصطرلاب ہے، جو اس وقت ندوۃ العلماء کے کتبخانہ مین ہے، اس اسطرلاب پر نام و تاریخ اس طرح ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسی بن شیخ اللہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۵۹ ہجریۃ"

---

[1] اس کرہ کی واقفیت کے لیے ہم مولوی سید احمد عرف حج، ہاشمی، صدر منزل، ہندرو، پٹنہ کے ممنون ہین،

۳۔ اس کا بنایا ہوا دوسرا اصطرلاب نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتبخانہ (حبیب گنج ضلع علی گڈہ) مین ہے، اسکی عبارت اور تاریخ یہ ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد، اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۴ ہجری"

۴۔ اسی سال کا بنایا ہوا اسکا کرہ رامپور مین ایک حکیم صاحب کے پاس تھا اور جواب طبیہ کالج علی گڈہ مین ہے، اس کا حلقہ ٹوٹ گیا ہے، مگر کرہ سالم موجود ہے، اس پر یہ عبارت ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۴ھ"

۵۔ اس کی چوتھی فلکی یادگار وہ کرہ ہے جسکا حال ڈاکٹر کلو برنے ہم کو لکھکر اس کے فوٹو کے ساتھ بھیجا ہے، یہ کرہ ہے، جو اس وقت جرمنی کے پایہ تخت برلن کے عجائب خانۂ انسانی مین ہے، اس پر کتبہ یہ ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری، فی سنہ ۱۰۷۱ ہجری"

اس کے بعد ۱۰۷۴ھ کے بنائے ہوئے اس کے چار اسطرلابون کا حال ہم کو معلوم ہے جو اس وقت یورپ اور ہندوستان مین موجود ہین،

۶۔ ایک مولانا ابوبکر صاحب جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈہ) کے پاس ہے، یہ نسبتہً چھوٹا ہے، اور اس پر عبارت یہ ہے:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن شیخ الہداد، اسطرلابی، ہمایونی، لاہوری، فی سنہ ۱۰۷۴ھ"

۷۔ دوسرا ریاست رامپور کے شاہی کتب خانہ مین ہے، اس کے حروف کہین کہین سے گھس گئے ہین، جو پڑھے جاتے ہین وہ یہ ہین [1]،

[1] اس اطلاع کے لیے ہم مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی، نائب ناظم کتبخانۂ شاہی رامپور کے ممنون ہین،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد . . . فی سنہ ۱۰۴۲ھ"

۸ - اس سنہ کا تیسرا اصطرلاب وہ معلوم ہے جو سنہ ۱۹۳۱ء کے ایرانی فنون کی نمائش منعقدہ لندن (پرشین آرٹ اگزبشن) مین پیش ہوا تھا، اور جسکا ذکر نمائش مذکور کی مطبوعہ فہرست صفحہ ۱۹۳ مین موجود ہے، اس پر یہ عبارت کھدی تھی[۱]

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری' فی

سنہ ۱۰۴۲ ہجری"

فہرست مذکور کے مرتب نے الہداد کے نام کے پڑھنے مین غلطی کی ہے، اس ہندوستانی نام کو جو "الہ" اور "داد" کا مجموعہ ہے، اور جس کے معنی عطیۂ الٰہی کے ہین، "الحدّاد" پڑھا گیا ہے، جس کے معنی عربی مین "لوہار" کے ہین، اور پیتل کی صناعی کی مناسبت سے شاید یہ الحدّاد موزون سمجھا گیا ہے، مگر یہ صریحًا تحریف ہے،

۹ - اسی سنہ کا بنایا ہوا اسکا چوتھا اصطرلاب جو بہت بڑا ہے، بانکی پور لائبریری مین ہے، عبارت یہ ہے:

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۴۲ھ"

نتائج | اوپر کے معلومات اور کتبون کی بنا پر حسب ذیل نتیجے برآمد ہوتے ہین،

ان لوگون کا وطن لاہور (پنجاب) تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے، ضیاء الدین' اس کا باپ قائم محمد، اس کا باپ ملا عیسیٰ، اس کا باپ ملا شیخ الہداد، کتبون کی عبارت اور لفظ "ملا" کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صفت علم سے آراستہ تھے، بدایونی مین ایک شیخ الہداد لنگرخانی لاہوری کا حال ان لفظون مین ہے،

"منسوب بمحلہ ایست از لاہور (محلۂ لنگرخان لاہور کا ایک محلہ ہے) دراکثر علوم متداولہ ماہر و متبحر . . . . . وبدرس مشغول است، ہرگز بخانۂ ارباب بیمروت دنیا نرفتہ و از ملوک حاجت نخواستہ و مدد معاش نگرفتہ، عمرش قریب بہشتاد است۔"

بدایونی نے اپنی کتاب سنہ ۱۰۰۴ھ مین لکھی ہے، اس حساب سے ان شیخ الہداد کی پیدائش تقریبًا سنہ ۹۲۴ھ ہوتی ہے،

---

[۱] اسکی اطلاع بھی ہم کو پروفیسر محفوظ الحق نے دی ہے،

ور ہمایون کی حکومت کا زمانہ ۹۳۷ھ سے ۹۶۳ھ تک ہے، اس بنا پر یہ ہمایون کے سامنے پچیس تیس برس کے جوان ہونگے، تاہم ان کو وثوق کیساتھ ضیاء الدین کا پردادا شیخ اللہ داد نہین کہا جا سکتا،

ضیاء الدین اور اس کے بزرگون کے نامون کو سلاطین کے نامون کیساتھ ملانے سے یہ نسبت پیدا ہوتی ہے،

۱- شیخ اللہ داد،	۱- بادشاہ ہمایون (۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء - ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء)
۲- ملا عیسی	۲- بادشاہ اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء)
۳- قائم محمد	۳- بادشاہ جہانگیر (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء - ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء)
	۴- بادشاہ شاہجہان (۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء - ۱۰۶۸ھ/۱۶۶۵ء)
۴- ضیاء الدین محمد،	۵- بادشاہ عالمگیر (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ - ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء)

ان مین سے دو کی تاریخین ہم کو ملی ہین، اور وہ دونون اس قیاس کے مطابق ہین، قائم محمد کے پہلے اسطرلاب کی تاریخ ۱۰۳۴ھ سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری ہے، اس کے دوسرے کرہ کی تاریخ ۱۰۴۷ھ ہے، اس سے ثابت ہے کہ اس نے جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ پایا ہے،

ضیاء الدین کے پہلے کرہ پر ۱۰۵۸ھ اور آخری کامون پر ۱۰۷۴ھ منقوش ہین، جنسے اس کے عمل و صنعت کا زمانہ کم از کم سترہ برس تو بالیقین ہے،

ان لوگون کا اس کثرت سے آلات بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ علمائے مدرسین یا علم ہیئت کے عام شائق و ماہر نہ تھے، بلکہ پیشہ ور کاریگر تھے، ایک ایک سال مین کم از کم چار چار اصطرلاب یا کرے بناتے تھے، جیسا کہ ۱۰۶۴ھ مین اسکے ایک اصطرلاب اور ایک کرہ اور ۱۰۶۵ھ مین اوس کے چار اصطرلابون کا پتہ ہمکو معلوم ہے،

ڈاکٹر کلوبر کا یہ شبہہ کہ ضیاء الدین یا اس کے کرہ کو راجہ جے سنگھ سوائی کے رصد خانہ سے تو کوئی تعلق نہ تھا، بے بنیاد ہے، اس رصد خانہ کی تعمیر محمد شاہ کے حکم سے راجہ جے سنگھ رئیس جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ نے ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء مین کرائی تھی، یعنی برلن کے کرہ کی ساخت کے چھیاسٹھ برس بعد اور ضیاء الدین کے پہلے بنائے ہوئے کرہ (موجودہ پھلواری ضلع پٹنہ) کی ساخت کے انہتر برس بعد

وجودِ روح "روحانیین" کے نقطۂ نگاہ سے

از

جناب محمد اصغر صاحب، انصاری، بی اے بھوپال

(۲)

اہل سائنس کی تحقیق نے مادیین کے اس نظریہ کو بالکل ہی کمزور کر دیا ہے کہ اس عالم میں مادہ اور مادہ کے اشکال کے سوا کچھ نہیں ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم صرف مادہ ہی کے واسطہ سے اس کائنات سے باخبر ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ نتیجہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کائنات تمامتر مادہ ہی مادہ ہے یا مادہ اس کائنات کی اصل اول ہے اگر ہم نے ایسا خیال کر لیا تو اس کے معنی تو اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ ہم اصل محرک کو اسکی علامتوں اور نشانیوں سے خلط ملط کر دیتے ہیں، اسکی مثال تو یہی ہوگی کہ ایک مقناطیسی برق پیما کی سوئی کا پھرنا ہی دراصل برق کی حقیقت ہے، اگر ہم کو ایک لوہے کا ٹکڑا حرکت میں نظر آئے تو اس سے ایک مقناطیسی حلقہ (MAGNETIC FIELD) کا وجود تو ثابت ہوتا ہے، لیکن کوئی صاحب عقل سلیم یہ نہیں کہہ سکتا کہ خود یہ آہنی ٹکڑا ہی کوئی اصل شے ہے یقیناً ہم اپنے آپ کو ایک بہت ہی غلط راستہ پر ڈالدینگے اگر مقناطیس و برق کی حقیقت اور اصلیت کو صرف اسی مادہ کے مظاہر و حرکات ہی تک محدود کر دیں لیکن کسقدر افسوس ہے کہ ذی حیات اجسام کے مطالعہ میں ان مادیین کا یہی رجحان پایا جاتا ہے کہ یہ حرکات ہی زندگی کی اصل حقیقت ہیں، حالانکہ یہ تو صرف زندگی کی علامات ہیں، بذات خود زندگی نہیں، ہمارے دماغ کے اندر رد عمل کیمیائی ہوتا ہے اور جو عناصر و سالمات کا باہمی تغیر ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ خیال کا باعث نہیں ہے بلکہ خیال اس تغیر کا باعث و موجب ہے،

گذشتہ بیانات کا خلاصہ یہ ہوا کہ مادہ بذات خود بیجان اور بیکار ہے یعنی وہ خود ان اثرات کا تابع ہے

ہ خلاء سے اس تک پہنچتے ہیں، اگر اس پر کوئی بیرونی قوت عمل نہ کرے تو نہ اس میں کوئی حرکت پائی جائے گی، ور نہ اپنی کسی حالت وکیفیت کو بدلنے کی وہ کوئی اہلیت رکھتا ہے، جس قدر تغیرات بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ اصل "خلا" کی ایک غیر معلوم قوت کا عمل ہے، اسی نتیجہ کی تائید مزید زمین کی کشش ثقل، برقیات، مقناطیسیت ر نور کے مطالعہ سے بھی ہوتی ہے، کچھ عرصہ پہلے اگر اہلِ علم کی کسی مجلس میں یہ دعویٰ کیا جاتا کہ مادہ بذاتہ جامد محض ے تو شاید اس کا جواب بے التفاتی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، لیکن آج ہر ماہرِ طبیعیات کے لیے یہ ایک روزمرہ کی ت ہے کہ روشنی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ خلا کی ایک غیر معلوم کیفیت کا نتیجہ ہے، برق ومقناطیس اور ب وکشش کے جملہ مظاہر دراصل کسی ایسی ہی قوت کا اثر ہیں جو مادہ کے واسطہ سے عمل کر رہے ہیں، یعنی آج رے وثوق اور یقین کیساتھ یہ تسلیم کیا جاتا ہے، کہ مادہ میں زندگی کی حرکت مادہ کا کوئی ذاتی وصف نہیں ہے، ہ یہ چیز باہر سے آتی ہے،

آئیے، انھیں متذکرۂ بالا نتائج کو ہم اُن مظاہرِ حیات پر منطبق کریں جو اجسامِ عضوی میں ہم مشاہدہ کرتے ب، اسی تشریح کے ماتحت مظاہرِ حیات محض مادہ کے مرہونِ منت نہیں ہیں بلکہ جسطرح غیر عضوی اور غیر ذی روح سام میں مادہ پر ایک ایسی دوسری قوت عامل ہوتی ہے جو اس مادہ سے بالاتر ہے، اسی طرح ہمارے دماغ کے ر بھی جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ کسی ایسی ہی قوتِ متصرفہ کے باعث ہوتا ہے جو ہمارے دماغ کے مادی وجود پر ل ومتصرف ہے اور اس بنا پر ہمارے دماغ کے سالمات وجواہر، خلایائے دماغی اور ہمارا نظامِ عصبی اس کے ا کچھ نہیں ہے کہ اُس قوتِ مدبرہ کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے جس کی حقیقت سے ہم ناواقف ہیں اور کا ہم ابتک کوئی علمی نام بھی نہیں رکھ سکے، اس قوتِ مدبرہ کا براہِ راست ہم کو کوئی علم نہیں ہوتا ہے، بلکہ ان مادی مظاہر ہی کے واسطہ سے ہمارے علم میں آتی ہے جنکا ہم نظامِ عصبی مراکزِ دماغی وغیرہ میں مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن مادہ کے اوپر عمل کرنے والی قوت کا شعور وادراک براہِ راست ہم کو نہیں ہوتا، یہ چیز تو صرف استدلال استخراج ہی کی بنا پر سمجھی جا سکتی ہے اور جس طرح ہم ایک برقی میدان کے خواص وکیفیات کو صرف ان اثرات

سے اخذ کرتے ہیں جو کسی برق بار جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور جسطرح ہم برق اور مقناطیس کی اصلیت کا پتہ انھیں اثرات سے چلاتے ہیں جو اجسام ادی پر مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح ہم اس حیات بخش قوت کے وجود کو ان اثرات ہی سے اخذ و مستنبط کرتے ہیں، جنکو ہم مظاہر زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ قوت حیات دراصل بنیادی چیز ہے جس کی بنا پر انسان کی دماغی مشین کی توجیہ و تشریح تو کیجا سکتی ہے لیکن خود اس قوتِ حیات کی تعبیر دماغی مشین کے ذریعہ ہرگز نہیں کیجا سکتی، ہمارا یہ میلان کہ یہ مادی مشین ہی اپنے اندر ابتدا و اولیت رکھتی ہے، واقعات و حقائق کی زد میں مفتوح ہوتا جاتا ہے، آج سے پہلے ہم عفونت کا سبب یہ سمجھتے تھے کہ مادہ میں عمل کیمیائی کے باعث تخمیر و عفونت پیدا ہوتی ہے لیکن پاسٹیور (PASTEURE) کی تحقیقات نے اس نظریہ کو بالکل لغو ثابت کر دیا ہے عفونت و تخمیر محض کیمیائی عمل نہیں ہے بلکہ ان تمام مظاہر کا سبب "زندہ جراثیم" کا وجود ہے، انھیں کے باعث یہ خرابی پیدا ہوتی ہے،

۵۰- اسی قسم کے شواہد و تجربات کی بنا پر پروفیسر وہائٹ فیلڈ (WHITEFIELD) جیسے مشہور و مستند طبیعی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ تمام کائنات ایک ذی حیات عضو ثابت کیا جا سکتا ہے،

الغرض اصل چیز ہمارے جسم و دماغ کی ساخت نہیں ہے بلکہ وہ قوتِ متصرفہ ہے جو جسم و دماغ کی اس مشین کو چلاتی ہے، اسی قوتِ متصرفہ کو ہم روح کے نام سے پکارتے ہیں، گو ہنوز یہ اصطلاح اہلِ سائنس میں رائج نہیں ہوئی ہے،

گذشتہ بیانات سے اس قدر واضح ہوگیا ہے کہ یہ نظریہ کہ انسانی روح کی حقیقت سوائے مادہ کے اور کچھ نہیں، قطعاً بے بنیاد ہے، اور ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے شواہد اور دلائل معدوم ہیں لیکن ہنوز دو ایک شبہات اس سلسلۂ بحث میں ایسے باقی رہگئے ہیں جنکا جواب دینا لازمی ہے،

یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ہمارے دماغ کی اندرونی ترکیب و ساخت اور اس کا عمل مادی سالمات کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی غیر معلوم چیز کا نتیجہ ہے جسکو قوت، ایتھر وغیرہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے

اور گو اس ایتھر یا قوت وغیرہ کے متعلق یہ نہ کہا جا سکتا کہ وہ مادی ہے، لیکن بہرصورت یہ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح یہ غیر معلوم قوت ہمارے دماغ کے باہر اس عالم ظاہر میں کارفرما ہے، اسی طرح ہمارے دماغ کے اندر کارفرما ہے، اسلئے اس سے یہ نتیجہ صراحۃً اخذ ہوتا ہے کہ ہمارا نفس اور یہ عالم مشہود دراصل ایک ہی جنس سے ہیں یعنی وہی غیر معلوم قوت ہی ان دونوں چیزوں کا باعث اور ان کے عمل و ظہور کا موجب ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہم (نفس انسانی) اصلاً اس عالم ظاہر سے مختلف ہیں واقعہ کے خلاف قرار پاتا ہے، اور جب اس استدلال کی بنا پر ہماری اور اس عالم مشہود کی اصل و ذات ایک قرار پائی تو پھر یہ محض لفظی نزاع رہ جاتا ہے کہ ہماری اصل مادی ہے یا نہیں، نتیجہ بہرحال ایک ہی ہے، وہ قوت جس طرح کسی غیر معلوم قانون کے تحت میں ہمارے اندر حسیات، جذبات، اور شعور پیدا کرتی ہے، اسی طرح اس عالم مشہود کے دیگر مظاہرات کون و فساد کا باعث بھی ہوتی ہے، اور گو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مادی نظریہ کے ٹوٹ جانے سے ہماری نگاہوں کے بہت سے حجاب بھی دور ہو گئے اور مادیت کے اس طلسم فریب کی شکست نے ہم کو حقیقت کے قریب تر کر دیا، تاہم روحانیین کا اصل دعویٰ ہنوز تشنۂ بحث ہے یعنی اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہماری اصل مادی ہے یا غیر مادی بلکہ تصفیہ طلب امر تو یہ ہے کہ وہ شئے جسکو عرف عام میں روح کہا جاتا ہے، اس کا وجود کوئی مستقل بذات وجود ہے یا نہیں، ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور بقول ڈیکاوٹس "میں سوچتا ہوں اسلئے میں موجود ہوں" اسی سوچنے کے معنوں کو وسیع کر لیجئے، میں محبت کرتا ہوں، میں نفرت کرتا ہوں، میں ایک خواہش رکھتا ہوں، میں ایک ذی ارادہ ہستی ہوں، میرا ارادہ اس دنیا میں بعض تغیرات کا باعث بھی نظر آتا ہے، الغرض یہی وہ اوصاف ہیں جو مجھ میں ایک "شخصیت" یا "ذات" کی نسبت پیدا کر دینے کا موجب ہیں، اس لیے سوال یہ ہے کہ کیا یہ تشخص یا ذات دراصل کوئی ایسی حقیقت ہے جسکو بذاتہ ایک عامل ہستی تصور کیا جا سکے، یا یہ محض دھوکا اور فریب ہے اور یہ ہستی ایک دوسری نامعلوم قوت کی (جو خواہ مادی ہو یا نہ ہو) مرہون منت ہے، اور جس طرح بیجان مادہ اس قوت کے اثرات سے معذور و مجبور ہے اسی طرح میں بھی مجبور و معذور ہوں،

یا بہ الفاظ دیگر یہ کہئے کہ مجھ میں اور بیجان مادہ میں صرف اس قدر فرق ہے کہ مظاہر مادی اور میری شیون نفسی میں صرف اشکال وحالات کا فرق ہے، اصل اصول کا کوئی فرق نہیں،

یہ بحث گذشتہ مباحث سے زیادہ دقیق اور بہت زیادہ پیچیدہ ہے، اس بحث کے سلسلہ میں ہماری توجہ بار بار روح کی حقیقت کی طرف منتقل ہو جائے گی، لیکن اس جگہ یہ واضح کردینا چاہئے کہ ہمارا مبحث روح کی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ بتا دینا ہے کہ "روح کا ایک مستقل وجود ہے" "حقیقتِ روح پر" بحث کرنا نہ صرف ہمارے موضوع سے خارج ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آج تک کسی کی بھی اس حقیقتِ مستور تک رسائی نہیں ہوئی ہے، دنیا کی سب سے بڑی کاشف اسرار کتاب میں جو زیادہ سے زیادہ بات اس بارہ میں کہی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے

قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، بحث ونزاع کا اصلی میدان یہ ہے کہ ایک فریق سرے سے روح کے وجود کا منکر ہے، اور اس نے اپنے انکار کو بعض علمی نظریوں پر مبنی کر رکھا ہے، اور دوسرا فریق اس کے وجود کا مقر ہے اور اس اقرار سے یہ نتیجۂ فرعی نکالتا ہے کہ یہ وجود اجسام مادی کیطرح فنا نہیں ہوتا بلکہ جس امر کو ہم موت کہتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس روح نے اپنا لباس ومکان بدل دیا ہے، منکرین روح کے نظریات علمی کی کمزوریاں تو آپ پر ظاہر ہو چکی ہیں، لیکن اس سے زائد سے زائد جو نتیجہ مترتب ہوا وہ صرف یہ تھا کہ روح کے انکار پر کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس سے روح کا وجود تو ثابت نہیں ہوتا، سطورِ ذیل میں ہم کو اس مبحث پر کچھ عرض کرنا ہے،

اجازت دیجئے کہ اس موقع پر بحث کی وسعت کو سمیٹ لیا جائے، سیدھا سادہ سوال یہ ہے کہ انسان بذاتہ "عامل ہستی" ہے یا یہ "معمول" ہے، اور اگر یہ "عامل ہستی" ہے تو اس کا یہ عمل خود اسکے وجود کی اصل حقیقت کے باعث پیدا ہوتا ہے یا یہ کسی بیرونی قوت یا اثر کا معمول ہے، اگر یہ معمول ہے تو پھر اس کا وجود کوئی مستقل شے نہیں ہے بلکہ دیگر اجسام ظاہری ہی کی ایک صنف ہے، لیکن اگر یہ عامل بالذات ہے اور کسی بیرونی

اثر کا معمول نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ عامل بالذات حقیقت انسان کا اصل اصول ہے تسمیہ کا سوال محض ثانوی اہمیت رکھتا ہے، خواہ تم اس کو روح کہو یا کوئی اور نام رکھو تو مراد و مفہوم ایک ہی رہیگا یعنی یہی عامل بالذات حقیقت سوچتی ہے، یہی ارادہ کرتی ہے، یہی محبت کرتی ہے، یہی نفرت کرتی ہے، یہی ہمارے اعمال ظاہری و باطنی کا موجب ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر اخلاقی احتساب جاری کیا جاسکتا ہے، یہی سزا و جزا کی مستوجب ہے اور اگر دلائل موجود ہوں تو یہی عامل بالذات "حقیقت، مرنے کے بعد زندہ بھی رہتی ہے"

جب ہم اس مسئلہ پر اس نوعیت کے تحت میں غور کرتے ہیں تو جو چیز سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ قوتِ ارادی ہے نفس انسانی کا ارادہ ایک ایسی متعارف حقیقت ہے کہ کسی مزید تعریف کی محتاج نہیں ہے لیکن علمی حیثیت سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ارادہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، اگر بقول مادیین "ارادہ" مادی سالمات کے باہمی عمل کا نتیجہ ہے یا ایسی ہی کسی دوسری غیر معلوم قوت کے باعث اس کا ظہور ہوتا ہے، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک انسان اپنے ارادہ پر قادر نہیں ہے، بعض خارجی طبعی مؤثرات کے باعث ہمارے دماغ کے بعض مخصوص سالمات میں باہمی ایک عمل ہوتا ہے اور اس کے باعث ایک خاص ارادہ پیدا ہو جاتا ہے، ہمارے ارادوں کے باہمی اختلاف اور تنوع کی توجیہ بھی یہی کیجا سکے گی کہ وہ سالمات جو ارادہ پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں ان کے ایتلاف باہمی کی نسبت میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے وہی ہمارے ارادے میں بھی تغیر کا باعث ہوتا ہے، اس توجیہ کو درست تسلیم کر لینے کا ایک بالکل منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب اسباب متقدم کی بنا پر ہمارے ان سالمات میں جو ارادہ پیدا کرنے کا موجب ہیں، ایک عمل کیمیائی ہو گیا تو ہم کو اس ارادے کے تبدیل کر دینے پر کوئی قدرت نہ ہونا چاہئے اور جب ہم ارادہ نہیں بدل سکتے تو ہم ارادے کے نتائج کو بھی نہیں بدل سکتے، ہمارے تمام اعضاء و جوارح ہمارے ارادے کے ماتحت ہیں، تمثیلاً یوں سمجھئے کہ اندرونِ معدہ ہضم غذا کا عمل جاری ہے جس کے باعث کیمیائی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، انھیں تبدیلیوں کے باعث معدہ کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی ضرورت کا احساس دماغ تک منتقل ہوتا ہے،

جس کے باعث ہمارے اعصاب حرکتی میں حرکت پیدا ہوتی ہے، اور ہم پیالہ اٹھا کر پانی پی لیتے ہیں،

اس تمام توجیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس شے کو ارادہ کہا جاتا ہے وہ دراصل "اضطرار" کے سوا کچھ نہیں ہے اور اسی توجیہ کے تحت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ ارادے کے پیدا ہونے کا کوئی نہ کوئی مقدم طبعی (نہ کہ نفسی) سبب ہونا لازمی ہے اور جب وہ اسباب جمع ہو جائیں تو پھر ارادہ بھی ایک مخصوص قسم کا پیدا ہوگا، اور اس میں تغیر نہ ہو سکیگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے تجربات زندگی اس نتیجہ کے مخالف ہیں، ہم میں سے ہر شخص بداہتہً جانتا ہے کہ ہم اپنے ارادوں میں مجبور نہیں بلکہ مختار ہیں، متذکرۂ بالا مثال ہی کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ہم اس پر مجبور نہیں ہیں کہ جب ہمیں پیاس لگے تو ہم اضطرارًا پانی پی لیں یعنی یہ نہیں ہوتا کہ پیاس لگتے ہی ہمارا ہاتھ کاسۂ آب پر جا پڑے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارا ہاتھ کاسۂ آب کی طرف بڑھ چکا لیکن عین اس وقت ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ اس پانی میں سم ملا ہوا ہے فورًا ہمارا ہاتھ ٹھٹک کر رہجاتا ہے، یہ کیوں ہوا، اگر ہمارا ارادہ دراصل مقدم اسباب کا ایک نتیجہ تھا تو اس میں اسوقت تک تغیر نہیں ہو سکتا تھا جب تک دوسرے ایسے اسباب مترتب نہ ہوتے، جو اس ارادے کی نفی کر کے دوسرا ارادہ پیدا کر دیتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر اس کے کوئی دوسرا سلسلۂ اسباب پیدا ہوا ہو ہم اپنے ارادہ کو بدل دیتے ہیں جیسا کہ متذکرۂ بالا مثال سے واضح ہو رہا ہے، تم کہوگے کہ اس مثال میں بھی ارادے کی تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ عین وقت پر یہ آواز کان میں آئی کہ "پانی سم آلود ہے"، بیشک یہ ایک سبب ہے، لیکن یہ کوئی طبعی سبب نہیں ہے، بلکہ نفسی سبب ہے اور بحث جو کچھ ہے وہ طبعی اسباب سے ہے، یعنی وہ اسباب جنکی اصل و نوعیت مادی ہو، یہ "آواز" کہ پانی میں سم ہے مادی حیثیت سے اس کے سوا کیا ہے کہ ہوا میں کچھ امواج پیدا ہوئیں اور وہ بذریعہ اعصاب دماغ تک پہنچ گئیں، فرض کرو کہ یہی آواز تمہارا ایک دوست مذاق میں بلند کرتا لیکن اس صورت میں یہ نتیجہ پیدا نہ ہوتا، تمہارے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوتی، درانحالیکہ آواز وہی ہے، امواج ہوا کی نوعیت یکساں ہے اور اس کے باعث ہمارے دماغ میں جو تغیرات کیمیائی وغیرہ پیدا

نے چاہئیں وہ سب یکساں ہیں، لیکن نتیجہ مختلف مرتب ہوتا ہے جس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان
رادہ بیرونی اسباب طبعی کا پابند نہیں ہے اور یہی صفت انسانی اس نتیجہ تک ہم کو پہنچاتی ہے کہ انسان بہر حال
ت معمول مخلوق نہیں ہے بلکہ بیشتر حالات میں ایک عامل بالذات وجود ہے، ہمارے روزمرہ کے شواہد
کی تائید کرتے ہیں، ہم اپنے جذبات رذیلہ کے دبانے پر قدرت رکھتے ہیں، ان کی جگہ اعلیٰ جذبات کو اپنے
ر جگہ دیسکتے ہیں، اسی عامل بالذات قوت کی بدولت ہم تہذیب وارتقائے نفس کا کام کرتے رہتے
ں، ہماری تربیت کا سارا دار مدار اسی قوت انتخاب اور ارادے پر ہے، سزا و جزا کا موجب یہی قوت ارادی
، اور یہی وہ قوت ہے جو ہم کو مجبور و معذور مادہ کی صف سے نکال کر ذی اختیار مخلوق کی صف میں لا کر
اکر دیتی ہے،

قوت ارادی سے ملی جلی ایک قوت ہم میں اور ہے، یعنی قوت شعور و ادراک، علم الحیات کے مسلمات
یہ بھی ہے کہ فطرت کسی چیز کو بیکار نہیں پیدا کرتی، اس مسلمہ کے تحت میں قوت شعور کی بھی کوئی نہ کوئی ضرورت
ی چاہئے، لیکن اگر انسان ایک مشین کے سوا کچھ نہیں تو پھر قوت شعور ایک بیکار شے ہوجاتی ہے، اگر ہمارے سارے
ل و افعال دراصل مشین کی طرح ہم سے سرزد ہوتے رہتے ہیں اور انسان ایک ایسی مشین ہے جس کا ہر
ں کانٹا اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہے تو پھر قوت شعور کا وجود قطعاً غیر ضروری ہے جس طرح ایک موٹر گاڑی
سب کام بغیر قوت شعور کے انجام دیتی ہے، اسی طرح انسان بھی اپنے تمام اعمال انجام دیسکتا تھا، لیکن
ت شعور انسان کا بہت ہی متعارف وصف ہے اس لئے علم الحیات کے اس اصول کی بنیا پر کہ فطرت کسی
ز کو بیکار پیدا نہیں کرتی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے متعلق منکرین روح کا یہ قیاس قطعاً غلط ہے کہ انسان
ب ایسی مشین کے سوا کچھ نہیں جو خلایائے دماغی کے کل پرزوں کے بل پر چل رہی ہے،

ان جملہ مباحث کو یکجا کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان میں قوت ارادہ و شعور کا پایا جانا
س کو مستلزم ہے کہ انسان ایک ایسا وجود نہیں ہے جو تمام تر بیرونی اثرات یا قوتوں کا معمول ہو بلکہ وہ بذات

خود بھی ایک عامل ہستی ہے اور ہمارے مظاہر حیات کا یہی وصف (یعنی عامل بالذات ہونا) نمایاں ترین وصف ہے، اس وصف کے متعلق جب ہم علمی حیثیت سے تلاش و جستجو کرتے ہیں تو ہم کو کسی دلیل سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ اُن اثرات کے باعث پیدا ہوتا ہے، جو بیرونی دنیا میں حدوث و تغیرات کے باعث معمولاً ہو رہے ہیں بلکہ یہ وصف انسان کا ایسا ذاتی وصف ہے، جس کا تعلق اس عالم مشہود و ظاہر سے معلوم نہیں ہوتا، رہا اس کی حقیقت کا سوال اس کے متعلق پہلے ہی معذوری کا اظہار کیا جا چکا ہے، ہمارا موجودہ موضوع تو صرف اس حد تک محدود تھا کہ ہم یہ بتا دیں کہ انسانی وجود کا راز خود انسان ہی کے عامل بالذات ہونے میں پنہاں ہے، اسی عامل بالذات وصف کیلئے رُوح کی اصطلاح ہماری زبان میں وضع ہو چکی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اصطلاح کے بارہ میں کوئی نزاع نہیں ہو سکتی،

جہاں تک "وجود روح" کی بحث تھی یہ موضوع ختم ہو چکا ہے، اب صرف یہ امر بحث طلب رہ گیا ہے کہ آیا یہ وصفِ انسانی جس کو رُوح کہا جاتا ہے، ہماری اس ظاہر ظہور موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے یا نہیں،

بقائے رُوح کے متعلق تفصیلاً کسی دوسرے موقع پر بحث کیجائے گی، لیکن اس مضمون کے خاتمہ پر اشارۃً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ ظاہر ہے کہ انسانی رُوح کا تعلق ہمارے اس جسم مادّی سے نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے ماوراء اور اس پر متصرف ایک ایسی چیز ہے جو خود اپنا مستقل بالذات وجود رکھتی ہے تو پھر یہ گمان کیوں کیا جائے کہ فنائے جسم کے ساتھ یہ بھی فنا ہو جائے گی، روح ہمارے جسم سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے، اس لیے یقیناً وہ ان حالات و اسباب کی تابع نہیں ہو سکتی جو ہمارے جسم یا اس عالم محسوس و مشہود سے متعلق ہیں، "فنا یا موت" کا جو کچھ بھی ہم کو علم ہوا اور اس کو جس طرح بھی ہم جانتے پہچانتے ہیں، وہ صرف اس جسم یا مادہ ہی کے احوال و کیفیات ہیں، اسلئے یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہوگا کہ جو شے جسم و مادہ کی جنس سے نہو اس پر موت و حیات کا وہ قانون جاری نہیں ہو سکتا جو جسم یا جسمانیت سے متعلق ہے، اس لئے یہ خیال کہ فنائے جسم کے ساتھ ہی فنائے رُوح بھی لازمی ہے، قطعاً بے دلیل اور بے بنیاد ہے، بلکہ دلائل کا رخ سمت مخالف میں ہے، لیکن بہرصورت یہ ضرورت مسلم ہے کہ بقائے رُوح پر براہِ راست شواہد ہونے چاہئیں جو کسی آیندہ موقع پر بیان کئے جائینگے

تاریخ خطیب بغدادی

از

نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی

اس دور قحط الرجال کی (جبکہ بقیہ نقبہ رجال علم بھی علمی مجلسوں کو خالی کر رہے ہیں) یہ بڑی سعادت ہے کہ وہ علمی اسلامی تصانیف جنکو زمانے کی آنکھیں صدیوں سے ترس رہی تھیں، اور جن کے نام صرف کتابوں میں رہ گئے تھے، یکے بعد دیگرے شائع ہو کر دل و دماغ کو منور کر رہی ہیں، تاریخ کے سلسلے کو ملاحظہ کیجئے، مثلاً تاریخ ابن جریر طبری عرصہ ہوا طبع ہو چکی، حافظ ابن عساکر کی تاریخ کے اجزا شائع ہوئے، حال میں تاریخ خطیب بغدادی مصر سے آئی، طباعت کی ان خوبیوں کو لیے ہوئے جنپر بیروت کے بہترین مطبعے رشک کریں، اہتمام صحت کیسا تھ ضروری تحشی بھی ہے، رجال کی فہرست دی ہے، ہر صفحے پر سطروں کا شمار ہے، اس تاریخ کی چودہ جلدیں ہیں، کل صفحات ۱۱۴۶ ہیں، تعجب ہے کہ مطبع نے ہر جلد کی لوح پر جلدوں کی تعداد ۱۲ اور صفحات کی تعداد ۴۸۰۰ لکھی ہے، انتہا یہ کہ چودھویں جلد کی لوح پر بھی یہی اطلاع درج ہے۔

اس تاریخ کا خلاصہ بھی کیا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ میرے یہاں ہے، یہ خلاصہ فلسکیپ کے ۲۸۱ صفحات پر ختم ہوا ہے، خلاصہ نگار قاضی ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری حنفی المتوفی سنہ ۴۹۱ھ خطیب کے شاگرد ہیں، دیباچہ میں تاریخ خطیب کی تعریف کر کے لکھتے ہیں کہ "طویل زیادہ ہے، اس لئے میں نے منتخب رجال کے (بہ ترتیب اصل کتاب) حالات، شعر، حدیث، حکایت حسب سند خود مختصراً نقل کئے ہیں"، واضح ہو کہ کل رجال خلاصہ کی تعداد چند صد سے متجاوز نہ ہو گی، منتخب شعر وغیرہ مستقل عنوان ہیں،

بستان المحدثین سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ خطیب کا کوئی حصہ شاہ صاحب کے پیش نظر بھی تھا مگر مطبوعہ

نسخہ کو دیکھکر یہ تعین مشکل ہے، کہ کونسا جز کتاب تھا، عبارت بستان کا ترجمہ یہ ہے،

"تاریخ بغداد خطیب بغدادی کی تصانیف میں سے ہے، اس کے جزء ثانی کے شروع میں مناقب بغداد اور اس مبارک بنیاد کی بزرگی اور اس کے باشندوں کے محاسن اخلاق درج کئے ہیں"

اس کے بعد بغداد کی دونوں نہروں کا جو دجلہ اور فرات ہیں ذکر کیا ہے، بخاری کے حالات شرح وبسط کے ساتھ لکھے ہیں، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب کے احوال تک کتاب کا ایک ربع ختم ہو جاتا ہے، پہلی اسناد اس کی یہ ہے، حافظ ابو بکر نے کہا ہے کہ ہم کو عبدالعزیز ابن ابی الحسن القرمیسینی نے خبر دی، الخ،

اس کے بعد چند شعر مدح بغداد کے نقل کئے ہیں جنکا پہلا شعر ہے ؎

فدی لک یا بغداد کل قبیلۃ من الارض حتی خطتی و دیاریا۔

مطبوعہ نسخہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مناقب بغداد جلد اول کے ابتدا میں ہیں، علی ہذا القیاس دجلہ وفرات کا ذکر، امام بخاری کا ذکر جلد دوم کے آغاز میں ہے، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب کا ذکر اسی جلد کے تین ربع ختم ہونے پر شروع ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ملاحظے میں کونسی جلد تھی، بظاہر جلد اول ودوم کا مجموعہ تھا، اس صورت میں ابن ابی ذئب کے ذکر تک ربع کتاب ختم ہونے کا کیا مطلب ہوگا،

خطیب بغدادی نام احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بغدادی، کنیت ابو بکر، ۳۹۲ھ میں بمقام درزیجان پیدا ہوئے جو عراق کا ایک قریہ تھا، ان کے والد قریۂ مذکور میں خطیب تھے، اور فی الجملہ علم آشنا، باپ کی تحریص سے بیٹے نے تحصیل علم شروع کی، گیارہ برس کی عمر تھی کہ والد نے ان کو حدیث سنوانی شروع کردی تھی، اس کے بعد خطیب نے اپنی محنت سے اقلیم در اقلیم سیاحت کرکے علم حاصل کیا، جملہ فنون حدیث میں امام وقت ہو گئے، حافظ ابو نعیم ان کے مشائخ میں ہیں، حافظ ابن ماکولا شاگرد، حافظ ابن عساکر جو ہیں شاگردوں کے شاگرد، خطیب کا شمار کبار شافعیہ میں ہے، فقہ ابن المحاملی اور قاضی ابو الطیب سے حاصل کی، اسپر اتفاق ہے کہ دارقطنی کے بعد علوم حدیث کا ماہر ان سے بڑھکر نہیں ہوا، حفاظ کا ان پر خاتمہ ہو گیا، صاحب ہیبت باوقار اور ثقہ تھے، خط پاکیزہ تھا، کثیر الضبط

فصیح البیان، آواز بلند تھی، جو روایتِ حدیث کے وقت جامع منصور کے آخری حصے میں سنی جاتی تھی، اسی کریمہ کے سامنے صحیح بخاری مکہ مکرمہ میں پانچ دن میں پڑھی، عمر کا زیادہ حصہ بغداد میں صرف کیا، حاضری حرم کے وقت زمزم پی کر تین دعائیں کیں، بغداد میں اپنی تاریخ کی روایت کریں، جامع منصور میں روایتِ حدیث کریں، حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوں، تینوں دعائیں قبول ہوئیں،

سفر حج میں شام تک قریب غروب ایک قرآن ترتیل کے ساتھ ختم کر لیتے تھے، اس کے بعد لوگ جمع ہو کر روایتِ حدیث کی التجا کرتے، خطیب سواری میں بیٹھکر روایتِ حدیث کرتے (عرب میں سفر شب کو ہوتا ہے) ایک بار کسی نے ان کو دیکھکر کہا تم حافظ ابوبکر خطیب ہو، فرمایا میں ابوبکر خطیب ہوں، حفظِ حدیث دارقطنی پر ختم ہو گیا، چلتے چلتے کتاب کا مطالعہ کرتے جاتے، حنبلیوں کی سختی سے تکلیف اٹھائی، تصانیف کی تعداد ۵۶ ہے (تفصیل ملاحظہ ہو تذکرۂ ذہبی میں)

بہت دولتمند تھے، اہل علم اور علم کی خدمت میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں،

عقائد میں مذہب ابوالحسن اشعریؒ کے پیرو تھے جو بقول امام سبکی محدثین کا مذہب قدیماً و حدیثاً رہا ہے،

ایک بار شیخ ابواسحاق شیرازی کے درس میں حاضر ہوئے، شیخ نے ایک حدیث بحر بن کنیز السقاء سے روایت کی بعد روایت خطیب کی جانب متوجہ ہو کر کہا ان کی نسبت کیا کہتے ہو، کہا اجازت ہو تو حال بیان کروں، یہ سنکر شیخ ان کے سامنے سنبھلکر شاگرد کی طرح بیٹھ گئے، خطیب نے اس شرح و بسط سے حال بیان کیا کہ اس کو سنکر شیخ ابواسحاق نے کہا کہ خطیب اپنے وقت کے دارقطنی ہیں،

اکہتر برس کی عمر پا کر ۴۶۳ھ میں انتقال کیا، نماز جنازہ ابوالحسن ابن المہتدی نے پڑھائی، شیخ ابواسحق شیرازی نے جنازہ کو کندھا دیا، حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوئے، رضی اللہ عنہ، وفات سے پہلے کتابیں وقف کر دیں، مال و دولت خلیفہ کی اجازت لیکر تقسیم کر دی، چونکہ کوئی وارث نہ تھا، لہذا متروکہ حق بیت المال ہوتا، اجازت یوں ضروری تھی، (ماخوذ از تذکرۃ الحفاظ ذہبی و طبقات سبکی)

تاریخ خطیب | جیسا کہ اوپر لکھا گیا تاریخ چوؔدہ جلدوں میں ہے، مصر سے ۱۳۴۹ھ میں اشاعت شروع ہوئی، بغداد کے حالات و واقعات آغاز بنیاد سے ۴۶۳ھ تک لکھے ہیں، اور یہ زمانہ (جیسا کہ اوپر کتاب پر بھی لکھا ہے) بغداد کی اقبالمندی کا زمانہ ہے، خطیب دیباچہ میں لکھتے ہیں "یہ کتاب مدینۃ السلام کی تاریخ ہے جس میں اس کے آبادی کا ذکر ہے، اس کے کبراء، ساکنین، واردین اور علما کا تذکرہ ہے، اپنے علم و معرفت کی حد تک میں نے اس میں حالات لکھدیئے ہیں"۔ اس عہد کے دستور کے مطابق حالات و واقعات بسلسلۂ روایت لکھے ہیں، سب سے اول بروایت یونس امام شافعی کا قول لکھا ہے، یونس سے پوچھا تم بغداد گئے ہو، نفی میں جواب سنکر فرمایا مارایت الدنیا تم نے دنیا نہیں دیکھی؛

تاریخ خطیب جسطرح بہترین زمانے کی تاریخ ہے اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معانی استعمال کئے ہیں، عبارت آرائی و مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح و تعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآرا مقامات مین قوت فیصلہ کی کمی نمایاں ہے محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ، منطقیانہ تذبذب پاس نہیں،

روش تاریخ مروجہ طریقہ سے علحدہ ہے، بجائے خلفاء و امراء کو مستقل موضوع قرار دیکر ان کے حالات بیان کرنے کے رجال تاریخ کا ذکر بہ ترتیب حروف تہجی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اپنے اپنے موقع سے خلفاء و امراء بھی آجاتے ہیں، رجال کے سلسلے میں ہر فن اور علم کے ماہرین مذکور ہیں، مفسرین و محدثین و فقہاء سے لیکر شعراء و مغنیین و اہل صنعت تک سب ہی کا ذکر ہے، اس طرح ۷۸۳۱ مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے،

چونکہ یہ زمانہ مجتہدانہ قوت کا تھا اس لیے اکابرین امت سب ہی اس سلسلے میں آگئے ہیں، مگر وہ حضرات جو بعد کو ہوے ابتدائی چند بابون میں مختلف فقہی مسائل سے محدثانہ و فقیہانہ بحث کی ہے، مثلاً زمین بغداد کی بیع و شراء اور اسکی پیداوار کا کیا حکم ہے، چونکہ حضرت عمرؓ نے سواد (عراق) کی زمین کو مسلمانوں کے حق میں وقف فرمادیا تھا اس لیے اس پر مالکانہ قبض و تصرف فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک ناجائز و مکروہ تھا، امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے تقوی کے متعلق کوئی مسئلہ پوچھا تو فرمایا۔ استغفر اللہ! میرے لئے ورع و تقوی کے مسئلے پر گفتگو کرنی

درست نہیں اس لئے کہ میں بغداد کی پیداوار کھاتا ہوں، بشر بن الحارث (حافی) ہوتے تو وہ تم کو جواب دے سکتے اصلی کو اسی لئے بغداد کی سکونت میں کلام تھا، اس مبحث پر موافق و مخالف دونوں پہلوؤں سے بسیط بحث کی ہے، فیصلہ جواز کے حق میں دیا ہے، دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارض سواد فاتحین میں تقسیم کیوں نہیں فرمایا، اسی سلسلے میں عہد فاروقی کے بندوبست اراضی کا ذکر آتا ہے، جو حضرت عثمان بن حنیف صحابی نے کیا تھا اس بیان میں بندوبست شدہ اراضی کی شرح لگان، اقسام پیداوار - تعداد رقبہ سب کچھ آجاتا ہے، لگان صرف قابل زراعت اراضی پر تھا، مکانوں وغیرہ پر ٹیکس نہ تھا، دوکانوں پر ٹیکس مہدی خلیفہ نے لگایا ۱۶۷ھ میں،

اسی سلسلے میں ایک باب اون روایتوں پر ہے جو عراق کی برائی پر ہیں اور بعد بیان ان کی تنقیح کرکے ضعیف قرار دیا ہے، اس کے بعد مناقب عراق اور اہل عراق کی صفات کا بیان ہے، عراق کی آب و ہوا کے اعتدال کی تعریف ہے، اہل عراق کی عقل و اخلاق کی تعریف ہے، اس کے ساکنین کی خدمتِ حدیث کا بیان ہے، نوما ہے ہیں کہ محدثین بغداد کا دامن وضعِ حدیث اور کذبِ روایت کی شہرت سے پاک ہے، بخلاف اہل کوفہ و خراسان کے کہ ان کے احادیث موضوعہ اور اسانید مصنوعہ پر جلدیں کی جلدیں لکھی گئی ہیں، ایک قول لکھا ہے "علم حجازی اخلاق عراقی، طاعت شامی جب کسی شخص میں جمع ہوں تو وہ کامل ہے"، دوسرا قول اذا خرجت من العراق فالدنیا کلھا رستاق - جب تم عراق سے نکل آئے تو ساری دنیا دیہات ہے، یوم جمعہ بغداد کا تراویح مکہ کی، عید طرسوس کی مشہور تھی،

بغداد | اس مقام کا قدیم نام بغداد تھا، بغداد کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ بغ اہل مشرق کے ایک بت کا نام تھا، واد بمعنی عطیہ یعنی بغ دیوتا کا بخشا ہوا، اسی لئے اگلے زمانے میں فقہا اس نام کا استعمال مکروہ خیال کرتے تھے، اب بغداد، بغداذ تعریف ہے، یہ ہے ارباب صلاح اور اہل دل کی گرمیِ تاثیر، بغداد کو بغدان اور مغدان بھی کہتے تھے (کیا دان اس میں ہندی کا لفظ خیرات کے معنی میں ہے) ایک وجہ تسمیہ میں بغ کو باغ کا مخفف بھی بیان کیا ہے اور داذ ایک آدمی کا نام - اس صورت میں نام بغداذ تھا اس نام کے استعمال میں فقہا کو کراہت نہ تھی،

منصور نے جس موقع پر مدینۃ السلام آباد کیا وہاں اہل بغداد کا ایک مزرعہ تھا جسکا نام المبارکہ تھا

ساٹھ آدمی اس کے مالک تھے، منصور نے ان کو معاوضہ دیکر رضامند کیا اور اسی مقام پر نیا شہر آباد کیا، چونکہ شہر دجلہ کے کنارہ بسایا گیا اور دجلہ کا نام وادی السلام و قصر السلام تھا اس مناسبت سے شہر جدید کا نام مدینۃ السلام رکھا گیا،

خلافت بنی عباس جن اثرات کے تحت بنو امیہ کے مقابلے میں قائم و کامیاب ہوئی ان کا اقتضا یہی تھا کہ اس کا دارالخلافہ و مرکز عراق میں ہوتا، اسی لیے عبد اللہ السفاح اول خلیفہ عباسی (۱۳۶ھ-۱۳۲ھ) نے دارالخلافہ پہلے کوفہ میں بنا کر اس کا نام ہاشمیہ رکھا ۱۳۴ھ میں انبار کو دارالخلافہ قرار دیکر ہاشمیہ سے موسوم کیا، وہیں سفاح کی وفات و تدفین ہوئی اور وہیں منصور کی بیعت، (معجم البلدان)

مدینۃ السلام کی بنیاد ۱۴۵ھ میں رکھی گئی ۱۴۶ھ میں شاہی عمارتوں کا اس قدر حصہ تیار ہو گیا کہ منصور مع لشکر اور خزانے کے ہاشمیہ سے منتقل ہو کر وہاں آگیا، سلسلۂ تعمیر ۱۴۹ھ تک جاری رہا، سنہ مذکور میں چار دیواری تیار ہونے پر کام ختم ہو گیا، مصارف تعمیر چالیس لاکھ آٹھ سو درم ہوئے، طریقۂ تعمیر یہ تھا کہ اول تمام ممالک خلافت سے ہر قسم کے کاریگر مثلاً انجینیر (مہندس) معمار، نجار، لوہار وغیرہ فراہم کئے گئے انکی تنخواہیں مقرر کیں، اس طرح ہزاروں آدمی جمع ہونے پر انجینیروں کو اپنا ذہنی نقشہ سمجھایا، انھوں نے اس کے مطابق داغ بیل کی، شہر کا نقشہ مدور قرار دیا گیا، اس اہتمام سے تعمیر شروع ہو کر پانچ سال میں ختم ہو گئی، عجیب تر یہ تھا کہ ساعت نوبخت منجم نے تجویز کی، یہاں تعمیر کے ضمن میں بہت سے مفید مباحث آجاتے ہیں، مثلاً معماروں وغیرہ کی شرح تنخواہ، اسکی مناسبت سے اس عہد میں اجناس کا نرخ، مدینۃ السلام کی پیمائش، اس کے دروازے، مساجد۔ پل۔ مقابر۔ نہریں وغیرہ،

تعمیر کے بعد جو ترمیمیں خود منصور نے کیں ان کا ذکر ہے، بازار پہلے محلات شاہی کے زیادہ قریب تھے، دور ہٹا کر آباد کے گئے، اسطرح کرخ کی آبادی وجود میں آئی، سڑکیں چوڑی کی گئیں، سب سے زیادہ چوڑی سڑک چالیس ذراع (ہاتھ) چوڑی تھی، تقریباً ۶۰ فٹ کرخ کے بعد رصافہ ولیعہد مہدی کے لیے آباد کیا، یہ ۱۵۱ھ کا واقعہ ہے،

اسی طرح عہد بعہد کے اضافے بیان کئے ہیں، اسی ضمن میں عروج تکلفات کا وہ منظر سامنے آجاتا ہے جبکہ المقتدر کے عہد (۳۰۵ھ) میں سفیر روم کی آمد میں شہر آراستہ کیا گیا تھا، تفصیل کا شوق ہے تو اصل کتاب دیکھو،

ان مقابر کے بیان میں جو علما و صلحا کے لئے مخصوص تھے جداگانہ مستقل باب ہے، سب سے اول مقابر قریش کا بیان ہے جہاں حضرت موسیٰ کاظم کا مزار تھا (یہی مقام اب کاظمین ہے) ابو علی الخلال کا قول نقل کیا ہے، ما همنی امر فقصدت قبر موسیٰ بن جعفر فتوسلت به الا سهل الله تعالیٰ لی احب، جب مجھکو کوئی مشکل پیش آتی اور میں موسیٰ بن جعفر کی قبر پر حاضر ہوکر ان کے توسل سے دعا کرتا تو اللہ تعالیٰ میری مراد برلاتا،

باب حرب کے مقبرے میں امام احمد بن حنبل اور حضرت بشر حافی مدفون تھے، اسی سلسلے میں دو روایتیں ہیں امام احمد بن حنبل کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا کہ ہر قبر پر ایک قندیل روشن ہے، پوچھا یہ کیا ہے، جواب ملا تم کو معلوم نہیں؟ امام احمد بن حنبل کی آمد کے سلسلے میں یہ قبریں پر نور ہوئی ہیں، جو عذاب میں تھے ان پر رحم فرمایا گیا، خاکسار کہتا ہے کہ جوانمرد امام کا استقبال اسی شان سے ہوتا تھا، رضی اللہ عنہ،

دوسری روایت حضرت بشر حافی کے وصال کے متعلق ہے، ایک راوی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے ایک پڑوسی کو بعد وفات دو حلے پہنے ہوئے دیکھا، استفسار پر کہا کہ ہماری قبرستان میں بشر بن الحارث دفن ہوئے ہیں، اس سلسلے میں تمام اہل مقبرہ کو دو دو حلے عطا ہوئے ہیں، قدس سرہ۔

حضرت معروف کرخی کی قبر باب الدیر کے مقبرے میں تھی، اسکی نسبت لکھا ہے، قبر معروف مجرب بقضاء الحوائج، سو مرتبہ قل ہو اللہ پڑھکر جو دعا ان کے قبر کے قریب کیجائے مقبول ہوتی ہے،

مقبرہ خیزران میں محمد بن اسحق مصنف سیرۃ مدفون تھے، نیز امام اعظم ابو حنیفہؒ۔

امام اعظم کی قبر کے متعلق امام شافعی کی ایک روایت لکھی ہے، علی بن میمون (شاگرد امام شافعیؒ) روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے شافعی نے کہا، انی لاتبرك بابی حنیفة واجئ الی قبره فی کل یوم لقبی زائراً فاذا عرضت لی حاجة صلیت رکعتین وجئت الی قبره وسألت الله تعالیٰ الحاجة عنده

فما یتعدل عنی حتی تقضی، میں ابو حنیفہ کے توسل سے برکت حاصل کرتا ہوں، ہر روز انکی قبر کی زیارت کو جاتا ہوں، جب کوئی حاجت پیش آجاتی ہے دو رکعت نماز پڑھکر ان کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں، دعا کے بعد مراد بر آنے میں دیر نہیں لگتی،

یہ بیانات جلد اول کے صفحہ ۱۰۲ تک چلے جاتے ہیں، اس کے بعد مدائن کا ذکر بوجہ قرب تام آتا ہے ذکر مدائن تقریب ہو جاتا ہے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر کی جنکے قدوم سے مدائن مشرف ہوا، ان حضرات کی تعداد پچاس ہے، اسی شرف کی وجہ سے مدائن کا ذکر دیگر قصبات متصلۂ بغداد مثلاً نہروان، انبار وغیرہ سے پہلے کیا ہے،

سب سے اول ذکر ہے حضرت امیر المومنین علی کا، سب سے آخر میں عبد اللہ الحارث کا، ذکر مدائن بھی باعث ہوا ہے تاریخ خطیب میں حضرات صحابہؓ کے ذکر مبارک کے آنے کا، ورنہ بغداد میں کسی صحابی کی آمد ثابت نہیں،

حضرت علیؓ کے مدفن کی بحث بسیط ہے، راوی نے امام ابو جعفر محمد بن علی (امام باقر) سے پوچھا کہ حضرت علی کہاں دفن ہوئے تو کہا بالکوفۃ لیلاً وقد عُمّی عنی قبرہ، کوفہ میں شب کو اور مجھکو ان کے قبر کا حال نہیں معلوم، محمد بن سعد کی روایت ہے کہ کوفے میں مسجد جامع کے قریب قصر الامارۃ میں دفن ہوئے،

عبد الملک راوی کا بیان ہے کہ میں حافظ ابو نعیم کے پاس بیٹھا تھا کہ کچھ سوار وہاں سے گذرے، میں نے کہا یہ لوگ کہاں جاتے ہیں، کسی نے کہا علی بن ابی طالب کے مزار کو جاتے ہیں، حافظ ابو نعیم نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کذبوا نقلہ ابنہ حسن الی المدینۃ، یہ لوگ کاذب ہیں ان کو ان کے بیٹے حسن نے مدینہ منتقل کر دیا ہے، شریک کا یہ قول حدیث نبوی میں ہے، نقلہ واللہ الحسن بن علی الی المدینۃ، واللہ حسن بن علی نے ان کو مدینہ منتقل کر دیا، اس مضمون کی اور متعدد روایتیں ہیں،

حافظ ابو نعیم سے خطیب نے روایت کی ہے کہ ابو جعفر الحضرمی اس کے منکر تھے کہ جو مصنوعی قبر کوفے کی بلندی پر ہے وہ حضرت علی کی قبر ہو اور یہ بھی کہتے تھے کہ شیعیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قبر کس کی ہے تو وہ سنگسار

نگے، یہ قبر مغیرہ بن شعبہؓ کی ہے، اگر یہ قبر علیؓ کی ہوتی تو میں اسکو اپنا ملجا وماوی بنا لیتا،

حضرت امام حسینؓ کی قبر کے متعلق لکھا ہے، احمد بن سعید الجمال سے روایت ہے، سألت ابا نعیم عن زیارۃ
الحسن فکانہ انکر ان یعلم این قبرہ۔ میں نے ابو نعیم سے زیارۃ قبر حسین کی بابت دریافت کیا تو ان کے
ن سے ایسا معلوم ہوا کہ ان کو اس کا علم نہ تھا کہ ان کی قبر کہاں ہے، صحابۂ کرام کے ذکر کے سلسلے میں پانچواں نمبر
ت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذکر کا ہے، اثنائے ذکر میں لکھا ہے، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ قرآن اور شرائع و
م کی تعلیم کے لیے بھیجا، فبث عبد اللہ فیھم علما کثیرا وفقہ منھم جما غفیرا، کوفہ پہنچکر عبداللہ نے کوفیوں
بکثرت علم پھیلایا، اور ایک گروہ کثیر ان کی تعلیم سے فقیہ بنا، خاکسار کہتا ہے کہ یہی علم فقہ حنفی کی بنیاد ہے،

حضرت ابن مسعودؓ کے اخلاق اسلامی کی وسعت کا ایک واقعہ اس زمانے میں شمع ہدایت بن سکتا ہے، علقمہ
ی ہیں کہ میں عبداللہ بن مسعود کے ساتھ مداین سے نکلا، راستے میں ایک مجوسی بھی ہمارے ساتھ ہو لیا، آگے چلکر
اللہ بن مسعود کسی ضرورت سے ہم سے الگ ہو گئے، واپس آئے تو مجوسی دوسرے راستے پر جا چکا تھا، یہ دیکھکر
راستے پر جاکر اس سے ملے اور سلام کیا، اور فرمایا ان للصحبۃ حقا رفاقت کا بڑا حق ہے، کاش اس واقعے
سنکر ہمارے سینے کشادہ ہو جائیں،

بم | صحابۂ کرام کا ذکر صفحہ ۲۱۲ پر ختم ہونے پر کتاب اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتی ہے، اور اہل بغداد کا ذکر
رع ہوتا ہے، خطیب لکھتے ہیں، اس سلسلے میں خلفاء، اشراف، کبراء، قضاۃ، فقہا، محدثین، قراء، زہاد، صلحا
دبین، شعرائے اہل مدینۃ السلام کا مذکور ہے، اہل مدینۃ السلام سے وہ مراد ہیں جو وہاں پیدا ہوئے یا دوسری
سے آکر وہاں بسے، ان کا بھی ذکر ہے جو بغداد چھوڑ کر دوسری جگہ فوت ہوئے، وہ بھی مذکور ہیں جو اس کی
ح قریب میں ساکن تھے یا وہاں آکر رہے، ان کی کنیت، ان کا نسب، مشہور واقعات، حسب، اخبار نیک،
عمر، تاریخ وفات، حالات بقدر اپنی معرفت وعلم کے درج کئے ہیں، اسی کیساتھ انکے متعلق ثنا و مدح و ذم و قدح،
ل رد اور تعدیل و جرح کے جو الفاظ محفوظ ہیں وہ نقل کر دیئے ہیں، اور حروف معجم کی ترتیب ملحوظ ہے تاکہ مطلب بآسانی حاصل ہو سکے، بعض اوقات

کسی بلند پایہ کتاب میں کوئی اہم مضمون نظر سے گذرا دوسرے وقت تلاش کیا، بہت وقت صرف کیا، نہ ملا، چھوڑ دیا، حالانکہ ضرورت وحاجت باقی رہی، اسی لئے حروفِ تہجی کی ترتیب اختیار کی،

نام مبارک سے برکت حاصل کرنے کے لحاظ سے اول ان صاحبوں کا ذکر ہے جنکا نام محمد تھا، اس کے بعد حروفِ تہجی کی پابندی کی ہے، اسی ضمن میں حافظ تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ طالبِ حدیث پر لازم ہے کہ سب سے اول اپنے شہر کی کتبِ حدیث اور ان کے مولفین کے حال سے آغاز کرے، ان کی فہم میں ملکۂ تامہ بہم پہنچائے جس سے صحیح وسقیم وغیرہ کی معرفت تامہ حاصل ہو، اس کے بعد دوسرے شہروں کو لے،

رجال تذکرہ کے حالات کے ضمن میں بڑے بڑے علمی دقائق ومباحث مجتہدانہ ومحدثانہ قوت کیساتھ حل ہوتے جاتے ہیں، جن سے علما استفادہ کرسکتے ہیں، کاش اہل مطبع مطالب کی فہرست بھی مرتب کرسکتے جس طرح یورپ میں ہوتا ہے،

اسم مبارک سے مسمی مشاہیر کے ۹۰۵ تذکرے تین جلدوں میں آئے ہیں، چوتھی جلد احمد نامی مشاہیر سے شروع ہوئی ہے، ہم چند تذکروں کا خلاصہ لکھکر اس عہد کے علمار کا پایہ بلند دکھانا چاہتے ہیں، خصوصاً یہ کہ یونانیت سے اذہان کے مغلوب ہوجانے سے قبل ہمارے علم وعلما کی کیا شان تھی،

سب سے اول ذکر محمد بن اسحٰق سیرۃ نگار کا ہے، اور یہ (بقول مولف) اس وجہ سے کہ ان سے زیادہ کوئی اور اکبر سن، اعلی اسناد، اقدم موت نہ تھا، ورنہ حروف تہجی کے رعایت کے اعتبار سے محمد بن احمد کا ترجمہ پہلے آتا، واضح ہو محمد بن اسحٰق صاحب سیرۃ کے تذکرے کی مناسبت سے تمام وہ مشاہیر جن کے باپ کا نام اسحٰق تھا، اسی سلسلے میں آگئے ہیں، اس طرح یہ سلسلہ ۱۵ سے شروع ہوکر ۹۶ پر ختم ہوتا ہے، ۹۷ نمبر سے محمد بن احمد کا آغاز ہے، اَدم برسرِ مطلب،

محمد بن اسحٰق صاحب سیرۃ | محمد بن اسحٰق صاحبِ سیرۃ کی کنیت بقول قوی ابوبکر ہے، ابوعبداللہ قول ضعیف ہے، صحابۂ کرام میں حضرت انس بن مالک کو دیکھا، اکابر تابعین سے روایت کی ہے، مثلاً حضرت نافع زہری، قاسم بن محمد، امام محمد باقر، ائمۂ علمانے ان سے روایت کی ہے مثلاً یحیٰی بن سعید، سفیان ثوری، شعبہ، حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ وغیرہم

غداد آکر مقیم ہوے، وہیں مقبرۃ الخیزران میں مدفون ہوئے بعض کے نزدیک فارسی الاصل ہیں، بعض کی روایت
ب عربی، موسیٰ بن جسار حضرت ابوہریرہؓ کے راوی ان کے چچا تھے، ان کی جرح تعدیل کے متعلق طویل بحث ہے
ن کے ثقہ اور صادق ہونے پر اکابر کا اتفاق نقل کیا ہے،

اسی سلسلے میں امام مالکؒ کی جرح کے مالہ وماعلیہ سے محققانہ بسیط بحث کی ہے، کہ محققین کے نزدیک امام
الک کی جرح کا کیا پایہ ہے، تالیف سیرۃ کی وجہ ایک روایت سے یہ بیان کی ہے کہ ابن اسحٰق ایک روز خلیفہ مہدی
کے یہاں گئے، اس وقت خلیفہ کے پاس ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، مہدی نے پوچھا جانتے ہو یہ کون ہے، کہا امیرالمومنین
کے فرزند ہیں، خلیفہ نے کہا تو ان کے واسطے ایک تاریخ لکھ دو جس میں آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک کی تاریخ ہو چنانچہ
بن اسحاق نے سیرۃ لکھی، مہدی نے دیکھکر کہا طویل بہت ہوگئی، مختصر کر دو، چنانچہ مختصر کیگئی، آج جو ان کی کتاب موجود
ہے، وہ یہی مختصر ہے، پہلا طویل مسودہ امیرالمومنین کے خزانے میں رہا،

یہ روایت بیان کر کے خطیب نے تصحیح کی ہے کہ بلحاظ واقعات یہ روایت صحیح نہیں، ابن اسحٰق خلیفہ منصور کے
پاس گئے ہونگے، اور اُن کے پاس مہدی ان کا فرزند ہوگا، مہدی کی خلافت کا آغاز ۱۵۸ھ میں ہوا، ابن اسحاق
کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی، بعض نے ابن اسحاق کا سن وفات ۱۵۰ھ اور ۱۵۲ھ بھی بیان کیا ہے،

محمد بن ابراہیم ابوحمزہ الصوفی | محمدؒ بن ابراہیم ابوحمزۃ الصوفی، احمد بن حنبل، بشر بن الحارث (الحافی) سری سقطی کے صحبت
یافتہ ہیں، علم قرأت کے عالم تھے، خصوصاً قرآت ابوعمرو کے،

امام احمد بن حنبل صوفی کہکر ان کو مخاطب فرماتے تھے، ماتقول فیہا یا صوفی، سب سے اول اسرار
تصوف انھوں نے بیان کئے، چنانچہ خطیب نے روایت کی ہے کہ بغداد میں جس نے سب سے اول صفا، ذکر، جمع ہمت
محبت، شوق قرب، انس پر کلام کیا ہے وہ ابوحمزہ ہیں، ان سے پہلے کسی نے علی رؤس الاشہاد یہ مسائل بیان نہیں
کئے، ۲۶۹ھ میں وفات پائی،

امام بخاری | امام بخاریؒ کے حالات میں تیس صفحے لکھے ہیں، جنمیں حالات کی پوری تفصیل ہے، خلق قرآن کے مسئلے

پر بھی مفصل بحث ہے جس کی وجہ سے امام بخاری کو آخر عمر میں دشواری پیش آئی،

حلیہ ضعیف الجثہ، قد اوسط نہ طویل نہ قصیر، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، عید الفطر کی شب میں ۲۵۶ھ میں وفات پائی، نماز ظہر کے بعد مدفون ہوئے، کسی نے پوچھا کہ طلب حدیث کس طرح شروع کی؟ فرمایا، دس برس کی عمر میں مجھکو الہام ہوا کہ حفظ حدیث کروں، اس وقت میں نشیبوں میں کام سیکھتا تھا، اسکو چھوڑ کر میں تحصیل علم حدیث میں مشغول ہوگیا، الداخلی وغیرہ کے یہاں جانا شروع کیا، ایک روز الداخلی نے کہا سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم، میں نے کہا ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی، انھوں نے جھڑک دیا، میں نے کہا اصل تمھارے پاس ہے تو دیکھ لو، چنانچہ وہ گھر میں گئے، اصل کتاب دیکھ کر باہر آئے، مجھ سے پوچھا روایت کس طرح ہے، میں نے کہا "الزبیر بن عدی عن ابراہیم، یہ سنکر قلم میرے ہاتھ سے لیا اور اپنا نسخہ صحیح کرکے کہا تمہارا بیان صحیح ہے، کسی نے پوچھا اس وقت کیا عمر تھی، فرمایا گیارہ سال کی، سولہ برس کی عمر میں ابن مبارک، وکیع کی کتابیں، حفظ کرکے سمجھنے لگے تھے، اسی سال اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے، حج کے بعد بھائی واپس گئے، خود تحصیل حدیث کے واسطے وہاں رہ گئے، اٹھارہ برس کی عمر میں قضایا صحابہ و تابعین اور ان کے اقاویل کی تصنیف شروع کردی، اسی زمانے میں چاندنی راتوں میں التاریخ کی تصنیف قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھکر کی، ان کا قول ہے کہ تاریخ میں جتنے نام آئے ہیں سب کے متعلق کوئی نہ کوئی قصہ مجھ کو معلوم تھا، مگر میں نے زیادہ طوالت پسند نہیں کی، فرمایا ہے میں نے تاریخ تین مرتبہ تصنیف کی ہے، تاریخ کی تصنیف کے بعد اسکا نسخہ اسحٰق بن راہویہ امیر عبداللہ بن طاہر کے پاس لے گئے، اور کہا کیا سحر میں تم کو نہ دکھلاؤں، عبداللہ بن طاہر دیکھکر متعجب رہ گیا،

جامع صحیح بخاری کی تالیف کی بابتہ ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اسحٰق بن راہویہ کے پاس تھا، بعض دوستوں نے کہا کاش تم سنن النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک مختصر لکھتے، میرے دل میں یہ خیال جم گیا، اور میں نے جامع صحیح کا جمع کرنا شروع کردیا، جامع میں صرف صحیح حدیث لکھی ہے، بہت سی حدیثیں طویل الحال ہونے کی وجہ سے چھوڑ

بھی دی ہیں، ہر حدیث غسل کرکے لکھی ہے، تراجم کتاب ما بین المنبر والقبر دو رکعت نماز پڑھکر لکھے ہیں، فربری کا قول ہے کہ جامع صحیح کی روایت بخاری سے نوے ہزار آدمیوں نے کی اب ان میں سے صرف میں باقی ہوں، رمضان المبارک میں دن میں افطار تک ایک بار کلام مجید ختم کر لیتے تھے، فرماتے تھے ہر ختم کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، مسجد میں کسی نے امام بخاری کی داڑھی میں سے تنکا نکال کر وہیں ڈالدیا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ امام نے لوگوں کی نگاہ بچنے پر ہاتھ بڑھاکر اس کو اٹھالیا اور آستین میں رکھ لیا مسجد سے باہر گئے تو اس کو لیجاکر باہر ڈالدیا، آج بہت سے بخاری خواں اس واقعے سے ادب آموز ہوسکتے ہیں،

ایام طالب علمی میں چند روز درس میں حاضر نہ ہوئے ساتھیوں نے تلاش کی تو معلوم ہوا کہ لباس پھٹ گیا، عریانی کی وجہ سے خانہ نشین ہیں، رفقا نے لباس کا اہتمام کیا تو شامل درس ہوئے، ایک ساتھی کا بیان ہے کہ میں ایام سفر میں راتوں کو امام بخاری کو دیکھتا تھا کہ شب میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھتے چقماق سے آگ نکالکر بتی روشن کرتے، حدیثوں پر نشان بناتے، پھر لیٹ جاتے، امام کا قول تھا کہ میرے نزدیک حامد اور ذام (مدح کرنے والا اور مذمت کرنے والا) یکساں ہے،

کئی صفحوں پر امام کے فضائل اور اکابر کی رائیں اُن کے حق میں پھیلی ہوئی ہیں، امام مسلم بن حجاج ان کے سامنے اس طرح بیٹھتے جیسے لڑکا استاد کے سامنے، ایک موقع پر انھوں نے کہا، تم سے بغض سوا حاسد کے کوئی نہیں کرسکتا، تمہارا مثل دنیا میں نہیں، ابومصعب المدینی کا قول ہے کہ امام بخاری ابن حنبل سے حدیث و فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں، کسی نے سنکر کہا آپنے حد سے تجاوز کیا، کہا اگر تم نے امام مالک کو دیکھا ہوتا تو تم ان کا اور بخاری کا چہرہ دیکھکر بول اٹھتے کہ یہ دونوں حدیث و فقہ میں برابر ہیں، امام بخاری کا ایک قول تھا کہ مجھکو ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حفظ یاد ہیں،

وفات کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ابن آدم طواویسی نے روایت کی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر مع صحابہ کے قیام فرما ہیں، میں نے سلام کیا، جواب سے مشرف ہوا، عرض

کی یہاں قیام کیوں ہے، فرمایا، محمد بن اسمٰعیل البخاری کے انتظار میں کھڑا ہوں، ان کا بیان ہے کہ چند روز کے بعد امام بخاری کی وفات کی خبر پہنچی، حساب لگایا گیا تو وہی شب تھی جس شب کو خواب میں حضرت سرورِ عالم کو انتظار میں کھڑا دیکھا تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

امام محمد | محمد بن الحسن بن الفرقد ابو عبد اللہ الشیبانی، صاحب امام ابو حنیفہ و امام اہل الرائے، دراصل دمشقی ہیں، حرستا نامی قریہ کے باشندے، ان کے والد عراق آئے، محمد واسط میں پیدا ہوئے، کوفہ میں نشو و نما پائی، وہیں امام ابو حنیفہ، مسعر بن کدام، سفیان ثوری وغیرہ سے علم سنا، سماع حدیث بکثرت کیا، نیز امام مالک، اوزاعی اور امام ابی یوسف قاضی سے، بغداد میں سکونت اختیار کی اور حدیث و فقہ کی روایت کی، امام شافعی، جوز جانی وغیرہ نے ان سے حدیث روایت کی ہے، ہارون رشید نے قاضی مقرر کیا، ان کے ساتھ خراسان گئے، بمقام رے انتقال کیا، وہیں مدفون ہیں، اسی روز کسائی نے وفات پائی، ہارون رشید نے کہا میں نے آج لغت اور فقہ کو دفن کر دیا،

پیدایش ۱۳۲ھ میں وفات ۱۸۹ھ میں عمر ۵۸ سال، اگرچہ حدیث کی سماعت کثیر تھی مگر رائے پر غور کیا، اسی کا غلبہ ہوا، اور اسی میں شہرت پائی،

ان کا قول ہے کہ باپ نے تیس ہزار روپیے چھوڑے تھے، میں نے پندرہ ہزار نحو اور شعر کی تحصیل میں اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تحصیل میں خرچ کر دیئے،

امام شافعی نے امام محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں تین برس سے زیادہ امام مالک کے پاس رہا اور سات سو سے زیادہ ان سے حدیثیں سنیں، امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ جب محمد بن حسن مالک سے روایت حدیث کرتے تھے تو کثرتِ سامعین سے گھر بھر جاتا، گنجایش نہ رہتی، ایک موقع پر خلیفہ ہارون رشید کی آمد پر سب لوگ کھڑے ہو گئے، محمد بن حسن بیٹھے رہے، تھوڑی دیر کے بعد خلیفہ کے نقیب نے محمد بن حسن کو بلایا، ان کے شاگرد و احباب پریشان ہوئے، یہ خلیفہ کے سامنے پہنچے تو پوچھا کہ تم فلاں موقع پر کھڑے کیوں نہیں ہوئے، کہا کہ جس طبقے میں خلیفہ نے مجھکو قائم کیا ہے اس سے نکلنا میں نے پسند نہیں کیا، اہل علم کے طبقے سے نکلکر اہل خدمت کے

طبقے میں آجانا پسند نہیں آیا،

آپ کے ابن عم (یعنی آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے، جو شخص اس بات کو محبوب رکھتا ہو کہ آدمی اس کے لیے کھڑے رہیں، وہ اپنا مقام جہنم میں بنائے، آپ کی مراد اس سے گروہ علما ہے، پس جو لوگ حق خدمت اور اعزاز شاہی خیال کر کے کھڑے ہوں تو یہ دشمن کے لیے ہیبت کا سامان ہوگا، اور جو بیٹھے رہے انھوں نے اتباع سنت کیا جو آپ کے خاندان سے لی گئی ہے، اور آپ کے لئے زینت ہے، ہارون رشید نے کہا سچ کہتے ہو، (ابن ابی ذئب کے بیان میں اس سے زیادہ شاندار واقعہ پڑھو گے)

بیس برس کی عمر میں مسجد کوفے میں علم کی تعلیم شروع کردی تھی، یحیی بن صالح کا قول ہے کہ مجھے ابن اکثم نے پوچھا تم نے مالک کو دیکھا ہے، ان سے حدیث سنی ہے، محمد بن حسن کی صحبت میں رہے ہو کون زیادہ فقیہ تھا، میں نے کہا محمد بن حسن مالک سے افقہ ہیں، ابو عبید کا قول ہے کہ کتاب اللہ کا جاننے والا محمد بن حسن سے زیادہ کوئی نہ تھا ربیع بن سلیمان نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر میں یہ کہنا چاہوں کہ قرآن محمد بن حسن کی لغت میں اترا ہے، تو محمد کی فصاحت کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں، مزنی نے یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے کوئی موٹا آدمی محمد سے زیادہ سبک روح نہیں دیکھا، ان سے زیادہ فصیح بھی نہیں دیکھا، جب میں ان کو قرآن پڑھتے دیکھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن انہی کی لغت میں نازل ہوا ہے، ربیع بن سلیمان نے امام شافعی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نے محمد بن حسن سے زیادہ عاقل آدمی نہیں دیکھا، یحیی بن معین کا قول ہے کہ جامع صغیر میں نے محمد بن حسن سے حاصل کر کے لکھی ہے، ربیع کا قول ہے کہ امام شافعی کا مقولہ تھا کہ میں نے محمد بن حسن سے ایک شتر بار کتابیں سیکھی ہیں، مزنی سے کسی نے پوچھا کہ ابو حنیفہ کے حق میں کیا کہتے ہو، کہا، سیدہم، ان کے سردار ہیں، کہا اور ابو یوسف، کہا، اتبعہم للحدیث، ان میں حدیث کے سب سے زیادہ تابع۔ کہا، محمد بن حسن کہا، اکثرھم تفریعًا، سب سے زیادہ مسائل نکالنے والے، کہا زفر کہا، احدھم قیاسًا، قیاس میں سب سے زیادہ بہتر،

امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ فقہ کے معاملے میں سب سے زیادہ احسان مجھ پر محمد بن حسن کا ہے۔" محمد بن حسن

کا اپنے متعلقین کو یہ حکم تھا کہ مجھ سے دنیاوی کوئی فرمایش نہ کرو، جو ضرورت ہو میرے مختار سے لو، تاکہ میرا قلب فارغ البال رہے اور میں بے فکر رہوں،

ابن داؤد کا قول ہے کہ بصرہ والوں کا فخر چار کتابیں ہیں، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین، نیز کتاب الحیوان، سیبویہ کی الکتاب خلیل کی کتاب فی العین (آنکھ پر) ہمارا فخر ستائیس ہزار مسائل پر ہے، جو حلال حرام کے متعلق ایک کوفی محمد بن حسن کے نتیجۂ عمل ہیں وہ ایسے قیاسی وعقلی ہیں کہ کسی انسان کو ان کا نہ جاننا روا نہیں

ابراہیم الحربی کا قول ہے کہ میں نے احمد بن حنبل سے سوال کیا کہ یہ مسائلِ دقیق تم کو کہاں سے حاصل ہوئے کہا محمد بن حسن کی کتابوں سے،

قاضی ابن رجا رنے محمویہ سے (جو ابدال میں شمار ہوتے تھے) روایت کی ہے کہ میں نے بعد وفات محمد بن حسن کو خواب میں دیکھا، پوچھا، ابا عبد اللہ کیا گذری، کہا مجھسے ارشاد ہوا، میں تمکو علم کا خزانہ نہ بناتا، اگر تم کو عذاب دینے کا ارادہ رکھتا، میں نے کہا ابو یوسف کا کیا حال ہے، کہا فوق، مجھ سے باتر ہیں، میں نے پوچھا ابو حنیفہ کہا فوق بطبقات، ابو یوسف سے بہت سے طبقے اوپر،

خطیب نے امام محمد بن حسن کی بابتہ جرح بھی نقل کی ہے، جنمیں بعض سخت ہیں، مگر اس قریبًا ڈیڑھ ہزار برس کے زمانے میں، اکابر امت نے جو فیصلہ امام محمد کی عظمت کی بابتہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی جرح قائم نہیں رہ سکتی خطیب کا قول ہے کہ جو قول آخر میں نقل کروں وہ میری رائے ہے، (تذکرۃ الحفاظ) چنانچہ محمویہ کا خواب جو سب سے اخیر میں نقل کیا ہے، اس سے جرح و تعدیل کا فیصلہ خطیب کی تنقید کے مطابق بھی ہو جاتا ہے

محمد بن جریر الطبری صاحب التفسیر والتاریخ

ولادت سنہ ۲۲۵ھ، وفات سنہ ۳۱۰ھ، عمر ۸۵ سال، عراق و شام اور مصر کی خلق کثیر سے علم حاصل کیا، بغداد میں آکر بسے اور وفات تک وہیں رہے، ان ائمہ علما میں سے تھے جن کے قول پر فتویٰ دیا جاتا تھا، اور ان کی معرفت و فضل کی وجہ سے ان کی رائے مانی جاتی تھی، اتنے علوم کے جامع تھے کہ ان کے زمانے میں ان کی نظیر نہ تھی، کتاب اللہ کے حافظ تھے، قرأتوں کے ماہر، معانی قرآنی میں صاحب بصیرت

احکام قرآن کے فقیہ سنت اور اس کے طرق کے عالم نیز اس کے صحیح و سقیم و ناسخ و منسوخ کے صحابہ و تابعین اور انکے بعد کے علما کے اختلافی احکام و مسائل حلال و حرام کے عارف، تاریخ انسانی کے عارف، تاریخ الملوک والامم میں ان کی تاریخ مشہور ہے، ایک کتاب تفسیر میں ہے جس کے مثل کسی نے تصنیف نہیں کی، ایک کتاب کا نام تہذیب الآثار رکھا تھا اپنی نوعیت میں وہ بھی بے مثل تھی مگر تمام نہیں ہوئی، اصول فقہ و فروع میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بہت سے مسائل فقہ میں متفرد ہیں جو محفوظ ہیں، اقوال فقہا میں اپنی رائے سے ترجیح بھی دی ہے، سمعانی کی روایت ہے کہ ابن جریر نے چالیس برس تک روزانہ چالیس ورق لکھے ہیں (کل تعداد اوراق ۵۸۴۰۰ ہوتی ہے، شروانی)

فقیہ ابو طاہر اسفرائینی کا قول تھا کہ اگر کوئی شخص چین تک تفسیر ابن جریر کے لیے سفر کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ سفر نہیں کیا،

یہ بھی روایت ہے کہ ابن جریر طبری نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ آیا تم تفسیر قرآن سے خوش ہوگے، پوچھا کس قدر ہوگی، کہا تیس ہزار ورق، شاگردوں نے کہا ختم ہونے سے پہلے عمریں ختم ہو جائینگی، یہ سنکر تین ہزار ورق میں مختصر تصنیف کی، اس کے بعد پوچھا تاریخ عالم سے خوش ہوگے، جو آدم کے زمانے سے لیکر آج تک ہوگی، باقی سوال و جواب مثل تفسیر کے ہوے، جب تیس ہزار ورق کو شاگردوں نے زیادہ بتایا تو کہا انا للہ ماتت الھمم، انا للہ ہمتیں فنا ہو گئیں،

ابن بالویہ کا بیان ہے کہ تفسیر کا املا ابن جریر نے کیا، میں کاتب تھا، ۲۸۳ھ سے لیکر ۲۹۰ھ تک آٹھ سال میں لکھی، ابو بکر بن خزیمہ نے یہ سنکر تفسیر مجھ سے مستعار لی اور کئی برس کے بعد واپس کی اور کہا کہ اول سے لیکر آخر تک میں نے پڑھی، روے زمین پر محمد بن جریر سے بڑھکر عالم نہیں ہے،

حنبلیوں نے ان پر مظالم کئے، کسی کو ان کے پاس جانے نہیں دیتے تھے، جو جانا چاہتا تھا اسکو روک دیتے اسی کی وجہ سے حسین تیمی ان سے حدیث نہ سن سکے، کلام مجید اس خوبی سے پڑھتے تھے، کہ ابن مجاہد کا قول ہے، ما ظننت ان اللہ تعالی خلق بشرا یحسن یقرأ ھذہ القرأۃ، میرا گمان نہیں کہ خدا تعالی نے کوئی انسان پیدا

کیا ہو جو کلام اللہ کی اس قرأت کو اسی خوبی و حسن سے پڑھتا ہو، بعد وفات اپنے مکان میں دفن ہوئے، انکی وفات کی بابتہ اذن کسی کو نہیں کیا گیا، تاہم اسقدر مخلوق جمع ہوگئی کہ ان کے شمار اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، مہینوں شب و روز انکی قبر پر نماز جنازہ پڑھی گئی،

حلیہ | رنگ پختہ، آنکھیں بڑی بڑی، نحیف الجسم، بلند و بالا، خوش بیان، باوجود پچاسی برس کی عمر کے سر اور داڑھی کے بال کثرت سے سیاہ تھے، اس سے قوت مزاج کا اندازہ کرو، رضی اللہ عنہ،

للہ در الطبری

اذا اعسرت لم اعلم رفیقی واستغنی فیستغنی صدیقی

حیائی حافظ لی ماء وجہی ورفقی فی مطالبتی رفیقی

ولو انی سمحت ببذل وجہی لکنت الی الغنی سہل الطریق

محمد بن عبد الرحمن بن المغیرۃ بن الحارث بن ابی ذئب مدنی | پیدائش ۸۰ھ، ابو الحارث القرشی المدنی، عکرمہ مولی بن عباسؓ نافع مولی بن عمرؓ، ابن شہاب الزہری وغیرہم سے حدیث سنی، سفیان ثوری، وکیع، عبد اللہ بن مبارک، یحیی بن سعید القطان اور ان کے سوا ایک جماعت نے اُنسے حدیث روایت کی ہے، ثقہ صالح متقی تھے، آمر بالمعروف ناہی بالمنکر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جرأت میں ان کی مثال سعید بن المسیب سے دیجاتی ہے، یہی قول امام احمد بن حنبل کا ہے،

امیر المومنین مہدی نے ان کو بغداد بلایا، وہاں روایت حدیث کی، امام شافعی کا قول تھا کہ مجھ کو دو صاحبوں کے نہ ملنے کا افسوس ہے۔ لیث اور ابن ابی ذئب، امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ابن ابی ذئب ثقہ، صدوق ہیں، مالک بن انس سے افضل تھے، مگر مالک تنقیۂ رجال میں زیادہ شدید تھے، ابن ابی ذئب کو اس کی پروا نہیں کہ کس سے روایت کرتے ہیں، ان کا مثل ان کے بعد نہ ان کے بلاد (حجاز) میں تھا اور نہ دیگر بلاد میں، ابن خلاد کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی کا سفر حج کے دوران

میں مسجد نبوی میں ورود ہوا، خلیفہ کے داخل مسجد ہوتے ہی تمام حاضرین کھڑے ہو گئے، صرف ابن ابی ذئب بیٹھے رہے، مسیب ابن زبیر نے کہا، کھڑے ہو جاؤ یہ امیرالمومنین ہیں، ابن ابی ذئب نے جواب دیا، انما یقوم الناس لرب العالمین، آدمی صرف پروردگار عالم کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، خلیفہ اس جواب کی جلالت سے کانپ گیا، ابن زبیر سے کہا ان کو چھیڑو میرے سر کے تمام بال کھڑے ہو گئے،

ابونعیم کی روایت ہے کہ جس سال منصور نے حج کیا، میں نے بھی اسی سال حج کیا، میری عمر اس وقت اکیس برس کی تھی، ابن ابی ذئب اور مالک بن انس خلیفہ کے ساتھ تھے، غروب کے قریب خلیفہ نے ابن ابی ذئب کو بلا کر اپنے پاس دارالندوہ پر بٹھا کر پوچھا کہ تمھارا خیال حسن بن زید کی نسبت کیا ہے، جواب دیا، انہ لیتحری العدل، وہ انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ سنکر منصور نے دو یا تین مرتبہ پوچھا، میری نسبت کیا کہتے ہو، ابن ابی ذئب نے فرمایا، ورب ھذہ البنیۃ انک لجائر، قسم ہے اس عمارت (کعبہ) کے رب کی تمھارے ظالم ہونے میں شک نہیں، ربیع حاجب نے یہ سنکر ان کی داڑھی پکڑ لی، منصور نے بگڑ کر کہا، اے گندی عورت کے بیٹے چھوڑ دے، اس کے بعد تین سو اشرفی انعام کا حکم دیا،

ابن ابی ذئب نے ایک بار منصور سے کہا،

امیرالمومنین تمھاری رعایا تباہ ہو چکی، کاش تم ان کی مدد مال غنیمت سے کرتے،

منصور، تمہیں تباہی! اگر میں سرحدوں کی حفاظت نہ کرتا اور لشکر نہ بھیجتا تو تمھارے گھر میں خوب گوشت پکتا،

ابن ابی ذئب، تم سے جو بہتر تھے انھوں نے سرحدوں کی حفاظت، لشکروں کا سرانجام فتوح تم سے زیادہ کیں، اور اسی کے ساتھ آدمیوں کو مالامال کیا،

منصور۔ تم پر تباہی، وہ کون تھے؟۔

ابن ابی ذئب ۔ عمر بن خطاب،

یہ سنکر منصور نے سر جھکا لیا، المسیب کے ہاتھ میں تلوار تھی، ابن ہشیم کے ہاتھ میں چوب، منصور اُس طرف تو متوجہ نہ ہوا، محمد بن ابراہیم امام کیطرف دیکھکر کہا، ھذا اخیر اھل الحجاز، یہ تمام اہل حجاز میں برگزیدہ ہیں،

ابن ابی ذئب تمام شب خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت میں مصروف رہتے، اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ کل قیامت قائم ہو جائے گی تو ان کو کچھ کرنا نہ تھا، ایک روز روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے، ایک مرتبہ شام میں زلزلہ آیا، ایک شامی نے ان سے زلزلے کی بابت پوچھا، انھوں نے متوجہ ہو کر حدیث بیان کی، وہ سنتا رہا، جب ختم کر چکے تو کسی نے کہا کھانا کھا لیجئے، (وہ دن افطار کا تھا) کہا آج ملتوی رکھو، اس کے بعد مرتے دم تک تمام عمر روزے رکھے افطار نہیں کیا، تنگ دست تھے، روٹی اور تیل غذا تھی، ایک قمیص تھی ایک طیلسان، اسی میں گرما و سرما کے موسم بسر ہوتے، وکان من رجال الناس صراحۃ وقولاً بالحق، سیف بیانی اور حق گوئی میں جوانمردوں میں سے تھے حدیث کی سماعت بڑی عمر میں شروع کی، جن شیوخ سے اس تاخیر کی وجہ سے نہ مل سکے، ان کے نہ ملنے کا افسوس رہا،

تمام حدیثیں حفظ تھیں کسی کتاب میں لکھی ہوئی نہ تھیں،

امام احمد بن حنبل نے ان کو حدیث میں ثقہ اور دینداری، تقوی اور حق گوئی میں امام مالک سے افضل کہا ہے، یہ بھی فرمایا ہے کہ ابن ابی ذئب منصور کے پاس گئے، حق کہنے میں ذرا بھی نہ ڈرے، صاف کہدیا الظلم فاشٍ ببابک، تمہارے دروازہ پر ظلم پھیلا ہوا ہے،

۱۵۹ھ میں وفات پائی، ۷۹ برس کی عمر تھی، جعفر بن سلیمان نے پہلی مرتبہ والی مدینہ ہونے پر انکو سو دینار دیئے تھے ان میں سے دس دینار کو ایک کُروی جبہ خریدا، ساری عمر وہی پہنا، انکے بعد ان کے بیٹے نے تیس برس پہنا،

خاکسار کہتا ہے کہ اس فقیرانہ گدڑی میں سے حق کے شعلے نکلتے تھے، خوش خوراکی و خوش لباسی کے دلدادہ وہ شعلے کہاں سے پیدا کریں گے،

(باقی)

خسرو باغ کے مقبرے

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف حیات جلیل الہ آباد،

(۲)

مقبرۂ خسرو

مقبرۂ خسرو ایک کنارے پر واقع ہے، اوس کے بعد کوئی مقبرہ نہین نہ اور کوئی چیز، باغ کے صدر (جنوبی) دروازہ سے وہان تک پہنچنے کے لئے کوئی مستقل راستہ بھی نہین بنایا گیا، آپ کیاریون کے کنارے کنارے یا روشون پر ہوکر نکل جائیے، "راہ راست برو اگرچہ دوراست" پر عمل فرماتے ہون، تو پھاٹک سے سیدھے سڑک پر ہوکر شاہ بیگم کے روضے تک (۲۰۰ قدم) تشریف لے جائین، وروہان سے مقبرون اور حوضون کو دیکھتے ہوے، خسرو کی قبر تک، یہ بھی کچھ دور نہین، مقبرون کے باہم درمیانی فاصلہ شرقاً غرباً تیس میس قدم ہوگا، سیر و تفریح کا شایق، یا آثار قدیمہ کا دلدادہ چارسو قدم آسانی و خوشی سے طے کر لیتا ہے،

مقبرہ ایک مرتفع پختہ (خشتی) چبوترہ پر بنا ہے جسکی بلندی ڈھائی فٹ (خسرو باغ کے باقی مقبرون سے ایک فٹ زائد) ہے، چڑھنے کے لئے پتھر کی تین سیڑھیان موجود ہین، چبوترہ مربع اور خوب وسیع و فراخ ہے، ہر ضلع انچاس گز، اسی چبوترہ پر پھر ایک اور چبوترہ بلند اور سنگین نقشدار (پتھرون کا) واقع ہے، یہ بھی چوکور ہے، ہر پہلو چبیس گز، بلندی ایک گز کے قریب، مقبرہ کی عالیشان تعمیر اسی پر ہوئی ہے، سب ملاکر کرسی کی بلندی پونے دو گز سے بھی زیادہ ہوگی، بحد حسب دستور عام خام اور مسطح زمین پر تہ خانہ مین ہے، مقبرہ کے فرش بالائی سے اس کے اندر پہنچنے کے لئے کبھی راستہ رکھا گیا تھا، اب مسدود ہے، قفس زندگی کے ہم جیسے زندانیون کی رسائی وہان تک دشوار ہے، اس لئے اوس کی صورت کشی یا موجودہ حالت کے بتلانے سے معذور و قاصر ہون،

عمارت مقبرہ ایک منزل کی ہے، مگر دُور سے دو منزلہ معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ درون اور محرابون کی قطارین جیسی اوپر ہین، ویسی ہی نیچے بھی ہین، فرق یہ ہے کہ اوپر والے دروازے اور بند دراتنے اونچے نہین ہین، جتنے کہ نیچے والے ہین، مگر دونون قطارین ایک ہی بنیاد پر قائم ہین، ہر ضلع یا پہلو مین پانچ پانچ دروازے (ہر سمت) ہین، بلند سادہ وضع کی محرابین ہین، درون کی چوڑائی چھ چھ فٹ ہوگی، کنارون کے دو دو دروازون مین زینہ ہے، دوسرا اور چوتھا ہر طرف کا بند ہے، طرق تعمیر اور محرابین اور نشانات سب کے یکسان ہین، محرابون کے اندر دیوار مین طاق ہین، ان کے پتھرون پر خط نستعلیق مین، اُبھرے ہوئے حروف مین اللہ اللہ کندہ ہے، اسی طرح زیر و بالا محرابون پر نقطۂ تماس کے دونون جانب کلمۂ طیبہ خوبصورت دائرون کے اندر کھدا ہے، گنبد مقبرہ کے چارون سمت، بیچ والی محرابون کے اوپر بڑے بڑے طاقچے ہین، ان مین پتھر کی جالیان اندر کی طرف پیوست ہین، آپ اُن کو ایک قسم کی گیلری تجویز کر سکتے ہین،

سامنے کے رُخ دُوسری چبوترہ پر چڑھنے سے، داخلہ کے دروازہ کے آس پاس اخیر کی دونون محرابون مین اوپر جانے کیلئے آمنے سامنے زینے ملین گے، سیڑھیون کی تعداد اُنیس اُنیس ہے، ایک خوش خیال مسلمان کا قیاس ہے، کہ حروف بسم اللہ کی رعایت سے یہ عدد فرد (۱۹) اختیار کیا گیا ہوگا، حفاظت و نگہداشت کے لئے ان زینون مین کواڑ لگا دئے ہین، نیچے شروع مین صرف پتھر کی چوکھٹ بازو ہے، اوپر پہنچکر زینہ کے ختم پر دروازے مین کواڑ ہین، کھولنے پر ایک چھوٹی سی مسطح جگہ اور اس کے بعد ایک قسم کی تنگ کنگنی (کارنس) ملتی ہے، کسی وقت لوگ باحتیاط کھسک کھسک کر محرابون مین آجاتے تھے، اور محرابون کے پاس سے جو گھومتا ہوا زینہ اوپر گیا ہے، اُس پر چڑھ جاتے تھے، یہ مرحلہ خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لئے کواڑ اب بند رہتے ہین، اس انسداد مین ایک مصلحت ظاہری مزار کی حُرمت و تعظیم بھی کارفرما ہے،

چھت کے چارون کونون پر نہایت مختصر بلکہ برائے نام منارے ہین، گوشے خالی نہین چھوٹے لوہے کی سیخون پر مختلف چڑھاؤ اُتار کے کلس پہنا کر ایک مخروطی شکل و ہیئت پیدا کر دی گئی ہے، اُس سے کچھ ہٹ کر گنبد کے متصل (دونون کے وسط مین) ایک ایک گونذی بنی ہے، جسکو بعض لوگ (شاید فن کی زبان مین) گلدستہ کہتے ہین، یہ ضرور خوشنما اور مشرقی تکلفات تعمیر کی علمبردار و یادگار ہے، ہلکے پھلکے چھوٹے چھوٹے آٹھ آٹھ ستونون پر چھجے کے لئے پتھر لگا کر بقدر مناسب باہر نکال کر اوپر کو

ایک خوبصورت گول قبہ بنا دیا ہو، کم و بیش گولائی، اونچائی، اور مختلف وضع کے کلس اوسکی رونق بڑھا رہے ہین، یہ ایک ہوادار خوبصورت نشین ہے، مگر وہان تک پہنچنا یا بیٹھ کر لطف اوٹھانا دشواری و نزاکت سے خالی نہین،

مقبرہ پر ایک بہت بڑا گنبد سایہ افگن اور قبر کے پورے دور پر محیط ہے، یہ عظیم الرفعت برج سقف عمارت کے وسط یا ضخیم دیوار کے اندر والے حصے پر سے اٹھایا گیا ہے جس سے نہ صرف عمارت مین حسن پیدا ہوگیا، بلکہ دوبالا ہو جاتا ہے، اور اس مقبرہ کو خسرو باغ کی تمام تعمیرات سے ممتاز و شاندار بنا رہا ہے، حسب معمول اس پر بھاری بھاری اُلٹے بنے ہین جو ٹی پر کلس ہے،

عمارت تمام و کمال سنگ سرخ کی ہے، اس کے ساتھ سنگ کھلو یعنی زرد رنگ کے پتھرون کا استعمال واشتمال ایک خاص کیفیت و لطف پیدا کرتا ہے، جالیان سب لال پتھر کی ہین، انکا قدرتی رنگ چونے کی سفید قلعی سے اب بے رونق و بدزیب ہوگیا ہے، اندر چونے اور گچ کی استرکاری ہے، مگر سچ یہ ہے کہ ایسی سنگ تراشی و نقاشی کے نمونے الہ آباد کی بعض پرانی مساجد اور خانقاہون مین بھی نظر آتے ہین، کوئی بے نظیر چیز نہین، دیوار کی چوڑائی ٹھوس ہو یا نمایشی چودہ فٹ ہوگی، یہ بھی تعجب کی بات نہین، جہانگیر کے مقبرہ واقع شاہدرہ (لاہور) کی دیوارون کا آتار پانچ گز سے کم نہین پایا جاتا، مقبرہ مین داخل ہونے کے لئے ہر طرف صرف ایک ایک دروازہ وسط کا کھلا رکھا گیا ہے، باقی دروازے سنگی خوشنما پھولون درخانہ دار جالیون سے بند ہین، فی الحال صرف دکھن رُخ کا بیچ والا دروازہ قبر تک آنے جانے کے واسطے نامزد ہے، باقی سمتون کے مقفل رہتے ہین، چوکھٹ بازو پتھر کے ہین، اور کواڑ لکڑی کے، ہندوستانی طرز کے مگر معمول سے کسی قدر زیادہ خوش وضعی کے ساتھ بنائے گئے ہین، تقریباً مرمّت ہین، بعض حصون پر کہنگی اور دیرینہ سالی نمودار ہے، پچھم والا یقیناً تبدیل کرکے نیا لگایا گیا ہے، اس مین بھی اصلی نمونے کی پابندی کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے بدنما نہین قرار دئے جا سکتے، سرخ لاکھی رنگ پھرا ہے، اسی جنوبی (وسطی) دروازے کے اوپر محراب کے اندر دو پریان بنی ہین رنگین ہین، بظاہر اسوقت کا درباری لباس زیب تن ہے، ایک کی شبیہ پوری پوری ہے، جو اڑ رہی ہے اور کتاب کی سی کوئی چیز ہاتھ مین لئے ہے دوسری کا صرف چہرہ اور پر بنے ہین، یہ تصویرین کسی اور دروازہ پر نہین ہین، قیاس کہتا ہے کہ چابکدست مصور یا نقاش نے اُس وقت

کی تصویر کھینچی ہے، کہ جسوقت (حسب روایت پٹیر منڈسے صاحب) ملک الموت نازل ہوا تھا، اور شاہزادہ قرآن پڑھ رہا تھا، فرشتہ کی صورت اہلِ بنزبریون سے مُشابہ بناتے ہین، ہاتھ کی کتاب سے خدا کی کتاب مراد ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ رحمت کا فرشتہ نذر و نیاز ذرود و سلام کا پیشکش ہاتھ مین لیکر ایصالِ ثواب کی اجازت لینے عالمِ بالا کو جارہا ہے، کسی ممتاز مسلمان کی گور پر تصویر کا بنایاجانا ایک نئی اور تعجب خیز بات ہے، مگر یہان تو وہی، ع :- سرِ مزار مجاور بھی نوحہ گر بھی ہے،

حُجرۂ قبر اندر کی جانب کچھ بلندی تک جہان محرابین ختم ہوتی ہین، چوکور بنا ہے، جہان سے گنبد کا دَور دَورہ شروع ہوتا ہے، گول ہو تا گیا ہے، چھت بھی خوب بلند ہے، اس کے نقطۂ علو کے گرد ایک دائرہ اور اس دائرے کے ہشت پہل، ا وبھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے، اور ملاتے ہوئے دائرے، اور پھر دائرہ بناتے ہوئے رنگین پھول ہین، اُن مین سے متصل ا وبھرے ہوئے مثلث اور قوسین اور پھول بھی بنتے چلے گئے ہین، یہ مثلثون، قوسون، اور دائرون کا لگاتار سلسلہ ایسا ملا چلا آتا ہے، جیسے کوئی پھولون کا جال در جال اوپر سے نیچے تک بچھا ہو، حسرت ہے اور افسوس، کہ ناواقفیت فن و عدم ذہانت و مہارت کے باعث سے میرا قلم اس چیز کی صحیح صورت کشی سے عاجز ہے، اور اس طلسمِ رنگین کو محض ایک گورکھ دھندا بنا کر چھوڑ نا چاہتا ہے، ورنہ اہلِ نظر کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ کام اور یہ رنگ آمیزی مغلون کے عہدِ زرین کی پینٹنگ اور نگار بندی کی بہترین یادگار ہے، اور الہ آباد کی لئے مایۂ ناز،

اس کارنامۂ رنگ و جمال کے نیچے، مگر محرابون کے اوپر چارون سمت اشعار لکھے ہین یعنی تاریخ کا پورا قطعہ گردن مین سیاہی سے مرقوم ہے، مقبرہ کے اندر اُس حصہ پر جو مربع ہے، طاقون پر اللہ، اللہ اور محرابون کے دونون جانب خوشخط نستعلیق مین کلمۂ طیبہ لکھا ہے، کندہ نہین ہے،

در و دیوار پر چارون طرف پھول پتے بنے ہین، محرابون اور طاقون کے گرد کے بیل بوٹے بالخصوص دلآویز ہین، سرو شمشاد کے جھاڑ بھی ہین، یہ تمام نقش و نگار پختہ شوخ رنگ، مصالحون سے بنائے گئے تھے، دست و برد زمانہ سے اب مٹتے جارہے ہین، مرمت مین عمارت کے حفظ و بقا کا انتظام کیا جاتا ہے، نقوش اور گلکاریون کے قائم اور برقرار رکھنے کا التزام مدنظر نہین رہتا، اسی طرح طاقون پر جو کچھ کام تھا یا تکلفات تھے، ان کو صدیون کے امتداد اور چراغون کے

اندھیرے نے تقریباً محو و محو کر دیا ہی،

سلطان خسرو کی قبر عرف عام مین، اوسکی بے گناہی اور خون ناحق کے سبب سے یار شاہ ورد آجا مزار کہلاتی ہے، مسٹر فرنیچ اپنے سفرنامہ مین لکھتے ہین[٥١] کہ مسلمان بادشاہون کی قبرین عام طور پر متبرک مانی اور سمجھی جاتی ہین، ان کا بڑا ادب و احترام کیا جاتا ہے، مسلمانون کی نسل کا یہ ایک طرۂ امتیاز ہے، کہ وہ اپنے بادشاہون کو پیوند خاک ہوجانے کے بعد بھی یاد رکھتے، اور بڑے خلوص و وفا کے ساتھ اظہار تعظیم و طاعت کرتے ہین، تربت سوا تین فٹ بلند چبوترہ پر واقع ہے، جس کا طول و عرض یکسان ہے، ساڑھے تیرہ تیرہ فٹ، تعویذ دو فٹ اونچا ہوگا، آٹھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا، سب ملاکر قبر کی بلندی، سوا پانچ فٹ ہوئی، چبوترہ کی بغلی دیوارون مین تین تین دلے خوشنما جدولون سے مصور ہین، قبر پر ایک انچ موٹا، مضبوط چونے کا پلاسٹر ہے جسکو اوس وقت کے طریقہ پر پالش کرکے جلا دیدی گئی تھی، سنگ مرمر کے مثل چمکنے لگا، مگر مرور زمانہ سے اب اس مین وہ آب و تاب باقی نہین رہی، ماند ہوتی جاتی ہے، دھوندلاپن اور خاکستریت چھاگئی ہے، اور دو جگہ مصالحہ بھی اوکھڑ گیا ہے جس سے یہ کیفیت و حقیقت کھل گئی، ورنہ اس لطیف و نازک صناعی کی بدولت ہر دیکھنے والا سنگ مرمر کا دھوکا کھاجاتا ہی،

تعویذ کے باہر چارون گوشون پر چودہ چودہ انگل کے فصل پر چوکور سوراخ ہین، خادم دمجاور کہتے ہین، کہ کچھ زمانہ پہلے یہان نقرئی ستون نصب تھے، جو زبردستون کی دراز دستی کے نذر ہوگئے، اوراق تاریخ شاہد ہین، کہ انھین چاندی سونے کے کھمبون پر مخمل کے زرین شامیانے کھڑے کئے جاتے تھے، پادری منڈی صاحب نے لکڑی کا حظیرہ (کٹہرہ) اور سیپیون اور موتیون کی جڑائی بہین دیکھی تھی، آج اسکا نشان بھی باقی نہین نہ کوئی پتہ دینے والا ہے ع حسرت سے دیکھتا ہون در و بام کی طرف، خیال رہے کہ اس قسم کی قیمتی نذرون نفیس و باریک دست کاری کی چیزون اور آبنوس پر لطیف و نازک پچی کاری کے چپر کھٹون کا مقابر پر چڑھانا اور لگانا صاحب مقدرت لوگون مین عام طور پر رائج تھا جس کے قابل دید نمونے شیخ سلیم چشتی کے روضہ[٥٢] (فتحپور سیکری) اور خواجہ نظام الدین کے مزار[٥٣] (دہلی) پر اب تک موجود اور اپنے اولو العزم

٥١ ص٦ ٥٢ سیاحت مقبول، ص٩ سفرنامہ مسٹر فرنیچ ص١٢ ٥٣ آثار الصنادید ص٣٥ مفتاح التواریخ ص١٣٤ تحفۃ الامرا ص٥٣،

عقیدتمندون کی یادگار ہین،

خسرو کی قبر کے ادھر اودھر (پورب پچھم) نسبتہً چھوٹی چھوٹی دو قبرین شہ نشینون مین ہین، ایک داہنے پہلو مین ہے، دوسری بائین مین، اُن پر کوئی کتبہ نہین جس سے صاحبِ قبر کا پتہ چل سکے، ایک کے تپھر پر صرف اللہ اللہ کندہ ہے، مجاورون کا بیان ہے، کہ پورب والی قبر مرد (لڑکے) کی ہے، پچھم والی لڑکی کی، ہیئت کذائی بھی اس قول کی تصدیق کرتی ہے کس کا لڑکا تھا اور کون سی لڑکی؟ یہان کیسے پہنچے؟ کیا نام تھا؟ تاریخ کی زبان اس بارہ مین خاموش ہے،

قبر کے دکن ایک تنگ کھڑکی ہے جس کے اندر زمین دوز راستہ بنا تھا، مگر اس وقت بند ہے، غیر مستند و غیر محقق روایت ہے، کہ اکبر اکبر کے قلعہ تک جاتا تھا جسکو بعض مصلحتون سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد نے مسدود کرادیا، میرے نزدیک سُرنگ کا قصہ بداہتہً غلط اور ایک بے بنیاد افسانہ ہے، یہ راستہ قبر والے تہ خانے تک پہونچ کر ختم ہوجاتا ہوگا،

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل، ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی یہ مختصر تحریر جزؤا درست ہے کہ مقبرہ پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہے، اس کے اندر پھولون اور چڑیون کی تصویرین ہین[1] بے شبہہ مقبرۂ خسروانی وسعت وفسحت اور عالی شان بُرج کے لحاظ سے، یا یون کہئے کہ بحیثیت مجموعی اپنے ہمسایہ مقابر بلکہ ضلع الہ آباد کی تمام متفرق شاہی عمارتون سے نمایان اور بلندی و خوبصورتی مین ممتاز ہے لیکن تاج کے ساتھ اوس کی مماثلت کیا ہوسکتی ہے تاج، دنیا کا تاج اوس کے سالہائے دراز بعد بنا ہے، مقبرۂ خسرو کے لئے اوس کی نظیر شاید بے نظیر شہرت ونام کی وجہ سے دی گئی ہو،

خسرو نے بھری جوانی مین جان دی تھی، فرزانگان فن کا تجربہ ہے، کہ جس درخت کی شاخین بہار مین اٹھان کے وقت کاٹ دی جاتی ہین، وہ خوب بڑھتا، اور پھیلتا ہے، خسرو کی نو دپودہ تو برابر قطع ہوتی رہی، بڑھنے نہین پائی۔ مگر شاید اس کلیہ کے ماتحت مزار خسرو کے خادم ومجاور یا مقبرہ کے محافظ اچھی عمر پاتے ہین، موجودہ خادم

---

[1] مطبوعہ ۱۸۸۳ء جلد اول صفحہ ۱۹۸ نیز صفحہ ۱۹۲ مطبوعہ ۱۸۸۵ء

اسّی سال کا ایک پیر مرد ہے، اس کا پیشیر داس کا بڑا بھائی سو برس کا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا،

خسرو اور اوسکی مادر گرامی نژاد کے مقابر کے گرد و پیش کی آبادی اور تعمیرات شاہی کا سلسلہ "خلد آباد" کہلاتا ہے۔ گور سلاطین کے متصل بستیون کا یہ نام تبرکًا و تیمنًا اور جگہ بھی رکھا گیا ہے، زمان و مکان کی قید نہین، دکن مین اورنگ آباد کے قریب شہنشاہ عالمگیر کے روضہ کے اطراف کو بھی یہی شرف تسمیہ حاصل ہے،[۱] سرکاری گزٹیر کی روایت ہی کہ خسرو کی جلا وطنی کی حالت مین خلد آباد کے سادات نے اوسکی رفاقت کی تھی، مگر اپنے ماخذ یا کسی تاریخ کا حوالہ نہین دیا، جس سے ان شرفا کے نامون اور کارنامون کا علم اور عصر حاضر مین ان کے اخلاف کی تحقیق و تصدیق ہو سکے، نہین جانتا کہ زمانہ جلای وطن سے لکھنے کا مقصود کیا ہے، خسرو کی پوری زندگی مین کچھ دن بھی ایسے نہین پائے جاتے، جن پر اس کی تعریف صادق آسکے، بچپن، اور کچھ جوانی دادا جان (اکبر) کے دربار اور سایۂ شفقت مین امن و امان، عیش و فراغت کے ساتھ گذری، اس کے بعد باپ کی نظربندی و نگرانی مین بھاگا، لڑا، پکڑا گیا، اور عمر بھر قید و حبس مین رہا، خسرو کی تمام کارزار حیات اور کارنامون مین اسکے رفقا اور جان نثارون کی فہرست مین جو گرفتار اور بعد ازان لقمۂ نہنگ اجل ہوتے رہے، کسی "الہ باسی" کا نام نہین ملتا،

کہہ چکا ہون کہ شاہزادہ کی عظمت اور اوسکے روضہ کی حُرمت عوام مین اب بھی باقی ہے، برسات کے موسم مین یہین، اُس کے مزار پر ہر سال میلا لگتا ہے، شیرینی چڑھائی جاتی ہے، رات کو روشنی ہوتی ہے، گانا بجانا بھی، خسرو باغ کا بڑا پھاٹک جو معینہ قواعد و احکام کے بموجب معمولاً بند کر دیا جاتا ہے، اس شب کو کھلا رہتا ہے، یہ رات اس پھاٹک اور اوس باغ کیلئے شب برات، رونق اور چہل پہل کا باعث ہوتی ہے، جنت نصیب شاہزادہ کی بدولت باغ کے دن بھی

---

[۱] ایلورا کے غارون سے پون میل اور دولت آباد سے ساڑھے آٹھ میل کے فاصلہ پر حضرت شاہ برہان الدین غریب کا روضہ (مرقد مبارک) مسلمانون کی مشہور زیارت گاہ ہے، جس کے پایٔن دفن ہونے کو نظام الملک آصف جاہ نے بھی سعادت و برکت کا باعث سمجھا تھا، یہ مقام پہلے روضہ کہلاتا تھا، اورنگ زیب خلد مکان دفن ہوا، تب سے "خلد آباد" کہلاتا ہے، (مفتاح التواریخ صفحات ۴۴۱ و ۴۹۵، و تاریخ اگرہ صفحہ ۶۱، قاموس المشاہیر صفحہ ۱۲۶، ۵۳، سلسلہ جدید جلد ۲۳ صفحہ ۹۶۔

پھر جاتے ہین، اسی رات مین پھاٹک پر نعل چڑھائے جاتے، کیون سے جڑے جاتے ہین،
کے بھی ہوتے تھے، جن کی دیکھنے والی آنکھین اور شہادت دینے والے لوگ اب تک باقی ہین، لیکن
یا حقیقۃً افلاس کے مارے اب عموماً لوہے کے رہ گئے ہین، اس اجتماع مین حسب معمول ہندؤن کی تو
ہوتی تھی، مسلمانون کی کم خوش اعتقاد مسلمانون کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کا سالانہ عُرس سمجھا جاتا
یا رسوم کے اعتبار سے ملک کی بول چال مین میلا، بہرصورت حاجت مندانِ عقیدت کیش خسرو شہید کے
بھی منتین مانتے، مرادین مانگتے، اور سب کچھ پاتے ہین، مشعلین اور روشنی ساتھ لاتے اور قبر پر حسب حیثیت
رات کے آٹھ نو بجے تک ایک اچھا خاصہ صاف ستھرا، شہری نیز دیہاتی، ملا جلا، مجمع دیکھنے کے قابل ہو
بروز کم ہوتا جاتا ہے، کچھ تو اعتقادات مین فرق آنے کی وجہ سے اور کچھ مخلوق کے اپنے اپنے اشتغالات
کے باعث سے،

حتی کہ اب شہر کے اعلیٰ وادنیٰ بھی اس سے کم واقف ہین کہ بھادون مین جب کہ یہان
پر سلیم سرائے کے قریب، مامون بھانجے کا میلا دیوگیری مین (ہندون کا) لگتا ہے، تو اوسی کے سا
پہلی دو جمعراتون کو یہان بھی ہوتا ہے، مقامی شہرت و اہمیت گھٹ جانے کے سبب سے، یا یہ کہ حسب
مجاورون کو کسی قدر اہتمام و اعلان کرنا پڑتا ہے، پھاٹک پر نقارہ بجایا جاتا ہے، لوگ آجاتے
سے محبت و عقیدت رکھنے والے جمع ہو کر اس کی تربت پر دو پھول چڑھا دیتے ہین، آپ جائین
گزری ہوگی تو بھی کچھ نہ کچھ باسی ہار اور بکھری ہوئی، پژمردہ و افسردہ کلیان وہان دیکھین گے، گ
(میلون کی) فہرست مین اس کو شامل نہین کیا ہے، بعض اور میلے بھی جن کی نوعیت بالکل مذ
کر دئے ہین،[1]

---

[1] ڈسٹرکٹ گزٹیر جدید جلد ۲۳ صفحہ ۶۶،

تاریخ اسلام کا ایک ورق

۷۶۷ھ میں اسکندریہ کی تباہی اور اوس کے چشمدید حالات

از

مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی، مہتمم تالیفات ریاست رام پور، وسابق رفیق دارالمصنفین

ممالک اسلامیہ پر صلیبی مجاہدین کے حملون کا سلسلہ گیارہوین صدی عیسوی کے اخیر سے شروع ہو کر چودہوین صدی کے وسط تک جاری رہا، اس سلسلہ کی آخری کڑی وہ تھی، جو ۷۶۷ھ مین اسکندریہ پر بلاے آسمانی کی شکل مین نازل ہوئی، اس حملہ کا علمبردار قبرس کا فرمانروا پیٹر اول (PETER-I) تھا، اس نے قبرس پر ۱۳۵۹ء سے ۱۳۶۹ء تک حکومت کی، انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا کے مضمون نگار کا بیان ہے، کہ چودہوین صدی مین صلیبی جہاد کا عام جوش سرد پڑ گیا تھا، اور اس وقت مسیحی دنیا مین صرف پیٹر ہی ایک ایسا تاجدار تھا کہ جس نے ارض مقدس کی واپسی کے لئے اپنی تلوار بے نیام کی، اور اس کے وزیراعظم پی ڈمیزرس (P.DE. MEZIERES) نے تمام یورپ کا دورہ کر کے اس آگ کو بھڑکانا چاہا، اگرچہ سلاطین یورپ اس جنگ مین شریک نہین ہوئے، تاہم اس وزیر کی کوشش سے پرستاران صلیب کی ایک بڑی جماعت قبرس مین مجتمع ہوگئی، اور خود شاہ قبرس کی زیر قیادت حضرت مسیح کی ان بھیڑون نے اسکندریہ مین وحشت و بربریت کا وہ ہولناک منظر پیش کیا، کہ اوس کے تخیل سے آج بھی آنکھون مین خون کے آنسو بھر آتے ہین،

اس واقعۂ ہائلہ کے متعلق کتب خانہ مشرقی پٹنہ مین تقریبًا پانچسو صفحات کی ایک ضخیم کتاب موجود ہے، ٹائٹل پیج پر کاتب نے اپنی جہالت سے کتاب کا نام "مرأة العجائب للواقدی" لکھدیا ہے، اس کتاب کا ایک غیر مکمل نسخہ برٹش میوزیم

لندن مین بھی ہے، مگر وہ شاید ہمارے اسی نسخہ کی نقل ہے، یا کم سے کم دونون ایک ہی اصل سے منقول ہین کیونکہ "مراۃ العم
للواقدی" والی غلطی بعینہ وہان بھی موجود ہے، اس کتاب کا ایک تیسرا نسخہ برلن کے کتب خانہ مین ہے، اس مین مصنف کا نا
مذکور نہین ہے، لیکن کتاب کا صحیح نام مندرج ہے، خود مصنف نے زیر تبصرہ نسخہ کے صہ۲ مین اس کتاب کو "الالمام فیما جر
من الاحکام والامور المقضیۃ من وقعۃ الاسکندریۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے، اگرچہ مصنف کا نام بالتص
موجود نہین ہے، تاہم وہ اپنی نسبت "النویری" کو اکثر ذکر کرتا ہے، علاوہ برین صہ۲۳۱ مین مصنف اپنے ایک قصیدہ مین جسکو اوس نے
ایک دوست شیخ شرف الدین ابوحفص عمر بن سید الناس صدر مدرس مدرسۂ مالکیہ فیوم کی تعریف مین لکھا ہی اپنے کو ابن قاسم کے نام سے
مخاطب کرتا ہے، چنانچہ وہ شعر جسمین یہ نام آتا ہی درج ذیل ہی:-

ان ابن قاسم مخلصًا لك بالدعاء

یرجو الاجابۃ من الہ الناس،

مذکورۂ بالا تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ درحقیقت یہ وہی کتاب ہے، جس کو حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (جا
صہ۱ مطبوعہ یورپ) مین تاریخ اسکندریہ کے سلسلہ مین اس طرح بیان کیا ہے، :-

وفی وقعتہا الحادثۃ کتاب لمحمد بن قاسم النویری المالکی المتوفی ۷۷۵ھ

صاحب کشف الظنون نے جو سال وفات درج کیا ہے، وہ یقینًا غلط ہے، کیونکہ صہ۱۸۳ مین مصنف کا بیان ہے
اوس نے اوسکی تصنیف سے ۷۷۵ھ مین فراغت پائی، اس لئے وہ اس وقت تک یقینًا زندہ تھا، علامہ ابن حجر العسقلانی نے
الدرر الکامنہ مین محمد بن قاسم النویری کا مختصر تذکرہ دیا ہے، مگر زیر مطالعہ نسخہ مین سال وفات مذکور نہین،

خود اس کتاب سے مصنف کے متعلق جسقدر حالات دستیاب ہوسکے، وہ یہ ہین، کہ ۷۳۶ھ مین وہ اپنا وطن النو
چھوڑکر تبلاش معاش اسکندریہ پہنچا، اور اوس کو ایک نہایت ہی خوبصورت اور پررونق شہر پاکر ہمیشہ کے لئے متوطن ہوگ
کتابین نقل کرنا اور اون کو علم دوست امرا، ورؤسائے شہر کے ہاتھون فروخت کرنا اس کا پیشہ تھا، ۷۶۷ھ مین جب پیٹراو
(PETER-I-) اسکندریہ پر حملہ آور ہوا تو ہمارا مصنف بھی مدافعین کی جماعت مین ایک مرد میدان کی طر

شریک کارزار ہوا، اہل قبرس کا یہ حملہ بالکل ناگہانی تھا، مسلمان بالکل غافل تھے، اسکندریہ کا حاکم حج کے سفر میں تھا، اس کا قائم مقام نہایت ہی ناتجربہ کار و ناعاقبت اندیش تھا، شاہی افواج بھی یہاں سے دور تھیں، صرف شہر کے رضاکاروں نے ساحل پر ان مسیحی حملہ آوروں کو جنہیں تمام یورپ کے منتخب نبرد آزما شامل تھے، روکا، تھوڑی دیر تک تیر و تفنگ کی بارش رہی مجاہدین صلیب اپنی آہنی ڈھالوں کی پناہ میں کشتیوں سے کود کود کر خشکی پر چڑھ آئے، کچھ عرصہ تک دست بدست کی جنگ رہی بالآخر مسلمان پسپا ہوتے ہوئے، شہر کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہوئے، مگر یہ قبرسی فاتحین درندوں کی طرح شہر میں گھس پڑے، اور عورت، مرد، بوڑھے، بچے، غرض ہر جاندار یہاں تک کہ گھوڑے اور گدھے بھی نہایت ہی بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دئے گئے، مصنف کا بیان ہے کہ اہل قبرس ایک خاص قسم کی آتشگیر چیز اپنے ساتھ لائے تھے، اس کو چھتوں اور دروازوں پر ڈال دینے سے فوراً آگ بھڑک اٹھتی تھی، غرض پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا، جو لوگ جان بچا کر بھاگ سکے، ان میں ہمارا مصنف بھی تھا، اپنے اہل و عیال کو لیکر اپنے قدیم مسکن النویرہ پہنچا، وہاں علامہ ابن سید الناس اس سے مل کر اسکندریہ کی المناک تباہی کا حال دریافت کرنے آئے، مصنف نے اون کو اپنا وہ قصیدہ سنایا، جس کا ایک شعر اوپر مذکور ہوا، تھوڑے دنوں کے بعد جب کہ سلطان مصر کی افواج قاہرہ نے اسکندریہ میں امن وامان قائم کر دیا، اور جو لوگ جان بچا کر بھاگ نکلے تھے، وہ پھر وہاں واپس آنے لگے، تو ہمارا مصنف بھی اس ویرانہ کی زیارت کے لئے آیا، اوسکو اس اجڑی ہوئی حالت میں دیکھ کر اس کا دل بھر آیا، آنکھوں نے خون کے آنسو بہائے، اور دل مضطر نے مرثیہ کی شکل میں اپنے جذبات درد و الم کا اظہار کیا، اوس نے جو مرثیہ لکھا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

عاذلی لاتلم وخل ملامی

نعیونی بعدالدموع دوامی،

مرثیہ خوانی سے فارغ ہو کر اس واقعۂ ہائلہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے اوس نے زیر تبصرہ تاریخ مرتب کی، اگرچہ اس کتاب کا موضوع تباہی اسکندریہ کی تاریخ ہے، تاہم ضمناً الشئی بالشئی یذکر کے اصول پر ابتدائے عہد نبوت سے آٹھویں صدی تک کے تمام اہم تاریخی واقعات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ دہرایا گیا ہے، کہ اصل موضوع گم ہو کر رہ گیا ہے، مصری

سیاسی حالت اور تباہی اسکندریہ کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، ان کو ہم کتاب کے مختلف حصّون سے ڈھونڈھ کر ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہان درج کرتے ہین،

اسکندریہ کی تباہی کے وقت سلطان الملک الاشرف ناصرالدین شعبان (۷۶۴ھ - ۷۷۸ھ) مصر کا محض برائے نام بادشاہ تھا، الامیر الاتابکی یلبغا الناسکی تمام سیاہ وسفید کا مالک بنا ہوا تھا، بحری مملوک سلاطین مصر کے آخری عہد مین اس امیر نے سلطان گر کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اس کے پاس دو ہزار غلام تھے، ان کو جلبان کہا جاتا تھا، یہ نہایت ہی سرکش تھے، اون کے ظلم وتعدی سے اہل مصر عاجز آگئے تھے، اُن کی سرکشی بالآخر یہانتک بڑھی، کہ انھون نے خود اپنے آقا امیر یلبغا کو مار ڈالا اور اوس کے بعد سلطان شعبان پر حملہ آور ہوئے، مگر مصر کی رعایا نے سلطان کی بروقت مدد کی، اور یہ جلبان ۷۶۸ھ مین ایک ایک کرکے مار ڈالے گئے، اب سلطان نے آزادی کے ساتھ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ مین سنبھالی، مصنف اوس کی دادرسی ورعایا پروری کی تعریف کرتا ہے، اور اوس کے طولِ حیات، دوامِ حکومت واستحکامِ مملکت کیلئے نہایت ہی خلوص کے ساتھ بارگاہ رب العزت مین دعاگو ہے،

مذکورۂ صدر تصریحات سے یہ صاف عیان ہے، کہ جسوقت پیٹر اول (PETER-I-) نے مصر و شام کے ساحلی شہرون مین قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس وقت دربارِ مصر کی حالت نہایت ہی بدسے بدتر تھی، اور غلامون کے ظلم وتعدی سے رعایا تباہ ہو رہی تھی، تاہم اسکندریہ کی تباہی نے مسلمانانِ مصر کی آنکھین کھولدین، ہر طرف سے انتقام انتقام کی صدائین بلند تھین چنانچہ اس واقعہ ہائلہ کے بعد امیر یلبغا نے مصر وشام کے سواحل مین جنگی جہازات کی تعمیر کے لئے متعدد کارخانے کھلوائے اور مصنف کے بیان کے مطابق صرف تھوڑے ہی عرصہ مین ایک سو پچاس جہازون کا ایک مضبوط بیڑا تیار ہوگیا، یہ ہر قسم کے سامان واسلحۂ جنگ سے آراستہ تھا، اس مین دو قسم کے جہازات تھے، ایک کو "طرائد الخیل" اور دوسرے کو "شوانی الغزو" کہا جاتا تھا، بحری فوج اور ملاحون کی تعلیم وتربیت اندلس کے ایک امیر البحر ابراہیم التازی کے سپرد تھی، الغرض جب یہ بیڑا پوری طرح مکمل ہوگیا، تو دریائے نیل مین امیر یلبغا کے سامنے اون کی نمائش ہوئی، ان جنگی جہازات کے بالمقابل خشکی پر بری افواج بھی صف بستہ تھین، اس طرح تری اور خشکی مین ایک ساتھ

جان بازی وبہادری کے کرتب دکھائے جا رہے تھے، دریائے نیل کے کنارے لاکھون تماشائیون کا مجمع تھا، اُن مین جزیرۂ کیتلان کے سفرا بھی موجود تھے، واقعۂ اسکندریہ کے ساتھ دربار مصر مین یہ اس لئے حاضر ہوئے تھے کہ اہل قبرص کی سفاکی پر صاحب کیتلان کی طرف سے بیزاری کا اظہار کرین، مصنف نہایت ہی جوش مسرت کے ساتھ اسلامی شان وشوکت کے اسی پر رعب منظر کا نقشہ کھینچتا ہے، اور کہتا ہے، کہ کیتلان کے سفرا پر اس نمایش کا بہت اچھا اثر پڑا ہوگا، انھین معلوم ہوگیا ہوگا، کہ صرف ایک سال کی مدت مین سکندریہ کی تباہی کا انتقام لینے کیلئے مملکت کیسی عظیم الشان تیاریان کر چکی ہے،

انتقامی تیاریون کے ساتھ ساتھ تعمیر اسکندریہ کی تجدید کا کام بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا تھا، یہ خدمت امیر سیف الدین الاکزدائی سکندریہ کے سپرد تھی، اس نے بہت جلد اس کھنڈر کو پھر عروس البلاد بنا دیا، اہل شہر کی راحت وآسایش کے لئے کشادہ سڑکین نکالی گئین، مساجد ومدارس کی ترمیم وتعمیر عمل مین آئی، مریضون کے لئے ایک عظیم الشان مارستان (اسپتال) کی بنیاد ڈالی گئی، اس مین ہر وقت ہر قسم کی دوائین تیار رہتی تھین، مریضون کی عافیت وآسایش کا خاص انتظام تھا، مصنف کا بیان ہے کہ اس زمانہ مین مصر کا سب سے بڑا مارستان قاہرہ کا "المارستان المنصوری" تھا، مگر اسکندریہ کا یہ جدید مارستان اپنی عظمت مین اس سے بھی بڑھ گیا، اس کا نام "المارستان الصلاحی" تھا، بلدیہ کیطرف سے سڑکون اور گلیون کی جاروب کشی، اور صفائی کے بہترین انتظامات عمل مین آئے سڑکون پر روشنی کا ایسا عمدہ انتظام کیا گیا کہ سارا شہر رات کو بقعۂ نور نظر آتا تھا، شہر کی حفاظت وقلعبندی کی طرف بھی خاص توجہ منعطف کیگئی، شہر پناہ کی دیوار مستحکم کیگئی، اسکے دروازون پر تیر اندازون کے لئے لکڑی کے برج بنوائے گئے، اور اون کو گائے اور گدھے کی کھالون سے منڈھا گیا، مصنف کا بیان ہے کہ کھالون سے منڈھے جانے کے باعث یہ دشمن کی آتشباری سے محفوظ ہوگئے تھے، شہر کے دروازون مین لوہے کے پھاٹک لگوائے گئے، یہ ایک مشین کے ذریعہ سے جب ضرورت ہوئی، اوپر اوٹھا لئے جاتے، اور جب ضرورت ہوتی نیچے گرا دیئے جاتے، اس قسم کے دروازے تعاقب کرنے والے حریف کو شہر مین داخل ہونے سے روکنے کے لئے زیادہ مفید خیال کئے گئے تھے، شہر کی مشرقی سمت مین خندق نہین تھی، اور اسی طرف سے اہل قبرص شہر مین گھس آئے تھے، چنانچہ اس تجدید تعمیر کے وقت اس جانب بھی ایک بڑی خندق کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا گیا، اس سلسلہ مین مصنف

نے چند جدید اختراعات کا ذکر کیا ہے، اون کو ہم یہان کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہین،

آتشبار مشعل اسکندریہ کے "دار الصناعۃ الحربیۃ" نے ایک خاص قسم کا مشعل ایجاد کیا تھا، جو رات کو روشنی کا کام دیتا تھا، اور ضرورت کے وقت دشمن کے جہازات یا مکانات پر آتشباری کرکے اون کو خاک سیاہ کرسکتا تھا،

المکاحل یہ چھوٹی توپچی کے مانند ایک چیز تھی، بارود کی قوت سے یہ دور دور تک تیراندازی کا کام دیتی تھی،

رقائق الحدید یہ لوہے کے نہایت ہی تیز کانٹے تھے، ضرورت کے وقت ہانڈیون مین بند کرکے منجنیق کے ذریعہ سے دشمن کے راستون مین پھینکے جاتے تھے، یہ اس کثرت کے ساتھ راستہ مین پھیل جاتے، کہ دشمن کو قدم بڑھانا دشوار ہوجاتا،

قدور النفاط ہانڈیون مین ایک خاص قسم کا تیزابی مادہ جو پیشاب سے تیار کیا گیا تھا، بھرا جاتا، اور ان کو دشمن پر پھینکا جاتا، اس کا ہر قطرہ دشمن کی بصارت چشم و قوای دماغی کو زائل کرنے کیلئے کافی تھا،

المدافع الکبار خاص قسم کی بڑی بڑی توپین بنوائی گئی تھین، اُن سے نہایت ہی تباہ کن پھٹنے والے گولے پھینکے جاتے تھے، یہ گولے آتشگیر اشیاء کی آمیزش کے ساتھ سنگریزون سے تیار کئے جاتے تھے، ہم اون کو اوس زمانہ کا بم کہہ سکتے ہین،

غرض ان جارحانہ و مدافعانہ تیاریون کی تکمیل کے بعد ۷۶۹ھ مین سلطان الملک الاشرف نے اسکندریہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مفتخر کیا، ملک امرا لامرا استبغا نے تمام اہم مقامات کا ملاحظہ کرایا، سلطان نے ایک دربار منعقد کرکے ان لوگون کو جنھون نے اسکندریہ کی تجدید تعمیر و قلعبندی مین غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی تھی، خلعت و انعام سے مشرف فرمایا، امیر البحر ابراہیم التازی کو علاوہ خلعت فاخرہ کے خاص اپنی سواری کا ایک قیمتی گھوڑا عطا فرمایا اور مصر کے جنگی بیڑے کا افسر اعلیٰ مقرر کرکے اہل قبرص کی سرکوبی کی خدمت سپرد فرمائی،

ابراہیم التازی ایک تجربہ کار بحری مجاہد تھے، عمر کا بیشتر حصہ سمندر کی لڑائیون مین بسر ہوا تھا، قبرص پر چڑھائی کرنے سے پہلے دشمن کی دیکھ بھال کے لئے ایک متجسسانہ بحری مہم لے کر روانہ ہوئے، صرف سات سو جانباز سپاہی اور دو جہازون کا ایک مختصر بیڑا ساتھ تھا، دشمن کو دھوکے مین رکھنے کے لئے ان لوگون نے فرنگی جہازرانون کی پوشاک اختیار کی تھی، یہ مختصر بیڑا تقریباً ایک ماہ تک بحر روم مین چکر کاٹنے کے بعد واپس آیا، اور بہت سے قیدی اور مال غنیمت ساتھ لایا، اس

کامیاب بحری مہم اور مصر کی غیر معمولی جارحانہ تیاریوں نے تمام جزائر بحر روم میں ہلچل برپا کر دی، اہل قبرس سے اظہار بے تعلقی کے لئے جنیوا، روڈس، اور بندقیہ (وینس) کے وفود آنے لگے، اور اون کی طرف سے مصالحت کی کوششیں ہونے لگیں، اہل قبرس اسکندریہ کے ہزاروں عورتوں اور بچوں کو پکڑ کرلے گئے تھے، اُن میں سے اکثر بحر روم کے مختلف جزائر و ملحقہ ممالک میں غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے، چنانچہ سلطان نے ہر ملک کے وفد کو یہی جواب دیا، کہ جب تک وہ تمام اسیران اسکندریہ جو اُن کے ملک میں پائے جاتے ہوں، واپس نہیں آئیں گے، اوس وقت تک مصالحت کی گفتگو ناممکن ہے، سلطان کے اس اصرار کے باعث تھوڑے ہی عرصے میں قیدیوں کی ایک بڑی تعداد واپس آگئی، مصنف ان قیدیوں کو نام بنام بیان کرتا ہے، اور بعضوں سے مل کر اون کی گرفتاری کے قصے اور جن ممالک میں اون کو رہنے کا اتفاق ہوا، وہاں کے حالات دریافت کرکے کسی قدر تفصیل کے ساتھ سپرد قلم کرتا ہے، اُن سے ظاہر ہوتا ہے، کہ زنانِ فرنگ کی بے حجابی و مردانہ وشی آٹھویں صدی ہجری میں بھی تقریباً ویسی ہی تھی، جیسی کہ اس موجودہ دورِ مدنیت میں ہے، مصنف کو اہلِ فرنگ کی بے شرمی و بے حیائی کے بہت سے قصے سنائے گئے ہیں، مگر وہ ان کو قصداً نظر انداز کرتا ہے،

جن ممالک نے اسیرانِ اسکندریہ کو واپس کیا تھا، وہاں کے تجار کو مصر و شام کے سواحل پر تجارت کی اجازت دی گئی، اور امیر سیف الدین طغیہ ابن العرضی سلطان کی طرف سے تحائف لیکر فرمانروایانِ بندقیہ (وینس) جنیوا اور کیتلان کے دربار میں، بھیجے گئے، اُن سے جو معاہدے ہوئے اون میں ایک شرط یہ بھی تھی، کہ وہ سلطانِ مصر کے مقابلہ میں اہلِ قبرس کی اعانت نہیں کریں گے، سلطانِ مصر کی ان تیاریوں سے اہلِ قبرس نہایت خائف ہوئے، اور کیتلان کے سفیر کی معرفت مصالحت کے لئے نامہ و پیام شروع کیا، سلطان کی طرف سے وہی اسیرانِ اسکندریہ کی واپسی کی شرط یہاں بھی پیش ہوئی، چنانچہ خاص قبرس میں جسقدر قیدی رہ گئے تھے، سفیر کیتلان کی وساطت سے وہ بھی واپس آگئے،

غرض ان مصلحانہ کوششوں کے ساتھ ہی مصر کی سیاسی حالت میں بھی کچھ ایسا قدرتی انقلاب رونما ہوا کہ

قبرس کی چڑھائی کا خیال ہی جاتا رہا، امیر یلبغا کی شہادت اور اس کے غلامون کے ہنگامہ و فساد نے سلطان کو اپنے ملک کی حالت درست کرنے پر مجبور کر دیا، دوسری طرف دربار قبرس بھی سیاسی ہیجان سے محفوظ نہین تھا پطیر اول، (PETER- I-) کے خلاف ملک مین سازش ہوتی ہے، اور ۱۳۶۹ء مین وہ مارا جاتا ہے، اس کی جگہ پر اس کا بھائی جس کو مصنف "بربر" کے نام سے یاد کرتا ہے، تخت نشین ہوتا ہے، اور اسکی مصالحانہ کوششین بالآخر مصریون کے جوش انتقام کو ٹھنڈا کر دیتی ہین،

اوپر جو کچھ لکھا گیا، وہ اصل موضوعِ کتاب کا ایک مختصر خلاصہ ہے، مگر جیسا کہ ہم کہہ آئے ہین، یہ کتاب درحقیقت اسلامی تاریخ کا کشکول ہے، تاریخِ اسلام کے متعلمین و محققین اس سے بہت کچھ فوائد حاصل کر سکتے ہین، زیر تبصرہ نسخہ نہایت ہی قدیم یعنی ۸۹۰ھ کا لکھا ہے،

سیر الصحابہ

حصہ ششم

جسمین بہ ترتیب چار اہم ہستیون حضرت امام حسن، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسین، اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے حالات و سوانح اخلاق و فضائل، اور ان کے مذہبی، علمی، اخلاقی، اور سیاسی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، ضخامت:- ۳۰۶ قیمت ؏ ر

مہاجرین

حصہ دوم

جسمین اُن صحابۂ کرام کے حالات جمع کئے گئے ہین، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، اور ہجرت کی، ضخامت ۳۷۲ صفحے، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت ؏

"منیجر"

دیوان نظامی کے قلمی نسخے

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڑھی

رسالۂ معارف (نمبرا؛ جلد ۲۲) مین بعنوان بالا ہم نے دیوان نظامی کے پانچ قلمی نسخون کا ذکر کیا تھا جنمین سے بوہار، رامپور، اور باڈلی کے کتبخانون کے قلمی نسخون کی نقلین ہم نے حاصل کرلی ہین، اس سلسلہ مین ہم یہان اس دیوان کے دو اور نسخون کا تذکرہ کرتے ہین جنمین سے ایک کتب خانۂ خدیویہ مین محفوظ ہے، اور دوسرا مطبع نولکشور (لکھنؤ) کے کتب خانہ مین موجود ہے، اور جس کی ایک نقل ہماری استدعا پر مطبع مذکور کے مہتمم صاحب نے ہمارے لئے بہم پہنچائی ہے۔

۱- نسخۂ خدیویہ | کتبخانۂ خدیویہ مصر (بسلرے درب الجمامیز) کے فارسی مخطوطات کی فہرست مین اس نسخہ کے متعلق لکھا ہے:

"دیوان نظامی تالیف المولیٰ نظام الدین ابی محمد جمال الدین یوسف بن مؤید الگنجوی الاویسی المتوفی سنۃ ۵۹۷ اولہ: یا اشرف البریۃ یا سید الوریٰ الخ

بقلم تعلیق بخط بیر احمد بن اسکندر، تم تحریرہ فی سنۃ ۹۲۳ وھو باللغۃ الترکیۃ"[1]

اس تحریر سے جہان یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ یہ دیوان انہی نامور شاعر نظامی کا ہے، جو گنجوی کہلاتے ہین، وہان یہ امر بھی کچھ کم تعجب خیز نہین ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان مین ہے، اگر واقعی یہ دیوان شیخ نظامی کا ہے تو شایقین ادب فارسی کے لیے یہ ایک نیا انکشاف ہوگا کہ نظامی ترکی زبان بھی جانتے تھے بلکہ اس مین شعر کہتے تھے، لیکن یہ آج تک ان کے کسی سوانح نگار یا تذکرہ نویس نے نہین لکھا اور نہ کہین نظامی کے کلام مین اندرونی طور پر اسکی کوئی

[1] فہرست الکتب الفارسیۃ والجادیۃ المحفوظۃ بالکتبخانۃ الخدیویۃ المصریۃ ص ۴۸۹،

شہادت ملتی ہے، علاوہ ازین آغازِ دیوان کے عربی شعر سے، جو عربی قصیدۂ نعتیہ کا مطلع معلوم ہوتا ہے، یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ اس دیوان میں ان کے عربی اشعار بھی ہونگے،

ہم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا یہ دیوان فارسی زبان مین ہے، یا ترکی مین، اپنے ایک کرمفرما مصر کے عیسائی فردوش کتب ایلیان سرکیس کو لکھا تھا کہ وہ اس دیوان کے متعلق ضروری معلومات سے ہم کو آگاہ کرین، چنانچہ انھون نے جواب مین لکھا ہے کہ

"یہ کتاب فارسی زبان مین ہے، ترکی مین نہین ہے، اس دیوان کے ۵۰۶ صفحے الٹنے کے بعد اشعار ذیل ملتے ہین:-

نظامی نظمکی کورسہ نظامی گنجہ اوتردی کنج لحدون کہ نم فیک مقال

دکل بر اہل معانی قتسندہ دون تیج محدث نم ایدر بو حال اہل مقال

طلب چتر سخن و امکن و لا اطناب کہ تا بخاطر عاطر رسد گزند و ملال"

ظاہر ہے کہ ان مین سے پہلے دو شعر ترکی زبان مین اور تیسرا شعر فارسی مین ہے، غالباً ہمارے کاتب کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوان مین صرف چند اشعار ترکی زبان مین پائے جاتے ہین، لیکن اگر تمام دیوان اسی زبان مین ہو تو پھر صاحب فہرست کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان مین ہے، ہم نے موجودہ مخطوطات مین ان اشعار کی تلاش کی مگر بے سود، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کے دیوان کے مختلف مجموعے ہین، چنانچہ عوفی نے اپنے تذکرہ مین جو غزلین نظامی کی نقل کی ہین، وہ بھی ہمارے ان مخطوطات مین نہین پائی جاتین، اسی طرح ہرمن ایتھے نے بھی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی (بوڈلین لائبریری) مین لکھا ہے کہ آگرہ کا مطبوعہ (۱۲۸۱ھ) نسخۂ دیوان بوڈلین کے قلمی نسخہ سے بالکل مختلف ہے، اس مین وہ قصائد اور غزلیات نہین پائی جاتین جو اس نسخہ مین موجود ہین"، اس سے دولت شاہ اور لطف علی آذر کے اس قول کی تائید ہوتی ہے، کہ "خمسہ کے علاوہ نظامی کے قصائد و غزلیات، قطعات و رباعیات کے بیس ہزار اشعار ہین"، اس کی مزید تائید اس امر

سے بھی ہوتی ہے کہ حال مین ادارۂ مجلۂ ارمغان (طہران) خمسۂ نظامی کا ایک صحیح اڈیشن شائع کر رہا ہے، اور اسکی عنقریب شائع ہونے والی پہلی جلد شیخ کی مثنوی مخزن اسرار کے علاوہ ان کے دیوان پر مشتمل ہوگی جس کے اشعار کی مجموعی تعداد ۴ ہزار ہوگی، حالانکہ موجودہ مخطوطات مین اشعار کی مجموعی تعداد بارہ تیرہ سو سے زائد نہین ہے،

۲ - نسخۂ نولکشور | یہ نسخہ مطبع نولکشور کے کتب خانہ مین موجود ہے، دیوان کے آخر مین یہ عبارت درج ہے،

"دیوان حضرت اولیائی نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ، در دار الخلافت شاہجہان آباد بہ اشتیاق تمام بہ سرعت بتاریخ دوازدہم ماہ اگست ۱۸۲۵ء روز دوشنبہ بخط پنڈت دھرم نراین انصرام پذیرفت"

اس نسخہ کی نقل ہم کو ملگئی ہے، اور اس طرح کل چار قلمی نسخون سے مقابلہ و تصحیح کے ساتھ دیوان نظامی کا ایک صحیح متن ہم نے ترتیب دینا شروع کر دیا ہے، جو امید ہے کہ انشاء اللہ عنقریب تیار ہو کر مطبع مین جائیگا،

مثنوی مولنا روم کا ایک عارفانہ انتخاب

مولانا عبدالماجد دریابادی اڈیٹر سچ فرماتے ہیں،

"مثنوی معنوی کو اللہ نے عجیب و غریب مقبولیت دے رکھی ہے اور اس سلسلہ میں تازہ ترین اور نہ صرف تازہ ترین بلکہ بہترین انتخاب وہ ہے جو مغز نغز کے نام سے مولنا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے قلم سے نکلکر ابھی شائع ہوا ہے، کتاب فاضل مرتب کے ذوق سلیم و حسن انتخاب و سلیقۂ ادب کا روشن ترین آئینہ ہے، صاحب مثنوی علیہ الرحمہ کے اس پھیلاؤ کو اس طرح سمیٹنا کہ لطف بیان کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے آسان بات نہ تھی، دریا کو کوزہ میں بند کرنا حقیقۃً ایسے ہی موقع کیلئے لکھا گیا ہے، ہر جزو مثنوی کا خلاصہ پوری لطافت کیساتھ آگیا ہے، کوئی ضروری بات بھی چھوٹنے نہ پائی ہے اور تسلسل ربط بیان اس طرح قائم کہ پڑھنے والے کو کہیں سے پتہ نہیں چلنے پاتا کہ اس کے سامنے اصل تصنیف نہیں ہے،

کتاب علاوہ طلبا کے عام شائقین کیلئے بھی ہر اعتبار سے مفید اور دلچسپ ہے، اچھے ابواب میں تقسیم ہے، کاغذ کتابت طباعت تقطیع ظاہری ہر اعتبار سے پسندیدہ ہے، اور سفر و حضر میں ہر جگہ رکھنے کے قابل ہے، قیمت عہ کچھ بھی نہیں ہے (پتہ، دائرہ مطبوعات ...)

تلخیص و تبصرہ

کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟

رومن حروف جنھیں یورپ کی اکثر زبانیں لکھی جاتی ہیں، اُن کی اصلیت کے متعلق اتنا تو معلوم ہے، کہ ان کو فنیشین قومیں مشرق سے مغرب کو لائیں، لیکن یہ مسئلہ اب تک پوری طرح ثابت نہیں، کہ وہ کس مشرقی خط کی نقل ہیں، دسمبر ۱۹۳۲ء میں ایک فرنچ اہل قلم نے فرانس کی مجلس علمی میں اپنی ایک نئی تحقیق پیش کی ہے، جس میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ رومن حروف مصر کے مقدس حروف سے ماخوذ ہیں، جنکو ہیروگلیفی کہا جاتا ہے، اس ہیروگلیفی کے لفظی معنی بھی مقدس حروف کے ہیں،

صاحب قلم مذکور کا ذہن اس نظریہ کی طرف بالکل اتفاقی طور سے متوجہ ہوا، پرانی چیزوں کی ایک دکان پر اس کا گذر ہوا، تو وہاں اس کو ایک ایسی کتاب ملی جس میں ہر قوم کے، ہر زمانہ کے، خطوط کے نمونے دیئے گئے تھے اس کتاب میں اس نے فنیشین حروف کا باب کھولا، تو اس میں اس کو ۲۲ حروف ملے، لیکن بعض حروف کی شکلوں کے سمجھنے میں اس کو بڑی دشواری پیش آئی، تو اس نے فنیشیہ کی دوسری ہمسایہ قوموں کے حروف سے ان کا مقابلہ کیا، تو ان فنیشین حروف اور قدیم مصریوں کے حروف میں جنکو ہیروگلیفی کہا جاتا ہے، عجیب و غریب مشابہت معلوم ہوئی، پھر اس نے مصری حروف میں سے ایک ایسے حرف کی تلاش کی جو فنیشین خط کے پہلے حرف "الف" کے مقابل ہو، شکل و صورت، اور آواز و تلفظ دونوں لحاظ سے، تو اسکو ایک حرف ایسا ملا جو مصری خط میں "مرد" کی طرف اشارہ کرتا ہے، اب اس نے فنیشین خط کے دوسرے حرف "ب" کا مقابل تلاش کیا،

تو اس کو وہ مصری حرف ملا، جو "عورت" سے عبارت ہے، اب یہ مسئلہ حل ہوا، کہ ان حروف کا سرا "مرد" ہے جو دنیا کے ہر کاروبار کی جڑ ہے، اور اس کے پہلو میں "عورت" ہے جو انسانیت کے تمام مشکلات میں اسکے ساتھ ہوتی ہے، اتنی بات معلوم ہونے پر یہ خیال سامنے آیا، کہ ان حروف کی ترتیب زبردستی کی نہیں ہے بلکہ ایک منظم و باترتیب خیال پر مبنی ہے، ان دو حرفوں کی دریافت نے تحقیق کے اس طالب کو تیسرے فنیشین حرف کی طرف پہنچایا اور وہ "جیم" ہے، جو ہیروگلیفی میں ہل کا اشارہ ہے، چوتھا حرف جو "دال" ہے، وہ دو چلتی پھرتی ٹانگوں (پیروں) کو بتاتا ہے، اور پانچواں جو "د" ہے، وہ گھڑیال کی تصویر پیش کرتا ہے، جو بطریق تشبیہ خود مصر کی طرف اشارہ ہے، اب اس محقق نے ان پانچوں حرفوں کو جب ایک دوسرے کے پہلو میں رکھا، تو اس کو اور مصری آثار قدیمہ کے ہر عالم کو معلوم ہوا کہ ان پانچ حرفوں میں ایک پورا فقرہ پوشیدہ ہے جو حسب ذیل ہے،

"مرد اور عورتیں جوے کی قید سے مصر سے نکلے ہیں"

اس سے معلوم ہوا، کہ یہ حروف کسی مرتب خیال پر اور ان کی ترتیب کسی حکیمانہ منطق پر مبنی ہے، اور یہ اس قصہ کے رموز ہیں، جو بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کو ظاہر کرتا ہے۔

باقی فنیشین حروف کے ہیروگلیفی ماخذوں کی حسب ذیل تشریح بھی ملی ہے،

واؤ	"Y"	سورج جس کے نیچے لکڑی کا ایک عمود ہے، جس سے مراد "پورب کی طرف"
ز	"Z"	وہ عضو جو پھیپھڑے کی تمام شاخوں کو ملاتا ہے، جس سے مراد "اکٹھا ہوئے"
ح	"H"	عبادتگاہ، اس سے مراد "عبادتگاہ" ہے،
ط	"T"	مختلف راستوں کا ملنا، یعنی "شہر میں"
ی	"Y"	روتی ہوئی آنکھ جس سے مراد "رونے لگے"
ک	"K"	بط جو اپنے دونوں بازو پھیلائے ہے جس سے مراد "وہ اٹھے"

ل	L	ایک شیر جو حملہ کے لیے تیار ہے، جس سے مراد "بہادر بن گر"
م	m	پہاڑیوں کا سلسلہ جس سے مراد "قوم"
ن	n	ایک شخص دوڑتا ہوا، یعنی "چلا"
س	s	تین ٹیڑھی لکیریں، اس سے مراد "دریا کو عبور کیا"۔
ع	o	ایک دائرہ جس کا کچھ حصہ سایہ میں ہے، اس سے مراد "پورے چاند کے وقت"
پ	p	کمان جس سے مراد "لشکر"
ص		شکار کے آلات جس سے مراد "وہ جو اس کے پیچھے تھا"۔
ق	q	ایک برتن جس سے پانی بہ رہا ہو، جس سے مراد "ڈوب گئے"
ر	R	کھلا ہوا منھ، جس سے مراد "سبھوں نے گایا"
ش	s	ایک ہندسی کمان جس سے مراد "جلال اور بزرگی"
ت	T	تاروں بھرا آسمان جس سے مراد "خدا"

اس نظریہ سے یہ منکشف ہوتا ہے، کہ یہ فینیشین حروف مصری قدیم حروف میں بنی اسرائیل کے مصری قصّے کی پوری زبانی روداد ہیں، "س"

اسلامی فن تعمیر

"اسلامی فن تعمیر" پر رسالہ الہلال مصر میں اختصار کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کی تلخیص حسب ذیل ہے۔

اثنائے فتوحات میں جن سلطنتوں کو عربوں نے اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا، ان کے اختلاط اور میل جول سے ایک نیا اسلامی فن تعمیر پیدا ہوا، جس میں اگرچہ کلی طور پر یکرنگی پائی جاتی ہے، لیکن مختلف شہروں کے اثر سے اس کے جزئیات میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کے لحاظ سے اس کی پانچ قسمیں قرار دیجا سکتی ہیں،

مصری اور شامی طرز تعمیر سلطنت امویہ کے زمانے سے شام میں فن تعمیر کے نہایت نادر نمونے قائم ہوئے، جنھیں

دو چیزیں اس عہد کی بہترین یادگاریں ہیں، ایک تو قبۂ صخرہ جس کو بیت المقدس میں عبدالملک بن مروان نے بنایا تھا، اور دوسری جامع اموی جسکو ولید بن عبدالملک نے تعمیر کیا تھا، ان دونوں کے اندر کی دیواروں میں پچہ کاری کا کام بنا ہوا ہے، جو بیزنطی صناعوں کی دستکاری کا بہترین نمونہ ہے،

مصر میں اسلامی فن تعمیر کی ابتداء احمد بن طولون کے زمانے سے ہوئی، اور جب سے اس نے جامع طولونیہ کو اینٹ سے بناکر چونہ سے پختہ کرایا، اور اس پر نہایت نادر نقش ونگار بنوائے، مصریوں نے چونہ کی گچ بنانے میں نہایت کمال پیدا کر لیا،

فاطمیین کے عہد سے مصر میں ایک جدید تمدن کا آغاز ہوا، اور انھوں نے اپنی یادگار بہت سی مسجدیں چھوڑیں، جو حسن وجمال میں فن تعمیر کی بہترین مثال ہیں، اور ان میں سب سے قدیم اور قابل ذکر جامع ازہر ہے، لیکن جامع سلطان حسن جو قلعہ کے پاس ہے، وہ مصر کے آثار اسلامیہ کا سرتاج ہے،

مغربی طرز تعمیر | یہ قسم اندلس اور بلاد مغرب یعنی تونس، جزائر اور مراکش کی اسلامی عمارتوں پر شامل ہے، اس وقت تک بلاد مغرب اور اندلس میں جو اسلامی عمارتیں باقی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ مشہور جامع قیروان اور تونس کی جامع زیتون ہیں اور یہ دونوں مصری اور شامی طرز تعمیر سے متأثر ہیں۔

مغرب میں مسلمانوں کے طرز تعمیر کی قابل فخر یادگار غرناطہ کا قصر حمراء ہے، جس کی شہرت صرف حسن تعمیر ہی کی بنیاد پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس میں اسکے باغات اور ان فواروں کو بھی بہت بڑا دخل ہے جو درندہ جانوروں کی شکل پر بنے ہوئے ہیں،

ایرانی طرز تعمیر | ایران خلفاے راشدین کے زمانے میں مفتوح ہوا، لیکن خلفائے راشدین بلکہ خلفاے بنو امیہ اور بنو عباس کی بھی کوئی تعمیری یادگار ایران میں موجود نہیں ہے، البتہ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری یعنی صفویہ کے زمانے میں دار السلطنت اصفہان میں جامع اصفہان تعمیر ہوئی،

اسلامی عہد میں ایران کی اکثر عمارتوں کی دیواریں کاشانی لوحوں سے مزین تھیں، جس میں ایرانیوں نے نہایت کمال پیدا کیا تھا، اور اس میں نہایت چمکدار رنگ شامل کئے تھے،

ایرانیوں کو نہایت قدیم زمانے سے قالین بافی میں بھی کمال حاصل تھا، اور اب تک یہ کمال باقی ہے، اسلامی فنون لطیفہ میں ایران جیسے مرقع تصاویر بھی نہیں پائے جاتے جس میں آدمیوں اور پرندوں کی تصویروں کے ذریعہ سے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں،

ترکی طرز تعمیر ترکی طرز تعمیر ایرانی اور بیزنطی طرز تعمیر کا مجموعہ ہے، یعنی ترکوں نے ایرانیوں سے الواح کاشانی کے ذریعہ سے دیواروں کے مزین کرنے کا طریقہ سیکھا ہے، اور بیزنطی شکل کی عمارتیں تعمیر کی ہیں،

تمام عثمانی مسجدیں کنیسئہ اباصوفیہ کی طرح، ایک وسیع مربع شکل کی ہیں، جن کے اوپر ایک بڑا قبہ بنا ہوا ہے جو چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے قبوں سے گھرا ہوا ہے،

عثمانیوں نے اول اول مسجدوں کے تعمیر کی یہی شکل اختیار کی تھی لیکن بعد کو ان قبوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا جو بیچ کے قبہ کو محیط تھے اور ستونوں میں بھی قبے بنائے جانے لگے، پھر ان تمام قبوں کے گرد بھی بہت سے قبے بنائے گئے،

عثمانیوں نے قسطنطنیہ میں جو مسجدیں بنائی ہیں، ان میں جامع بایزید اور جامع سلیمانیہ نہایت ممتاز ہیں،

ہندوستانی طرز تعمیر یہ طرز تعمیر شمالی ہند میں پیدا ہوا اور وہ دو عظیم الشان زمانوں پر مشتمل ہے،

(۱) ایک تو مغلوں سے پہلے کا زمانہ جس میں اسلامی فن تعمیر قدیم ہندوستانی فن تعمیر سے متاثر تھا،

(۲) دوسرے مغلوں کا زمانہ جس میں ایک خاص طرز تعمیر ایجاد ہوا،

ہندوستان کے شہروں میں اسلامی عمارتیں سب سے زیادہ فتح پور سیکری، آگرہ اور دلی میں پائی جاتی ہیں، بالخصوص آگرہ میں جہاں اعتماد الدولہ کا مقبرہ اور تاج محل موجود ہیں،

"ع"

کوہ نور

جنرل آف انڈین ہسٹری میں کچھ عرصہ سے شاہجہان کے عہد کی تاریخ باقساط شائع ہو رہی ہے، اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار

تاعبدالعزیز، بیرسٹر نے "کوہ نور" کی تاریخ پر ایک محققانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے، عہد مغلیہ کے مورخین کے سامنے یہ مسئلہ ابتدا سے یہ بحث رہا ہے کہ جو ہیرا آج "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہے، اسکی گذشتہ تاریخ کیا ہے۔ اس باب میں تین مختلف جماعتیں قائم ہو گئی ہیں، اور ہر جماعت کے نزدیک "کوہ نور" اس ہیرے سے مختلف ہے جو دوسری جماعت میں اس نام سے موسوم ہے، یعنی اس بحث میں تین مختلف ہیرے پیش کئے جاتے ہیں، اور ہر گروہ اپنے ہیرے کو "کوہ نور" ثابت کرنا چاہتا ہے، مقالہ نگار موصوف نے ہر فریق کے بیانات و دلائل پیش نظر رکھنے کے بعد فیصلہ کی کوشش کی ہے، لیکن جیسا کہ موصوف نے اعتراف کیا ہے، اس مسئلہ پر کوئی آخری فیصلہ نہیں دیا جاسکتا، بہرحال موضوع کی دلچسپی کے خیال سے ہم اس مضمون کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

"جن تین ہیروں پر "کوہ نور" کا گمان ہوتا ہے ان میں پہلا وہ ہے جسے بابر کا ہیرا کہتے ہیں، بابرنامہ کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہیرا بابر کے پاس کیونکر آیا:-

"سلطان ابراہیم کی شکست میں گوالیار کا راجہ بکرماجیت مارا گیا، اسوقت بکرماجیت کا خاندان آگرہ میں تھا، ابراہیم کی شکست کے بعد ان لوگوں نے آگرہ سے بھاگنا چاہا لیکن ہمایوں نے وہاں پہنچکر ان کا راستہ روک دیا، اُسیران لوگوں نے ہمایوں کے سامنے بہت سے جواہرات اور قیمتی چیزیں پیش کیں، ان میں وہ مشہور ہیرا بھی تھا جو علاء الدین دکن سے لایا تھا، اسکی قیمت کا اندازہ یہ ہے کہ ڈھائی روز تک اس سے تمام دنیا کی خوراک کا انتظام ہو سکتا ہے، بظاہر اس کا وزن آٹھ مثقال ہے، جب میں آگرہ پہنچا تو ہمایوں نے یہ ہیرا میرے سامنے پیش کیا لیکن میں نے اسے واپس کر دیا"

اس ہیرے کی ابتدائی تاریخ قصوں اور غیر مستند روایتوں میں پوشیدہ ہے، پروفیسر ماسکیلائن کا خیال ہے، اس پر تاریخ کی روشنی اوّل اوّل چودھویں صدی کی ابتدا میں پڑتی ہے، سنہ ۱۳۰۴ء میں یہ مالوہ کے راجہ کے قبضہ میں تھا، سنہ ۱۳۰۶ء میں سلطان علاء الدین محمد شاہ کی فوج نے مالوہ کو فتح کیا اور اجین کا خزانہ اس قدیم راج کے ہاتھوں سے نکل گیا، اس وقت یہ عظیم الشان ہیرا تاریخی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا، تاریخ میں یہ ذکر نہیں کہ علاء الدین خلجی کے ہاتھ سے نکل کر یہ کیونکر راجگان گوالیار کے پاس پہنچا، بہرحال یہ ایک عرصہ تک ہمایوں کے پاس رہا، پھر جب ہمایوں شیرشاہ سے شکست کھا کر ایران پہنچا تو اس نے اس شاہانہ مہمان نوازی کے صلہ میں جو شاہ طہماسپ نے اس کیساتھ برتی تھی یہ ہیرا اور اس کے ساتھ ڈھائی سو لعل بدخشانی

اسکی نذر کیے، خود شاہ جو دربار ایران میں ابراہیم قطب شاہ والی گولکنڈا کا سفیر تھا بیان کرتا ہے کہ شاہ طہماسپ نے اس ہیرے کی قدر نہ کی اور کچھ دنوں کے بعد اسے نظام شاہ فرمانروائے دکن کے پاس بطور ہدیہ بھیجدیا، اس روایت کی تصدیق تاریخ فرشتہ سے بھی ہوتی ہے، اس کا وزن بابر کی روایت کے مطابق آٹھ مثقال تھا یعنی (۳۲۰) رتی یا ۱۴۴ ،۵۸۹) چاول،

دوسرا ہیرا جسے بعض لوگ "کوہ نور" بتاتے ہیں وہ ہے جو میر جملہ کے ہیرے کے نام سے مشہور ہے، اس کے متعلق شاہجہاں کے دربار کا مستند مورخ محمد وارث بادشاہ نامہ کی تیسری جلد میں بیان کرتا ہے کہ "۱۸ صفر سنہ ۱۰۶۶ ہجری (۱۷ دسمبر سنہ ۱۶۵۵ء) کو نئے وزیر اعظم محمد سعید میر جملہ نے شاہجہاں کے سامنے پیشکش کے طور پر قیمتی جواہرات حاضر کئے جنمیں ایک بڑا ہیرا بھی تھا جس کا وزن (۹) ٹانک یا (۲۱۶) سرخ تھا، اور جس کی قیمت دو لاکھ سولہ ہزار روپیہ تھی" اس بیان کی تصدیق نہ صرف قار نبہ (؟) اور ماثر الامرا بلکہ عمل صالح اور منتخب اللباب سے بھی ہوتی ہے، تمام مقامات پر اس کا وزن ٹانک کے علاوہ رتی میں بھی دیا ہوا ہے اور اس میں شبہہ کی گنجایش نہیں کہ اسکا وزن (۲۱۶) جوہری رتی یا (۷۶، ۴۸، ۵) چاول تھا،

تیسرا ہیرا وہ ہے جو اب عام طور پر "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہے، سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اسے دہلی سے لے گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اُسی نے اسکا نام "کوہ نور" رکھا تھا، سنہ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد "کوہ نور" اُس کے جانشین شاہ رخ کے قبضہ میں آیا، شاہ رخ نے اسے احمد شاہ درانی کو دیدیا اور احمد شاہ کے بعد یہ اس کے لڑکے تیمور کو وراثت میں ملا، تیمور کے بعد سنہ ۱۷۹۳ء میں یہ اُس کے بڑے لڑکے شاہ زماں کے ہاتھ آیا، دو سال کے بعد یہ شاہ زماں کے تیسرے بھائی شاہ شجاع کے قبضہ میں آیا، شاہ شجاع اپنے بڑے بھائی محمد سے شکست کھا کر رنجیت سنگھ کے دربار میں لاہور پہنچا اور کابل کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے مدد کا خواستگار ہوا اور اس کے معاوضہ میں "کوہ نور" رنجیت سنگھ کی نذر کر دیا، یہ سنہ ۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے، سنہ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد "کوہ نور" اس کے جانشین دلیپ سنگھ کے قبضہ میں آیا، سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب سلطنت برطانیہ میں شامل کر لیا گیا، اور جدید بورڈ آف گورنمنٹ نے "کوہ نور" کو حاصل کر کے ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجدیا،

یہ ہے ان ہیروں کی تاریخ، ان کے متعلق تین مختلف رائیں ہیں، بعض مورخین مثلاً پروفیسر ماسکیلائن کا خیال ہے کہ بابر کا ہیرا اور "کوہ نور" دراصل ایک ہی چیز ہیں، دوسرے گروہ کی جسمیں ڈاکٹر بال سب سے زیادہ ممتاز ہیں یہ رائے ہے کہ

میر جملہ کا ہیرا اور کوہ نور ایک ہیں، تیسری جماعت اس طرف گئی ہے کہ تینوں ایک ہی ہیں،

اس مسئلہ میں سب سے زیادہ غلط فہمی فرانسیسی سیاح ٹیورنیر کے بیان سے پیدا ہوئی ہے جو ایک عرصہ تک شاہجہاں کے دربار میں تھا اور جس نے خود وہ ہیرا دیکھا تھا جسے وہ میر جملہ کا ہیرا لکھتا ہے، پروفیسر ماسکیلائن کا خیال ہے کہ کوہ نور اور بابر کا ہیرا حقیقۃً ایک ہی چیز ہیں، اور یہی وہ ہیرا تھا جسے ٹیورنیر نے دیکھا تھا لیکن اس نے غلطی سے اسکو میر جملہ کا ہیرا سمجھا اور اس کے ساتھ وہ روایت شامل کر دی جو میر جملہ کے ہیرے کے متعلق اسوقت عام طور پر رائج تھی،

بابر نامہ کی عبارت سے بلاشبہ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ بابر کے ہیرے کا وزن (۳۲۰) معمولی رتی سے کچھ کم و بیش تھا اور اگر ہم ایک مثقال کو (۲۷) جوہری رتی کے برابر مانیں تو اس ہیرے کا وزن (۲۱۶) جوہری رتی ہوتا ہے، وزن کی اس یکسانی کے لحاظ سے مسٹر ہیوبرج کا خیال ہے کہ بابر اور میر جملہ کے ہیرے ایک ہی ہیں، اور میر جملہ نے اس ہیرے کو جنوبی ہند میں کہیں پایا تھا اور وہاں سے لاکر شاہجہاں کے حضور میں پیش کیا تھا، اس طرح فرض کرنے سے بابر کے ہیرے کا دوبارہ خزانۂ مغلیہ میں آنا بھی ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اس نظریہ کو تسلیم کرنے میں تامل یہ ہے کہ اگر میر جملہ کا ہیرا بابر کا ہیرا ہوتا تو میر جملہ اسکا فخریہ اعلان کرتا اور درباری مورخین بھی اس واقعہ کا ذکر ضرور کرتے، لیکن ایسا نہیں ہوا، علاوہ بریں دونوں کی قیمتوں میں بھی بے حد فرق ہے، جس ہیرے کی قیمت شاہجہاں کے دربار میں زیادہ سے زیادہ تین لاکھ روپئے قرار پائی تھی وہ ہیرا نہیں ہو سکتا جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو تیس سال قبل ایک غیر محدود رقم سے کیا گیا تھا اور پھر ۱۸۳۰ء میں رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جس کی قیمت تین کرور روپیے ٹھہری تھی،

تمام شہادتوں کو پیش نظر رکھنے اور ہیروں کے اوزان کا باہم مقابلہ کرنے سے گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ بابر کا ہیرا اور "کوہ نور" ایک ہی چیز ہیں، تاہم یہ واقعہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بابر کے ہیرے کا خزانۂ مغلیہ میں دوبارہ داخل ہونا آج تک ثابت نہیں ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے "کوہ نور" اور بابر کے ہیرے کو قطعی طور پر ایک نہیں سمجھا جا سکتا،

"ع ز"

اخبار علمیہ

ہندوستان اور افریقہ کا قدیم تعلق

بعض سائنس داں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں سال پیشتر بحر عرب میں ایک عظیم الشان براعظم تھا جو ایک طرف ہندوستان سے ملا ہوا تھا اور دوسری طرف افریقہ سے، اس براعظم کی دریافت وتحقیق کے جو علمائے ارضیات کے ہاں لیموریا کے نام سے معروف ہے، عنقریب ایک مہم بحر ہند کو روانہ ہونے والی سائنس دانوں کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ کسی زمانہ میں لیموریا، ہندوستان، افریقہ، اور آسٹریلیا کو ملا تھا، مسٹر لیوس اسپنس جنھوں نے اس مسئلہ کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے بیان کرتے ہیں کہ اس براعظم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا کیونکہ اس کے بعض حصے سترہویں صدی کے آخری ربع میں سطح آب پر دکھا دیتے تھے، جیسا کہ اس وقت کے جہاز رانوں کی عینی شہادت سے معلوم ہوتا ہے، ان کی رائے ہے کہ لیمو چھوٹے چھوٹے براعظموں یا بڑے بڑے مجمع الجزائر میں منقسم تھا اور اس میں ایک سفید نسل کے لوگ آباد جنکا تمدن عہد حجری کے آخری دور کا تمدن تھا اور وہ فن تعمیر میں نمایاں قابلیت رکھتے تھے، مسٹر اسپنس کا یہ ہے کہ ایک براعظم جزائر سینڈوچ سے نیوزی لینڈ تک پھیلا ہوا تھا، دوسرا نیوکیلیڈونیا اور سماترا سے اور تیسرا جزیرہ ایسٹر کے قریب واقع تھا، اس جزیرہ پر سنگ تراشی کے عظیم الشان نمونے اب تک موجود ہیں نے دوسو برس سے زائد سے اہل سائنس کو حیرت میں ڈال رکھا ہے، لیکن اس نظریہ پر تمام سائنس دانوں نہیں ہے اور اس باب میں دو مختلف جماعتیں ہیں، ایک کا خیال ہے کہ بحر الکاہل اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے

جماعت کہتی ہے، کہ اس میں متعدد تغیرات پیش آچکے ہیں، علماے ارضیات کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ جب دنیا اپنی حیات کے ابتدائی دور میں تھی اس وقت ایک قدیم اور زبردست براعظم مسمی بہ گونڈوانالینڈ جس میں افریقہ، ہندوستان کا ایک حصہ، امریکہ، اور آسٹریلیا شامل تھے، کرۂ ارض کے جنوبی نصف کو گھیرے ہوئے تھا، اس براعظم اور کرۂ ارض کے شمالی نصف کے درمیان ایک عظیم الشان بحرِ اعظم حائل تھا جسے ٹیتھائیس (TETHYS) کہتے تھے اور بحرِ روم جسکا ایک باقی ماندہ حصہ ہے، اس گروہ کی رائے ہے کہ یہ براعظم اب سے چوبیس کرور برس پیشتر موجود تھا، اور اس وقت کوہ ہمالیہ اور اس سے ملحق تبت کے خطے تہ آب تھے، اس کے بعد ہزار ہا ہزار سال کی مدت میں بعض دوسرے ارضی تغیرات کے باعث لیموریا کا وجود عمل میں آیا اور براعظم ایشیا اپنی موجودہ شکل میں ظاہر ہونے لگا، پھر کچھ زمانہ کے بعد ہندوستان، افریقہ اور آسٹریلیا سب علیحدہ علیحدہ ہوگئے،

طوالتِ عمر کی نادر مثالیں

حال میں چین سے خبر آئی ہے کہ لی چنگ یون نے جو تمام دنیا کا سب سے زیادہ طویل العمر انسان تھا، (۲۵۶) سال کی عمر میں انتقال کیا، یہ شخص جو ایک کاشتکار اور جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا اور اب ایک مدت دراز سے اپنا وقت غور و خوض اور عبادت میں صرف کر رہا تھا خود اپنی روایت کے مطابق ۱۶۷۷ء میں پیدا ہوا تھا، اس کے اہل وطن بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، تین سال ہوے ایک خاص وفد محض اس کو دیکھنے کی غرض سے چین گیا تھا اس وفد کا بیان ہے کہ وہ ایک تندرست اور زندہ دل شخص تھا، جس کی عمر بظاہر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی، اس نے اپنی غیر معمولی طویل عمر کیوجہ یہ بیان کی کہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جب کہ وہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پہاڑوں پر گھومتا پھرتا تھا اتفاق سے ایک روز اُسے ایک نادر جڑی ہاتھ آگئی جسے اس نے کھا لیا، اسی کے اثر سے اس کی عمر اتنی بڑھ گئی،

ناگپور میں ایک شخص سیدی استاد نامی ابھی موجود ہے جس کی عمر صوبہ جات متوسطہ کے افسر مردم شماری

کی رائے میں (۱۳۰) سال ہے، اگرچہ خود ناگپور کے لوگ اسکو (۱۵۰) سال کا بتاتے ہیں، ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی وبا تک اس کی صحت نہایت عمدہ تھی، لیکن اس کے بعد سے اس کے دانت ٹوٹ گئے ہیں اور بال سفید ہوگئے ہیں، سیدی استاد جس کا باپ افغان اور ماں عرب تھی ایک زمانہ میں گائکواڑ بردہ کے دربار کا مشہور پہلوان تھا اور ۱۸۵۰ء میں اپنے فن کے شباب میں تھا، اس کا بیان ہے کہ میسور کی لڑائی اور سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کی وفات (۱۷۹۹ء) اُسے یاد ہے

سیدی ہی کی عمر کے قریب امریکہ کے مشہور جان شل (UNCLE JOHNNY SHELL) کی عمر بھی تھی جو چند سال قبل (۱۳۲) برس زندہ رہکر مرا ہے، ۱۹۱۸ء میں لوگ اُسے دیہات سے شہر میں لائے جہاں وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز اور ریل میں سوار ہوا متعدد ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا اور اس نے چند کاغذات پیش کئے جن سے معلوم ہوا کہ اس کی پیدائش ۱۷۸۸ء کی ہے۔

اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ بوڑھا آدمی غالباً زارو آغا ہے، اس مشہور ترک کی پیدائش ۱۷۷۴ء کی ہے چند سال ہوئے اس کے ایک لڑکے کا انتقال (۱۱۰) سال کی عمر میں قسطنطنیہ میں ہوا ہے، زارو آغا گوشت بہت کم کھاتا ہے، اس کی غذا زیادہ تر پھل، ترکاری، اور دودھ ہے،

انگلستان میں بھی دو آدمی ایسے گذرے ہیں جن کی عمروں تک وہاں کا کوئی دوسرا شخص نہیں پہنچا، ایک ہنری جنکنس جس کی وفات (۱۶۹) سال کی عمر میں ۱۶۷۰ء میں ہوئی، اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جنگ فلاڈن (۱۵۱۳ء) میں موجود تھا، اور اس وقت اس کی عمر (۱۲) سال تھی، دوسرا مشہور شخص بوڑھا پار ہے جس کا انتقال ۱۶۳۵ء میں ہوا جبکہ اس کی عمر (۱۵۲) سال تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ سو برس کے سن میں اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جسنے (۱۱۳) سال کی عمر پائی،

اسپین اور پوپ کی جنگ

اسپین کے جس قومی انقلاب نے ملوکیت کا خاتمہ کرکے ایک جمہوری حکومت قائم کردی ہے اُسی نے حال میں عیسائیت کے بعض اہم حقوق پر بھی حملے کئے ہیں اور اسپین میں جو اٹلی کے بعد کیتھولک مذہب کی سب سے بڑی

طاقت خیال کیا جاتا تھا اس مذہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے، ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو پریزیڈنٹ زامورا (صدر جمہوریہ ہسپانیہ) نے اس بل پر دستخط کر دیئے جس سے اسپین کے جدید مذہبی قوانین کا نفاذ ہوتا ہے، ان قوانین کے رو سے کلیسائے اسپین کی تمام جائداد و قومی حکومت کی ملک قرار دیگئی ہے، اور پادریوں کو صنعت و حرفت میں حصہ لینے اور مدرسوں میں تعلیم دینے سے قطعًا روک دیا گیا ہے، جس روز پریزیڈنٹ زامورا نے یہ قوانین نافذ کئے اس کے دوسرے ہی روز پوپ نے حکومت اسپین کے نام نہایت برہمی کا ایک خط روانہ کیا، جس میں مذہب اور کلیسا پر اس سخت حملہ کے خلاف احتجاج کیا ہے، اسپین کے بعض کیتھولک حلقوں میں بھی ان قوانین کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، لیکن چونکہ ان کا نفاذ جمہوریہ اسپین کی مجلس عامہ کی جانب سے ہوا ہے اس لئے یہ تمام مخالفتیں غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہیں، تخمینہ ہے کہ ۱ر جنوری ۱۹۳۴ء سے (۷۸۳۶۹۹) طلبہ پادریوں کی تعلیم سے آزاد ہو جائیں گے،

مدرسۂ علوم عربیہ غرناطہ

مدرسۂ علوم عربیہ، غرناطہ سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ جو لوگ اسپین جا کر وہاں کے مناظر و تمدن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی سہولت کے لئے تعطیل کے زمانہ میں مدرسۂ مذکور نے خطبات کے ایک سلسلہ کا انتظام کیا ہے، جو امسال ۱۰ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء تک حسب ذیل مضامین پر انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں دیئے جائیں گے،

(۱) اسپینی لٹریچر۔ (۲) تاریخ اسپین، (۳) اسپینی آرٹ،

(۴) اسپین کا جغرافیہ، (۵) موجودہ اسپین، (۶) اسپین کے تمدن پر عربوں کا اثر،

(۷) اسپین کے آرٹ پر عربوں کا اثر، (۸) اسپینی زبان کا نصاب

ع ز

کی رائے میں (۱۳۰) سال ہے، اگرچہ خود ناگپور کے لوگ اسکو (۱۵۰) سال کا بتاتے ہیں، ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی وبا تک اس کی صحت نہایت عمدہ تھی، لیکن اس کے بعد سے اس کے دانت ٹوٹ گئے ہیں اور بال سفید ہو گئے ہیں، سیدی استاد جس کا باپ افغان اور ماں عرب تھی ایک زمانہ میں گائکواڑ بروده کے دربار کا مشہور پہلوان تھا اور ۱۸۰۵ء میں اپنے فن کے شباب میں تھا، اس کا بیان ہے کہ میسور کی لڑائی اور سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کی وفات (۱۷۹۹ء) اُسے یاد ہے

سیدی ہی کی عمر کے قریب امریکہ کے مشہور جان شل ((UNCLE JOHNNY SHELL کی عمر بھی تھی جو چند سال قبل (۱۳۴) برس زندہ رہکر مرا ہے، ۱۹۱۸ء میں لوگ اُسے دیہات سے شہر میں لائے جہاں وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز اور ریل میں سوار ہوا، متعدد ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا اور اس نے چند کاغذات پیش کئے جن سے معلوم ہوا کہ اس کی پیدائش ۱۷۸۸ء کی ہے۔

اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ بوڑھا آدمی غالباً زارو آغا ہے، اس مشہور ترک کی پیدائش ۱۷۷۴ء کی ہے، چند سال ہوئے اس کے ایک لڑکے کا انتقال (۱۱۰) سال کی عمر میں قسطنطنیہ میں ہوا ہے، زارو آغا گوشت بہت کم کھاتا ہے، اس کی غذا زیادہ تر پھل، ترکاری، اور دودھ ہے،

انگلستان میں بھی دو آدمی ایسے گذرے ہیں جن کی عمروں تک وہاں کا کوئی دوسرا شخص نہیں پہنچا، ایک ہنری جنکنس جس کی وفات (۱۶۹) سال کی عمر میں ۱۶۷۰ء میں ہوئی، اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جنگ فلاڈن (۱۵۱۳ء) میں موجود تھا، اور اس وقت اس کی عمر (۱۲) سال تھی، دوسرا مشہور شخص "بوڑھا پار" ہے جس کا انتقال ۱۶۳۵ء میں ہوا جبکہ اس کی عمر (۱۵۲) سال تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ سو برس کے سن میں اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جسنے (۱۱۳) سال کی عمر پائی،

اسپین اور پوپ کی جنگ

اسپین کے جس قومی انقلاب نے ملوکیت کا خاتمہ کرکے ایک جمہوری حکومت قائم کردی ہے اُسی نے حال میں عیسائیت کے بعض اہم حقوق پر بھی حملے کئے ہیں اور اسپین میں جو اٹلی کے بعد کیتھولک مذہب کی سب سے بڑی

لافت خیال کیا جاتا تھا اس مذہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے، ۲؍ جون ۱۹۳۳ء کو پریزیڈنٹ زامورا (صدر جمہوریۂ ہسپانیہ) نے اس بل پر دستخط کر دیئے جس سے اسپین کے جدید مذہبی قوانین کا نفاذ ہوتا ہے، ان قوانین کے رو سے کلیسائے اسپین کی تمام جائداد قومی حکومت کی ملک قرار دیگئی ہے، اور پادریوں کو صنعت و حرفت میں حصہ لینے اور مدرسوں میں تعلیم دینے سے قطعاً روک دیا گیا ہے، جس روز پریزیڈنٹ زامورا نے یہ قوانین نافذ کئے اس کے دوسرے ہی روز پوپ نے حکومت اسپین کے نام نہایت برہمی کا ایک خط روانہ کیا، جس میں مذہب اور کلیسا پر اس سخت حملہ کے خلاف احتجاج کیا ہے، اسپین کے بعض کیتھولک حلقوں میں بھی ان قوانین کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے لیکن چونکہ ان کا نفاذ جمہوریۂ اسپین کی مجلس عامہ کی جانب سے ہوا ہے اس لئے یہ تمام مخالفتیں غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہیں، تخمینہ ہے کہ ارجنوری ۱۹۳۴ء سے (۷۰۸۴۷ ۶۹۹) طلبہ پادریوں کی تعلیم سے آزاد ہو جائیں گے،

مدرسۂ علوم عربیہ غرناطہ

مدرسۂ علوم عربیہ، غرناطہ سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ جو لوگ اسپین جا کر وہاں کے مناظر و تمدن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی سہولت کے لئے تعطیل کے زمانہ میں مدرسۂ مذکور نے خطبات کے ایک سلسلہ کا انتظام کیا ہے، جو امسال ۱۰؍ ستمبر سے ۳۰؍ ستمبر ۱۹۳۳ء تک حسب ذیل مضامین پر انگریزی، فرانسیسی زبانوں میں دیئے جائیں گے،

(۱) اسپینی لٹریچر۔ (۲) تاریخ اسپین، (۳) اسپینی آرٹ،

(۴) اسپین کا جغرافیہ، (۵) موجودہ اسپین، (۶) اسپین کے تمدن پر عربوں کا اثر،

(۷) اسپین کے آرٹ پر عربوں کا اثر، (۸) اسپینی زبان کا نصاب

"ع ز"

ادبیات

سوز و ساز

(بمواجہہ انور حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام)

از حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی

مل گیا صوتِ سرمدی　　میرے شکستہ ساز سے
نغمہ کی آتی ہے صدا　　نوحۂ دل گداز سے

ابتو مری نظر میں ہے　　حُسن ہی حُسن ہر طرف
خلعتِ عشق مل گیا　　بارگہِ مجاز سے

حاصلِ عمر مل گیا　　قلبِ فسردہ کھل گیا
پڑ گئی زندگی میں جان　　اُن کی نگاہِ ناز سے

برسوں کے بچھڑے مل گئے　　داغ دلوں کے دُھل گئے
لپٹی ہے اُن کی خاکِ پا　　میرے سرِ نیاز سے

صَلِّ کانَّکَ تراہ　　آج صحیح ہو گیا
رفع یدین کر سکے　　کون اب اس نماز سے

دل کی شکستگی نے آج　　جوڑ دیا کسی کے ساتھ
دیکھ لیا رخِ حسیں　　اس درِ نیم باز سے

حالتِ وجد و ذوق میں　　دل سے، یہ کہہ رہا ہے درد

"ہم نے ملا دیا سب تجھے — سے، ترے چارہ ساز نے"

ہر رگِ جانِ امجد اب — رقص میں ہے بصد طرب

بربطِ روح بھر گیا — نغمۂ دل نواز سے

وثائقِ حقائق

از جناب میرزا عزیز صاحب فیضانی، دارا پوری

۱
عشق سرور میں ماسوا سے کیسا کام — سید ھا رستہ ہے رہنما سے کیا کام

اس رہ میں فقیر بنکے جاتا ہوں عزیز — جو بھی مل جائے، مدعا سے کیا کام

۲
کیوں آج ہے کل کی فکر، کیسا ہوگا — ایسا سوچیں ہی کیوں کہ ایسا ہوگا

ہاں چھوڑ کے کل کو، کچھ کرو آج کی فکر — کل ہی دیکھینگے کل کو، جیسا ہوگا

۳
میدانِ عمل نہ ہو تو جینا بیکار — دنیا بے سود، روزِ عقبےٰ بیکار

اب وقت ہے کوئی کام کر لے غافل — یادِ ماضی و فکرِ فردا بیکار

۴
چھوڑو غفلت کو، آنکھ کھولو، جاگو — یہ وقت کی ہے صدا کہ جاگو جاگو

تم سوتے ہو اور جاگ اٹھی ہے دنیا — جاگو! جاگو!! خدا کے بندو جاگو!!!

۵
پھر جلوہ فگن جہاں میں خاور ہوگا — دنیا میں بلند نام سرور ہوگا

"مغرب" میں غروب ہو چکا ہے اب پھر — "مشرق" سے طلوعِ مہرِ انور ہوگا

۶
نظارہ و رونقِ جوانی دلکش — ہستی دلکش ہے، زندگانی دلکش

دلکش ہے عزیز "نقشِ اول" لیکن — ہوگا کس درجہ "نقشِ ثانی" دلکش

مطبوعات جدیدہ

مولنا شبلی اینڈ عمر خیام ۔ (انگریزی) تالیف جناب رستم پستن جی بھاجی والا، ۱۱۸ صفحے، قیمت مع خوبصورت جلد للعہ مصنف سے امبا واڑی مزے گاں بمبئی نمبر ۱۰ کے پتہ سے طلب کریں،

جناب رستم پستن جی بھاجی والا، بمبئی کے ایک معزز پارسی خاندان کے رکن ہیں، ان کو حب وطن کے طور پر فارسی ادبیات سے عموماً اور خیام سے خصوصاً گہری شیفتگی ہے، اور اسی تعلق سے فارسی ادبیات کے خدمتگذار شبلی نعمانی کی عقیدت ان کے دل میں جاگزیں ہوئی، زیر نظر کتاب، انہی اثرات کا آئینہ ہے، اس میں پہلے تقریباً پچاس صفحوں میں مولنا شبلی کے سوانح حیات شرح و بسط سے لکھے ہیں، بلکہ مولنا کے حالات میں اب تک اس سے مفصل کوئی چیز لکھی نہیں گئی، مصنف نے کاوش سے ان تمام ماخذوں پر نظر ڈال لی ہے، جو سیرت شبلی سے متعلق ہو سکتے ہیں، نیز مستند ذرائع سے دیگر حالات بھی فراہم کئے ہیں، پھر شعر العجم کے حصہ "خیام" کا ترجمہ ہے، جس میں کہیں کہیں مترجم نے خود حاشیے بھی لکھے ہیں، خیام کے حالات میں بعض باتیں اسوقت تک علمی حلقوں میں بعض حیثیات سے "خلافیات" کی شکل رکھتی ہیں، اور شعر العجم کے اس حصہ پر بھی اختلافی مضامین نکل چکے ہیں، جنکا حوالہ بھی زیر نظر کتاب کے تبصرہ میں، اردو کے ایک رسالہ میں نظر سے گذرا، جس میں مترجم موصوف کو مطعون کیا گیا ہے، کہ اُس "تحقیقی نقد و نظر" کو مترجم نے نظر انداز کر دیا ہے جو ان مضامین میں پیش کئے گئے ہیں، لیکن کیا ستم ہے کہ معترض نے بھی اُس جواب نقد کو نظر انداز کر دیا ہے، جو ان خلافیات میں بہرصورت نظر انداز کرنے کے لائق نہیں، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اسوقت تک عمر خیام کے موضوع پر بعض ابواب لاینحل رہ گئے ہیں، لیکن ہمیں انھیں یہاں چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ امروز فردا میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک ضخیم تصنیف "عمر خیام" چار پانسو صفحوں میں پریس سے نکلنے والی ہے، جو امید ہے کہ خیام کے مالہ و ماعلیہ

پر حاوی ہونے کے علاوہ ان خلافیات میں بھی شاید قول مختتم بن سکے،

کتاب کے آغاز میں ایک دوسرے فاضل پارسی مستشرق جناب شمس العلماء ڈاکٹر سر جیون جی جمشید جی مودی پی ایچ ڈی، ال ال ڈی، سی آئی ای، کے ٹی کا ایک مقدمہ ثبت ہے جس میں مقدمہ نگار نے اپنے انکسار کے باوجود ادبیاتِ ایران پر فاضلانہ نظر ڈالی ہے، اور فاضل مترجم نے شعر العجم کے حصہ کے ترجمہ میں رباعیاتِ خیام کا انگریزی ترجمہ بھی اپنے ذوق وشوق سے خود کیا ہے، جو سلیس اور شگفتہ ہے، اور یوں تو پوری کتاب کی زبان نہایت شستہ سلیس اور عام فہم ہے، ہم جناب بھاجی والا کو اس مفید خدمت پر دلی مبارکباد دیتے ہیں،

کیفیۃ العارفین ونسبۃ العاشقین (فارسی) مرتبہ ومصححہ جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ گیا، حجم مجموعی ۴۰۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ، قیمت عہ، پتہ :۔
خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ، محلہ رام ساگر گیا،

حضرت سید شاہ عطا حسین صاحب منعمیؒ (۱۲۳۱ھ - ۱۳۱۱ھ) دورِ آخر میں صوبہ بہار کے برگزیدہ بزرگوں میں گذرے ہیں، موصوف اپنے حین حیات میں اپنا فیض عام جاری کئے رہے، اور صوبہ بہار کے جنوبی اضلاع خصوصیت سے اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوئے، اور موصوف کی وفات کے بعد بھی ان کی تصنیفات لوگوں کی روحانی تسکین کا ذریعہ ہیں، اور سلسلۂ فیض جاری ہے، موصوف کی تقریبًا تیس سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں ہیں جنہیں سے بعض ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں، لیکن ان کا بیشتر حصہ قلمی صورت میں ان کی خانقاہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے مسرت ہے کہ اس خانقاہ کے لائق سجادہ نشین جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب منعمی نے ان قلمی کتابوں کی اشاعت کا تہیہ کیا ہے، اور اسی سلسلہ کی پہلی کڑی زیر نظر کتاب کیفیۃ العارفین ونسبۃ العاشقین ہے، جو سلسلۂ ابو العلائیہ کے اکابر مشائخ وخلفا کی مرتب سوانح عمریوں پر مشتمل ہے، اور اس میں حضرت مخدوم ابو العلاء رحمۃ اللہ (۹۹۰ھ - ۱۰۶۱ھ) کے عہد سے مصنف کے زمانہ تک کے بزرگوں کے مختصر حالات، روحانی جذب وشوق، رحلت اور مقام دفن وغیرہ کی مرتب تصریحات ہیں، مصنف کے زمانہ کے مشائخ وخلفاء میں زیادہ تر صوبہ بہار کے بزرگوں

کا تذکرہ آیا ہے، کتاب کے مرتب و مصحح جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب نے کتاب میں جا بجا خود بھی حواشی لکھے ہیں، جنسے ان اسلاف کے اخلاف کا تذکرہ بھی منضبط ہوگیا ہے، نیز موصوف نے کتاب کے آخر میں ایک اردو ضمیمہ بھی لگا دیا ہے، جس میں پہلے مصنف کے حالات زندگی، پھر ان کے خلفار و مسترشدین کے حالات و تراجم ہیں، اور اسی ذیل میں خانقاہ دانا پور و گیا کے تاریخی حالات بھی ضمناً آ گئے ہیں، اور کتاب کی ابتدا میں مرتب کا ایک دیباچہ ہے، جسمیں مصنف اور تصنیف دونوں کا سرسری تعارف کرایا گیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اپنے عہد کے بہت سے ایسے اکابر کے حالات منظر عام پر آگئے، جو ابھی تک نگاہوں سے اوجھل تھے، اور جو ہندوستان کے پچھلے دور کی تاریخی تحقیقوں میں ماخذ بن سکتے ہیں، اسلئے مرتب موصوف نہ صرف تصوف کے حلقہ سے بلکہ علمی حلقوں کیجانب سے بھی شکریہ کے مستحق ہیں، ضرورت ہے کہ موصوف مصنفؒ کی دیگر قلمی کتابوں کو بھی وقف عام فرما کر علم و تصوف دونوں کی خدمت انجام دیں،

مثنوی یادِ اسلام، از جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب آہ، امیٹھوی، حجم ۷۶ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۱۰؍ پتہ :- مولوی محمد ساجد صاحب مغل پورہ فیض آباد،

جناب آہ امیٹھوی، امیر مینائی مرحوم کے وہ تلمیذ رشید ہیں جنکو وہ اپنے خوشنو شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح کے لیے منتخب کرتے تھے، آہ اردو کے مشہور لغت امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں بھی اپنے استاذ کے دست راست تھے لیکن رامپور سے قطع تعلق کے بعد خلوت نشین ہو گئے تھے اور اب ایک زمانہ بعید کے بعد اس مثنوی یادِ اسلام کے ذریعہ پھر شریک بزم ہوئے ہیں، یہ مثنوی حالی کی مثنوی کے طرز پر لکھی ہے جس سے عروج و زوال اسلام دونوں کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں اسلام کو محض قرآن مجید ہی کی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ابتدا حمد و صفات الٰہی کا ذکر ہے، پھر صنعت و خلقت سے صانع و خالق کے وجود کا ذکر کرکے خالق باری تعالیٰ کا تصور پیش کیا ہے، اس کے بعد توحید، تخلیق آدم، ضرورت رسالت، نبوت محمدی، سیرت نبویؐ، فضائل اسلام اور کارنامہائے اسلام کا تذکرہ ہے، پھر یہیں سے گریز ہے اور دور حاضر کے مسلمانوں کا حالِ زار آتا ہے، او ر دراصل یہیں سے یہ مثنوی مسدس حالی سے بھی جدا ہوتی ہے کہ حالی نے اپنے زمانہ کے حالات کے اعتبار سے علمائے کرام کا ماتم کیا ہے، اور آہ نے اپنے دور کے مغرب پسند مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے، اور پھر اصلاح حال کی دعوت دی ہے، مثنوی کا طرز بیان مؤثر اور دلنشین ہے، ضرورت ہے کہ اس کی عام اشاعت ہو کہ اسکا مطالعہ عام و خاص دونوں طبقوں میں دلچسپی سے کیا جاسکتا ہے،

"ر"

| جلد ۳۲ | ماہ جمادی الاولی ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء | عدد ۳ |

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی،	۱۶۴-۱۶۲
مسلمانون کی آیندہ تعلیم،	”	۱۸۵-۱۶۵
تاریخ وفاتِ نظامی گنجوی،	جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی،	۱۹۸-۱۸۶
گجراتی زبان اور اسکی تاریخ،	مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی سابق معلم عربی و فارسی مہاودیالے احمد آباد و مولف تاریخ گجرات،	۲۱۱-۱۹۹
خسرو باغ کے مقبرے،	مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی الہ آباد،	۲۱۸-۲۱۲
شاہی کتاب خانہ رامپور کے آلاتِ ہیئت،	مولوی امتیاز علی خانصاحب عرشی نائب ناظم کتبخانہ شاہی رامپور،	۲۲۲-۲۱۹
اسلام کے قرونِ وسطیٰ مین ساہوکاری کی ابتدا،	”ع ز“	۲۲۸-۲۲۳
یورپین عورتون کی مشرقی سیاحتین اور انکی یادداشتین	”ع“	۲۳۰-۲۲۹
اخبار علمیہ،	”ع ز“	۲۳۴-۲۳۱
خونِ جگر	حضرت جگر مرادآبادی،	۲۳۵
”تازیانہ“	جناب اسد ملتانی، بی اے،	۲۳۶-۲۳۵
بیان اثر،	جناب محمد علی خانصاحب اثر رامپوری،	۲۳۷-۲۳۶
سخن تاثیر،	پروفیسر تاثیر، ایم اے،	۲۳۷
مطبوعات جدیدہ	”ز“	۲۴۰-۲۳۸

شذرات

اخبار پڑھنے والے دوستون کو معلوم ہوگا کہ آجکل دار العلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ کے احاطہ مین طلبہ اور مدرسین کے لیے ایک مسجد زیر تعمیر ہے، اور ہمارے مہتمم دار المصنفین مولٰنا مسعود علی صاحب ندوی رکن ندوۃ العلمار نے اسکی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، اور اسی تقریب سے وہ دو تین مہینون سے لکھنؤ مین مقیم مین، موصوف کا کام نہ صرف مسجد کو اپنی نگرانی مین نبوانا ہے، بلکہ اس تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کرنا بھی ہے، خوشی کی بات ہے کہ ان کو حسب دستور سابق دونون کامون مین کامیابی ہورہی ہے، مسجد کا طول ترسٹھ ۶۳ فٹ ہے، اور محرابون تک عمارت پہنچ چکی ہے، مسجد کے نقشہ مین کسی قدر جدت بھی روا رکھی گئی ہے، جس سے مسجد ہوادار اور خوش منظر بھی ہوگی، دائین بائین اور قبلہ رخ بمبئی کی مسجدون کی طرح دروازے اور کھڑکیان رکھی گئی ہین، اور گنبدون کے بجاے چھت کا خیال ہے،

تعمیر مسجد مین امداد سے مسلمانون کو فطرۃً جو شغف ہے وہ بیان کا محتاج نہین، اور نہ معارف کے ناظرین کو اس کے ثواب کی آیتین اور حدیثین سنانی ہین، صرف ان کو یاد دلانا اور متوجہ کرنا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے پرجوش اور فرض شناس ناظرین اپنے سے خود اور اپنے خاندان کے افراد اور اپنے شہر کے نیک عمل مسلمانون سے تحریک کرین، اور جو کچھ جمع ہو اسکو ناظم صاحب ندوۃ العلمار لکھنؤ کے پتہ سے بھیجدین،

آجکل مولٰنا مسعود علی صاحب ندوی کے قیام کی وجہ سے دار العلوم کے مختلف صیغون مین اصلاح اور ترقی نظر آرہی ہے، اور امید ہے کہ ان کے "ڈکٹیٹر شپ" مین دار العلوم کو ہر قسم کے فوائد میسّر ہونگے، ضرورت اسکی ہے کہ ہمارے طلبہ اور مدرسین بھی اپنے فرائض کو محسوس کرین، یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ طلبہ آجکل مسجد اور مدرسہ کے کام مین پوری دلچسپی لے رہے ہین، اور سمجھ رہے ہین کہ کسی درسگاہ کی اصلی اہمیت بلند عمارات اور وسیع سامان نہین، بلکہ خود طلبہ ہین،

دارالعلوم کے فارغ شدہ طلبہ بھی آجکل کے ماحول مین دین وملت کی خدمت مین مصروف نظر آتے ہین، لاہور مین مولنا محمد حنیف صاحب
ی خطیب جامع مبارک کے خطبات پسند کئے جارہے ہین، کلکتہ مین مولنا مظفرالدین صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ نے انگریزی مین
ام کے اصول وماخذ پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے، جسمین اسلام کے عقائد کلامی اور تصوف کے قرآنی ماخذ بتائے ہین، اور ان مستشرقین کی پرزور تردید
ی جنھون نے اسلام پر دوسرے مذاہب کی خوشہ چینی کا الزام لگایا ہے، اور انکی غلطیان دکھائی ہین، ایک تیسرے ندوی عالم مولوی مطلوب الرحمان
حب نگرامی ندوی نے لکھنؤ سے اصلاح کے نام سے ایک ماہوار تبلیغی اور اصلاحی رسالہ جاری کیا ہے جسکے تین پرچے نکل چکے ہین، تین روپے
ں اسکی قیمت ہے، اس رسالہ کا مقصد مسلمانون کی مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی اصلاح ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اس کی خریداری
طرف توجہ کرین،

آجکل کے اسلامی اخبارات مین باہمی ذاتی مناقشون کی ایسی بدترین تصویرین نظر آرہی ہین، کہ انکے صفحات کو غض بصر کے بغیر پڑھنا مشکل ہے
ی دوسرے پر الزام تراشی، اور حریف کو ہر طرح بدنام کرنے کیلئے مشتبہ الفاظ، ذومعنین جملے اور دوسرے ناپاک واقعات کی تلمیحات بے محابا استعمال
رہی ہین اور مزید تعجب یہ ہے کہ ان چھینٹون سے مقدس عباؤن کے دامن بھی پاک نہین، انقلاب وزمیندار، وہند جدید کا قضیہ تو پرانا ہو چکا،
ہند جدید اور خلافت باہم دست وگریبان ہین، مدینہ اور الجمعیۃ ایک طرف، الامان ووحدت دوسری طرف ہین، بہار مین اتحاد ایک
ب، اور نقیب دوسری سمت، باہم اس طرح نبرد آزما ہین، کہ متانت اور سنجیدگی کو آنکھین بند کرلینی پڑتی ہین، جب ہمارے معلمین اخلاق
ے یہ اخلاق ہین، تو عام مسلمانون کا کیا شکوہ؟

ان خانہ جنگیون کا آغاز گو اختلاف راے سے ہوا، مگر اب وہ قومیات کے بجائے ذاتی عناد وکاوش کا مظاہرہ
رہی ہین جنمین ہر فریق اپنے حریف کو بدنام کرنے کے لیے اس کے خلاف غلط فہمیون کے پیدا کرنے مین سراپا مصروف عمل ہے،
وجدہ جدید طرز تحریر کا ہر اسلوب ایک مستقل حربہ کی صورت مین استعمال پا رہا ہے، مشتبہ الفاظ، سوالات، نقطے، افواہ، طنز،
لمیحات، بے نام تحریرین، ہر چیز معرض اشاعت مین آرہی ہین، اور ان کو "پاک قومیات" کا درجہ دیا جارہا ہے،

یہ منظر کس قدر دردناک ہے،

مسلمانون کا سیاسی انتشار اب کچھ چھپا راز نہین، ہم نے پہلے مسلم لیگ بنائی، پھر خلافت قائم کی، پھر جمعیت کھڑی کی، بعدازین مسلم کانفرنس کو پیدا کیا، پھر جماعت احرار میدان مین آئی، اوران مین سے ہرایک کو مسلمانون کی سیاسی نمایندگی کا دعویٰ ہے، اورہرایک پوری قوم کی زبان ناطق بننے کی مدعی ہے، ایسی حالت مین مسلمانون کا کوئی پروگرام اب تک نہ قابل عمل ہوسکا ہے، اور نہ آیندہ ہوگا، اس سے پہلے کہ مسلمانون کو اصلاح کی دعوت دی جائے، ضرورت ہے کہ ان انجمنون کی شکست وریخت کیجائے، ان مین سے بعض کو دفن کردیا جائے، بعضون کے مقاصد بدل دیئے جائین، اورصرف ایک سیاسی انجمن قائم رکھی جائے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ احرار اور معتدلین دوگروہون مین منقسم ہوکر دو سیاسی مجلسین بنالین، لیکن یہ تو نہ ہو کہ دو جمعیۃ العلمائین ایک شہر مین، بلکہ ایک ہی محلہ مین قائم ہوکر "جمعیۃ علمائے ہند" کہلائین، اوراصلی کو نقلی سے تمیز کرنا مشکل ہوجائے، حالانکہ شعراء کے تخلص کی طرح ابھی نئی انجمنون کے لیے نامون کی کمی نہین،

ملکی حالات کے انقلاب کے سبب سے ضرورت ہے کہ ہم اپنے حالات پر پھر ایک نظر ڈالین اورگذشتہ تعصبات کو چھوڑ کر فکر وعمل کی وحدت کی نئی کوشش کرین، اوراس ذمہ داری کو محسوس کرین جو پوری قوم کی گمراہی اور غلط روی سے ہمارے رہبرون کے سر پہ عائد ہوگی، ذاتی کدوکاوش، اورپرانی مخالفتون اور رایون کے اختلافات کو اگراب بھی مسلمانون نے دفن نہین کیا، تو وہ نہ ملک کے کام آسکین گے، اورنہ حکومت ہی کی خوشنودی کی وہ "دولت" پاسکین گے، جس کے لئے ہمارے بہت سے افراد بہت بیتاب ہین، سلطنتین دوستی کا پیمان صرف اس طاقت اور قوت سے باندھتی ہین جوان کو نفع یا نقصان پہنچا سکے، مختلف الآراء، کمزوردل، اورناتوان جماعت کس برتے پہ کسی کو اپنے ساتھ عہدوپیمان باندھنے پر مجبور کرسکتی ہے،

مقالات

مسلمانون کی آیندہ تعلیم

"مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے عنوان سے اڈیٹر معارف نے ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء کی شب کو جامعۂ ملیہ، دہلی کے ایوان مین ایک مبسوط مقالہ پڑھا تھا جسکو رسالۂ جامعہ نے اپنے مئی اور جون کے نمبرون مین شائع کیا ہے، اب ہم اس مقالہ کو فائدہ کی تعمیم اور صحیح خیالات کی اشاعت کی غرض سے معارف مین شایع کرتے ہین،

"اڈیٹر"

دوستان و عزیزانِ جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولینا شبلی مرحوم نے علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے مین "مسلمانون کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا، جو نہایت مقبول ہوا تھا، اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہو کہ "مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے مسئلے پر غور کیا جائے،

اُسی زمانہ مین سرسید مرحوم نے مسلمانون کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانون کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا، بہت سے صاحبون نے اس کا سبب جہالت اور اس کی علاج تعلیم جدید کو قرار دیا تھا، چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کرکے عمل کیا، اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے، اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے، کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہئے، ان پچاس برسون مین ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے اور ایک منٹ کیلئے بھی اس پر غور نہین کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جسمین مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے جہان

ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہو گیا، ورنہ ہلاکت کا عمیق غار اُن کے پاؤن کے نیچے تھا،

اب یہ کوئی چھپا راز نہین کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے مین اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہین، پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریان تھین، اور یہ یقین تھا، کہ سرکاری نوکریون کا دروازہ اسی کنجی سے کھلے گا لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت مین ہے، کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہو گا پچاس برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعے کی شکل مین ہمارے سامنے آگیا، :-

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماکر وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر،

مسلمانون مین جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ ۱۸۸۳ء مین علی گڑھ سے مولینا شبلی نے اپنے وطن کے دوستون کو یہ مبارکباد بھیجی تھی، کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانون کے ہاتھ مین ہے، آٹھ لڑکے انٹرنس مین پاس ہوئے جنمین پانچ مسلمان ہین" (مکاتیب اول ۱۸۸۳ء طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا، اس سے وہ چند گریجوٹ ہو رہے ہین، تاہم اب کیا مسلمانون کا انحطاط کم ہو گیا، اور وہ اب ترقی کر رہے ہین، ؟ مولینا شبلی مرحوم جب مولویون کے مدرسون کو چھوڑ کر علی گڈھ کالج آئے تھے، تو وہان کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے، :-

یہان آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خوان فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہین، یہان ان چیزون کا ذکر نہین آتا، بس خالی زنہ تیون کی تماشا گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے، کہ وُہ ہی باتون کو تمامتر ضعیف ثابت کر دین گے، لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہین سکتے،

"سید صاحب (سر سید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانون مین ایک بھی ایسا نہین، جو کسی مجمع مین کچھ کہہ سکے، یا لکھ سکے، صرف تین شخصون کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہین کہ انگریزی ان کے

دماغون مین کچھ تبدیلی نہین پیدا کرتی،،

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے، جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے، کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانون کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہین ہے، ؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ نفس اے بی سی ڈی ہمارے کامیابیون کے خزانے کی وہ کنجی ہے، جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی،

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھین، ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہئے،

تعلیم | تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہین، اور ہم اپنی زبان مین اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہین، اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے، اور آج کل اس کے معنی اس بھی زیادہ محدود ہین، یعنی انگریزی زبان مین لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہین، ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے، تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے، جو عام یونیورسٹیون کے ماتحت دی جاتی ہے۔ دوسرے معنون مین ہم یون کہہ سکتے ہین، کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے،

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے، کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور اُن کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جسطرح نجاری، لوہاری، معماری، اور دنیا کے دوسرے پیشے ہین، اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہی، تو وہ اسی طرح موردِ الزام ہوسکتا ہے جسطرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیون نہین جانتا کہ موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے مین یہ چیز حدِ فاصل تھی کہ اس مین فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہین، کیا جب عربون نے رومیون اور ایرانیون کو شکست دیکر تاج و تخت پر قبضہ کیا، وہ اپنی فی صدی تعلیم مین اپنے حریفون سے بڑھ کر تھے پھر جب اُنھین عربون کو سسلی مین نارمنون نے اور اندلس مین اسپینیون نے اور عراق اور خراسان مین تاتاریون نے شکست دی، تو وہ فی صدی تعلیم مین ان نارمنون، اسپینیون، اور تاتاریون سے کم تھے،

خود ہندوستان مین مسلمانون کو ایک طرف سکھون نے اور دوسری طرف مرہٹون نے دبا کر اُن کے نظام حکومت

کو درہم برہم کر دیا، تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم مین بڑھکر تھے، ؟

عزیز ر! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں مین ہے جنکو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا مین پھونک رکھا ہے، اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہوگئے ہین، کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور ناپتے ہین، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد مین نہین، بلکہ اس کی کیفیت مین ہے، اگر کہین صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی، تو وہ ۵۰ ہزار انگریز ۳۵ کروڑ ہندوستانیون پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیون کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے،

قوم کی ترقی کا راز ان واقعات سے جو مشاہدات ہین، یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے، کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہین، بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت مین ہے، اس کیلئے سب سے پہلی چیز یہ ہے، کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراضِ زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصودِ زندگی رکھتے ہون جس کے حصول مین اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد، غرض، اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو، اور اسی کی دھن مین اس کا جینا مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، سب کچھ ہو اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو، کہ جب کبھی اسکے سامنے اسکے ذاتی اور شخصی مقاصد اسکے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہون، تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہان تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کر دے،

اٹھارہوین صدی کے ہندوستان کی تاریخ مین جو واقعات پیش آئے، ان کی تحلیل کیجئے، تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا، کہ ارکاٹ، سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی مین مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستون اور سلطنتون کو اس آسانی سے کیونکر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے، ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت اور منظم طاقت تھی، او دوسری طرف منتشر افراد اور پراگندہ اشخاص تھے جنمین سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا، کہین اگر کوئی خاندان حکمران تھا، تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے باہم نبرد آزما تھے، آرکاٹ اور بنگال کی نوابیون مین کیا یہی پیش نہین آیا، حیدر علی، اور ٹیپو جنھون نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ یہ ذہنی مضبوطی

اُن کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت مین کس طرح ڈھل گئی تھی، اور اس وقت تک اس آہنی انسان کی قوت مین کمزوری نہین آئی، جب تک اس کے خاندان اور دربار مین وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آگئی، مذہب کی اصطلاح مین اسی "ذہنی وحدتِ مقصد" کا نام **ایمان** ہے، جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہین ملسکتا،

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہین ہو سکتا، بہت کچھ اسی مقصدِ عزیز کی گران بہا متاع کی حفاظت بقا، ترقی، اور استواری کی خاطر وجود مین آتی ہے، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری، اور موت سے بے خوفی، اسی طلسم کے روحانی اسرار ہین، یہ حقیقت مین وہ جرس ہے، جس کی آواز پر قومون کے قافلے اپنے سفر کرتے ہین، اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہین،

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا مین کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہین ہے تو وہ قوم نہین، بلکہ جانورون کا گلہ اور حیوانون کا جھنڈ ہے،

غور سے دیکھئے اسی ملک مین ہندو قوم آباد ہے، اس پر انقلابات کے بیسیون دور گذر چکے ہین، صد ہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، اُن کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک نوکری پیشے سے لیکر آزادی طلب تک، غریبون سے لے کر دولتمند مہاجنون تک، محکومون سے لیکر اُن کے رئیسون اور راجاؤن تک، اور سب سے بڑھکر یہ کہ اُن کے کانگریسیون سے لیکر خوشامدیون تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے، اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر، اور عائق اور مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتون کو واحد قوم بنانا، اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک مین مستقل وجود بخشنا، اب اس قوم کی ہر کوشش ہر راہ سے اسی ایک منزلِ مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے، اس کے اہلِ سیاست کی کوشش یہ ہے، کہ اس کو سیاسی خود مختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشین، اہلِ تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کیلئے اس کے علم و فن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہین، اصلاحِ معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقون سے آگے بڑھا رہے ہین، اہلِ دین اس کی دینی وحدت کی دُھن مین ہین، اہلِ علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہین، اہلِ ادب

اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق مین مصروف ہین، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتون کی تفریق کے خلاف حصول وحدت کیلئے پس دیوار لڑ رہے ہین، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتین اور تدبیرین ہین، قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان مین سے ہر ایک کی تکمیل مین مصروف ہین، اور ان مین سے ہر ایک یہ جانتا ہے، کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہین جا رہا ہے جہان وہ خود جانا چاہتا ہے، اسلئے راہ رو اور راہبر باہم دست و گریبان نہین،

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلے چیز "وحدتِ مقصد" کا وجود ہے، یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہین، حکمران اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان مین، اہل پیشہ اپنے بازار مین، عالم اپنی درسگاہ مین، صناع اپنی کارگاہ مین، اخبار نویس اپنے دفتر مین، یہان تک کہ اسکے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ مین اپنے دوسرے کامون کے ساتھ اسی ایک مقصد کیلئے جیتے اور مرتے ہین،

تعلیم کا پہلا مقصد، مقصدِ زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے، کہ وہ قوم کے افراد مین اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے، قوم کے ہر فرد مین بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اسکی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اسکے حصول اور بقا کی خاطر ہر آزمایش اور امتحان مین پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے،

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اول مسلمانون کے سامنے اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانون کے سامنے اُن کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی، اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک کوئی درسگاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے،

ہمارا پچھلا نظامِ تعلیم کتنا ہی برا سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیر سایہ علوم و فنون کی تحصیل، اس مقصد کا اثر یہ تھا، کہ تعلیم ہمارے نظامِ زندگی مین ایک دنیوی نہین، بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا، یہان تک کہ کتابین اور کتابون کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب اور احترام کے قابل تھے، ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی، اور اوسکی خدمت کیلئے ہر علم و فن کو سیکھتے تھے،

اور پڑھتے تھے، ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا، اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیر مسلم قومون سے لئے، مگر غور سے دیکھئے، کہ ہمارے اسلاف نے ان مین پوری اصلاح و ترمیم کرکے ان کو اپنے نصاب درس مین اس طرح رکھا کہ وہ آج تمامتر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہین، ارسطو، اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہین کہ دہریت سکھاتا ہی جب وہ ہماری مشرقی درسگاہون مین پڑھایا جاتا ہے، تو پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھکر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے، تو نیچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی نامون سے اس کی تعبیر نہین ہوتی، بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدء فیاض کے فلسفیانہ لیکن باادب نامون سے اس کی تعبیر کیجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درسگاہون کے طلبہ مین بے دینی یا مذہبی بے حسی پیدا نہین ہوتی،

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا، تو قرآنِ پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتائے گا، کہ وَمَن يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (جس کو حکمت دی گئی، اسکو بڑی نیکی دی گئی) جب ہیئت و فلکیات کا درس دیگا، تو تمہید مین ويتفكرون فى خلق السموات والارض اور ربنا ما خلقت هذا باطلا اور لتعلموا عدد السنين والحساب اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتون کو پہلے پیش کریگا، جغرافیے کی کتاب لکھے گا تو کہے گا کہ یہ سيروا فى الارض کی تفسیر ہے، علم طب پڑھائے گا تو شفاء للناس اور العلم علمان علم الاديان وعلم الابدان. کو دیباچہ مین ذکر کرے گا، فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالی کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے پڑھتا ہے ومن لم يعرف الهيئة والتشريح فهو عنين فى معرفة الله تعالىٰ. (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہین جانا تو وہ خدا کی معرفت مین نامرد ہے) غرض جس علم و فن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی، اس کو اپنے مقصد مین رنگ کر پیش کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا، کہ ہر عقلی علم و فن اور ہر دنیاوی صنعت و ہنر بھی سرتاپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر مین جلوہ گر ہوتا تھا، ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دکان دار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہین بلکہ وارث پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ استاد کے رنگ مین رنگ کر ظاہر ہو، اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد و ستد کا معاملہ اور ایک ہاتھ سے لینے اور دوسرے

ہاتھ سے دینے کی بنیوٹی، اور مزدوری کا پیشہ نہین سمجھتے تھے، بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ اس لئے اس راہ مین ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر و مناظر پیش ہوتے تھے جنکو آجکل لوگ مشکل سے باور کرسکتے ہین،

آج کل کی تعلیمی تاریخ مین یہ کوئی انوکھی بات نہین کہ چند روپیون کی خاطر استاد اِس کالج سے اُس کالج اور اِس یونیورسٹی سے اُس یونیورسٹی مین دوڑے پھرتے ہین، اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا ذریعہ جانتے ہین، اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپیون کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہین،

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ مین یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اُجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقوی اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے، اور پھر لیتے بھی تھے، تو وجہ کفاف سے آگے نہین بڑھتے تھے، وہ بڑے بڑے علما جن کے نامون کی عزت ہمارے دلون مین ہے، اونھون نے دس دس اور پندرہ روپیون پر اپنی زندگی بسر کردی ہے، اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر لوگون پر اپنے احسان کا بار بھی نہین رکھتے تھے،

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا، اور خصوصاً بیرونی ملکون مین جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے، لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے، جب ہماری نگاہون کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا، تو علم کی طلب مین نہ تو خشکی کی مسافت اور نہ تری کی ہولناکی ہماری ہمتون کو پست اور ہمارے ارادون کو کمزور کرتی تھی، محدثین نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا، بخارا کا یتیم محمد بن اسمٰعیل بخاری اپنی بیوہ مان کے زیر سایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور واپسی مین عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درسگاہ کو چھان ڈالتا ہے، مصر کے طالب علم خراسان آتے ہین، خراسان کے مصر جاتے ہین اسپین اور سسلی سے ملکر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہین، اور مصر و شام سے اسپین جاتے ہین، بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۸ھ نے علم کی طلب مین بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہراۃ، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصری، دینور، ری، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسدآباد، اسفرائین، آمل، اہواز، بسطام، خسروجرد وغیرہ شہرون کی خاک چھانی، جغرافیے مین دیکھئے، یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لیکر ترکستان، خراسان

ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہین،

محمد بن مفرح اموی اندلسی کی راہ طلب مین یورپ، افریقہ، اور ایشیا، تین براعظمون کے شہر داخل ہین، اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر، اور ایشیا کے شہر دمشق، صنعاء، اور زبید (یمن) ان کے تعلیمی مقامات ہین، ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر سرقسطہ (سراکوزہ) مین ہوئے لیکن اندلس سے لیکر خراسان تک کچھ گردی کی، ابو محمد عبد اللہ بن عیسیٰ بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے، وہ اسپین سے فارغ ہوکر اسکندریہ اور مصر آئے، پھر مکہ گئے، پھر عراق مین داخل ہوئے، اور بغداد مین مقیم رہے، پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور، اور بلخ مین قیام کیا، پیدا اسپین کی خاک مین ہوئے، اور ۵۴۷ء مین افغانستان کے شہر ہرات مین پیوند زمین ہوئے، حسین بن احمد پیدا قرطبہ مین ہوئے اور ۴۵۶ء مین یمن کی سرزمین مین دفن ہوئے،

تاج الدین سرخسی ۵۲۴ھ مین پیدا خراسان کے شہر سرخس مین ہوئے، نشو و نما شام مین ہوئی، اور وفات ۵۹۷ھ مین اندلس مین پائی، نحو کے مشہور امام ابو علی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر مین ہوئے، پھر تعلیم و تعلم کی خاطر ملکون کی سیر کرتے، بغداد اور موصل سے چل کر اسپین مین جاکر دم لیا، اور ۵۲۳ھ مین قرطبہ مین وفات پائی، ابن المقری اصفہان کے محدث تھے، اونھون نے اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، صیدا، بیروت، عکہ، رملہ، واسطہ، عسکر مکرم، حمص، رقہ، اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی، کہتے ہین، کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کئے اور اونکی حالت یہ تھی، کہ اگر کسی نان پز کے سامنے ایک روٹی کے معاوضہ مین اوسکو پیش کیا جاتا تو وہ اوسکو قبول نہ کرتا،

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے، کہ وہ پیٹھ پر کتابون کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابو العلاء معری کی خدمت مین شام پہنچے ہین، تو پسینے سے کتابون کی یہ حالت تھی، کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا،

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیون مین دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علمون کو دیکھ کر ہم دنگ رہجاتے ہین،

لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانیوالی دوربینین ہوتین، تو آپ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعا، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہراۃ اور نیشاپور، مین ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے،

مین اس عہد کی صرف دو درسگاہون کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہون، ایک کوفہ مین حضرت امام ابوحنیفہ رح کی درسگاہ، اور دوسری مدینہ منورہ مین امام مالک کی، امام ابوحنیفہ کے حلقۂ تعلیم مین مکہ، مدینہ منورہ، دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، ری، قومس، دامغان، ترمذ، ہراۃ، قہستان، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے، ذرا نقشہ مین ان شہرون کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے،

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ مین ہے، حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجین اٹھتی ہین، اور یثرب کی پہاڑیون سے آکر ٹکراتی ہین، عرب کے شہرون مین مکہ معظمہ، صنعا، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہرون مین سے ایلہ، دمشق، عسقلان، خلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور، اور انطاکیہ، اور عراق، کے شہرون مین سے بغداد، بصرۃ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رملہ، اور ممالک عجم مین سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قومستان، چغان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہراۃ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہو چکا، اب مغرب کی طرف چلئے، مصر کے شہرون مین سے قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسفان، تنیس، اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہرون مین سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بسطہ، باجہ، قرطبہ، تنہ اور اٹلی کی سسلی، اور ایشیائے کوچک کے سمرنا (ازمیر) سے طالب العلم آ اور جا رہے تھے،

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن مین رہے، کہ اس وقت دنیا مین نہ آج کی طرح ریلین تھین جنھون نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے، اور نہ دخانی جہازات تھے جنھون نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے، اور جو برسون کے سفر کو ہفتون مین اور مہینون کے راستون کو دنون مین اور دنون کی مسافت کو

گھنٹوں مین طے کرتے ہین، اور وہان نہ ڈاک اور تار کے یہ انتظامات تھے، جو گھر بار اور اہل وطن کی خبرین دمبدم پہنچاتے رہتے ہین، اور نہ یہ ہوٹل اور مسافرخانے تھے، جو مسافرون کو گھرون سے زیادہ آرام پہنچاتے ہین، اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا، جو ریتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کیلئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے،

لیکن ایک لمحہ ٹھہریئے، یہ گذشتہ عہد کی داستان کہن اخوان فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہی، بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کون ساجذبہ تھا، جوان طالب علمون کو اس زمانے مین اس طرح کوچہ بکوچہ شہر بشہر، اور ملک بملک لئے پھرتا تھا، کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے، نہ دریا عائق ہوتے تھے، پھر وہ کیا جوش و خروش تھا جوان کو اس راہ طلب مین اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا،

ہیچ گر ذوق طلب از جستجو بازم نداشت دانہ می چیدم من آن روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصد زندگی اور نصب العین تھا جس کو دین کا ولولہ اور مذہب کا جوش کہتے ہین، یہ ان کی زندگی کی روح تھی، اوران کی حیات کا مقصد، ان کے قبضے مین یہی بجلی کا وہ خزانہ تھا، جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبون سے عبارت ہین، چل رہے ہین،

اس سے دوسرے درجے پر جو جذبہ ہے وہ سیاست ہے، اگر اسلام مین دین خود سیاست ہے، تو اس کے یہ معنی ہین، کہ سیاست کا جذبہ کار اس مین دین کے تحت ہے، ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہون یا گورے، ایشیائی ہون یا یوروپی سب کے سب سلطنت مین برابر کے حصہ دار ہین، اسلام مین صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری، اور قومون کو غلام بنانے کی نیت سے نہین، بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانون مین قومیت، وطنیت اور رنگ و روپ کی مختلف برادریون کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہوجائے، انسانون کے درمیان طبعی اور فطری تفرقون کو ملیت کی بنیاد نہ قرار دیا جائے، جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہین سکتے، بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جس کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان بدل سکتا ہے،

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا، اور کم از کم بارہ سو برس تک اُس نے ہر میدان مین اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ مین لے کر نکلتا تھا، اور چند روز مین نومسلمون کی ایک جماعت اپنے ساتھ لیکر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے مین اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا، افریقہ مین، بحری جزیرون مین اور مختلف ملکون کے دور دراز گوشون مین اس طرز سیاست نے بڑی بڑی ریاستین، اور حکومتین کھڑی کر دین، اسطرح غلامون کو اسلام کی آزادی سے مالامال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشورکشائی، اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا، مصر مین غلامون کی سلطنت صدیون تک اسی طرح چلتی رہی ہے، اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نومسلم ہین جنھون نے بارہا شمالی افریقہ مین حکومتین کین،

وہ کون سا جذبہ تھا جو نومسلم ترکون، تاتاریون، اور مغلون کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیوارون سے لیکر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکون پر ان کو بارہا حکمران بناتا رہا، سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچا، اور پھر غزنی مین بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہی، جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہی، غور کے نومسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہین، وہ اٹھتے ہین، اور آندھی کی طرح غزنی سے لیکر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہین،

ان مثالون سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مین یہ دکھاؤن کہ اسلام نے کیون کر دین ہونیکے ساتھ سیاست کا فرض انجام دیا، دوسرے لفظون مین یون کہنا چاہئے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پرزور اور قوی ہے، کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہین پڑتی ہے،

عشق خود را، است و ہم خود منزل است

باین ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہین برتا جاسکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قومون اور اسلامی ملکون مین جو فشار برپا کر رکھا ہے، اس کے لئے یہ لازمی ہوگیا ہے، کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومین اور جماعتین باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملکر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہون کہ حریف ہماری صفون کو چیر کر درہم برہم نکر سکے، اس کیلئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان مین تطبیق دی جائے جس طرح ہم عقل و

نقل اور معقول ومنقول کو تطبیق دیتے ہین، غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہین جنمین کبھی صلح نہین ہو سکتی، اسلامیت کے حامی ہر چیز مین مسلمانون کی علحدگی کے خواہان ہین، اور وطن کی دوسری قومون سے ملکر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کرکے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرنا چاہتے ہین، دوسری طرف وطنیت کے طرفدار اس تفریق وامتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تبری کرنے پر آمادہ ہو رہے ہین، پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے، تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بیزاری ہے، اور یہ دونون نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لیجا رہے ہین، حالانکہ جس طرح عقل ونقل کی تطبیق ممکن ہے، ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے، ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء کے نظریۂ سیاست نے اس امکان کو واقعے کی صورت مین ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے، کیا ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت مین پست تھا، اور موجودہ عہدِ تحریک مین جمعیتی خادمانِ وطن کانگریسی خدمت گذارون سے کسی بات مین کم ہین، حالانکہ سب کو معلوم ہو کہ جمعیۃ العلماء سرتاپا مذہبی جماعت ہے، اور باین ہمہ وطنی خدمات مین خالص وطن پرستون سے کسی درجہ کم رتبہ نہین،

میرے نزدیک جس طرح **ندوۃ العلماء** کی درسگاہ عقل ونقل کی تطبیق ہے، **جامعہ ملیہ** اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق ہے، اور اسی لئے یہ دونون درسگاہین مسلمانون کی آیندہ تعلیم مین بہت بڑا اثر رکھین گی،

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکشون کا بہترین فیصلہ نہ کرین گے، اس ملک مین ان کا مستقبل حد درجہ خطرناک رہے گا،

ہندوستان مین اسلام اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکون مین جہان مسلمانون کو تعدادی اکثریت حاصل نہین ہے، ان کے دینی اور وطنی فرائض مین یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے، کہ خالص مذہبی اور قومی امور ومسائل مین اپنی وطنی حکومت کے زیر سایہ نیم خود مختاری حاصل کرکے ملک کے عام سیاسی وانتظامی امور ومسائل مین اپنے دوسرے ہم وطنون کے ساتھ اشتراک عمل کرین، صاف لفظون مین یون کہا جا سکتا ہو کہ اُن کے اپنے مذہبی وتمدنی مسائل مین جن سے قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خود مختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی، سیاسی

انتظام و مسائل مین وہ دیگر فرزندانِ وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہو کر اپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراکِ عمل کرین، موجودہ سیاسی اصطلاح مین ہم یون کہہ سکتے ہین، کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلاشرکت غیرے کلچرل آٹانومی حاصل کرین، اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات مین وہ اپنے ہم وطنون کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی پر قناعت کرین، اس طرح مسلمانون کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہوجاتی ہے اور دوسری طرف ان پر ملی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہین ہوتا، جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخابِ نمایندگی کی علحدگی کا مطالبہ کرتے ہین، وہ بجائے خود علحدہ نمایندگی سے طے ہونگے، اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات مین ان کو دوسرون سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبے کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے، اور نہ لوگون کو عام ملکی معاملات و سیاسیات مین ان کی مخصوص قومی معاملات مین علحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے،

اس طرح مسلمانون کی دو مجلسین ہون گی، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی امور و معاملات کا فیصلہ کرے گی، اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی،

ہم نے جہانتک ان مسائل پر غور کیا ہے، ہم کو اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلے کا نظر نہین آتا، یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے مین جو پہلے سے ملک مین رائج نہ ہو، ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے، مگر جس طرح ہر نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر طے کرکے عمل مین لاتے ہین، اسی طرح اس پر ہم عمل کرسکتے ہین،

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہوگا، کہ ہندوستان مین ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہین،

۱- پیغامِ اسلام کی تعمیل، حفاظت اور بقا،

۲- اس ملک کیلئے ایک عام جمہوری نظامِ حکومت کا قیام،

۳- اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص اسلامی کلچرل آٹانومی" کا قیام،

مقاصد ثلاثہ ہین جنکو ہم اپنی قومی زندگی کی روح عمل قرار دیسکتے ہین، ان کے لئے جدوجہد اشاعت و تبلیغ
بی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہوسکتا ہے،

اس موقع پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی بازپرس کی جائے لیکن اگر میری تقریر کا پچھلا حصہ حاضرین کے
، تو یقیناً وہ میری طرف سے اس بازپرس کا جواب دیسکتے ہین، میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے، کہ وہ قوم
زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے، اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کرکے
ل بنائے، دنیا مین آج جہان کہین کوئی قومی حکومت ہے، اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی
ہے، انگلستان مین جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزون کے تعلیمی مرکز ہین، اسی طرح ان کے نظری سیاسیات
ن، وزیراعظم سے لیکر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہون کے احاطون مین آکر اپنی سیاسیات کے
ن کرتا اور وہان کے طالب علمون کو آیندہ کی سیاسی ذمہ داری کیلئے تیار کرتا رہتا ہے،

ئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو مین کہونگا کہ اس کا
ں ملک کے بچون کی بے مقصد تعلیم ہے، جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنادیا ہے، اور دنیا مین ایک
ق کی ہے جسکی زندگی کی کوئی غایت نہین ہے،

ب کھلا ہوا ہے انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہین، بلکہ سیاسی نقطۂ
اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانون کی اور دوسری قومون کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کردیجائے
ونذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے، اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ
جائے،

سری طرف اسکو اپنی سلطنت کے چلانے کیلئے ایسے کم قیمت وسیلون کی ضرورت تھی، جو اسکے محکمون کے
ر کو سنبھال سکین اسلئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جسمین کوئی زندگی نہ تھی، اور علوم مین سے بھی صرف
ے جائین جن کی ضرورت آیندہ بننے والے کلرک (بابوون) کو مٹپن آسکتی ہین،

اسکول تک مین ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے، ایک ایسی بدیسی زبان جسکے ذریعے سے ہم اپنے افسرون سے گفتگو کرسکیں اوران کیلئے انکی زبان مین اون کے لئے مواد مہیا کرکے رکھ سکین، اور جغرافیہ جس مین زیادہ تر ہم یہ جانین، کہ وہ دنیا کون کون سے بڑے عظیم جزیرے اور ٹاپو ہین، جہان وہ علم لہراتا ہے جس کا آفتاب دنیا سے کبھی نہین ڈوبتا، اور تاریخ مین ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے، کہ ہندوستان کی موجودہ قومون نے کیونکر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے تاکہ اس ملک کی قوم تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے،

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جسمین ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈون کا ذکر ہے پڑھکر بے انتہا ہنسی آتی ہے، ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفین اوٹھائی ہین، اور جو انتظامات کئے ان کا ذکر ہوتا ہے، پھر وہ رخصت ہوکر چپ جاتا ہے، اور دوسرا آتا ہے، تو پھر انھین مناقب کی تکرار ہوتی ہے، اس طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جاسکے، اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا جس سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو، اور قوم کو زندہ قوم، سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم

ہم نے ہزارون اور لاکھون کے صرف سے ملک مین جابجا اسلامی اسکول، اسلامی کالج، بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے، کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول، اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہین، اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچتا ہے، بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹرون اور پروفیسرون کی پرورش ہوتی ہے، اور کچھ مسلمان طالب علمون کو کلاس میں جگہین مل جاتی ہین، مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایہ سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے، تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہین، کہ ان قومی سرمایے سے جو اسکول اور کالج قائم ہین، وہ قومی نتائج کے لحاظ سے سرکاری مدارس سے کس حال مین بہتر ہین، ؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت مین کہین بہتر ہے، کہ ہم اس سرمایہ کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہرون میں صرف اسلامی دارالاقامے قائم کرنے مین صرف کرین کہ ان اسلامی اسکولون اور کالجون سے جو فائدہ پہنچنا ممکن

وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہین، بلکہ دار الاقامے کی حیثیت سے ہو،

بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ ہے، کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربہ کو جھٹلانا ہے، اور اس تعلیم نے صرف نوشت و خواند کے ہنر کی تعلیم واشاعت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو، مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی مین اس سے فائدے کے بجائے روز افزون نقصان پہنچ رہا ہے، مذہبی مقصدِ زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے، کہ وہ حرف لایعنی جن کا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا، اب وہ برملا ادا کئے جا رہے ہین، اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے، کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے، اور خیالات واعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہو، ڈھیلی پڑتی جارہی ہے، اور ایک ایسی قوم پیدا ہورہی ہے، جو ظاہر و باطن دونون لحاظ سے حکمران قوم کے لفافے کی صرف نقل ہو،

مسلم یونیورسٹی کیلئے ۱۹۱۰ء مین جس وقت ملک مین جوش وخروش برپا تھا، مولنا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد مین اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی، جس کا ایک مصرع یہ ہے :-

کہ این سر رشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس کی برجستہ جوابی نظم کہی تھی، جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے، "مگر دستِ شما دستِ شما باشد" لوگون نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال وجواب پر محمول کیا ہو، مگر بیس برس کے بعد معلوم ہوگیا کہ لسان العصر نے جو شبہہ ظاہر کیا تھا، وہ شبہہ نہین حقیقت تھا، اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آجانا چاہیے، کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہیے، اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہیے، اور آیندہ ہماری درسگاہین صرف نوشت وخواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کیلئے نہ ہون، بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے،

اسی لئے مسلمانون کی آیندہ تعلیم کیلئے ضروری ہے، کہ ایسی درسگاہین بکثرت قائم کیجائین، جو بامقصد ہون، اور ان کا سر رشتہ واقعی مسلمانون کے حقیقی ہاتھون مین ہو، مسلمانون نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی، مگر انھون

نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہین کیا کہ یہان کے کرورون دماغون کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھون مین لے کران کو مذہبی وقومی جذبات سے یکسر خالی کر دین، اب ضرورت ہو کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کرین اور ایسی درسگاہون کی بنیاد قائم کرین، جوان کوان کی زندگی کا مقصد بتائین، اوران پران کی حیات ملی کے اسرار کھولین،

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانون کی زندگی کا تنہا مقصد تھی، اس وقت ملک کی عربی درسگاہون پر پھبتی کہی جاتی تھی، کہ یہ اپاہجون کے پیدا کرنے کی کلین ہین، اس طعن کو قبول کر لینے کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہین، کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و مبتذل حالت مین ہون، تاہم وہ بامقصد ہین، اور اپنے مقصد پران کو ناز ہے اور زمانے نے بتا دیا کہ زمانے کی بے التفاتیون اور بے توجہیون کے باوجود وہ زندگی رکھتی ہین، اور آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ آج کل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا ہوا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اوران پر عمل کرنے مین آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولون اور کالجون کے طلبہ سے بڑھکر ثابت ہوئے، اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تمنا نہین، جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہو،

مسلمانون کی علٰحدہ تعلیم اوپر کے معروضات اگر ذہن نشین ہون تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے مین عذر نہ ہونا چاہئے، کہ مسلمانون کی بامقصد تعلیم کیلئے یہ نہایت ہی ضروری ہے، کہ ان کی قومی درسگاہین، بالکل الگ جہان ان کو خاص اُن کے مذہبی وقومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دی جائے، ہمارے بہت سے مسلمان دوستون کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلون مین اُن کی نشستین معین ہون اور نشستون کا انتخاب مخلوط نہ ہوتا کہ مسلمانون کی مستقل ہستی رہے، میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستون مین عدم مخلوط انتخاب سے کہین زیادہ ضروری یہ ہے، کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تاکہ ان کی علٰحدہ قومی ہستی فنا نہ ہوجائے، اوران کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہوجائے،

اسی اصول کی بنا پر مسلمانون کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے، مسلمان ملک کی دوسری قومون کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیکس ادا کرتے ہین، لیکن آپ دیکھین گے، کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ

کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اُٹھاتے ہیں، اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں، وہان کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمامتر ہندو ہے، مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے اکثر عاری ہیں، ایسی حالت مین مسلمان طلبہ کا ان مین کم ہونا قدرتی بات ہے،

یہ تو اُن مدارس کا سلبی پہلو ہے، ایجابی پہلو یہ ہے، کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمامتر کفیل ہین، مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کرکے نہ خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے مین رکھتے ہین، ایسی حالت مین دوسری قوم کے مقابلے مین مسلمانون کا ابتدائی تعلیم مین کم ہونا بالکل کھلی بات ہے، یوپی مین سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اس لئے ناکام ہے، کہ اُن کیلئے بھی اُن کے سررشتہ کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے، جو ہمارے اغراض کے مطابق نہین،

مکتبی تعلیم کا نظام پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے، جا بجا شخصی یا جماعت کے چندون ہی کہین کہین بعض مکتب ہین جنہین سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے، اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے، پورے ملک مین چھوٹے بچون کا ایک بھی معیاری مکتب نہین جو چھوٹے بچون کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے، جامعہ ملیہ کے کارفرما دوستون اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے مین نے اس ضروری تجویز کو بار بار پیش کیا ہے، مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہین، اور ان کے احاطے مین اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے، گورکھپور مین انجمن اجرائے مکاتب کے نام سے ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلع مین قائم کئے ہین، اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلعے مین ضرورت ہے، جنکے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو، اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیون اور ڈسٹرکٹ بورڈون سے اپنے مکتبی سلسلون کیلئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کرین، اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کرین کہ مسلمانون کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغے کے سپرد کیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے مین کر رہے ہین،

میری اس گذارش سے اس نتیجہ تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کیلئے مسلمانون کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے

سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے خصوصًا جب وہ وقت آئے گا، کہ ملک مین جبری تعلیم کا نفاذ ہو، اس وقت مسلمانون کیلئے علٰحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج سے زیادہ عیان ہو جائے گی،

ضرورت ہو کہ بچون کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کی جائے اور اس کیلئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائین، اور بچون کے نفسیات سے باخبر اہل قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائین، جو سادہ سے سادہ سہل سے سہل ہو، حمایت اسلام لاہور کا نصاب بہت کچھ مقبول ہو، مگر افسوس ہو کہ اس مین الفاظ کے استعمال مین بے احتیاطی برتی گئی ہو، مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب مین محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفون سے مرکب ہین، استعمال کیے گئے ہین، کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے، نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہون، ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے، کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو،

ابتدائی تعلیم مین دو اور مشکلین حل کرنی ہین، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے، لوگ قرآن پاک پڑھانے کیلئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہین، اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہین، میرے خیال مین یہ طریقہ غلط ہو، میرا تجربہ یہ ہے، کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو دان ہو جائے، تو اردو عبارت عربی خط مین چند روز پڑھائی جائے اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے، اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہو، لیکن ضرورت ہو کہ بچون کیلئے ایسے قرآن چھاپے جائین جنہین خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت مین کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچون کی نظرون مین مشتبہ نہ ہونے پائین، اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت مین اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صور بچون کا ذہن اس حرف کے پہچاننے مین مشوش نہ کر دے،

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے، کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے، افسوس ہو کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے اس طرف توجہ نہین کی ہو،

بچون کیلئے جو نصاب بنایا جائے اس مین شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی

اور قومی روح کی تربیت کرے، بدیسی نظامِ تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ اور بے مزہ قصے ہمارے بچوں کیلئے وہ غذاے فاسد ہے، جو جزوِ بدن نہیں ہوتی، بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو بھی سے خراب کر ڈالتی ہے، اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کیلئے ایک ذرہ کار آمد نہیں،

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہرحال انھوں نے اتنا پورے یقین کیساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے، کہ اگر ہمکو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے، چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے

امریکہ کے ایک مشنری رسالہ "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے، جو درج ذیل ہے،

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی، ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے، یا کیونکر ہے، وہ بہت بڑا ہے ......

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے، اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے، اللہ تعالیٰ، پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے،

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے، ہم ترک ہیں، ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں، ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا، اور ہمیشہ دشمنوں پر فتحیاب ہوگا، جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے، اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے، میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں، جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں، جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں، ان سے مجھے مطلق محبت نہیں"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے، کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پا لیا ہے، اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ایک منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے،

(باقی)

تاریخِ وفاتِ نظامی گنجویؒ

۵۳۶ھ یا ۵۹۹ھ

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی،

اختلافِ سنین فارسی شعراء کے حالات مین عام طور پر سنین و تواریخ بلحاظ صحت مشتبہ اور بسا اوقات مختلف پائی جاتی ہین، لیکن جیسا شدید اختلاف نظامی کی تاریخِ وفات مین ہے، شاید ہی کسی شاعر یا مصنف کی نسبت پایا گیا ہو، اس کی وجہ زیادہ تر یہی معلوم ہوتی ہے، کہ نظامی کی مثنویان جن سے ان کی تاریخِ وفات پر استناد کیا جاتا ہے، اغلاط و تصحیفات سے لبریز ہین، چنانچہ ان مثنویون کی تواریخ تصنیف متعدد نسخون مین آپس مین ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہین کہ ان سے صحیح سنین و تواریخ کا معلوم کرنا بہت دشوار امر ہے، یہی سبب ہے، کہ تمام تذکرہ نویس نظامی کی تاریخِ وفات پر متفق نہین ہین،

نظامی کا تذکرہ لکھنے والون مین سب سے قدیم محمد عوفی صاحب لباب الالباب ہے، مگر اوس نے سوائے چند مبہم مدحیہ سطور اور چند غزلیاتِ نظامی کے اور کچھ نہین لکھا، اس کے بعد قدیم مآخذ مین مولانا جامی ہین، جنھون نے بہارستان اور نفحات الانس مین نظامی کا مختصر تذکرہ لکھا ہے، اونھون نے آخر الذکر کتاب مین اتمام سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۲ھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ نظامی کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے متجاوز تھی،[1]

اون کے علاوہ اور کئی مورخین اور تذکرہ نویسون نے نظامی کی تاریخِ وفات کا ذکر کیا ہے، جن کو ہم

---

[1] نفحات الانس ص ۱۲۴۳، مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۵ء

ذیل مین درج کرتے ہین،۔

مشرقی مصنفین کی دی ہوئی تاریخین

(۱) مشہور جغرافیہ نویس قزوینی نے گنجہ کا ذکر کرتے ہوئے نظامی کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور تاریخ وفات تقریباً سنہ ۵۹۰ھ بتائی ہے[1]،

(۲) دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ مین لکھا ہے، کہ نظامی نے طغرل بن ارسلان کے عہد (سنہ ۵۷۱ھ - سنہ ۵۹۰ھ) مین وفات پائی، اور سنہ ۵۷۶ھ تاریخ وفات بیان کی ہے[2]،

(۳) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون مین مختلف مقامات پر مختلف تاریخین لکھی ہین،۔

سنہ ۵۷۶ھ - سنہ ۵۹۶ھ - سنہ ۵۹۷ھ - سنہ ۵۹۹ھ[3]

(۴) ملا عبد النبی نے میخانہ مین ۸۴ برس کی عمر پر سنہ ۶۰۲ھ مین نظامی کی وفات بیان کی ہے[4]، جو یقیناً غلط ہے، جیساکہ خود اس کتاب کے مدون کا خیال ہے[5]،

(۵) لطف علی آذر نے (بقول ریو[6]) سنہ ۵۸۶ھ لکھی ہے، مگر بمبئی والے نسخہ مین یہ سنہ نہین پایا جاتا، کہ لفظ "سنہ" کے بعد اس مین سے تاریخ محذوف ہے[7]،

(۶) تاریخ حبیب السیر مین صرف اتمام سکندر نامہ کی تاریخ بقول جامی بیان کی گئی ہے، لیکن حاشیہ پر محمد تقی تستری نے ایک مختصر نوٹ لکھا ہے، جسمین اتمام سکندر نامہ کی تاریخ سنہ ۵۹۷ھ بتا کر تذکرہ نتائج الافکار، اور صبح صادق کے حوالہ سے نظامی کا اس تاریخ کے بعد پانچ سال اور زندہ رہنا ثابت کیا ہے، اور اس لحاظ سے سنہ ۶۰۲ھ تاریخ وفات بتائی ہے[8]،

(۷) تاریخ جہان آرا مین (بقول ریو[9]) سنہ ۵۹۷ھ ہے،

---

[1] آثار البلاد القزوینی صفحہ ۳۵۲ مطبوعۂ یورپ [2] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ یورپ بمبئی والے نسخے مین صرف "سنہ سبعین" لکھا ہے، (دیکھو صفحہ ۱۱) [3] کشف الظنون، جلد اول صفحہ ۵۲۵ و صفحہ ۳۸۷ و صفحہ ۴۶۲، جلد دوم صفحہ ۳۰۴ [4] میخانہ صفحہ ۱۱ [5] حواشی میخانہ صفحہ ۲ [6] فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم صفحہ ۵۶۴ [7] آتشکدہ طبع بمبئی صفحہ ۲۴۲ [8] تاریخ حبیب السیر جزو چہارم از جلد دوم صفحہ ۱۲ کا حاشیہ [9] فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم صفحہ ۵۶۴۔

(۸) مخبر الواصلین میں گنجوی گل جنت "مادۂ تاریخ لکھا ہے جس سے ۵۹۲ھ برآمد ہوتی ہے، طامس ولیم بیل[۱] اور مولینا آزاد[۲] نے اتمام سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۹ھ نقل کرکے اس تاریخ کی تغلیط کی ہے،

(۹) تقی کاشی صاحب صبح صادق نے (بقول اسپرنگر[۳]) ۶۰۶ھ لکھی ہے،

(۱۰) ہدایت قلی نے اپنے تذکرہ[۴] میں ۵۷۶ھ (غالباً دولتشاہ کے تتبع میں) لکھی ہے،

مستشرقین یورپ کی دی ہوئی تاریخین، ان مشرقی مآخذ نیز اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر مستشرقین یورپ نے مندرجۂ ذیل سنین لکھے ہین:-

۱- مُہل (دیباچہ شاہنامہ ص ۲)
۲- وان ہیمر (تاریخ ادب فارسی)
۳- ارڈمین فلوگل (تاریخ ادب فارسی)
} ۵۷۶ھ[۵]

۴- سر گور اوسلی (SIR GOUROUSLEY) ۵۹۷ھ[۶]

۵- ڈاکٹر باخر، (DR. WILHELM BACHER) ۵۹۹ھ[۷]

۶- ڈاکٹر ریو، (DR. RIEU) ۵۹۹ھ، ۵۹۵ھ[۸]

۷- ڈاکٹر ایتھے، (HER MAM ETHE) ۵۹۹ھ[۹]

---

[۱] مفتاح التواریخ [۲] نگارستان فارس ص ۴۶، [۳] اودھ کٹیلاگ ص ۷، [۴] مجمع الفصحا، جلد اول ص ۶۳۷، طبع ایران [۵] ترجمہ سکندر نامہ از ولبر فورس کلارک (دیباچہ) [۶] (BIOGRAPHICAL NOTICES OF PERSIAN POETS P. 48 (1846)) [۷] باخر نے نظامی کے سوانح اور تصانیف پر ایک محققانہ رسالہ جرمن زبان میں لکھا ہے، جس کا نام (NIZAMIS LEBEU UND WERKE) ہے، اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ رابنسن نے اپنی کتاب (PERSIAN POETRY FOR ENGLISH READERS) میں شامل کیا ہے جو ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئی ہے، دیکھو کتاب مذکور ص ۱۰۹ تا ص ۱۱۳، [۸] فہرست مخطوطات جلد دوم ص ۵۶۵ [۹] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۷ ص ۵۲۱،

۸- ڈاکٹر مودی (J. J. MODI) ۱۹۲۵ء[۱]

۹- پروفیسر براؤن (E. G. BROWNE) ۱۹۱۵ء[۲]

ان سب میں جرمنی کے مستشرق باخر نے خود نظامی کی مثنویات کے بعض اشعار کی بنا پر ان کی تاریخِ وفات سے متعلق ایک نظریہ قایم کیا ہے جس کی اکثر مستشرقین نے تائید کی ہے، یہ نظریہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے قابلِ غور ہے، اور ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

باخر کا نظریہ (الف) نظامی نے لیلیٰ مجنون کی تاریخِ تصنیف ۵۸۴ھ بیان کی ہے، جیسا کہ اشعارِ ذیل سے ثابت ہوتا ہے:-

برجلوۂ این عروس آزاد — آباد تر آن کہ گوید آباد،

کاراستہ شد بہ بہترین حال — در سلخِ رجب بہ ثا و فا و دال،

تاریخ عیان کہ داشت باخود — ہشتاد و چہار بعد پانصد،

اس مثنوی کے اختتام کے وقت نظامی کی عمر (۴۹) انچاس برس کی تھی، جیسا کہ اسی مثنوی کے سبب تالیف میں فرماتے ہیں:-

مجموعۂ ہفت سبع خواندی — یا ہفت ہزار سال ماندی

اور:-

زان سحر سحرگہی کہ رانم — مجموعۂ ہفت سبع خوانم،

---

[۱] شمس العلما، ڈاکٹر جمشید جی مودی بمبئی کے مشہور علم دوست پارسی مستشرق اور ایرانیات و پہلویات کے بڑے محقق عالم تھے جنھوں نے گذشتہ ماہ اپریل میں انتقال کیا، سکندر نامہ کے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۷۶۳ھ پر سے اونھوں نے نظامی کی تاریخ وفات پر ایک مضمون رایل ایشیاٹک سوسائٹی (شعبہ بمبئی) کے جلسہ میں پڑھا تھا، جو اسی سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا تھا، [۲] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۴۰۲،

اب اگر ۵۸۴ھ سے ان کی عمر کے ۴۹ سال وضع کئے جائیں، تو ۵۳۵ھ ان کا سالِ ولادت ہوتا ہے،

(ب) خمسۂ نظامی کے کسی جامع یا حاشیہ نویس نے جس نے بعد میں ان کی تدوین و ترتیب کی ہوگی، سکندر نامہ کے آخر میں نظامی کی وفات کے متعلق اشعارِ ذیل اضافہ کر دئے ہیں،

نظامی چو این داستان شد تمام ... بعزمِ شدن تیز بر داشت گام،
نہ بس روزگارے بر این برگذشت ... کہ تاریخِ عمرش ورق در نوشت
فزون بود شش مہ ز شصت و سہ سال ... کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال"

ان اشعار کے مطابق نظامی نے سکندر نامہ کے اتمام کے بعد ہی وفات پائی ہے، اور اس وقت ان کی عمر ۶۴ سال (یا ۶۳ ½) کی تھی، لہذا اگر ۵۸۴ھ میں ان کی عمر ۴۹ سال کی ہو تو لازمی ہے کہ پندرہ سال کے بعد (۴۹ + ۱۵ = ۶۴، ۵۸۴ھ + ۱۵ = ۵۹۹ھ) جب کہ انھوں نے انتقال کیا، ۵۹۹ھ تاریخِ وفات ہونی چاہئے،

نظریۂ مذکورۂ بالا سے معلوم ہوگا کہ باخر نے خود مصنف کی سند پر نہیں، بلکہ اس مدون یا جامعِ خمسہ کے قول پر اسکی بنیاد رکھی ہے جس نے نظامی کی عمر ۶۳ ½ بتائی ہے،

باخر کا خیال ہے کہ نظامی نے سکندر نامہ کی تاریخ تصنیف نہیں بیان کی، چنانچہ وہ لکھتا ہے،:-

"سکندر نامہ کی تاریخِ تصنیف کا تعین ہنوز باقی ہے، جسکو نظامی نے براہِ راست نہیں بیان کیا"[۱]

لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ باوجودیکہ سکندر نامہ کے دونوں حصوں (شرف نامہ و اقبال نامہ، یا بری و بحری) میں سنینِ تصنیف ۵۹۷ھ اور ۵۹۹ھ علی الترتیب دے گئے ہیں، باخر کو یا تو سکندر نامہ کے وہ مخطوطے نہیں ملے جنمیں یہ سنین موجود ہیں، یا اس نے اون کو صحیح نہیں تسلیم کیا،

باخر کے تمام نظریہ کی بنیاد دیلی مجنون کے اشعار مندرجۂ بالا ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ "ہفت سبع خوانا" کے معنی سات کو سات سے ضرب دینے کے کیسے ہوگئے، ؟ فارسی کے کسی معتبر لغت یا فرہنگ میں اس کے

۱؎ دیکھو رانبن کی کتاب ص ۱۱۳

یہ معنی نہیں پائے جاتے، تعجب ہی کہ باخبر کی کورانہ تقلید میں تمام مستشرقین حتی کہ ریو اور براؤن جیسے محققین بھی اس کو ان معنوں میں صحیح سمجھتے ہیں، "ہفت سُبع" سے مراد قرآن کریم کی سات منزلیں یا حصے ہیں، جو قاریوں نے قرأت کی سہولت کی غرض سے مقرر کئے ہیں، تاکہ ایک ہفتہ میں پڑھا جا سکے[۱]، سعدی نے بھی ایک شعر میں "ہفت سُبع خواندن" کا ذکر کیا ہے، :-

اگر خود ہفت سُبع از بر بخوانی،

چو آشفتی الف باتا ندانی،[۲]

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر باخر نے جو نظریہ قائم کیا ہے، گو نتیجہ کے لحاظ سے وہ صحیح ہو، مگر تفصیلات کے لحاظ سے غلط ہے، چنانچہ ڈاکٹر ریو کے قول سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، "کہ ناکافی مواد کی وجہ سے باخر کے نتائج کی تفصیل اغلاط سے پاک نہیں ہے"[۳]

تاریخ وفات معلوم کرنیکا صحیح اور مکمل طریقہ ہمارے خیال میں نظامی کی تاریخ وفات معلوم کرنے کا بہترین اور مکمل طریقہ یہ ہے، کہ مثنویوں کی تاریخ تصنیف، اُن کی عمر کی نسبت اشارات اُن کے صاحبزادہ کی عمر، ان فرمانرواؤں کے سنین حکومت جن کے نام پر یہ مثنویاں معنون ہوئی ہیں، ان سب میں صحیح طور پر مطابقت دیکر تاریخ وفات معلوم کی جائے، تاکہ بعد میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو، چنانچہ مندرجہ ذیل طریقہ سے نظامی کی تاریخ وفات کے متعلق ہم ایک صحیح نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں، :-

(الف) تاریخ ولادت :-

۱- مثنوی شیرین خسرو کا سال اتمام معتبر قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے مطابق ۵۷۶ھ ہی، :-

گذشت از پانصد و ہفتاد و شش سال[۴]

نزد بر خدِ خوبان کس چنین خال،

---

[۱] غیاث اللغات ص ۵۵۴ رزاقی پریس کانپور [۲] گلستان باب ہفتم، [۳] فہرست مخطوطات جلد ۲ ص ۵۶۴ [۴] خمسہ نظامی کے بعض قدیم

اگرچہ طغرل بن ارسلان سلجوقی (۵۷۳ھ-۵۹۰ھ) کی مدح، محمد جہان پہلوان اتابک کی وفات (۵۸۲ھ) کا ذکر، قزل ارسلان کے قتل (۵۸۷ھ) کا واقعہ اور ابو بکر نصرالدین اتابک (۵۸۷ھ-۶۰۷ھ) کی وفات، اتنی چیزیں اس مثنوی میں پائی جاتی ہیں، لیکن ان سے صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے، کہ نظامی نے اسی کتاب کو طغرل کے بعد قزل کے نام، اور اسکی وفات کے بعد نصرۃ الدین کے نام سے، جو فرمانروایان وقت تھے، منسوب کیا تھا، اور اس لئے یہ مدحیہ اشعار بعد کو اضافہ کئے گئے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اصل کتاب ۵۷۶ھ سے شروع ہو کر ۵۷۶ھ میں پوری ہو چکی تھی، جیسا کہ خود نظامی نے تصریح کی ہے،

۲- اس مثنوی میں وہ اپنے صاحبزادہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، :-

ببین این ہفت سالہ قرۃ العین

مقام خویشتن در قاب قوسین

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے صاحبزادہ کی عمر اس وقت سات سال کی تھی،

سبب نظم کتاب میں نظامی نے اپنے ایک دوست کی زبانی اپنی عمر چالیس سال کی بتائی ہے، :-

پس از پنجاہ چلہ در چہل سال

مزن پنجہ برین حرف ورق مال

اسی طرح معلوم ہوا کہ ۵۷۶ھ میں نظامی کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، اب اگر اس سنہ میں سے ان کی عمر کے چالیس برس کی تفریق کی جائے، تو ان کا سال ولادت ۵۳۶ھ ہوگا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۱) جو نسخوں (موجودہ برٹش میوزیم) میں ہفتاد و یک ہفتاد و دو اور ہفتاد و نہ تک سنین پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں قدیم نسخہ مکتوبہ ۷۱۸ھ کے ورق ۱۸ ہفتاد و شش ۵۷۶ھ ہی لکھا ہوا ہو یہی سن مخطوطات نمبر ۲۵۹۰۰ (مکتوبہ ۸۴۶ھ) نمبر ۲۷۲۴۰ اور دیگر قدیم نسخوں میں پایا جاتا ہے، اسی طرح طہران کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی ہفتاد و شش موجود ہے، (دیکھو فہرست ریو جلد دوم ص ۵۶۶) بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم میں خمسۂ نظامی کا ایک مخطوطہ مکتوبہ ۹۹۱ھ موجود ہے، اس میں بھی ہفتاد و شش ہی لکھا ہوا ہے،

(ب) تاریخ وفات:۔

۱۔ مثنوی لیلیٰ مجنون ۵۸۴ھ میں لکھی گئی، جیسا کہ اس کے تاریخی حروف اور سال اتمام سے صاف ظاہر ہے:

کاراستہ شد بہ بہترین حال، در سلخ رجب بہ تثا و فا دال،

تاریخ عیان کہ داشت با خود ہفتاد و چہار بعد پانصد،

اس مثنوی کی تصنیف کے وقت ان کے صاحبزادہ کی عمر ۱۴ سال کی تھی، چنانچہ اس کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

اے چاردہ سالہ قرۃ العین بالغ نظر علوم کونین،

اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، کہ مثنوی شیرین خسرو کی تصنیف کے وقت یعنی ۵۷۶ھ میں ان کے صاحبزادہ کی عمر سات سال کی تھی، اور ان کی عمر چالیس سال کی، اس طرح لیلیٰ مجنون خسرو شیرین سے سات سال کے بعد لکھی گئی، یا یوں کہو کہ ۵۸۴ھ میں ختم ہوئی، لہذا اس حساب سے نظامی کی عمر اس سنہ میں ۴۷ یا ۴۸ سال کی ہونی چاہئے،

۲۔ لیلیٰ مجنون کے ۳ سال بعد یعنی ۵۸۷ھ میں سکندر نامہ یا شرفنامہ کا آغاز ہوتا ہے، (کہ اس کا زمانہ تصنیف ۵۸۷ھ سے ۵۹۹ھ تک ہے) جیسا کہ اپنے صاحبزادہ کی عمر ۱۷ سال کی جو ۵۸۷ھ ہی میں ہو سکتی ہے) بتاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

وزین ہفدہ خصل آوریدن بدست

شدہ ہفدہ سالہ بدینسان کہ ہست[1]

اسی میں وہ اپنی عمر پچاس برس کی بتاتے ہیں:۔

چو تاریخ پنجہ در آمد بہ سال دگرگونہ شد برنشانندہ حال،

[1] سکندر نامہ (شرف نامہ) ص ۲۵، طبع بمبئی، ۱۳۲۶ھ

یعنی ۵۸۷ھ میں نظامی کی عمر پچاس سال کی تھی، اس مثنوی کی تاریخ اتمام ۵۹۷ھ اشعار ذیل سے معلوم ہوتی ہے :-

گفتم من این نامہ را در جہان | کہ تا دور آخر بود در جہان
بتاریخ پانصد نود ہفت سال | چہارم محرم بوقت زوال۱؎

۲- سکندر نامہ کا دوسرا حصہ یا اقبال نامہ ۵۹۹ھ میں اتمام کو پہنچا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں :-

جہان بردہ ہم روز بود از ایار
نود نہ گذشتہ ز پانصد شمار۲؎

اس طرح ۵۸۷ھ سے لیکر ۵۹۹ھ تک سکندر نامہ (ہر دو حصہ) کی تکمیل ہوتی ہے، اور اسی اثنا (غالباً ۵۹۹ھ) میں وہ اپنی عمر ۶۰ برس کی بتاتے ہیں :-

---

۱؎ آغا احمد علی (ہفت آسمان ص۲۹) کو ان اشعار کی صحت میں کلام ہے، کیونکہ یہ اشعار سکندر نامہ جلد اول کے کسی نسخہ میں اُن کی نظر سے نہیں گذرے، علاوہ ازین ان کے نزدیک ابیات کی رکاکت اور قافیہ کی تکرار اس کے موید ہین، کہ یہ اشعار نظامی کے نہیں ہو سکتے، لیکن آغا صاحب کی یہ رائے درست نہیں معلوم ہوتی، خمسہ نظامی کی کثرت اغلاط و تصحیفات پر نظر کرتے ہوئے بہت ممکن معلوم ہوتا ہے، کہ کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے ان اشعار کی صورت مسخ ہو گئی ہو، مگر اس مین شک نہیں ہے کہ ان اشعار سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے، تو یہ مصرعہ تاریخی ایک سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ نسخون مین پایا جاتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے، (جلد دوم ص۵۶۳) کہ برٹش میوزیم کے مخطوطات ۱۰۹۰ھ، ۱۱۱۱ھ اور ۱۲۲۶ھ مین یہ تاریخ موجود ہے، ڈاکٹر مودی نے بھی اپنے مضمون مین جو نسخہ مکتوبہ ۱۲۱۰ھ کا ذکر کیا ہے، اس مین بھی یہ اشعار باختلاف بعض الفاظ پائے جاتے ہین، اسی طرح بمبئی کے دو مطبوعہ نسخون (۱۲۶۵ھ اور ۱۳۲۸ھ) مین بھی یہی اشعار موجود ہین، پھر قرائن بھی اسی تاریخ کے موید ہین، لہذا حصہ اوّل کا سنہ تصنیف ۵۹۷ھ صحیح معلوم ہوتا ہے، ۲؎ سکندر نامہ بحری مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر، مطبوعہ کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی ص۱۹۰ خمسہ نظامی کے ایک نسخہ مکتوبہ ۹۳۶ھ موجودہ برٹش میوزیم (فہرست ریو جلد ۲ ص۵۷۰) مین بھی یہی تاریخ موجود ہے،

بشصت آمد اندازۂ سال من ،

نگشت از خود اندازۂ حال من[1]،

اس حساب سے ۵۹۹ھ میں سکندر نامہ ختم ہوا، اس وقت انکی عمر ۶۲ یا ۶۳ سال کی ہوتی ہے،

۴۔ اب اُن اشعار کو لیجئے جو کسی نے سکندر نامۂ بحری یا اقبال نامہ کے آخر میں "انجامش روزگار نظامی رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان سے الحاق کر دیے ہیں، ان اشعار کا لکھنے والا غالباً جامع اوراق یا کاتب ہوگا، جو معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کے "دم وابسین" کے وقت حاضر تھا، اور جس کو نظامی کی عمر کا بھی صحیح علم تھا، ممکن ہے کہ وہ نظامی کا کوئی قریبی عزیز یا دوست ہو، بہرحال یہ اشعار قدیم ترین نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں، اور حسب ذیل ہیں:۔

نظامی چو این داستان شد تمام ‌ ‌ ‌ بعزم شدن تیز برداشت گام

نبس روزگارے براین برگذشت ‌ ‌ ‌ کہ تاریخ عمرش ورق درنوشت

فزون بود شش مہ ز شصت وسہ سال ‌ ‌ ‌ کہ برعزم رہ بر دھل زد دوال

چون حال حکیمان پیشینہ گفت ‌ ‌ ‌ حکیمان بخفتند و او نیز خفت

رفیقان خود را بگاہ رحیل ‌ ‌ ‌ گراز رہ خبر داد و گراز دلیل

بخندید و گفتا کہ آمرزگار ‌ ‌ ‌ بآمرزشم کرد امیدوار،

ز بار رحمت خویش دارید دور ‌ ‌ ‌ شما وین سرا ما و دار السرور،

درین گفتگو بود خوابش ربود ‌ ‌ ‌ تو گفتی کہ بیدار یش خود نبود[2]

اشعار مرقومۂ بالا سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو زیادہ قرین قیاس ہیں، ایک یہ کہ داستان سکندر نامہ ختم ہونیکے بعد بہت ہی قلیل عرصہ میں نظامی نے وفات پائی، دوسری یہ کہ انتقال کے وقت نظامی کی عمر ۶۳½ برس

[1] سکندر نامہ بحری ص۱۹ طبع اسپرنگر [2] سکندر نامہ بحری مرتبہ اسپرنگر ص۱۶۲،

کی تھی، لہذا اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ ۵۹۹ھ میں نظامی ۶۲ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اور کہ ۵۹۹ھ میں یعنی اتمام سکندر نامہ کے ساتھ ہی ان کا بھی خاتمہ بالخیر ہوگیا، جیسا کہ ریو، ایتھے، باخر، اور براؤن کا خیال ہے یا کم از کم یہ کہ وہ ۵۹۹ھ تک زندہ تھے،

پروفیسر شیرانی کی تحقیق اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پروفیسر محمود خان شیرانی ۶۰۶ھ تک نظامی کا زندہ رہنا بتاتے ہیں، چنانچہ اپنی تنقید شعر العجم میں فرماتے ہیں :-

"نظامی کی وفات کا حادثہ اقبال نامہ کے اختتام کے بعد تصور کرنا چاہیے"

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن آگے چل کر سکندر نامہ کی مختلف اشاعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس کی آخری اشاعت اتابک نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، اور ۶۰۶ھ میں اوکی وفات کے بعد نظامی اسی کتاب کو نور الدین ارسلان شاہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں"[۱]

غالباً شیرانی صاحب کو مندرجۂ ذیل اشعار پر سے دھوکا ہوا ہوگا، جو سکندر نامہ بحری کے بعض قلمی نسخوں میں پائے جاتے ہیں، اور جن کو ڈاکٹر ریو[۲] نے بھی نقل کیا ہے :-

طرفدار موصل بمردانگی، قدر خوان شاہان بفرزانگی،

سر سرفرازان گردن کشان، ملک عز الدین قاہر شہ نشان

بطغرائے دولت چو طغرل تگین ابو الفتح مسعود بن نور الدین

آخری شعر میں مسعود بن نور الدین کا نام ہے، لیکن ان اشعار میں بھی شیرانی صاحب کے خیال کے مطابق نور الدین ارسلان نہیں، بلکہ اس کے بیٹے مسعود کا نام ہے، اور چونکہ "قاہر" کا لقب بھی موجود ہے، اس بنا پر ڈاکٹر ریو کو بھی مغالطہ ہوگیا کہ یہ الملک القاہر عز الدین مسعود ثانی بن نور الدین ارسلان ہے، چنانچہ خمسۂ نظامی کے ایک مخطوطہ

---

[۱] رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۔ [۲] فہرست جلد ۲ صفحہ ۵۶۹۔

۵۹۸ھ مین اقبال نامہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ریو رقمطراز ہے:-

شروع مین ملک قاہر عزالدین مسعود بن نورالدین والی موصل کے نام پر انتساب ہے جو اس طرح شروع ہوتا۔

طرفدار موصل بمردانگی، الخ

الملک القاہر آخر رجب ۶۰۷ھ مین اپنے باپ کا جانشین ہوا (کامل ابن اثیر ج ۱۲ ص ۱۹۱) اگر یہ انتساب واقعی نظامی کا لکھا ہوا ہے، تو اس سے معلوم ہوگا کہ نظامی اس تاریخ کے بعد تک بھی زندہ رہے ہیں، اور آخر مین بھی ملک عزالدین مسعود کی مدح پائی جاتی ہے[۵۱]۔

لیکن اس سے پیشتر ریو خود ہی لکھ چکا ہے کہ

نظامی کی وفات کے متعلق اس تمہید (بنام عزالدین مسعود) سے شبہ پیدا ہوتا ہے، کہ یہ تمہید بہت سے قدیم مخطوطات نیز مطبوعہ نسخون مین نہین ہے، اور سب سے بڑھکر اشتباہ انگیز امر تو یہ ہے، کہ بغور معائنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ سوائے نامون کے یہ مدح تمامتر سکندر نامہ حصہ اول سے (جو ملک نصرۃ الدین کے نام پر معنون ہے،) نقل کردی گئی ہے"

عزالدین بن قطب الدین مودود اپنے بھائی سیف الدین غازی کی وفات کے بعد ۵۷۶ھ مین موصل کا فرمانروا ہوا اور شعبان ۵۸۹ھ مین رحلت کر گیا، (دیکھو ابن خلکان اور کامل بن اثیر ج ۱۲ ص ۲۶)

ڈاکٹر باخر کا خیال ہے، کہ یہ تمہ سکندر نامہ کی کسی اگلی اشاعت کا ٹکڑا ہے، چنانچہ ایک اتفاقی حوالے جسمین نظامی کے صاحبزادہ کی عمر ۱۷ سال بتائی گئی ہے:- ؎

شدہ ہفدہ سالہ بدینسان کہ ہست

ڈاکٹر باخر نے قیاس کیا ہے کہ چونکہ لیلیٰ مجنون کی تصنیف (۵۸۴ھ) کے وقت نظامی کے صاحبزادے کی عمر ۱۴ سال کی تھی اسلئے یہ تمہ اس کے تین سال کے بعد یعنی ۵۸۷ھ مین لکھا گیا ہوگا[۵۲]

---

۵۱ ضمیمہ فہرست مخطوطات ریو ص۱۵۴ تا ص۱۵۵، ۵۲ فہرست مخطوطات جلد دوم ص۵۶۹

بہرکیف اگر یہ تہذیب صحیح ہو تو بھی یہاں عزالدین مسعود سے مراد پوتا نہین، بلکہ دادا ہے، جیسا کہ آخری شعر مین اوس کی کنیت ابوالفتح اس پر صریحاً دلالت کررہی ہے، اس لئے باخرزکا یہ خیال صحیح ہے، کہ سکندرنامہ کی اگلی اشاعت اسی کے نام سے منسوب کی گئی ہی، پروفیسر براؤن کے قول سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے:-

"سکندرنامہ پہلے عزالدین مسعود (اول) اتابک موصل کے نام معنون کیا گیا، اور بعد مین نظرثانی کے بعد اوس کی دوسری اشاعت نصرۃ الدین ابوبکر بشکین کے نام منسوب کی گئی، جو اپنے چچا قزل ارسلان کے بعد ۵۸۷ھ مین اتابک آذربائیجان کی حیثیت سے اُس کا جانشین ہوا[۲]"

مندرجۂ بالا بیانات کی بناپر پروفیسر شیرانی کے اس خیال کی کماحقہ تردید ہوجاتی ہے، کہ نظامی نے ۵۸۷ھ کے بعد اسی کتاب کو نورالدین ارسلان کے نام سے منسوب کیا،

---

[۱] ابن خلکان جلد دوم ص ۹۳، [۲] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۴۰۳،

شعرالعجم

حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس مین شاعری کی ابتدا از عہد بعہد کی ترقیون اوران کے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اوراسی کے ساتھ تمام مشہور شعرا (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، مطبوعہ معارف پریس ضخامت ۵۸۰ صفحے، قیمت ۳ ؁

حصہ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک) مع تنقید کلام، مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۳۰۲ صفحے، قیمت :- ۲؁

"منیجر"

گجراتی زبان اور اوسکی تاریخ،

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی)

ہندوستان مین جو دوسری ترقی یافتہ زبانین ہین، ضرورت ہے کہ ہم اون کی تاریخ خصوصیات اور اونکے لٹریچر سے واقف ہون خصوصًا گجراتی اور سندھی ایسی زبانین ہین جن کا تعلق اردو سے بہت پرانا ہے، ہم چاہتے ہین کہ ان زبانون کی مختصر تاریخ اور لٹریچر سے اہل اردو کو مطلع کرتے رہین، اور اس سلسلہ کا ہم گجراتی زبان کی تاریخ سے آغاز کرتے ہین،

یہ مضمون مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی نے اپنی تاریخ گجرات کے لئے، مہاودیالی احمد آباد کے اپنے ایک شاگرد سے انگریزی مین لکھوایا تھا، اور پھر انگریزی سے اوسکا اردو مین ترجمہ کرایا تھا "

"اڈیٹر"

تاریخ گجرات کے طالب علمون کے لئے اور اون کے لئے جو گجرات کے باشندون کو اور اون کے رسوم ورواج اور خصوصیات کو جاننا چاہتے ہون، گجراتی زبان کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے،

ہر پرانی قوم کی تاریخ کی طرح گجرات کی قدیم تاریخ اور اوس کا لٹریچر بھی گمنامی مین رہا ہے، اور یہ کہنا بہت دشوار ہے، کہ ایام قدیم اور متوسط زمانون مین گجرات مین کوئی لٹریچر موجود بھی تھا، اور اگر کوئی تھا، تو وہ کس قسم کا تھا،

"جب آریہ" ہندوستان کی طرف ہجرت کرکے آئے، تو پہلے پہل وہ گجرات مین نہین آئے، مگر ایک بڑی مدت کے بعد یہ ہوا

کہ وہ جنوب کی جانب پہنچے، جہان سے گجرات کی طرف، رفتہ رفتہ وقتاً فوقتاً بہت سی قومین مثل آریون کے گجرات پر حملہ آور ہوئین، اُن مین سے خاص خاص قومین ہنس، گرجرز، (گوجر) عرب، پٹھان وغیرہ تھین، پارسیون نے بھی جو مسلمانون کے عہد مین ایران سے بھاگ کرائے تھے[1]، گجرات مین پناہ لی تھی، یہ تمام اجنبی قومین اور جماعتین رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ملتی جلتی گئین، اور اپنے رسوم اور تہذیب و تمدن کو گجراتی سوسائٹی مین بھی داخل کر دیا، اور گجراتی سوسائٹی نے اپنا بہت کچھ اثران پر ڈالا، اسطرح سے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے ملنے جلنے سے ایک جماعت کی خصوصیات کو دوسری جماعت نے اختیار کر لیا، یہ مختلف جماعتین ایک طریقہ پر متحد ہو گئین، ان کے طریقے اور رسوم مشترک ہو گئے، ان کا تمدن ایک ہو گیا، اور اون کی سوسائٹی متحد ہو گئی، اور اس طرح انکی تاریخ زبان اور لٹریچر سب نے باہم ملکر ترقی کی،

"انا یاز" کی زبان کو چھوڑکر ایسا یقین کیا جاتا ہے، کہ صرف سنسکرت ہی تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونی چاہئے، بہت سی ملکی اور غیر ملکی زبانین اس وقت کی سنسکرت کے ساتھ مل جل گئین، اور یہ تمام زبانین آپس مین ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئین، اس طرح سے ان زبانون مین سے ہر ایک زبان نے کچھ اپنا کھویا کچھ دوسری زبان سے لیا، اور جس کو جذب نہ کرسکے چھوڑ دیا، برہمنون اور اعلیٰ طبقہ کے لوگون کو خاص کر سنسکرت پڑھنے کا عام طور سے حق حاصل تھا، اور یہ تکلیف دہ امر ہے، کہ اسطرح دوسری جماعتون کا اس بڑے تمدن کی زبان کے ساتھ تصادم نہین ہوسکا، تعلیم اور تمدن کا فقدان، تلفظ کی دشواریان اور ادنیٰ جماعتون کی جہالت بعض وہ وجوہ ہین جن سے سنسکرت عوام مین دخل نہ پاسکی، اور مستقل اور عام طور پر مقبولیت نہ حاصل کر سکی، تہذیب و تمدن کے طالب علم سنسکرت کا مطالعہ کرتے تھے، اور شایستہ سوسائٹی کی زبان بھی ایسے وقت مین سنسکرت تھی، جب کہ سوسائٹی کے بعض اشخاص ٹوٹی پھوٹی سنسکرت پراکرت بولتے تھے، اب سنسکرت نے اپنی ممتاز جگہ کو کھونا شروع کیا، ایسے موقع پر آریہ قوم کا قیام ہندوستان کے شمالی حصہ مین نہین معلوم ہوتا تھا، بلکہ وہ گجرات اور دیگر جنوبی صوبون مین چلے گئے تھے، آریون کے دور دراز صوبون مثل گجرات اور بنگال مین چلے جانے آمد و رفت کی

---

[1] یہ قطعاً غلط ہے بلکہ ایرانی لوگ مسلمانون سے پہلے ملک گجرات مین تجارتی آمد و رفت رکھتے تھے مسلمانون کے ایران پر قابض ہو جانیکے بعد وہ تجارتی سلسلہ ٹوٹ گیا، تو وہ یہین رہ پڑے، (ابوظفر)

ہوتیں نہ ہونے، مختلف آب و ہوا، اور ملکی اور غیر ملکی جماعتوں کے آپس میں ملنے جلنے سے نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت کی مختلف شاخیں
ل آئیں، پراکرت، پالی، مگدھی، اردھ مگدھی وغیرہ پراکرت کی مختلف شاخیں ہیں،

علاوہ اس کے پراکرت خود خراب ہوگئی، اور اس سے ایک اور زبان "اپھابراہنست" پیدا ہوئی، "اپھابرہنست"
زمنۂ متوسط میں گجرات کی زبان تھی، "سدھ راج جے سنگھ" کے زمانہ کے پنڈت ہیمچند سوری نے "اپھابراہنست" زبان کے
راعد اُس وقت لکھے تھے، جب کہ ہندوستان کی دیگر صوبہ وار زبانوں میں کسی زبان کو یہ فخر حاصل نہ تھا، "اپابراہنست" میں
ی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ہر ایک صوبہ کو اپنی خاص زبان رکھنے کا فخر تھا، ہندی، ورَاج، مارواڑی، بنگالی، مرہٹی،
ور گجراتی زبانیں وجود میں آئیں، مارواڑی زبان یا تو گجراتی زبان کی شاخ، یا اوسکی مختلف شکل یا ہندی اور گجراتی دونوں ملی
دئی زبانیں ہیں، ان زبانوں میں بھی صوبہ وار زبان کی خصوصیات پائی جاتی تھیں، ہر ایک زبان صاف اور مہذب ہونے لگی،
س طرح سے ہماری موجودہ متمول گجراتی زبان جو قریباً ایک کروڑ انسانوں کی مادری زبان ہے، وجود میں آئی،

اس نے اپنی بعض اصلی خصوصیات کو قائم رکھا ہے، اور نئی خصوصیات اور دوسری زبانوں کی خاص خاص
تیں اُن سے وقتاً فوقتاً ملنے جلنے سے حاصل کرلی ہیں، سنسکرت گجراتی کا مخرج ہے، اور یہی وجہ ہے کہ گجراتی زبان سنسکرت
بان کی خصوصیات اور دیگر اوصاف سے پُر ہے، گجراتی کی لغت میں بہت سے سنسکرت کے الفاظ ہیں، اور یہ الفاظ دو قسم
کے ہیں، ان میں سے بعض وہ الفاظ جو قسم اول سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی اصلی سنسکرت کی شکل میں ہیں، اور باقی ماندہ الفاظ
دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں، گو علم اللغۃ کے قواعد کی وجہ سے ان میں قدرے تبدیلی واقع ہوگئی ہے، لیکن پھر بھی وہ
لفاظ سنسکرت سے لئے گئے ہیں، جو الفاظ قسم اول سے تعلق رکھتے ہیں، بہت ہیں، اور ہم ان میں سے بعض الفاظ مثال کے
طور پر ذیل میں دیتے ہیں، ان تمام الفاظ کا شمار کرنا اتنا ہی دشوار امر ہوگا جتنا کہ ایک ڈکشنری کا تیار کرنا، لیکن ان
ن سے بعض الفاظ جو عام طور پر داخل ہوگئے ہیں، انھیں انتخاب کرلیا ہے، اور وہ یہ ہیں،

سنگیت، ودھا، بدھی، مت، شریر، آتن، منتو، الشور، پشو، پکنتی، شاستر، تھاگ، النکار، سنسکار، آنیب، ناری،
ری، لکشمی، پتنگ، مستک، جنم، نام، وِدوان، پنڈت، سرناسور، گرک، بھگتی، ششٹ، دنتی، اندر، بدو غیرہ، ان الفاظ میں

سے بہت سے الفاظ کو مُن یا کو جا تین بدل دیا گیا ہی، یُوان، جوان بن جاتا ہے، اور یتی جتی مین تبدیل ہو جاتی ہے،

علم اللغۃ کے قواعد کے مطابق بہت سے الفاظ مین تغیر و تبدل واقع ہوا ہے، سنسکرت سے اون کو پراکرت مین لیا گیا تھا، اور پراکرت سے انھین "اپا برامہنت" مین داخل کیا گیا تھا، اور وہان سے انھین گجراتی مین شامل کر لیا گیا تھا، ان تمام الفاظ کو جنہین تبدیلیان واقع ہوئی تھین، اس مختصر مضمون مین شامل نہین کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک عام قاعدہ کا بیان کر دینا کافی ہوگا، جس سے یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے، جس سنسکرت لفظ کے آخر مین "اک" واقع ہو، وہ پراکرت یا اپابراہمست مین "اُٹ" مین تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر وہ گجراتی "اُو" مین تبدیل ہو جاتا ہے، مثلاً:-

سنسکرت،	پراکرت یا اپابراہمنت،	گجراتی،
دنتک،	دنتٹ،	دنتو،
مرکٹک،	مکٹٹ،	ماکنو،
پرسترک،	پتھرٹ،	پتھرو،
کرپک،	کپیٹ	کانو
رسک،	رسٹ،	رسو،
بھارک،	بھارٹ	بھارووغیرہ،

جس سنسکرت لفظ کے آخر مین "ک" واقع ہو، وہ گجراتی مین "آ" سے بدل جاتا ہی، مثلاً:-

سنسکرت،	پراکرت یا اپابراہمنت،	گجراتی،
دنک	دنتو،	دان،
کرک،	کینیٹو،	کان،
ہت، (؟)	ھتو،	ہاتھ،
رسن (؟)	رسو،	رس،

اس طرح سے گجراتی لفظ کا مخرج عام طور پر سنسکرت ہی ملتا ہے، اور گجراتی لغت کا زیادہ تر حصہ ایسے الفاظ کا ہوتا ہے، جو یا تو سنسکرت ہوتے ہین، یا جو سنسکرت سے لئے جاتے ہین، اور جنہین علم اللغۃ کے قواعد کے مطابق تبدیلیان ہوتی رہتی ہین، گجراتی زبان پر سنسکرت کا اثر بہت زیادہ ہے، اس سے ہم یہ دیکھ سکتے ہین، کہ سنسکرت کا اثر گجراتی پر بہت مضبوط ہے، اور اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے، اور وہ یہ ہے، کہ گجراتی اور دیگر صوبہ وار زبانین اپنی اصلی زبان سنسکرت سے نکلی ہین، لیکن بوجہ زمانہ گذر جانے کے، اور غیر ملکی لوگون کے ساتھ بہت عرصہ تک میل جول رکھنے کے، اور غیر ملکی زبانون کو اون کی اصلی غیر تبدیل شدہ حالت مین جذب کرنے کی قابلیت نہ ہونے کے بہت سی تبدیلیان واقع ہو گئی ہین، اور نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ صوبہ وار بول چال کی دو زبانین بن گئی ہین،

دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھنے سے اور علم اللغۃ کے دوسرے عام قاعدہ کو لینے سے مذکورۂ بالا حقیقت اور زیادہ صاف طور سے معلوم ہوتی ہے، کوئی زبان بغیر تبدیل ہوئے نہین رہ سکتی، ہر سو سال مین کچھ نہ کچھ تبدیلیان ضرور ہوتی ہین، اور یہ تبدیلیان کچھ اس غیر معلوم طریقہ سے ہوتی رہتی ہین، کہ وہ آسانی سے نظر نہین آسکتی ہین، مزید یہ کہ وہ اتنی سرعت کے ساتھ ہوتی ہین کہ وہ شخص بھی جو جانتا ہے، اور زبان کی تنقید کرتا رہتا ہے، ان کی غیر معلوم رفتار پر قہقہہ لگانے مین پس و پیش نہین کریگا، اس طریقہ سے تمام صوبہ وار زبانین مثلاً گجراتی، بنگالی، ہندی، مرہٹی، وغیرہ سنسکرت سے مختلف اور علٰحدہ ہین، اور دوسری طرف سے نظر ڈالنے سے ہم کو مشترک ہونے کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے، گجراتی، بنگالی، ہندی، مرہٹی وغیرہ تمام خاص طور پر ایک دوسرے سے علٰحدہ ہین، ایک صوبہ کا باشندہ دوسرے صوبہ کی بات چیت یا زبان نہین سمجھ سکے گا، لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ یا تو لغت یا ایک صوبون کی زبانون کے قواعد مین اشتراک ضرور معلوم ہوگا، اس سے ایک صوبہ کے باشندے کو دوسرے صوبہ کی زبان کا مطالعہ کرنے مین بہت مدد ملتی ہے، اس قاعدہ کے مطابق دنیا کی تمام زبانین خواہ وہ کتنی ہی مختلف اور جدا ہون، تمام ایک دوسرے سے ان طریقون پر وابستہ کر دی گئی ہین،

ان غیر معمولی حالات کے ماتحت زبانون کے علم اللغات کا ارتقا ہوا ہے، گجراتی زبان سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ تر نازک ہو گئی ہے، کیا ماں کے حسن اور نزاکت کے ورثہ سے اس کی لاڈلی بیٹی ہمیشہ محروم رہ سکتی ہے، اس بحث کو کہ گجراتی کا

سنسکرت کے ساتھ کیا رشتہ تھا، طول دینے کی ضرورت نہین ہے، اب ہم یہ دیکھین گے، کہ گجراتی زبان دوسری زبانون کی کہانتک زیر بار احسان ہے، ہندوستان کی اصلی زبان "دیشیا" کہلاتی تھی، اس زبان کے بعض الفاظ چند تبدیلیون کے بعد گجراتی مین داخل کرلئے گئے ہین، ان مین سے بعض یہ ہین:-

دیشیا	گجراتی
کڈایو	کڈیو
کوئیلا	کوئیل
ڈنگارا	ڈونگرو
پدن چا	نباچ
اوسریا	اوسری
اوکھیا	اکھیون
منکاڑ	نکون

ان کے علاوہ کھابو، شانہ، ڈالبھو، بامیان، بستی بھانڈے، ڈھانکے، کھانڈے، چابانی، ڈھیکون وغیرہ تمام دیشیا الفاظ ہین،

گجراتی کا مرہٹی زبان کے ساتھ بھی رشتہ بہت قدیم ہے، مرہٹی زبان کا اثر قدرے گجرات کے قدیم ترین شاعر "نسیاح" مین بھی پایا جاتا ہے، کبھی کبھی وہ مرہٹی لفظ "چا" جو اسم جنس کے آخر مین واقع ہوتا ہے، بے تکلف استعمال کرتا ہے، اس کی نظمون مین سے ایک نظم مین ہین چار یا پانچ سطرین خاص مرہٹی کی ملتی ہین، مسلمانون کی حکومت کے بعد مرہٹون نے گجرات پر کچھ وقت تک حکومت کی اور اس سے مرہٹی کا اثر گجرات پر اور زیادہ ہوگیا، اس وقت بھی شہر بڑودہ کی تقریبًا نصف آبادی مرہٹون اور دکنیون کی ہے،

کاٹھیاواڑ کے گجراتی بولنے والے، کاٹھی اور اہیر جب کبھی وہ ادب کے ساتھ کسی معزز خاتون سے مخاطب

ہوتے ہین، تو وہ لفظ آئی کو جو ماں کے لئے مرہٹی لفظ ہے، بے دریغ استعمال کرتے ہین، گجراتی شاعر پریمانند جس نے مرہٹون کی حکومت کی ابتدا مین ترقی کی بعض وقت اپنی نظمون مین لفظ "ڈرل" استعمال کرتا تھا، جو خالص مرہٹی زبان کا لفظ تھا، ان کے سوا الفاظ مثل "آئی"، "بائی"، "نانی"، وغیرہ بہت زیادہ عام ہوگئے ہین، گجراتی مرہٹی کی نسبت ہندی سے زیادہ صاف طور پر مناسبت رکھتی ہے، ہندی اور "دراج" کا گجراتی پر اتنا مضبوط قبضہ تھا کہ دیارام، پریمانند، نرسینہ، اور میران، جیسے بڑے شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہین رہ سکے، دیارام کا دیوان شاید ہندی مین گجراتی کے بہ نسبت زیادہ ہے،

ہندوستان بحیثیت مجموعی عدم تشدد کے مسلک پر کاربند ہے، اور گجرات زیادہ کاربند ہے، گجرات کی زبان بھی اس صوبہ کے لوگون کی طرح نازک واقع ہوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ گجراتی زبان اس قدر نرم اور نازک ہے، کہ اس زبان مین کوئی شخص غصہ کا اظہار کافی طور سے نہین کرسکتا ہے، جب کبھی کسی گجراتی کو غصہ آتا ہے، تو وہ جان بوجھ کر یا بغیر جانے ہندی مین غصہ کا اظہار کرتا ہے، گجرات کی تاریخ مین ایک ایسا زمانہ بھی تھا، جب کہ گجراتی مین نظم لکھنا ذلیل کام خیال کیا جاتا تھا، بہترین (اعلیٰ تہذیب یافتہ) شاعر وہ شخص ہوتا تھا، جو یا تو ہندی یا سنسکرت مین نظمین لکھتا تھا، اس دھبہ کو گجرات کے بڑے شاعر پریمانند نے دور کردیا، اور اوس نے مادری زبان کی ترقی کے لیے مصمم ارادہ کرلیا، مگر وہ بھی ابتدا مین اس دھبہ سے بچ نہ سکا، ہندی کا تسلط گجراتی پر اس قدر تھا کہ اس زبان کا گجراتی پر اثر ہونا لازمی امر تھا، خود پریمانند نے ہندی لٹریچر کی نقل مین نظمین لکھنے کا کام اپنے لڑکے اور اپنے خاص شاگرد دلبھ کے سپرد کردیا، بعض "ناٹک لٹریچر" اور بڑی نظمین نیم تاریخی لٹریچر کی ہندی کی نقل ہین،

گجرات کا صوبہ تجارتی میدان کے لئے مشہور ہے، ہندوستان تمام دنیا کی تجارت کا مرکز سمجھا جاتا تھا، اور دنیا کو اپنا مال واسباب مہیا کرتا تھا، ہندوستان کا دوسرے ملکون کے ساتھ تعلق عام طور پر سمندر کے راستون کے ذریعہ تھا، اور گجرات ان راستون کی کڑی تھا، بھروچ، سورت، اور کھمبایت، گجرات کے خاص اور قدیم ترین بندرگاہ تھے، نہ صرف گجرات، بلکہ ہندوستان کا تجارتی کاروبار انھین بندرگاہون کے ذریعہ کیا جاتا تھا، قدیم ترین

غیر ملکی سوداگر جنھون نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنی شروع کی، وہ عرب تھے، ہندوستان اور عرب کے سوداگرون کے درمیان تجارتی رشتہ (مسیح سے پہلے) موجود تھا، اس لئے بعض عرب سوداگرون نے کھمبایت اور گجرات کے بندرگاہون پر سکونت اختیار کرلی، کھمبایت عربون کا خاص مرکز تھا، اور اس مین کوئی تعجب کی بات نہین ہے، کہ گجراتی زبان کا اثر ان پر ہوا، اور یہ اتصال مسلمانون کی حکومت کے بعد اور زیادہ مضبوط ہوگیا، ساتوین صدی عیسوی کے بعد مسلمان ہندوستان کے بہت سے مختلف حصون مین اور زیادہ بستے چلے گئے، پٹھان، مغل، ترک، عرب اور بہت سی دیگر مسلم قومین ہندوستان پر حملہ آور ہوئین، اس کا اثر گجرات پر ہوا، اور وہ اس اثر سے بچ نہین سکتا تھا، محمود غزنوی نے ہندو بادشاہ بھیم دیو (بھیم دیو) کے زمانہ مین گجرات پر حملہ کیا، لیکن وہان سکونت اختیار کرنے کے بجائے وہ سومناتھ دیو کے بڑے مندر کو لوٹ کر وہان سے چلا گیا، اس کے بعد شہاب الدین غوری نے چھوٹے بھیم دیو، کے زمانہ مین گجرات کو لوٹنے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن گجرات کو دراصل علاؤالدین خلجی نے آخری ہندو بادشاہ کرن دیو (کرن دیو) سے، بوجہ خانگی مناقشات کے فتح کیا، اس وقت گجرات کی راجدھانی کو "انھل واڑا یا پاٹن" سے احمد آباد ساول (موجودہ اساول) کے قریب منتقل کر دیا، اور اس کی بنیاد احمد شاہ نے ۱۴۱۱ء ۸۱۳ھ مین رکھی، اس وقت سے احمد آباد گجرات کی راجدھانی رہی ہے، محمود بیگڑا نے محمد آباد کی بنیاد ڈالی، اور جوناگڈھ اور چمپانیر کے قلعون کو فتح کیا، اب مسلمانون نے بغیر کسی رکاوٹ کے تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ پر حکومت کرنا شروع کر دی، یہ پہلے ہی سے بتا دیا گیا ہے، کہ سوسائٹی اپنا اثر لٹریچر پر ڈالتی ہے، لٹریری اور سیاسی تاریخین دونون مین کچھ نہ کچھ اشتراک ضرور ہے، ان دونون مین سے کوئی ایک دوسرے پر اثر ڈالے بغیر نہین رہ سکتا، مسلمانون نے مسلسل صدیون تک گجرات پر حکومت کی، اور اس وجہ سے آجکل کی انگریزی زبان کے اثر کی طرح فارسی اور عربی کا بہت کچھ اثر گجراتی پر ہوا، یہی وجہ ہے کہ گجراتی کی لغت مین فارسی اور عربی کے الفاظ پائے جاتے ہین، اور معمولی طالب علم کے لئے ان الفاظ مین جو بہت زیادہ عام ہوگئے ہین، فرق معلوم کرنا قدرے دشوار ہے، ان مین سے بعض الفاظ مخلوط نہین ہوئے ہین، اور دوسرے الفاظ نے علم لغت کے قواعد کے مطابق اپنی اصلی شکل ترک کردی ہے، اور وہ گجراتی الفاظ بن گئے ہین، جیسا کہ ہم انھین آج پاتے ہین، ایسے فارسی اور عربی الفاظ مین سے چند الفاظ ہم ذیل مین ان کی اصلی اور مخلوط شکلون مین دیتے ہین،

مشکل، قول، بیچانو، حیران، عیب، غیر حاضر، انامت، (امانت) پردو، اثر، دھاردن، خزانون، ڈگلو، پیرہن، باغ، بغیچہ، غلیچہ، ریزو، مادرن، کھانا، کھاتون، دیوانو، نا لو، زنانو، خریطو، جامو، دامو، اگھارون، نخلو، کاوا، تکیو، شنبتیہ، حصو، محلو، ہیتو، غریب، غلام، سال وغیرہ، یہ تمام الفاظ اس قدر مانوس ہوگئے ہین، کہ گجراتی بولنے والے ان الفاظ کو اپنی روز مرہ کی بات چیت مین بے دریغ استعمال کرتے ہین، اور ان فارسی اور عربی الفاظ کو جو بول چال مین اور تحریر مین بھی اتنے عام ہوگئے ہین، کہ ترک کر دینا قطعی بے سود، اور عملاً ناممکن ہے، ایسی تباہ کن تجویز کا تصور کرنا بھی محض مضحکہ انگیز ہے، مزید یہ کہ خود گجرات کے مسلمان بھی اپنے گھرون مین گجراتی بولتے ہین، اُن کی اردو بہت ہی زیادہ خراب ہے، اور وہ ایک گجراتی اُردو زبان بن گئی ہے، اس طرح سے گجرات کے ہندو اور مسلمان دونون قومین ایک مشترکہ زبان بولنے لگی ہین، اور انھون نے بہت سے مشترکہ تمدنی رسوم و رواج اختیار کر لئے ہین اس اتحاد نے اُن کی بہت سی قومی تمناؤن کی پرورش کی ہے، ایرانی خصوصیات گجرات کی سوسائٹی اور زبان مین پائی جاتی ہین، ضمیر اتصالیہ "کہ" فارسی "کہ" سے لیا گیا ہے، قریباً تمام اصطلاحات جو گجرات کی عدالتون اور کچہریون مین استعمال ہوتی ہین، وہ یا تو عربی سے یا فارسی سے لی گئی ہین،

یہ ایک قاعدہ ہے کہ جب کوئی غیر ملکی قوم دوسری قوم پر حملہ کرتی ہے، تو حملہ کرنے والی قوم انصاف کے نظم و نسق مین بہت سے اپنی ہی زبان کے الفاظ داخل کرتی ہے، یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ پہلے پہل نئی حکومت کی نگرانی کا دارومدار محض اس کی فوج اور عدالتون پر ہوتا ہے، وہ الفاظ بھی جو پہننے کے متعلق استعمال ہوتے ہین، وہ بھی یا تو فارسی سے لئے گئے ہین، یا عربی سے، اس زمانہ کا عدالتی لباس خالص اسلامی لباس تھا، اس کی ایک وجہ اوپر بتائی جا چکی ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ لباس جو کہ کمر تک پہنا جاتا ہے، وہ مسلمانون ہی کے زمانہ کا تحفہ ہے، مسلمانون کی حکومت کے زمانہ مین جو ہندو وزیر اور پردھان کے اعلیٰ عہدون پر ممتاز تھے، وہ ناگر اور کایستھ جماعتون سے تعلق رکھتے تھے، ہندو اچھے حساب دان تھے، "ناگر" اور "کایستھ" جماعتون کی طبیعت کا رجحان چونکہ سیاسی تھا، اس لئے وہ عدالتون اور دربارون سے میل جول رکھتے تھے، اُس زمانہ کی عدالتی زبان فارسی تھی، اور ان کو یہ زبان

سیکھنا پڑتی تھی، اور وہ اسکو سیکھتے تھے، اس لئے دوسرے ہندوں نے بھی فارسی سیکھنا شروع کردیا، اور اس غیر ملکی زبان کے اتصال کا اثر ان کی مادری زبان کو مالدار بنانے مین فائدہ مند ثابت ہوا، ناگرون مین فارسی زبان مین گفتگو کرنا ایک "فیشن" تھا، اور آج بھی ہم ان ناگرون، اور کایستھون کو اس زبان سے خوب واقف پاتے ہین، یہ مسلمانون کی حکومت کا اثر تھا کہ بہت سے فارسی اور عربی کے الفاظ گجراتی زبان مین داخل کرلئے گئے تھے، اب ہم یہ دیکھین گے کہ دوسری کس قوم اور زبان نے گجراتی زبان پر اثر ڈالا ہے؟

انگریزون کے آنے سے پہلے فرانسیسی اور ڈچ ہندوستان مین تجارتی اغراض کیلئے بس چکے تھے، ڈچ زیادہ مدت تک نہ رہ سکے لیکن پرتگیز اور فرانسیسیون نے ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات بہت مدت تک قائم رکھے، انھون نے اپنے تجارتی مرکز قائم کئے، "گووا" اور "دمن" اب تک پرتگیز کے قبضہ مین ہین، گجرات کا تجارتی تعلق ان لوگون کے ساتھ تھا، اور اس وجہ سے بہت سے تجارتی الفاظ پرتگیزی سے لئے گئے تھے، اُن مین سے حسب ذیل الفاظ ہین، آپس (آم) پاپری (آم) اناس، کافی، کاجو، اسکوپڑا، پدری، بٹاٹا، ٹماٹا، تباکو، انگریز، اجنیر (انجینیر) وغیرہ وغیرہ،

اس کے سوا گجراتی زبان نے بہت سے ملکون اور صوبون کی خصوصیات اختیار کرلی ہین، گلی ڈنڈا گجرات کا خاص کھیل ہے، اس کھیل کے اصطلاحات "تامل زبان" سے لئے گئے ہین، مثلاً وکات، لین، ٹلہ، ناز وغیرہ، ایچی، کنوی لفظ ہے، اس طرح سے ٹامل، کنڑی اور دیگر جنوبی دُور دراز ملکون کی زبانون سے بھی گجراتی زبان کے لغت نے بہت کچھ حصہ لیا ہے، ان کے علاوہ بنگالی زبان کا بھی اثر گجراتی زبان پر ہورہا ہے، اگر کسی صوبہ کی زبان نے گجراتی زبان پر زیادہ اثر ڈالا ہے، تو وہ یقیناً بنگالی زبان ہی ہے، فی الحال بہت سے بنگالی زبان کے ناولون اور کھیلون کا ترجمہ گجراتی مین ہورہا ہے، کلکتہ کی تجارتی جماعت کا بہت بڑا حصہ گجرات کے لوگ ہین، گجرات مین بھی ہم بہت سے آدمیون کو بنگالی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے پاتے ہین، گجراتی لفظ "تماشہ" جو انگریزی لفظ "سرکس" کے برابر ہے، خالص بنگالی زبان کا لفظ ہے،

اب ہمین یہ دیکھنا ہے، کہ ہماری موجودہ کورٹ لنگویج (عدالتی زبان) یعنی انگریزی زبان کا گجراتی زبان پر

لسان تک اثر ہوا ہے، انگریز ہندوستان پر ڈیڑھ صدی سے حکومت کررہے ہیں، انگریزی تعلیم کے متعلق بعض قوانین ہندوستان میں ۱۸۳۵ء میں نافذ کئے گئے تھے، ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دینے کی اسکیم تیار کی گئی تھی، اور اون کو کلرک اور غلام بنانے کیلئے یونیورسٹی اور سکنڈری (ثانوی) تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دیا جانا تجویز کیا گیا تھا، اور یہ طریقہ تمام تعلیم گاہوں میں اب تک جاری وساری ہے، لارڈ میکالے نے جس نے انگریزی زبان کو تعلیمی ذریعہ قرار دینے کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کیا تھا، ابتدا ہی میں یہ اعلان کر دیا تھا، کہ اس اسکیم سے ہندوستانی ذہنیت عیسائی خیالات میں تبدیل ہو جائیگی، اور فی الواقع حالت یہی ہے تعلیمی ذریعہ کے لئے حکمران کی زبان کو مادری زبان پر ترجیح دی گئی ہے، اور اس طرح سے جبراً اُسے ملکی زبان پر غالب کر دیا گیا ہے، اس طرح سے انگریزی کے بہت سے الفاظ بول چال، تقریر، سائنس، تاریخ اور جغرافیہ کے گجراتی ڈکشنری میں داخل کر لئے گئے ہیں، سائنس کے قریب قریب تمام الفاظ انگریزی زبان سے لئے گئے ہیں، یہی حالت انجینیرنگ کے متعلق الفاظ کی ہے، یہ اس لئے ہے کہ تمام سائنس مغرب ہی سے متعلق ہے، ان موجودہ اختراعات کے لئے گجراتی زبان میں اردو الفاظ نہیں ہیں، اس سے ایک فائدہ یہ ہوا ہے، کہ ڈکشنری کے الفاظ میں اضافہ ہو گیا ہے، میں اُن میں سے بعض وہ الفاظ درج کرونگا، جو روزانہ استعمال ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ٹیبل، کوٹ، پوسٹ آفس، پوسٹ کارڈ، کورٹ، جج، مسٹر، ماسٹر، سائنس، اسکول، کالج، اسٹیشن، ریلوے، ٹرین، کلاس، برج، پیپر، گلاس، مشین، بائیسکل، موٹرکار، انجن، انجینیر، الیکٹرسٹی، پولیس، گیٹ، انجن، یونیورسٹی، گیٹر، نیکٹائی، بل وغیرہ وغیرہ

رسم ورواج، آداب نیز پوشاک کے لئے بھی انگریزی الفاظ لئے گئے ہیں، یہیں فوج، عدالت، ملکی نظم ونسق، تعلیم اور مغربی تہذیب کی چیزوں کے لئے بھی انگریزی الفاظ گجراتی میں ملتے ہیں، ایک وقت وہ تھا، کہ تمام گجرات بلکہ تمام ہندوستان میں انگریزی زبان مروج ہو چلی تھی، لیکن خوش قسمتی سے قومیت کے جذبہ کے بیدار ہونے سے متذکرۂ بالا حالت بہت تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے، اور مادری زبان کے ساتھ محبت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت کے الفاظ بھی بنائے جانے لگے ہیں، ہم نے یہ اکثر دیکھا ہے کہ سوسائٹی اور علوم وفنون ہمیشہ دونوں باہم منسلک

رہے ہین، اور لوگ جان بوجھکر یا بغیر جانے بوجھے اپنی ضروریات کے مطابق نئے الفاظ بنا لیتے ہین، گویا نئی تحریک نے نئے نئے دویا تین الفاظ کو باہم ملاکر نئے الفاظ یا پرانے الفاظ کو نیا جامہ پہنا کر بنائے ہین، چونکہ آج کل تحریک عدم تعاون خوب زور پر ہے، زبان اور لٹریچر بھی نئے قالب اختیار کر رہے ہین، گو پہلے لفظ کا پرشن (تعاون) تھا، اب نیا لفظ نان کواپرشین (عدم تعاون) مروج ہو گیا ہے، اور سول ڈس اوبیڈینس (تحریک سول نافرمانی) ستیا گائی، خاص مفہوم رکھتا ہے، اور مزید برآن تحریک عدم تعاون نے زبان کو بہت کچھ بدل دیا ہے، پہلے الفاظ کو اہمیت دی جاتی تھی، اور اب اوسکی جگہ خیالات نے لے لی ہے، گجراتی زبان اب زوردار سادی ستھری خیالات سے مملو، مضبوط، اور بااثر ہو گئی ہے، الفاظ کی پہیلیان اب جا چکی ہین، گجراتی زبان شیرین زبان ہے، خیالات کی گہرائی اس زبان مین سنسکرت زبان سے لی گئی ہے، اس مین نہ تامل زبان کی سختی اور نہ مرہٹی زبان کی سنگدلی ہے جسطرح گجرات مین چھوٹے سیر چھوٹے گھر تنگ گلیان، چھوٹے پلاٹ، چھوٹے شہر، چھوٹی سڑکین ہین، اس طرح سے زبان بھی چھوٹی، نازک، معصوم، شیرین، حسین، مثل معصوم بچے کے ہے، دنیا نے گجراتی لٹریچر کو زنانہ لٹریچر اور زبان بنایا ہے، گو اس مین اس قدر حُسن ہے، کہ جب کبھی کوئی غیر ملکی "گربا پارٹی" کو دیکھتا ہے تو وہ درحقیقت گجرات کے حسن و نزاکت اور اسکی زبان سے ششدر و حیرت زدہ ہو جاتا ہے "گربا" ہندو خواتین، آشا مہینے کی پہلی نوراتون مین گجراتی زبان مین گاتی ہین، وہ ایک حلقہ بنا لیتی ہین، اور وہ گاتے ہوئے اپنے ہاتھون سے تالیان بجاتے ہوئے اور پاؤن کو زمین پر ٹپکتے ہوئے چکر لگاتی ہین،

گربا لٹریچر کی نوعیت گانے والا یا پڑھنے والا دیوی کی طاقتون اس کے حُسن اُس کے لباس، اس کے زیور کی تعریف کرتا ہے، اور اسکی مہربانی کے لئے التجا کرتا ہے، گجرات کے اس نوعیت کا لٹریچر ناظرین کو بنگال مین بھی ملے گا، جہان متوسط زمانہ کے بنگالی لٹریچر (نظم) کے ہر شاعر نے ہمیشہ کالی کے تعریف کا راگ گایا ہے، کہ وہ ماتا ہے، محافظ ہے، اور کبھی کبھی تباہ کرنے والی بھی ہے، آسوین مہینے کے پہلے نو دن خاص طور سے دیوی کی پوجا کے لئے مخصوص ہوتے ہین، اور اس زمانہ مین ان گربون کو بہت کثرت کے ساتھ کاٹھیاواڑ مین مرد اور گجرات مین عورتین

ا ہین، ان عورتون کا حلقہ بنا کر گھومنا اور تالیان بجا بجا کر تال دینا اور نصف جسم کو جھکا جھکا کران گربون کو ن کے وقت دیر تک گاتے رہنا بہت پیارا نظارہ ہے، سورت، بڑودہ، احمد آباد، اور بمبئی جیسے مقامات مین عورتون کا رقص مردون کے رقص سے بہت زیادہ پر لطف ہوتا ہے، مرد تو محض کودتے اچھلتے اور چیخیے چلاتے ن، اور تالیان بجاتے ہین، جب دوسرے صوبہ کا آدمی ان عورتون کو بے پردہ پورے ساز و سامان اور مکمل آزادی کے اتھ گجرات کے شہرون اور قصبہ کے گلی کوچون مین گربا (جھومر) گاتے ہوے دیکھتا ہے، تو وہ اس حسین منظر سے محو برت ہو جاتا ہے، گجرات کے گربون مین خاص لٹریچر ہوتا ہے گربون کا نفس مضمون "دیوی ماتا" کی تعریف مین راگ الاپنا ہے، ربھ ڈھولا نے "بھاچارا" ماتا کی تعریف مین گربے لکھے ہین، اس کے بعد اس مضمون کا بہترین شاعر دیارام تھا، اس نے اپنے گربون مین رادھا اور کرشنا کے حسن و عشق کے قصے دکھائے تھے، یہ بہت زیادہ مقبول ہین اور بہت سی عورتین ان گربون کو دل سے چاہتی ہین، آج کل کے زمانہ مین نانالال، راس، اور گربا، کا بہترین لکھنے والا ہے، اس نے روحانی عشق مین جو اب تک گربون کا مضمون ہوتا تھا، دنیادی عشق کا بھی اضافہ کر دیا ہے، گربے گجرات کی خصوصیات ہین،

گجراتی کی تقسیمات | تمام گجرات مین گجراتی زبان ایک ہی طریقہ سے نہین بولی جاتی ہے بلکہ مختلف مقامات کے لئے مختلف تلفظ مخصوص ہین، گجراتی زبان تین خاص قسمون مین تقسیم کی جاسکتی ہے،

۱ - **احمد آبادی** یعنی وہ گجراتی زبان جو خاص احمد آباد اور اسکے گرد و نواح اور بمبئی مین بولی جاتی ہے، یہ ادبی زبان ہے جو بولی اور لکھی جاتی ہے

۲ - **کاٹھیاواڑی** گو یہ گجراتی بولی ہے، مگر اسکے تلفظ کے طریقہ مین فرق ہے، کاٹھیاواڑ کے لوگون کا تلفظ بہت وسیع ہے، وہ "س" کے بجاے "ح" بولتے ہین

۳ - **کچھی** گو کچھ گجرات مین ہے، لیکن اس کی بولی گجراتی زبان سے بالکل جدا ہے، اس پر سندھی زبان کا زیادہ اثر پڑا ہے، احمد آبادی یا کاٹھیاواڑی، کچھی زبان کو سمجھ نہ سکے گا، لیکن باوجود اس اختلاف کے تمام لوگون کی تجارتی زبان وہی ہے، جو احمد آباد مین بولی جاتی ہے، لٹریچر بھی مشترک ہے، کچھی گجراتی زبان کی ایک شاخ ہے، اور وہ ایک ایسی بولی ہے جو صرف بولی جاتی ہے لیکن کبھی لکھی نہین جاتی ہے، احمد آبادی کی ایک اور شاخ ہے، اور وہ سورتی زبان ہے، یعنی وہ زبان جو سورت مین بولی جاتی ہے، یہان "تا" "ہا" بولا جاتا ہے، جیسے شربت کے بجاے ہربت بولتے ہین،

باقی

خسرو باغ کے مقبرے

از مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف حیات جلیل" الہ آباد،

(۳)

مقبرۂ خسرو

پھاٹک پر چڑھائے اور جڑے ہوئے نعل نو وارد تماشائی کے لیے سب سے پہلے جاذبِ توجہ ہوتے ہین، یہ مرادین برآنے والوں کے حسنِ عقیدت کے نگینے ہین، ان کی تعداد اب بھی کافی ہے، ان میں ہر قسم اور ہر نمونہ کے حاضر ہین، بڑے بھی، چھوٹے بھی، گھوڑون کے بھی، بیلون کے بھی، حتی کہ جوتون کے بھی، ہندوستانی اور انگریزی دونون وضع کے، حال کے لگائے ہوئے نعلوں میں تازگی اور چمک بخوبی نمایاں ہے، اس فلزاتی (معدنی) نذر و نیاز یعنی آہنی نعلون سے منت پوری کرنے کی کوئی معقول اور جلد باور ہو جانے والی وجہ نہین بتائی جاتی، مختلف روایتین زباں زد ہیں، سب سے زیادہ مشہور و مقبول قصہ یہ ہے کہ مرزا خسرو کا گھوڑا نہایت عمدہ، اچھی نسل اور شریف ذات کا تھا، کسی نازک موقع پر اس نے کود کر جان بچائی اور دادِ رفاقت دی تھی، یہ صحیح ہو سکتا ہے، خسرو کے مقبرے کے سامنے یا اس کے دامن میں، جو ایک مسطح پست سا چبوترہ (کچھ کم ایک بالشت اونچا، چار گز دو فٹ لمبا، ساڑھے تین گز چوڑا) ہے ایک مختصر نشانِ تعویذ کے بنا ہے، وہ اسی غازی مرد کی قبر بتائی جاتی ہے، مین اس روایت کو باور کرنے اور اس رسم اور اسکی اصلیت کو اس طرح ماننے سے معذور ہون، خادمون کی حاضر جوابی، اور فضول گوئیوں کی شکایت ہمیشہ سے چلی آتی ہے، حتی کہ آج سے ایک صدی پیشتر مسٹر فریزر[1] بھی اسکو برداشت نہ کر سکے تھے، مین نے تو اس قسم کے نعل اکثر قلعون، پرانی عمارتوں اور مشہور روضون پر دیکھے ہیں، ان کی نسبت مجھے معلوم ہوا تھا کہ کواڑون کی

[1] سیاحت نامہ بالائی ہند ۱۸۲۳ء ص ۱۱۰،

استواری واستحکام اور آہن پوش بنانے کے لیے لگائے گئے ہیں، ان کی خوش اندامی اور جامع ونافع ہیئت کو ان کی برتری وانتخاب کی سب سے بڑی سند سمجھا جاتا ہے، فتح پور سیکری کی درگاہ کے بلند دروازہ (جسکو مسٹر فرنیچ ساویبع النظر تمام عالم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جلالت وعظمت والا پھاٹک اور ایک عجیب وغریب چیز لکھتا ہے) پر کے سیکڑوں موٹے موٹے اور بھاری بھرکم نعل اسی خیال کے مؤید ہیں، یہی صاحب لکھتے ہیں کہ "قلعہ بھرت پور کے مہیب پھاٹکوں پر پیتل کے موٹے موٹے تختے جڑے ہوئے ہیں، ان پر بڑی بڑی کیلیں اور اسی دھات کے لٹو لگے ہیں" میں نے بھی دیکھا ہے کہ دروازہ کی یہ شان اب تک قائم ہے، قلعہ آگرہ کے باہر بیرونی فصیل کے نیچے پھاٹک کے پچھم (امرسنگھ دروازہ) پر اس بہادر راجپوت کے گھوڑے کی مورت بہتوں نے دیکھی ہوگی، اس شریف نژاد جانور کے متعلق واقعات اور اسکی جولانیوں کی داستانیں بہت سی زبانوں پر ہیں، کتابوں میں بھی، لیکن خسرو کے کسی خاص گھوڑے کا ذکر یا اسکا کوئی کارنامہ صفحات روزگار پر درج نہیں،

مولوی خدا بخش خاں مرحوم کے ذخیرۂ نوادر یعنی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی تصاویر کا ایک نایاب البم محفوظ ہے، اس مرقع میں خسرو کی شبیہ بھی ہے، وہ جوانی کی عمر اور اپنے زمانے کے چست مردانہ لباس میں اونچی بنا ہوا ایک چاق چوبند گھوڑے پر سوار ہے، ہاتھ پر کلائی کے قریب ایک شاہباز متمکن ہے. وہ توسن راہوار، فرضی وخیالی نہ ہو، تاہم اس کا وجود، اور الہ آباد میں آمد متخیلات وموہومات سے خالی نہیں میں اپنی تحقیق وتفحص کے نتیجہ اور قرائن وقیاسات کو اس قبر نما چبوترہ کے حالات میں درج کرونگا جسکا ذکر ابھی کیا ہے،

اس قدیم رسم کے پرستار کچھ ہم ہی نہیں، ایشیا کے حدود سے نکل کر آپ یورپ میں بھی اسکو پائیں گے، عہد برطانوی کی تاریخ حکومت ہند میں محمود غازی کے مقبرے کے دروازوں کا غزنین سے لانا ایک عظیم معرکہ شمار کیا جاتا ہے،

لہ مفتاح التواریخ صفحہ ۲۷۳ ٢ه ایضاً ص ۱۷۱، ٣ه ایضاً ص ۱۱۱ ٤ه ان کواڑوں کے متعلق مسٹر بل نے بعض باتیں اپنے علم وآگاہی اور بعض منشی موہن لعل کے حوالہ سے لکھی ہیں، (مفتاح التواریخ ص ۵۰۸) مولوی سید احمد تحریر فرماتے ہیں کہ انگوری باغ (قلعہ) کے ایک دالان میں محمود غزنوی کے مقبرہ کا صندلی پھاٹک رکھا ہوا ہے جسے ابتدائی غلطی سے سومنات کے مندر کا پھاٹک سمجھا گیا تھا (تاریخ آگرہ حصہ ... چنانچہ اس مضمون کا اشتہار انگریزی، اردو اور ہندی میں اس پر چسپاں ہے، (صفحہ ۹)

ڈاولین پرانے اپنے اعلان میں اسکو بڑی اہمیت دی تھی، انگریزوں کی سعی تحقیق، کاوش اور وقتِ نظر مسلم ہے، مسٹر ملیو
ہسن نے دیکھا، شبہ کیا، اور قوی وجوہ و دلائل کے ساتھ لندن ڈیلی نیوز کو لکھا کہ یہ پھاٹک تو سومناتھ والے ہو نہیں سکتے،
رفرگسن[1] نے خوردبین سے جانچ کی تشخیص فرمایا کہ "صنوبری دیودار کی لکڑی ہے، حالانکہ تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ
مناتھ کے مندر کے کواڑ چوب صندل کے تھے، جن پر اعلیٰ درجہ کا نفیس کام تھا، جنکی بڑی شہرت تھی، جنکو محمود اپنی فتحمندی
اظہار کے لیے گجرات سے کابل لے گیا تھا جو اُسکی وفات کے بعد اُس کے مقبرہ میں لگا دیئے گئے تھے، بیشک یہ کواڑ
ی نئے نہیں ہیں لیکنگی اور دستبردِ زمانہ کے بہت سے بدیہی آثار ان پر نمودار ہیں، دِلے چور چور ہو گئے ہیں، بہت سا
یسنی کام ضائع ہو چکا ہے، بدنما بھدی مرمت لکڑی کی چھڑیوں ٹکڑوں اور لوہے سے کر دی گئی ہے (سب سے
ھکر یہ کہ) مشرق و مغرب کے اتصال کی عجیب و غریب کڑی یہاں بھی جلوہ فرما ہے، یعنی اُن پرانے کواڑوں پر گھوڑوں کے
نعل کثیر تعداد میں کیلوں سے جڑے ہیں[2]"

یورپ کے ہنرمندوں نے کامل غور و فکر اور تجربہ کے بعد اپنی کثیر الاجتماع محفلوں اور درباروں کے لئے مفی
یٹر اور کونسل ہال کے واسطے نعل کی شکل کی عمارتیں پسند و اختیار فرمائی ہیں، کیا اس انتخاب و قرارداد میں آپ
برۂ خسرو کی نعل والی رسم کی ذرا سی بھی جھلک دیکھتے، یا اس سے کچھ دور کا لگاؤ تجویز فرماتے ہیں،

رسمی معذرت و عفو خواہی کی ضرورت نہیں، بعض شرق نواز شرفا کی خفیف سی غلط رائی و غلط آرائی سے
ملات و گریز پر بر خود غلط مقبول مجبور تھا، ورنہ ان فرزانگانِ فرنگ کی تحقیق پسندی اور علم دوستی کا کون نا احسان
شناس قائل نہ ہوگا، جو غیر ملک، غیر قوم، غیر زبان کی ایسی گران ارز خدمت فرما رہے ہیں، اپنے اوقاتِ عزیزہ کی ساعت
بت میں جتنا غور کرتا ہوں، ان کی کرامت نفس کمال عظمت و عزت میرے دل میں بڑھتی جاتی ہے،

---

[1] مسٹر ڈنکن فرماتے ہیں کہ جیمس فرگسن دنیا میں، عصر حاضرہ کا علم تعمیر و آثار کا سب سے بڑا ماہر اور مستند شخص تھا، اسکی "تاریخ تعمیر"
جواب اور یادگار زمانہ ہے، دوسری کتاب "ہندوستانی اور مشرقی تعمیرات کی تاریخ" بیش بہا ہے ۱۸۸۶ء میں انتقال کیا،
گرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۰۷۔ نوٹ) [2] فرینچ صاحب کا سفرنامہ، صفحہ ۱۲۹ نوٹ، آگرہ و نواح آگرہ)

سلطان خسرو کی وفات کا قطعۂ تاریخ روضہ کے اندر گنبد کے قریب حاشیہ کے دور میں تحریر ہے،

آہ، افسوس آسمان را سیرت بیداد شد | آرے آرے کار چوں بر ظلم آمد داد شد
زندگی زد خیمہ بیروں از دیار خرمی | دید چوں بنیاد عالم را خراب آباد شد
اہل دا و باش اندا گاہ از فلک کا حداثِ او | ہر کجا زد شعلۂ خاکسترش بر باد شد
گلبنے ہر جا کہ بینی برگ ریزاندر پے ست | بلبل ایں باغ بودن مصلحت ازیاد شد
گل عذارے را طراوت جیست کا خرفا رمرگ | از پئے چاک قبا صد سوزن فولاد شد
چوں بہ لب رانم حدیثے را کہ می سوزد بہ آہ | مشکل است اما جہاں تا ہست ایں معتاد شد
آں گل رعنا کہ بود آرائے گلشن صد دریغ | عندلیباں را برنگ و بوئے او دل شاد شد
چاک پیراہن شد از خار قضا در باغ عمر | ہم زمین بگریست ہم از آسماں فریاد شد
شد قبا بر قامتِ مردم قبا در ماتمش | شاہ خسرو را بسوئے خلد چوں ارشاد شد
آں تنِ نازک کہ بر وے بود پیراہن گراں | در تہِ خاکِ جفا افسوس استعداد شد
شد غریقِ رحمتِ حق چوں ولیِ پاک بود | خاصِ درگاہ خدا و ہمدمِ او تاد شد
سلمی ارشد سال فوتش "فیض لائق" باز گو | صفۂ جنت زجان پاک او آباد شد

(کتبہ سلطان سرہندی)

خسرو کا تذکرہ نویس حال، خسرو کے اولین تاریخ نگار یا اُس کو حیات جاوید بخشنے والے شاعر کا بھی شکر گذار و منت پذیر ہے،

ہائے شوق جستجو کو کیا کروں | لب پہ بے قصد اُس کا نام آہی گیا

یہ تسلیم ہے کہ سلمی کا نام شعرا کے زمرہ میں پایا نہیں جاتا، میں نے خود بہت سے مطبوعہ و مخطوطہ تذکروں میں تلاش کیا، ناکام رہا، چند وسیع النظر کرم فرماؤں اور اساطین علم و فضل کو بھی زحمت و تکلیف دی، کوشش و کاوش

فرمائی، سعی نامشکور ثابت ہوئی، نواب والاجناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی، صدر یار جنگ بہادر اپنے ملاطفہ عالی میں ارقام فرماتے ہیں:۔

" میں اول مرتبہ الہ آباد اس وقت حاضر ہوا تھا جبکہ مسلم بورڈنگ کا سنگ بنیاد مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کے زیر اہتمام رکھا گیا تھا، اس موقع پر پہلی دفعہ خسرو باغ دیکھا، تاریخ پڑھی، نقل کی، اب تک محفوظ ہی، کبھی کبھی نظر بھی پڑ جاتی ہے، جب سے اب تک سلمی (ارشدوا) مصرع کھٹکتا ہی رہا"

گرامی نامہ کو پڑھکر مزید کاوش کی بے ڈھنگا ہی رہا، ایک شاہزادہ کی تاریخ فوت "فیض لائق" واقعۂ رحلت سے کیا مناسبت رکھتی ہے، میرا قاصر ذہن اس کے فہم سے عاجز ہے، پھر ارشد، باز گوکی کھپت، بھرتی ہی بھرتی ہے، اب "لفظ سلمی" سامنے آتا ہے، بفتح سین، بکسر میم تخلص ہے تو یہ نسبت کس طرف ہے، کوئی مناسب معنی سلم کے نظر سے نہیں گذرے، بکسر سین و میم ہے، تو البتہ سلم یعنی صلح یا اسلام کی طرف نسبت ہو سکتی ہے، بہرحال پیش نظر تذکرے اس تخلص سے خالی ہیں، ریاض الشعرا، داغستانی، مخزن الغرائب، تذکرہ حسین دوست سنبھلی، مرآۃ الخیال، صبح گلشن دیکھے گئے، کسی میں یہ تخلص نہ پایا، اگر سلمیٰ ہے تو کسی بی بی کا تخلص ہو سکتا ہے، کیا ضرورت ہے کہ جس کی تاریخ ایک معتوب شاہزادے کے مقبرے پر کندہ ہو جائے وہ با نام و نشان شاعر بھی ہو، قابل تذکرہ، رہا یوں میدان سخن، وہ مجموعۂ خرافات ہے، سوائے تخلص کے کوئی اور لفظ یہاں آ ہی نہیں سکتا،

میں ان جامع تذکروں کی فہرست میں شیخ محمد افضل سرخوش دہلوی کی مبسوط و مشہور تالیف کلمات الشعراء کو بھی داخل کرنا چاہتا ہوں جو ۱۰۹۳ھ میں شروع ہو کر ایک قرن ممتد کی مسلسل محنت و عرق ریزی سے بارھویں صدی کے عشرۂ دوم میں مکمل ہوا تھا، اس میں جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد کے تمام مستند شعرا کے حالات مندرج ہیں، سرخوش کا دعویٰ ہے[۱]

داخل اہلِ سخن نیست بہ پیشِ دانا　　　　آنکہ نامش نہ بود در کلمات الشعرا

[۱] خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۶۳ نولکشوری،

وہ بھی سلمی کو اہل سخن کی صف میں جگہ نہیں دیتے، نہ نام لیتے ہیں، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے نقوش اولیں ید بیضا اور سرو آزاد، میں جو فی الجملہ جامع اور ہر صنف کے شعرا کے احوال پر حاوی ہیں، سلمی کا ذکر نہیں کیا، یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کی حیثیت سے ان کا پایہ اسوقت (۱۰۳۱ھ = ۱۶۲۲ء میں) یا اس کے بعد بھی چنداں بلند نہ رہا ہو، شاید یہ بھی اعتراف حقیقت ہوگا کہ ایک بادشاہزادہ کی موت کی تاریخ "فیض لائق" کسی طرح قابل داد نہیں ہو سکتی، لیکن دوسرا مصرع (تاریخ) بلکہ پورا قطعہ، زبان کی لوچ، خیال کی برجستگی، بیان کے زور، حسرت و درد کا قصہ سنانے، دل کی چوٹ دکھانے کے اعتبار سے کس سے کم ہے، جس نے ان کے عنفوان شباب میں باوجود نومشقی دکمی مہارت ایک مہتم بالشان بادشاہی عمارت ایک عالی مرتبت سلطان کے مرقد پر جگہ پائی، واقعہ یہ ہے کہ سلمی نے ایک دوسری حیثیت سے شہرت و نمود حاصل کی تھی صاحب مخبر الواصلین، سید محمد فاضل[۲] ان بزرگ کا پورا نام و نثراد، ملا سلمی ہندی سرمست خاں اور سال وفات ۱۰۹۱ھ[۳] بتاتے ہیں، یہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا، ظاہر ہے کہ خسرو کے مرنے کے وقت سلمی محض نوخیز یا جوان رہے ہونگے، ساتھ ہی دلخستہ و جگر ریش، زمانہ کی سردی و گرمی سے کم آشنا، تلخی ناچشیدہ، دنیا سے دل ہٹائے گوشہ گزین بسر کرتے ہونگے، زہد و ریاضت میں مشغول، اپنے قطعہ میں وہ دردبھری باتیں کہہ گئے ہیں جو سن رسیدہ باکمالوں کو بھی نہیں سوجھتیں، وہ خدمت بجالائے ہیں جس کی انجام دہی کی جرأت کسی جاہ طلب اہل قلم کو نہیں ہو سکتی تھی، سید فاضل کیسے مرتبہ شناس نے جب دنیا بھر کے مشائخ اور اہل اللہ کو یاد کیا اور ہر ایک کی وفات کی تاریخیں نکالیں تو اس شہرت و نمود سے گریزاں و نفور انسان کے متعلق تین قطعے لکھے، سب کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، یہ شعر کافی ہیں،

(۱) سلمیِ ہندی کہ سخن سنج بود رفت ز دنیا بہ رباط بہشت

(۲) مست مئے صلاح سلمی بودست تاریخ وصال او ازیں نیز بدال

---

[۱] تاریخ جہانگیر، از گلیڈون، صفحہ ۱۷۰، [۲] ابو عبد اللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسین، منظر الحق اکبر آباد کے باشندے تھے، ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۷ء) میں وفات پائی، اپنی کتاب میں ۱۱۰۶ھ تک کے مادہائے تاریخ وفات لکھے ہیں، (قاموس المشاہیر) ص ۵۰) [۳] صفحہ ۱۱۹، مطبوعہ ۱۲۶۵ھ - مصطفائی،

(۳) چہ در دنیا و عقبیٰ جز خدا و مصطفیٰ ہرگز ندارد التجا و تکیہ بر کس سلمی ہندی

(۴) بماہ صوم تاریخ وصال آں سخن آرا بگفتا ہاتفم بودہ خدا رس سلمی ہندی

پہلے اور چوتھے شعر کے پہلے مصرعوں کو میں نے کئی بار پڑھا، "سخن سنج" و "سخن آرا" سلمی کی شاعری کا درجہ مجھے نہایت ممتاز و رفیع نظر آتا ہے، ان کے صلاح و تقویٰ، بزرگی و مشیخت کیساتھ ان کا کمال و کلام بھی مسلم ہے، ملا کا لقب اس دور میں اکابر علما، و فضلا کے لیے مخصوص تھا، کون تھے؟ کہاں کے تھے؟ یہ مراحل ہنوز جلباب خفا میں ہیں، قرینہ مقتضی ہے کہ بلادِ دکن کو ان کے توطن اور بود و باش کا شرف حاصل رہا ہوگا، اگر اطراف الہ آباد کے ہوتے تو ان کی شہرت و بلند نامی کا کچھ نہ کچھ نشان اب تک ضرور باقی رہتا،[۱]

[۱] فقیر ہیچمدان یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ خان سرمست کا یہ تخلص یا لقب نسبی امتیاز سے وابستہ تھا، یا انتسابی سے، نسب کا علو و تعلق فریدوں کے پسر بزرگ سلم تک پہنچتا ہے اور انتساب کی برتری و اعزاز صوفیہ صافیہ کے ایک مشہور اور پرانے خانوادے "سلمی" تک، جسکو غالباً صحابی جلیل حضرت سلمان فارسی سے شرف اختصاص حاصل ہے، اس سلسلہ کے چند برگزیدہ شیوخ کے نام مولینا فریدالدین عطار کی لاجواب کتاب، اور درویش صفت صوفی مشرب پروفیسر نکلسن کے مایۂ ناز کارنامے "تذکرۃ الاولیا" (مطبوعہ لائیڈن، ہولانڈ سنہ ۱۹۰۵ میلادی) میں جابجا ملتے ہیں، (۱) عطا سلمی، ان میں متقدم الایام پائے جاتے ہیں جنھوں نے بعض بعض باتیں عبداللہ مبارک کے حوالہ سے اور بعض خود ابراہیم ادہم سے نقل کی ہیں، (صفحہ ۹۶) (۲) احمد سلمی، ذوالنون کے معاصر و معتقد تھے، (صفحہ ۱۲۱) (۳) عبداللہ سلمی نے وصیت کی تھی کہ میں جب مرون تو ابوحفص حداد کے پانوں پر میرا سر رکھدیا جائے، جنکا حضرت جنید بھی ادب کرتے تھے، (صفحہ ۳۳۱) ان صورتوں اور اعرابوں کے علاوہ جو نواب محتشم نے تحریر فرمائے ہیں، اس لفظ کی ایک صورت اور بھی ہوسکتی ہے "سُلمی"، ابوعبدالرحمن السُلمی (رف ۲۱۲، دتمہید انگریزی ۱-۰۱) جس کی زندۂ جاوداں مثال موجود ہیں، مگر وزن شعر اس کو قبول نہیں کرتا،

متصوفین کے سوا عرب کے شاعروں میں بھی یہ نام و لقب اور اس لفظ (سلم) کے بعض مشتقات و مصرفات و منسوبات بہت محبوب و رائج تھے، نامور کاتب عبداللہ بن مُسلم ابن قتیبہ کی "طبقات الشعراء" (مطبوعہ لیڈن، سنہ ۱۹۰۲ء) میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، جیسے عُقبہ بن سَلم (صفحہ ۷۰۴) اور سعید بن سَلم (صفحہ ۵۱۳) وغیرہ، اشجع السلمی (۵۶۲) کے حالات واضح ہے کہ سلمیوں کا خاندان برامکۂ عجم کا قرابتدار تھا،

صحابۂ سیرۃ النبی ج ۳ صفحہ ۳۵۳ میں بھی حضرت عمرو و عتبہ سلمی، و عتبہ بن عبدالسلمی کے نام ملتے ہیں، نیز حجاج بن علاط السلمی کا (المستطرف جزء دوم صفحہ ۱۳۳)

شاہی کتابخانۂ رامپور کے آلاتِ ہیئت

از

جناب مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی، نائب ناظم کتبخانۂ شاہی رامپور،

معارف کے گذشتہ نمبر میں لاہور کے فلکی آلات ساز پر جو مضمون شائع ہوا ہے، اوسکی تقریب سے ریاست رامپور کے شاہی کتبخانہ میں ہیئت و فلکیات کے جو آلات اس وقت موجود ہیں، ان پر یہ ایک سرسری تبصرہ ناظرینِ معارف کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا،

کتبخانۂ مذکور میں اس وقت اس قسم کے نو مختلف آلات ہیں، جن کا ذکر بترتیب ذیل میں کیا جاتا ہے،

اڈیٹر

۱- اصطرلاب نمبر ۱ | پیتل کا بنا ہوا ہے، علامات وحروفِ اصطلاحی واسماء سب بخط کوفی ہیں، ۱۵½ انچ کا قطر ہے، ۱۴¾ انچ قطر کا جوف میں خلا ہے، جسمیں ۴ باریک پرت اسی دھات کے تلے اوپر رکھے ہوئے ہیں، اور ہر دو جانب نقوش وخطوط سے پُر ہیں، ان پرتون کے اوپر ایک ہلالی شکل کا اور پرت ہے، جس کے وسط میں بدری شکل تراشی گئی ہے، اس پرت پر ستارون کے نام کندہ ہیں، اور یہ گردش کر سکتا ہے، وسط میں ایک سوراخ ہے جس میں ایک کیل پڑی ہوئی ہے۔ اس کا ایک سرا موٹا ہے، جس کے باعث یہ وار پار نہیں گذر سکتی، دوسرے سرے پر ایک شگاف ہے، جسمین ایک پیتل کا پتلا ٹکڑا ڈال دیا جائے، تو وہ قفل کا کام دیتا ہے،

پشت کے بالائی حصہ پر بخط کوفی صانع کا نام، اور تاریخ ومقامِ صنعت ان الفاظ میں منقوش ہیں:-

"صَنعہَ السّراج بدمشق سنۃ خطوط"

یہ تمام حروف غیر منقوط ہیں، چونکہ تاریخ بلحاظ حروفِ ابجد لکھی گئی ہے، اس لئے حساب کرنے سے ۶۱۵ھ

برآمد ہوتے ہیں،

۲- اصطرلاب نمبر ۲- پیتل کا بنا ہوا ہے، علاماتِ و حروفِ اصطلاحی و اسماء وغیرہ بخطِ نسخ کندہ ہیں، ۵ انچ کا قطر ہے،

جوف میں ۴/۱ ۴ انچ قطر کا خلاء ہے، جس میں ۵ پرت پیتل ہی کے نیچے اوپر رکھے گئے ہیں، اور ہر دو جانب منقوش ہیں، ان

اصطرلاب کے بالائی ہلالی شکل کے پرت میں پھولدار جالی تراشی گئی ہے، پشت پر وسط میں بخطِ نسخ صانع کا نام اور

تاریخِ کتابت منقوش ہے، جس کے حروف گھومنے والے حصہ کو بے احتیاطی سے پھرا دینے کے باعث کہیں

کہیں سے محو ہو گئے ہیں، عبارت یہ ہے:-

عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قاسم[1] محمد بن ملا عیسی بن شیخ الہد[2] فی ۱۰۶۱ھ

۳- کرہ افلاک خورد نمبر ۱ یہ کرہ مسی ہے، تمام علاماتِ ہیئت اور تحریریں بخطِ کوفی کندہ ہیں، اس کرہ میں ستاروں

کے نام، اور ان کے مقامات ظاہر کئے گئے ہیں، ہر ستارہ کے جائے وقوع پر کرہ میں کسی دوسری سفید دھات کی باریک

کیلیں جڑ کر ہموار کر دی گئی ہیں، کرہ کو ایک مسی گھیرا محیط ہے، یہ گھیرا اسٹینڈ پر رکھا گیا ہے، اسٹینڈ کے چار پائے ہیں، کرہ کا قطر

۳ انچ کے قریب ہے، اور اسٹینڈ کی اونچائی ۴/۳ ۱۲ انچ ہے،

کرہ پر ایک جانب ۵ سطروں پر بخطِ کوفی یہ عبارت کندہ ہے،

سطر نمبر ۱ رسمت هذه الکواکب بعد ما زاد طوالهما.

سطر نمبر ۲ على ما فى صور ابى الحسين عبد الرحمن.

سطر نمبر ۳ الكوفى فى سنه ضلد الحجره وض ه.

سطر نمبر ۴ الرحوده دغ ذل و.

---

[1] یہ نام غالباً قاسم محمد ہے، (عرشی) **معارف**:- قاسم محمد ہے، [2] یہ نام یا الہداد ہے، اور یا الہدی، (عرشی)

معارف:- الہداد صحیح ہے،

سطر نمبر ۵ الاسکندری

دوسری جانب یہ عبارت ۳ سطروں میں منقوش ہے:-

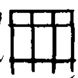
سطر نمبر ۱ صنعه محمد بن جعفر

سطر نمبر ۲ بن عمر الاصطرلابی

سطر نمبر ۳ الملقب بجلال .

یہ دونوں تحریریں غیر منقوط ہیں، اور تاریخ حروف ابجد کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے، میں نے ان عبارتوں کو اس طرح پڑھا ہے۔ رسمت هذه الکواکب بعد زیادة اطوالهما ر علی ما فی صور ابی الحسین، عبد الرحمن الکوفی[۱] فی سنة ضلد (۸۳۴ھ) الهجریه وضه (۸۱۱ھ) ایزدجردیه وغذلو (۱۷۳۶ھ) الاسکندریه.

صنعه محمد بن جعفر بن عمر الاصطرلابی الملقب بجلال

اسٹینڈ کی شکل یہ ہے:- 

صدر پر بخط نسخ یہ عبارت کندہ ہے:- صاحب سابق بوستانجی باشی الحاج احمد آغا ۱۲۱۳ھ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ کرہ ٹرکی میں بھی رہ چکا ہے،

۴- کرۂ افلاک متوسط نمبر ۲ | یہ کرہ پیتل کا بنا ہوا ہے، اس میں ستاروں کے نام، ان کی مفروضہ اشکال اور جائے وقوع وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، اسمائے نجوم بخط نستعلیق اور حروف اصلاحیہ ابجد یہ بخط نسخ ہیں، ستاروں کو ظاہر کرنے کے واسطے سفید کیلیں جڑ دی گئی ہیں، کرہ کو ایک مسی گھیرا محیط ہے، یہ گھیرا اسٹینڈ پر رکھدیا جاتا ہے، اسٹینڈ کی شکل مذکورہ بالا کرہ نمبر ۱ کے اسٹینڈ کی سی ہے، کرہ کا قطر ۹ انچ کے قریب اور اسٹینڈ کی اونچائی ۱۶ ۳/۴ انچ ہے، اسم صانع اور تاریخ و مقام وغیرہ ندارد، غالباً ۱۰ ویں صدی کا ہے،

۱؎ معارف:- الکوفی صحیح نہیں الصوفی ہے، یہ مشہور عالم ہیئت ہے،

۵۔ کرۂ افلاک نمبر ۴ کلاں | کرہ تانبے کا بنا ہوا ہے، اسمین ۱۲ برجون کے نام، جای وقوع اور اختلاف موسم وغیرہ کو ظاہر کیا گیا ہے، کرہ پر اسماء وغیرہ بخط نستعلیق اور اسٹینڈ کے اوپر کے گھیرے پر بخط نسخ کندہ ہین، اس کرہ کے چار پائے ہین جنکے نیچے کے سرے شیر کے پنجونکے مشابہ ہین، تاریخ کتابت اور صانع کا نام کندہ نہین ہے، لیکن اسٹینڈ کی شکل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوین صدی عیسوی کی یورپ کی ساخت ہے، ممکن ہے کہ اسٹینڈ دوسرا ہو، کرہ کا قطر ۶ اینچ کے قریب ہے اور اسٹینڈ کی اونچائی ½۱۶ اینچ ہے،

۶۔ کرۂ افلاک نمبر ۵ | یہ کرہ دفتی کا بنا ہوا ہے، لندن کی ساخت ہے، اسمین اشکال و اسماء اور مواقع نجوم ظاہر کیے گئے ہین، اسما بخط انگریزی ہین،

۷۔ ربع مجیب نمبر ۱ | پیتل کی ساخت ہے، ۷ اینچ لمبائی اور ۷ اینچ چوڑائی ہے، تاریخ صنعت ۱۲۷۳ھ بالائی گوشۂ راست پر بخط نسخ اور صانع کا نام عبدہ جمال الدین محمد علی الحسینی عفی عنہ بالائی گوشۂ چپ پر بخط مذکور کندہ ہین، اس آلہ کے حروف اصطلاحی وغیرہ بخط نستعلیق کندہ کیے گئے ہین،

۸۔ ربع مجیب نمبر ۲ | یہ آلہ لکڑی کے پالش شدہ تختہ پر بنایا گیا ہے، پالش زرد اور تحریر سیاہ ہے، حروف بخط نستعلیق اور عبارت بزبان فارسی ہے، صانع کا نام مرزا افضل علی عامل ہے، تاریخ صنعت ندارد، ۵۰ سال سے اوس طرف کا معلوم ہوتا ہے،

۹۔ دوامی جنتری | یہ آلہ پیتل کے ایک گول ٹکڑے پر بنایا گیا ہے جس کا قطر ۱۴ اینچ ہے، وسط مین ½۲ اینچ قطر کا خلا ہے جسمین ایک گول پرت رکھا ہے، یہ پرت گردش کرتا ہے، اس پرت کے وسط مین ایک تیسرا پرت ہے، پرت نمبر ۱ پر انگریزی مہینون کے نام، نمبر ۲ پر ہندوستانی دنون کے نام اور نمبر ۳ پر تاریخین ظاہر کرنے والے اعداد ۱ سے لیکر ۳۱ تک اور ہندی اور انگریزی مہینون کے نام منقوش ہین،

پشت پر بروج دوازدہ کے اسماء اور کچھ نجومی اصطلاحات منقوش ہین، حروف و اسماء بخط نستعلیق کندہ ہین، اسکے بالائی حصہ پر یہ عبارت کندہ ہے،

ازعمل دہر مخید اختراع نوجوتشی سمبت ۱۹۱۸

پشت کے بالائی حصہ پر یہ عبارت منقوش ہے:-

برائے نظر (نذر) خداوند نعمت حضور فیض گنجور مہاراجہ صاحب بہادر،

تلخیص و تبصرہ

اسلام کے قرون وسطیٰ میں ساہوکاری کی ابتدا

یہ مضمون جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے دو نمبرون (اپریل و جولائی ۱۹۳۲ء) مین شائع ہوا ہے، پہلے حصہ کی تلخیص معارف ماہ جولائی ۱۹۳۳ء مین گذر چکی ہی، دوسرے حصے کا خلاصہ سطور ذیل مین پیش کیا جاتا ہی،

جہابذۃ الحضرہ (COURT BANKERS) کی حیثیت سے یوسف بن فنیحاس اور ہارون بن عمران کا کاروبار خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل مدات پر مشتمل تھا،

۱۔ مالی کاروبار:۔ (الف) سرمایہ کا انتظام، (ب) سرمایہ کی ترسیل، (ج) سرمایہ کی فراہمی،

۲۔ تجارتی کاروبار،

(۱) الف:۔ سرمایہ کا انتظام | دسوین صدی کے عرب ماخذون سے معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانہ مین لوگون کو دولت جمع کرنے کی حرص بہت زیادہ تھی، ساتھ ہی ساتھ اس کے تلف ہوجانے کا خطرہ بھی بہت تھا، حکومت کے عہدہ دارون اور تاجرون کو اس بات کا اندیشہ رہتا تھا، کہ اون کی دولت حکومت کی طرف سے ضبط نہ کر لی جائے، اس خطرہ کی وجہ سے لوگ اپنے سرمایہ کو کسی محفوظ مقام پر رکھ دینا چاہتے تھے، چنانچہ اس کے لئے طرح طرح کی تدبیرین اختیار کرتے تھے، سونے چاندی کو زمین کے نیچے دفن کر دیتے تھے، یا کنوؤن مین، حوضون مین، کھدیانون مین، اور کپڑون مین چھپا دیتے تھے، بعض اوقات ناجائز مال کی ضبطی کے خوف سے اُسے زیورون اور جواہرات کی شکل مین تبدیل کر دیتے تھے، غیر منقولہ جائدادون کو وقف کرکے محفوظ کر لیتے تھے،

اپنی دولت کو زمین میں دفن کرنے یا کسی اور جگہ چھپا کر رکھنے کے علاوہ لوگوں نے اُسے سربرآوردہ اشخاص، تجار اور پیشہ ور ساہوکاروں کے پاس رکھنا شروع کیا، یہ تدبیر بڑے بڑے عہدہ دار اور خلفار کے وزیر اختیار کرتے تھے، اسی لئے عام لوگ بھی ان ساہوکاروں کو قابلِ اعتماد سمجھ کر اپنی دولت اُن کے پاس جمع کر دیتے تھے، مقتدر کے زمانہ کے ہر وزیر کا دستور تھا، کہ وہ اپنا ایک خاص ساہوکار رکھتا تھا، اس امر کی احتیاط کی جاتی تھی، کہ جو سرمایہ ان ساہوکاروں کے پاس جمع کیا جائے، وہ اُن کے کھاتہ میں درج نہ ہو، چنانچہ وزیر ابن الفرات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ اوس نے پوشیدہ طور پر بڑی بڑی رقمیں تاجروں اور ساہوکاروں کے پاس جمع کی تھیں، اسی طرح ایک دوسرے عہدہ دار نے بھی حفاظت کے خیال سے دس ہزار دینار ایک ساہوکار کے پاس جمع کر دیے تھے لیکن اس رقم کو کھاتہ میں درج نہیں کرایا، وزیر حامد بن عباس نے بھی ایک لاکھ دینار شخ ابراہیم بن یوحنا جہبذ کے پاس جمع کئے تھے، یوسف بن فینحاس اور ہارون بن عمران جہابذۃ الحضرۃ ہونے کی حیثیت سے خاص طور پر قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے، اور ان کے پاس اس قسم کے سرمایے جمع کئے جاتے تھے، ان سے کاروبار کرنے والے زیادہ تر وزرار ہوتے تھے، خصوصًا ابن الفرات کا کاروبار ان سے سب سے زیادہ تھا، چنانچہ اپنی معزولی کے بعد ابن الفرات کو اقبال کرنا پڑا کہ اوس نے مال المصادرہ کی رقم سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار ہارون بن عمران اور اس کے لڑکے کے پاس جمع کئے تھے،

(ب) سرمایہ کی ترسیل، یوسف اور ہارون نہ صرف دوسروں کا سرمایہ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے، بلکہ رقموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کا کام بھی کرتے تھے، اس زمانہ میں ہنڈی کا رواج شروع ہو گیا تھا، دسویں صدی عیسوی میں قرضہ صرف نقدی کی شکل میں نہیں، بلکہ چک کے ذریعہ سے بھی ادا کیا جاتا تھا، اس چک کو سفتجہ کہتے تھے، سفتجہ کا مقصد یہ تھا، کہ روپیہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک راستہ کے تمام خطرات سے محفوظ رہکر پہنچ جائے، چنانچہ ایک بار ایک شخص نے پانچ ہزار دینار کے سفتجہ کے ساتھ کسی دور دراز مقام کا سفر کیا، اور اوس کے ساتھ صرف ایک راہ نما اور دو ملازم تھے، صوبہ اہواز سے خلیفہ کی والدہ کے لئے تین ہزار

دینار کا ہدیہ بھی سفتجہ کی شکل میں آیا تھا، جدید عرب ماخذوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سلطنت عباسیہ میں سفتجہ کا رواج عام تھا،

سفتجہ کے ذریعہ سے ترسیل زر کا طریقہ نہ صرف غیر سرکاری کاروبار میں رائج تھا، بلکہ اس سے حکومت کے مالیاتی نظام کو بھی مدد ملتی تھی، چنانچہ انہیں کے ذریعہ سے سلطنت عباسیہ کے صوبوں کا محصول بیت المال عامہ میں آتا تھا، ان ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۹۱۶ء میں بغداد کے بیت المال سے فارس، اصفہان اور مشرقی صوبوں سے اموال سفاتیج آئے تھے، علی بن عیسیٰ نے جو اس وقت مصر و شام کا مہتمم مالیات تھا، ایک لاکھ سینتالیس ہزار دینار محصول سفتجہ ہی کے ذریعہ سے بغداد روانہ کیا تھا، اسی طرح صوبہ جات اہواز، فارس اور اصفہان کی زمینوں کا لگان بھی بیت المال عامہ میں سفتجہ ہی کی شکل میں آتا تھا، سفتجہ کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنے کا رواج اسقدر عام تھا، کہ مصنف مفاتیح العلوم ان اصطلاحات کی شرح کرتے وقت جو حکومت عباسیہ میں رائج تھے، سفتجہ کیلئے صرف "معروفہ" لکھکر خاموش ہو جاتا ہے،

(ج) سرمایہ کی فراہمی　جوں جوں خلیفہ اور سلطنت کیلئے روپیہ کی ضرورتیں زیادہ ہوتی گئیں، اس کی فراہمی کی جدید شکلیں بھی اختیار کی جانے لگیں، عمال مستاجر خلیفہ کو ایک متعین رقم ادا کرتا تھا، اس کے علاوہ وہ حکومت کو کچھ پیشگی بھی دیتا تھا، لیکن بعض قوموں پر یہ رقمیں ناکافی ثابت ہوتی تھیں، اور دوسرے طریقے بھی اختیار کرنا پڑتے تھے، نئے محکمے اور جدید شعبے صرف مالی مقاصد کی بنا پر قائم کئے جاتے تھے، عہدے عموماً انھی لوگوں کو دئے جاتے تھے، جو ان عہدوں کے لئے سب سے زیادہ روپے پیش کرتے تھے، شاہی زمینیں فروخت کر دی جاتی تھیں، بعض لوگوں کی جائدادیں ضبط کر لی جاتی تھیں، خلیفہ کے خزانہ خاص میں جو کچھ ہوتا، نکال لیا جاتا، یہانتک کہ ناگہانی ضروریات کے لئے اس میں کچھ باقی نہ رہتا،

غالباً ایسے ہی وقتوں میں ان یہودی ساہوکاروں کی مدد سے حکومت کی مالیات کو مستحکم کرنیکی ضرورت محسوس کی گئی، ہارون بن عمران اور یوسف بن فنیحاس کے جو حالات عرب ماخذوں میں دئے ہوئے ہیں، ان

سے معلوم ہوتا ہے، کہ مقتدر کے زمانہ مین یہ دونون سلطنت کے خاص مہاجن تھے، سلطنت کیلئے روپیہ فراہم کرنا ہی اُن کا مخصوص کام تھا، یہ ساہوکار ضرورت کے وقت سلطنت کو قرضے دیتے تھے، تین قرضون کا خاص طور پر ذکر ہے:۔

۱۔ وزیر ابن الفرات نے اپنی پہلی وزارت کے زمانہ مین یوسف بن فنیحاس کو بلا کر قرضہ کا مطالبہ کیا، اور یوسف کو اس کے اصرار سے ایک ماہ کیلئے قرضہ دینا پڑا،

۲۔ وزیر علی بن عیسیٰ نے ایک روز یوسف اور ہارون کو بلا کر کہا، کہ"ہر ماہ کے شروع مین پیدل سپاہ کے مصارف کیلئے مجھے تیس ہزار دیناروں کی ضرورت ہوتی ہے، عموماً میرے پاس اتنی رقم مہینہ کے پہلے یا دوسرے روز موجود نہین رہتی، لہذا مین چاہتا ہون کہ تم ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ڈیڑھ لاکھ درہم قرضہ کے طور پر دیدیا کرو، یہ رقم مہینہ کے اندر ہی تم کو اہواز کی مالگذاری سے مل جایا کرے گی، کیونکہ اہواز کے محاصل کا انتظام تمھارے ہی ہاتھ مین ہے، ان محاصل کے علاوہ جو تمھارے لئے ایک مستقل ضمانت ہین، مین بیس ہزار دینار کا اضافہ مزید ضمانت کے طور پر ادا کرتا ہون، جو ہر مہینہ حامد بن عباس سے واجب الادا ہین، یہ پہلی قسط کا معاوضہ ہوجائے گا" ان دونون ساہوکارون نے شروع مین تو انکار کیا، لیکن بالآخر انھین منظور کرنا ہی پڑا،

۳۔ وزیر علی بن عیسیٰ نے ۹۱۳ء مین بھی انھی ساہوکارون سے قرضہ لیا تھا، اس قرضہ کیلئے جو طریقہ اختیار کیا گیا، وہ اس سے قبل سلطنتِ عباسیہ کے مالیات مین غالباً کبھی نہین برتا گیا تھا، جب وزیر علی بن عیسیٰ کو مطالبات کی ادائی کے لئے روپیہ کی ضرورت پیش آئی، تو اوس نے تجار سے دس ہزار دینار قرض لئے اور اس قرضہ کی ضمانت سفتجے کی، جو صوبون سے آئے تھے، لیکن جو اُس وقت تک واجب الادا نہ ہوئے تھے، اس قرضہ پر اوس نے ڈیڑھ نقرئی دانق فی دینار سود دینا منظور کیا، جس سے ایک مہینہ مین ڈھائی ہزار درہم ہوجاتے تھے، یہ اقرار نامہ یوسف بن فنیحاس، ہارون بن عمران، اور اون کے جانشینون کے ساتھ سولہ سال کی مدت کے لئے کیا گیا، اس اقرار نامہ مین جو آب سے ایک ہزار برس پہلے ہوا تھا، زمانہ حال کی ساہوکاری کے تقریباً تمام اجزاء پائے

جاتے ہین اُن مین سے خاص حسب ذیل ہین:-

۱- حکومت کی طرف سے قرضہ کی گفتگو،

۲- سود کی ادائی،

۳- سفتجہ کو ضمانت کے طور پر دینا،

۴- حکومت کا ایک یہودی بنک سے قرضہ کا معاملہ کرنا،

(۲) تجارتی کاروبار | ان جہابذۃ الحضرۃ کے مالی کاروبار پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اُن کے پاس روپیہ کہان سے آتا تھا، کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سفتجہ کو بھنا کر وہ نقد روپیہ حاصل کر لیتے تھے، پھر بھی اس قدر کثیر نقد سرمایہ کا اُن کے پاس ہر وقت موجود رہنا تعجب سے خالی نہین، آخر اُن کی دولت کے ذرائع کیا تھے،؟

اُن کی آمدنی کا سب سے پہلا ذریعہ تو یہ تھا کہ جو رقمین حکومت کے عہدہ دار اور وزراء اُن کے پاس جمع کرتے تھے، اُن کو وہ سرمایہ کے طور پر استعمال کرکے فائدہ حاصل کرتے تھے، دوسرا ذریعہ تجارت تھا، یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ یوسف اور ہارون "تجار" کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے، ان ماخذون مین اُن کا ذکر اکثر اسی نام سے آیا ہے، "تجار" اور "جہابذۃ" کے نامون کے فرق سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دونون یہودی تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے، اگرچہ عرب ماخذون مین صرف اُن کے مالی کاروبار کا ذکر ہے، بہرحال یہ خیال کہ وہ تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے محض تجار اور جہابذۃ کے فرق پر مبنی نہین ہے، بلکہ اس کے لئے تاریخی وجوہ بھی موجود ہین، تمام قرون وسطیٰ مین مالی اور تجارتی کاروبار ہمیشہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، مالی کاروبار دراصل تجارتی کاروبار کی ایک ارتقائی شکل ہے، اور قرون وسطیٰ کی تاریخ مین اس کی بہتیری مثالین پائی جاتی ہین، کہ مالیات کی ابتدا تجارت ہی سے ہوئی،

لیکن ایک عرب تاریخی ماخذ سے جو ابھی حال مین شائع ہوا ہے، اور جس سے ان یہودی ساہوکارون

کی حیثیت پر بہت صاف روشنی پڑتی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ کی فراہمی کیلئے ان کا دار و مدار صرف اپنے ذاتی سرمایہ دوسرون کی امانت اور اپنے کاروبار کے منافع پر نہ تھا، التنوخی کی نشوار المحاضرہ جلد ثانی مین اس اقرار نامہ کے سلسلہ مین جو علی بن عیسیٰ نے ان ساہوکارون کے ساتھ قرضہ کیلئے کیا تھا حسب ذیل بیان موجود ہے:-

کیونکہ وہ مرتے دم تک اپنے عہدون سے برطرف نہین کئے گئے، وہ عبید اللہ بن یحییٰ الخاقانی کے زمانہ مین مقرر کئے گئے تھے، تجار کی نظرون مین جہبذ کے عہدہ کی جاہ برقرار رکھنے کے خیال سے سلطان اُن کو علٰحدہ کرنا نہین چاہتا تھا، تاکہ تجار ضرورت کے وقت جہبذ کے ذریعہ سے روپیہ قرض دے سکین، اگر کوئی جہبذ نکال دیا جاتا، اور دوسرا اُسکی جگہ مقرر کر دیا جاتا جس کے ساتھ تاجرون کو اس وقت تک لین دین کا تعلق نہ ہوتا، تو خلیفہ کا کاروبار معطل ہو جاتا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے نزدیک ان یہودی ساہوکارون کی کیسی عزت اور کیا اعتماد تھا، اور وہ دربار کیلئے کسقدر ضروری تھے، خلیفہ نے اپنے پچیس[25] سال کے دورِ حکومت مین پندرہ مرتبہ وزیرون کو تبدیل کیا لیکن ان ساہوکارون کو ایک مرتبہ بھی برطرف نہین کیا، اور اُن کو تاحیات برقرار رکھا، اس بیان سے ایک بات اور بھی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ یوسف اور ہارون اپنے وقت کے دوسرے مالدار تاجرون کے اعتماد پر بھروسہ کر سکتے تھے، دربار مین اُن کی مخصوص حیثیت کا راز یہ تھا، کہ وہ اپنے عہدہ، اپنی شہرت اپنے اعتماد و عزت، اور تجارتی حلقون مین اپنے گوناگون تعلقات کی بنا پر وہ رقمین حاصل کر سکتے تھے، جو حکومت اور دربار خلافت کی ضروریات کیلئے درکار ہوتین،

بہرحال مذکورۂ بالا بیانات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ دسوین صدی کی ابتدا مین تاجرون اور ساہوکارون کی ایک باقاعدہ اور مرتب جماعت موجود تھی، جس کا مرکز بغداد تھا، اس جماعت کے سردار یوسف ابن فنحاس، اور ہارون بن عمران تھے، یہ دونون جہابذۃ الحضرہ تھے، اور بغداد، اہواز اور سلطنت کے دوسرے صوبون کے مالدار تاجرون سے گہرے کاروباری تعلقات رکھتے تھے، یہ سب مل کر خلافت عباسیہ کی ایک اہم معاشیاتی خدمت انجام دیتے تھے، اور بار بار حکومت کی شدید مالی ضروریات کو پورا کرکے اونھون نے اس کو تباہی سے بچانے مین مدد دی،

"ع ز"

یورپین عورتون کی مشرقی سیاحتین اور انکی یادداشتین

عنوان بالا سے الہلال مصر مین ایک مضمون آیا ہے، اس کی تلخیص دلچسپی کیلئے درج ذیل ہے،

اوّل اوّل ایک اسپینی لیڈی سلویا (SYLVIA) نے چوتھی صدی عیسوی کے اخیر مین فلسطین کا تعب انگیز سفر کیا اور اپنے مشاہدات کی ایک یادداشت مرتب کی، جسکو ایک اسپینی راہب نے ساتوین صدی کے اخیر مین شائع کیا، اس کے ایک مدت کے بعد ۱۸۸۵ء مین ایک اور پادری نے اوسکی اشاعت کی، یہ لیڈی ایک راہبہ تھی اسلئے اوس نے گرجون، اور مذہبی رسمون اور مشرقیون کے اخلاق و عادات پر نہایت صداقت کے ساتھ لکھا ہے کہ اور یہ پہلی یورپین عورت ہے جس نے مشرق پر قلم اوٹھایا ہے،

اس کے بعد پانچوین صدی سے بارہوین صدی تک کسی یورپین لیڈی کے علمی سفر کا تذکرہ نہین ملتا، لیکن بارہوین صدی کے وسط مین ایک اٹالین عالم عراق مین علمی تحقیقات کیلئے گیا، اور چند دنون بغداد مین قیام کیا، یہان اسکی ملاقات ایک اٹالین لیڈی سے ہوئی، جو بعد کو اس کی بیوی بن گئی، اور یہی لیڈی ہے جس نے مشرق کے اطراف و جوانب کا سفر کیا، اور مشرقی قومون مین رہ کر اون کی زبان اور اخلاق و معاشرت کا طرز سیکھا، اور ان دونون میان بیوی کے سفر نے یورپین علماء کے سامنے تحقیقات کے نئے نئے دروازے کھول دئے، اور جس طرح قدیسہ سلویا نے مشرق کے متعلق سب سے پہلے مذہبی حیثیت سے لکھا تھا، اوسی طرح اس لیڈی نے سب سے پہلے مشرق کے متعلق علمی اور تاریخی حیثیت سے لکھا،

اس کے بعد ہم درمیان کا زمانہ چھوڑ کر اون لیڈیون کا ذکر کرنا چاہتے ہین جنھون نے اونیسوین صدی عیسوی مین مشرق کا سفر کیا، اور اس سفر کے متعلق علمی آثار چھوڑے،

ان لیڈیون مین مستشرق بلنٹ (BLUNT) کی بیوی سب سے زیادہ نمایان شخصیت رکھتی ہے، جس نے ۱۸۷۸ء مین اپنے شوہر کے ساتھ صحراے نجد کا سب سے پہلے سفر کیا، اور وہابیون کے مذہب

اور اخلاق کے متعلق یورپین اخبارات میں مضامین لکھے، اور اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب اپنی یادگار چھوڑی،

اسی زمانے میں ایک فرنچ لیڈی دیولافائے (DIEULA FOY) نے بھی اپنے شوہر کے ساتھ عرب کے شمالی حصہ کا سفر کیا، اور اپنے شوہر کے حکم سے مشرق کی قدیم و جدید زبانیں سیکھیں،

ایک اور لیڈی الکزنڈرڈیوڈنیل (ALEXANDRA DAVID NEEL) نے بلادِ تبت کا سفر اس وضع کے ساتھ کیا کہ اس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے اور ہاتھ میں ایک درخت کی ٹہنی تھی، جس پر ٹیک لگا کر وہ در در کی دریوزہ گری کرتی پھرتی تھی، اور گھروں کے اندر داخل ہو جاتی تھی، اس طریقہ سے اوس نے بلادِ تبت میں ۱۴ سال بسر کرکے وہاں کے باشندوں کی زبانیں سیکھیں، اور ان کی تاریخ اور مذاہب و رسم و رواج کا مطالعہ کرنے کے بعد اس ملک کے متعلق ایک نہایت جامع کتاب لکھی، ایک اور اٹالین لیڈی نے پورے پانچ سال بلاد اناطولیہ میں بسر کئے، اور اپنی یادداشت میں اس ملک کے متعلق نہایت وسیع معلومات درج کیں،

مشہور فرنچ عالم رنیان کی بہن کا نام بھی اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے جس نے گذشتہ صدی میں ارضِ مقدس کا سفر کیا، اور مشرقی روح، مشرقی خصائل، اور مشرقی ذہانت کے متعلق نہایت بلیغ انداز میں لکھا،

اس کے بعد بیسویں صدی عیسوی میں جنگِ عظیم سے پہلے اور جنگِ عظیم کے بعد بہت سی یورپین لیڈیوں نے مشرق کا سفر کیا، لیکن ان کے مقاصد سفر میں سخت اختلاف تھا، جن لیڈیوں نے جنگِ عظیم سے پیشتر مشرق کا سفر کیا، ان کا مقصد خالص علمی اور ادبی تھا، اور اس میں مذہب اور سیاست کی آمیزش نہیں تھی، لیکن جنگِ عظیم کے بعد سیاست ہر چیز میں داخل ہو گئی، اس لئے اس جنگ کے بعد جن یورپین لیڈیوں نے اخبار نویسوں کے ساتھ مشرق کا سفر کیا، اونھوں نے سب سے پہلے سیاسی اغراض پر قلم اوٹھایا، اور بغض و تعصب سے کام لیکر ان چیزوں کو چھپایا، جن کا اظہار سیاسی مصلحت کے خلاف تھا، اور ان چیزوں کو نمایاں کیا، جن کے اخفا میں کوئی سیاسی مصلحت پوشیدہ نہ تھی، چنانچہ ان لیڈیوں میں میڈم جوبیٹ آدم، مادام ہاری، دی سان بوان، روزنیا فورس اور رباوش بجیز، مس میو وغیرہ ہیں، جنھوں نے مشرق کے متعلق بہت کچھ لکھا، لیکن ان میں سے اکثر کی تصنیفات محض سیاسی مصالح کا آئینہ ہیں، "ع"

اخبارِ علمیہ

چہرے کی ساخت

ڈاکٹر ڈاسفاسس (پیرس) نے تیس سال کے ذاتی تجربہ اور صدیوں کی شہادتوں پر غور کرنے کے بعد انسانی چہرے کی ساخت کے متعلق بعض دلچسپ معلومات حاصل کئے ہین، اُن کا بیان ہے کہ مستطیل اور مثلث شکل کے چہرے انسان کی سرداری اور عظمت کی علامت ہین، ایک اوسط درجہ کا مستطیل چہرہ مستقل تعمیری اور مردانہ قوت ارادی کو ظاہر کرتا ہے جو ایک قائد یا سردار مین پائی جاتی ہے، زمانہ حال مین پاسٹر (مشہور فرانسیسی سائنس دان) جوفرے (جنگ عظیم کا ایک برطانوی جنرل) اور فوش (جنگ عظیم کا مشہور فرانسیسی سپہ سالار) کے چہرے اسی قسم کے تھے، ایسا چہرہ عموماً سیاسی قائدون لائق فوجی افسرون اور صنعت و حرفت کے بڑے بڑے ماہرون کا ہوتا ہے، بہترین انسانون مین بھی اسی قسم کا چہرہ پایا جاتا ہے، زمانہ قدیم کے آرٹسٹ جوپیٹر (قدیم رومن مذہب کا سب سے بڑا خدا) کا چہرہ اسی شکل کا دکھاتے ہین، مسیحی آرٹسٹ بھی (نعوذ باللہ) خدا کے چہرے کو ایسا ہی پیش کرتے ہین، ہر زمانہ کے مصورون اور صناعون کو اس شکل کے چہرے کی عظمت پر اتفاق رہا ہے، مثلث شکل کا چہرہ دماغی قوت کی زیادتی کا پتہ دیتا ہے، ایسے چہرے بیشتر مفکرین کے ساتھ مخصوص ہین، ممتاز مدبرین کے چہرے بھی عموماً اسی شکل کے ہوتے ہین، سیزر اعظم، اور رچلو (مشہور فرانسیسی وزیر اعظم) کے چہرے اسی شکل کے تھے، بیضاوی شکل کے چہرے جن کے اوپر کا حصہ کسی قدر زیادہ چوڑا ہوتا ہے، اعلیٰ دماغی قوت کو ظاہر کرتے ہین، ان سے ان اشخاص کے غرور اور غیر معمولی حوصلہ کا پتہ بھی معلوم ہوتا ہے، فلپ اسٹروزی (سولھوین صدی کا ایک فرانسیسی جنرل) اور لینن (انقلاب روس کا بانی) جو اپنے مظالم اور شقاوت مین مشہور ہین، اسی شکل کا چہرہ رکھتے تھے، الزابتھ، (ملکہ انگلستان) کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا، وہ غیر معمولی ذہین تھی، سولہ سال

کی عمر مین فرانسیسی، اطالوی، لاطینی، اور یونانی، زبانون مین بات کر سکتی تھی، وہ نہایت تند مزاج اور حد سے زیادہ مغرور تھی، وہ معاف کرنا جانتی ہی نہ تھی، اپنے سیاسی مخالفین کو نہایت دردناک سزائین دیتی تھی، بالکل بیضاوی شکل کے چہرے زیادہ تر عورتون مین پائے جاتے ہین، یہ عموماً طبیعت کی نرمی اور مروت کو ظاہر کرتے ہین، جو چہرے زیادہ بیضاوی ہوتے ہین، اُن سے اعصاب کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے، مسدس شکل کے چہرے سے جسمانی قوت اور کام کرنے کی اہلیت ظاہر ہوتی ہے، ایسے چہرے بعض ایسی نسلون مین پائے جاتے ہین، جو فطری زندگی بسر کرتے ہین لیکن یہ تمام مذکورۂ بالا علامتین محض علامتین ہین، اور ڈاکٹر ڈسفاسس کو اعتراف ہے کہ یہ کوئی معیار نہین ہے،

مکان کو گرم رکھنے کا ایک نیا طریقہ،

اب تک مکان اور دوسری عمارتون کے گرم رکھنے کا جو طریقہ رائج تھا، اوس سے بالکل مختلف اور کہین زیادہ آسان طریقہ ڈاکٹر جیب (امریکہ) نے معلوم کیا ہے، ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ انسان کے جسم سے جو حرارت نکلتی ہے اس مین سے قریب ۴۴ فی صدی دیوارون مین داخل ہوجاتی ہے، (قریب (۲۰) فی صدی بخارات کی شکل مین نکل جاتی ہے، اور باقی مکان کی ہوا مین مل جاتی ہے، معمولی حالت مین انسان کے جسم سے اتنی حرارت خارج ہوتی ہے، کہ اوس سے ایک گھنٹہ مین قریب تین پائنٹ (قریب ڈیڑھ سیر) پانی اُبل سکتا ہے، یہ حرارت عموماً ۱۰۰ ڈگری پر رہتی ہے، جب اس حرارت کے اخراج مین کمی واقع ہوتی ہے، تو ہم گرمی محسوس کرتے ہین، اور جب ضرورت سے زیادہ زیادتی ہوجاتی ہے، تو ہمین سردی معلوم ہونے لگتی ہے، انسانی جسم کو آرام اُسی وقت ملتا ہے، جب یہ حرارت نہ بہت زیادہ مقدار مین نکلے، اور نہ بہت کم،

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ سردی کی حالت مین گرم ہوا مین رہنے سے جسم کو زیادہ آرام ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جسم انسانی کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی خارجی حرارت کی ضرورت نہین ہے، جو حرارت اوس کے اندر موجود ہے، وہ اس کے لئے کافی ہے، اوس کو سردی سے محفوظ رکھنے کے معنی یہ ہین، کہ اس حرارت کو

باہر نکلنے سے روک دیا جائے، اگر مکان کی دیوارین اور چھت گرم کردی جائین، تو حرارت کا وہ معتد بہ حصہ جو جسم سے نکل کر عام حالات مین دیوارون اور چھتون مین داخل ہوجاتا ہے جسم کے اندر ہی محفوظ رہے گا، اور سردی کو دفع کرنے کیلئے ہوا کو گرم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی، ڈاکٹر حبیب نے اسی اصول کے ماتحت دیوارون کو حسب خواہش گرم کردینے کا ایک جدید طریقہ دریافت کیا ہے، وہ دیوارون مین پتلی پتلی نلکیان لگا کر انھین بجلی یا بھاپ کے ذریعہ سے گرم کردیتے ہین، اس تدبیر سے مکان کے دروازون اور کھڑکیون کو بند کرنے یا ہوا کو گرم کرنے کی ضرورت باقی نہین رہتی، اور تازہ ہوا ہر وقت اندر آسکتی ہے،

ایک جدید برقی ایجاد

دوسری طرف اسی امریکہ مین ایک جدید برقی مشین ایجاد ہوئی ہے، اس کے ذریعہ سے ہوا کی سردی و گرمی حسب خواہش کم و بیش کیجا سکتی ہے، امریکہ کی یہ جدید برقی ایجاد ہندوستان کے گرم میدانی خطہ مین بھی زندگی کو ایام گرما مین اتنا ہی خوشگوار بنا سکتی ہے، جتنا کہ سرد مقام پر ممکن ہے، اس برقی مشین سے ہر اُس مکان مین کام لے سکتے ہین، جسمین برقی قوت کا خزانہ ہے، یا وہ برقی صندوق موجود ہے جسمین پھلون اور کھانے کی دوسری چیزون کو تازہ اور سرد رکھتے ہین، اس ایجاد سے امریکہ نے حسب خواہش گرمی اور سردی پیدا کرلینے پر قدرت حاصل کرلی ہے، چنانچہ نیویارک کے اُنیس عظیم الشان برقی کارخانے کثیر تعداد مین یہ مشینین تیار کررہے ہین، تاکہ امریکہ کے تین کرور گھرون کے لئے گرمی و سردی کا مسئلہ حل ہوجائے، ان مشینون کی تیاری پر پندرہ کرور پونڈ صرف ہون گے، لیکن خیال ہے، کہ ایک سال کے اندر اس مشین کی قیمت اتنی کم ہوجائے گی کہ ہر وہ شخص جو مذکورۂ بالا برقی صندوق خرید سکتا ہے، اوس کو بہ سہولت رکھ سکے گا، اس مشین کا تجربہ اول اول امریکہ کے ایک سینما گھر مین کیا گیا، جس کی عمارت کا اندرونی حصہ بہ نسبت دوسرے حصون کے دفعۃً بقدر (۲۰) درجہ زیادہ سرد ہوگیا، اور سارے عمارت تماشائیون سے بھر گئی،

کرۂ ارض کا رنگ

پروفیسر وی، ایم، سلائیفر نے حال مین رائل اسٹرانامیکل سوسائٹی لندن کے ایک جلسہ مین بیان کیا ہی کہ اگر ہم کرۂ ارض کو آسمان کی بلندی سے دیکھین تو یہ ایک نیلگون سیارہ معلوم ہوگا، پروفیسر موصوف نے اس دعویٰ کے ثبوت مین اُس عکس کی تصویر پیش کی ہی، جو زمین ماہتاب پر ڈالتی ہی، اس تصویر مین زمین کا وہ نیلگون رنگ قائم ہی جو ماہتاب کے آئینہ مین اُترا ہے، سیارہ پلوٹو (PLUTO) کا رنگ جو حال مین رصدخانہ لاول مین دریافت کیا گیا ہے سُرخی مائل ہے،

خودکشی کا پہاڑ

چند مہینون سے جاپان مین خودکشی کی ایک عجیب روپیدا ہو گئی ہے جسمین نوجوان مرد اور عورتین سرعت کیساتھ اپنی جانین تلف کر رہی ہین، ٹوکیو سے پچاس میل جنوب مغرب کی جانب جزیرہ اوشیما پر ایک کوہ آتش فشان ہمارا نامی ہی، اُسی کو اُن نوجوانون نے اپنا مدفن قرار دیا ہے، گذشتہ فروری مین سب سے پہلے ایک مدرسہ کی لڑکی وہان جا کر پہاڑ کے دہانہ مین کود پڑی، اُسکے بعد تین مہینے بھی گذرنے نہین پائے تھے، کہ بیس نوجوانون نے اسی طرح جان دیدی، اُنکے علاوہ ایک سو پچاس بجبر اس ارادہ سے باز رکھے گئے، ایک روز سہ پہر کے وقت چھ نوجوانون مردون نے اسی طریقہ سے خودکشی کر لی، پہاڑ کے دہانہ پر جو سپاہی نگرانی کیلئے مامور ہو، اُس نے لندن ڈیلی میل کے نمایندہ سے بیان کیا کہ ہر روز کم سے کم دو آدمی ضرور دہانہ مین کودنے کی کوشش کرتے ہین،

نہ جلنے والے کپڑے

کبھی کبھی پہننے کے کپڑون مین بھی آگ لگ جاتی ہو اور خیمے وغیرہ تو گھرون اور چھپرون کی طرح اکثر جل جایا کرتے ہین، لیکن حال مین بعض ایسے سوتی کپڑون کے بننے کا طریقہ معلوم کیا گیا ہے، جن پر آگ کا کوئی اثر نہین ہو سکتا، اس لئے خیمے وغیرہ اب جلنے سے محفوظ رہ سکتے ہین،

"ع ز"

ادبیات

خونِ جگر

از حضرت جگر مراد آبادی،

ذیل کی سادہ غزل جسمین شاعر نے ہمارے بزرگون کی پرانی بولی مین اظہار مدعا کیا ہے کس درجہ پُراثر ہو، ضرورت ہی، کہ پُرانے متروکات مین جو الفاظ اور محاورے عمدہ اور شیرین ہین، اون کو پھر سے رواج دیا جائے،

"اڈیٹر"

کیا بتائین عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے، یہ سمجھ لو، جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہی،
جب نہین تم، تو تصور بھی تمھارا کیا ضرور اوس سے بھی کہدو کہ یہ تکلیف کیون فرمائے ہی،
ہائے وہ عالم نہ پوچھو اضطرابِ عشق کا یک بیک جس وقت کچھ کچھ ہوش آجائے ہی،
کس طرف جاؤن کدھر دیکھون کسے آواز دون اے ہجومِ نامرادی! جی بہت گھبرائے ہی،

تازیانہ

از

جناب اسد ملتانی بی اے

مارچ کے "معارف" مین شاعر کا "ترانہ شعراء" شائع ہوا تھا، جس مین شعراء کے خصائص کے بیان مین فخریہ پہلو خود بہ خود نمایان ہوگیا تھا اس خودستائی کے کفارہ کے طور پر شاعر نے یہ نظم بعنوان "تازیانہ"

لکھی ہے، امید ہے کہ "ترانہ" کے بدست اس "تازیانہ" سے ہوش مین آجائین گے،"

"اڈیٹر"

کب تک اے غافل یہ بے حاصل خیال آرائیان ایک گوشے مین پڑے رہ کر فلک پیمائیان
اُڑکے پہنچے رفعتِ گردون پہ اربابِ عمل اپنے بستر ہی پہ تو لیتا رہا انگڑائیان
اپنے ہم جنسون کی صحبت سے ہمیشہ اجتناب اور نجومِ آسمان سے انجمن آرائیان
اک خیال و خواب کی دنیا مین بتا رات دن عالمِ ہستی کے ہنگامون سے بے پروائیان
رفتہ رفتہ کرکے زائل قوّتِ سعیِ عمل تجھ کو لے ڈوبین نہ تیری فکر کی گہرائیان
کب تلک؟ باغِ تصور کا تماشا کب تلک؟ کھول آنکھ اور دیکھ فطرت کی چمن آرائیان
کیون حقیقت کے سمندر کو سمجھتا ہے، سراب؟ اے ترے دم سے فروغِ دینِ سوفسطائیان
تجرباتِ زندگی پر جب نہین ان کی بنا سر بسر اوہامِ باطل ہین تری دانائیان
تیری نظرون مین نہ ہو جب تک فضای کائنات کیا کھلین تجھ پر خود اپنی ذات کی پہنائیان
تاکہ تیرا دیدۂ باطن کرے کسبِ ضیا، دیکھ چشمِ ظاہری سے حسن کی رعنائیان
آہ تو نے حلقۂ الفاظ تک محدود کین، حسن کی دارائیان اور عشق کی گیرائیان

اے کہ تو دنیا مین ہے تفسیرِ "کالا یفعلون"،
عاقبت مین بھی تجھے حاصل نہ ہون رسوائیان

بیانِ اثر

از

جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری،

بارشِ نورِ مسلسل جلوہ گاہِ دل مین ہے، کوئی مہوش آج مہمان اس لٹی منزل مین ہے

فطرتِ انسان پرستارِ تجلّی کیون نہ ہو،
بادۂ عشقِ ازل مینائے آب و گل مین ہے،

بیخودی مین امتیازِ دشت و منزل تک نہین
کاروان کا کاروان بھٹکا ہوا منزل مین ہے،

دیکھتے جاؤ تم انجامِ وفا کو آنکھ سے،
بھر چکی ہین تیلیان، کچھ جان ابھی بسمل مین ہے،

بزمِ عالم مین نہین گر صاحبِ محفل کا نور
کس کا رُعبِ حُسن طاری اس بھری محفل مین ہے،

کر رہی ہے شمع، تفسیرِ رموزِ زندگی
ایک جارہ کردہ ہر ساعت نئی منزل مین ہے،

کشتیٔ طوفان زدہ اور بحرِ الفت بے کنار
طالبِ ساحل عبث امیدِ لاحاصل مین ہے،

نعمتین دونون جہان کی عشق مین سب چھِن گئین
اک تری تصویر باقی ہے، جو میرے دل مین ہے،

خود فراموشی ہی دے گی، اے اثرؔ ان کو جواب
پوچھتے ہین مجھ سے وہ اب کیا تمنا دل مین ہے،

سخنِ تاثیر

از

پروفیسر تاثیرؔ، ایم اے لاہور،

حُسن کے رازِ نہان شرح بیان تک پہنچے
آنکھ سے دل مین گئے دل سے زبان تک پہنچے

دل نے آنکھون سے کہی آنکھون نے اُنسے کہدی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھین کہان تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقین سے واصل
انتہا عقل کی یہ ہے، کہ گمان تک پہنچے،

کعبہ و دیر مین تو لوگ ہین، آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغان تک پہنچے،

آنکھ سے آنکھ کہے دل سے ہون دل کی باتین
وائے وہ عرضِ تمنا جو زبان تک پہنچے،

مطبوعات جدیدہ

ہندی شاعری از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی، حجم ۲۰۲ صفحے، لکھائی چھپائی ٹائپ کی، کاغذ عمدہ، قیمت ۶؍ پتہ :- ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد،

کتاب مذکور ایک دیباچہ اور دو بابون مین تقسیم ہی، دیباچہ مین "مسلمان اور ہندی شاعری" اور "ہندی اور اردو زبان" پر اظہار خیال ہے، پھر پہلے باب مین بھاشا زبان کی ابتدا، دکھا کر تلسی داس اور ان کی رامائن کے چند ترجمے دئے ہین، اور دوسرے باب مین ہندی زبان کے گیارہ بارہ شعراء کا سرسری تذکرہ ہے جنمین پانچ چھ باکمال مسلمان ہندی شعراء کے نام بھی ہین، اس کے بعد ہندی شاعری کا انتخاب چند عنوانون "فلسفۂ زندگی دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی" "حسن و عشق" "فلسفہ اخلاق و حسن معاشرت"، "مذمت اہل دنیا" اور "تصوف، معرفت حقیقت" مین درج کیا ہے، لیکن ہمین افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس تالیف سے نہ ہندی شاعری کا صحیح تخیل سامنے آتا ہے، نہ اس کے خصوصیات نگاہ مین آتے ہین، اور کتاب کی ترتیب بھی صحیح مذاق پر نہین ہے، اگر یہ کتاب ہندی شعراء کے تذکرہ مین نہین ہی، اس لئے بھاشا زبان کی تاریخ اور شعراء کے سوانح حیات مین جامعیت موجود نہین، تو ہندی شاعری پر تو نقد و نظر کی ضرورت تھی، اگرچہ مصنف نے چوپایون اور دوہون پر اظہار خیال بھی کیا ہے لیکن بجز بے معنی توصیفی الفاظ کے ان مین کوئی چیز موجود نہین خصوصاً ان کی تقریباً ہر ہر چوپائی پر کوئی نہ کوئی بے معنی توصیفی فقرہ موجود ہے، جیسے سبحان اللہ کیا دلآویز تشبیہ ہے، کیا دلکش ہی، وغیرہ، اگر ہر چوپائی اور دوہے کی تعریف و توصیف کرنے کے بجای اون کی لطافتون کو آشکارا کیا جاتا، خیالات مین جو جدت ہوتی، طرز تعبیر مین جو شیرینی اور مٹھاس ہوتی، اون سب کو نمایان کیا جاتا، تو زیادہ مناسب تھا، ہندی شاعری مین ہجر و فراق کی ستائی ہوئی دکھیاری کی بڑی پُر درد کہانیان اور جذبات ہین، ہندی شاعری سے اس حصہ کو نکال لینے کے معنی اوسکی روح کو

کھینچ لینا ہی لیکن اس کتاب مین بجز بعض جگہ ضمنی تذکرہ کے اسکی تصویر کہین نہین کھینچی گئی، ہمارے نقطۂ نظر سے "منتخبات ہندی کلام" جو اس سے پہلے شائع ہو چکی تھی، وہ بھی اگرچہ نقائص سے خالی نہین جس کا تذکرہ ان صفحات مین آچکا ہے تاہم وہ ہندی شاعری کی بڑی حد تک صحیح ترجمان ہی اس موضوع پر یہ موخر الذکر تصنیف اگر اوس سے بلند پایہ نہ ہوتی تو اسے ہم پلہ تو ہونا تھا، پھر بھی ہندی شاعری سے اس وقت تک اُردو دان طبقہ بڑی حد تک نامانوس رہا ہے، اس لئے اوس کے متعلق اردو رسم خط مین جو کچھ بھی مل جائے، بسا غنیمت ہم جناب ڈاکٹر اعظم کریوی کو مشورہ دین گے، کہ وہ چونکہ ایک اچھے ہندی دان ہین، اور اردو کے بھی صاحب قلم ہین، اگر وہ اس قسم کی تصنیف کے بجائے کسی ایک دور کے ہندی شعرا کا تذکرہ اور منتخب کلام مرتب کرین، یا کسی ایک ہندی شاعر کو اردو مین مکمل طور پر پیش کرین، تو وہ ایک مفید خدمت انجام دین گے، اور ایسے کام اردو زبان کے ایسے ہی اہل قلم انجام دے سکتے ہین،

تاریخ عجیب از جناب شیر محمد صاحب کاکوروی حجم چھوٹی تقطیع کے ۴۴ صفحے، قیمت ۴ر ایس ایچ شیر محمد مشین ساز دریزہ مرچنٹ، نظیر آباد لکھنؤ،

کہا جاتا ہی کہ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضؓ نے کبھی سر کے بال تراشے تھے، اسی مناسبت سے حلاقون کی برادری مین حضرت موصوف کا نام گرامی بطور استاذ لیا جاتا ہے، زیر نظر رسالہ اسی تقریب سے موصوف کے مختصر سوانح حیات مین ہی جس مین حجامت کے پیشہ اوس کے لوازم، قیود، شرائط وغیرہ کا تذکرہ بھی آیا ہے، رسالہ کی ترتیب کا مقصود اس انتساب سے اس پیشہ کی وقعت و عزت بڑھانا ہے، اور مسلمانون مین اس پیشہ ور کو جس حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس کو دور کرکے اسلامی مساوات کو پیش کرنا ہے،

سرمایۂ صحت، از جناب حکیم حافظ یوسف حسن خان صاحب سوری، حجم ۱۵ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۴ر، مؤلف سے بہار شریف ضلع پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے،

اس رسالہ مین چھوٹے بچوں کو حفظان صحت کے اصول، امراض، اور ان سے بچنے کے طریقے بتائے گئے ہین، رسالہ کی زبان کسی قدر اور آسان ہوتی تو مناسب تھا،

ہدایۃ الوریٰ فی تشریح الربوٰ، از مولٰنا محمد نقی صاحب صدر مدرس مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں، ضلع ناسک (بمبئی) حجم ۶۰ صفحے، قیمت ۱؎ پتہ :- انجمن اصلاح المسلمین مالیگاؤں ضلع ناسک (بمبئی)

اس رسالہ میں سود کی حرمت کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے، اور آخر میں دکھایا ہے کہ ہندوستان دار الحرب کی تعریف میں داخل نہیں، اس لئے یہاں مسلمانوں کے لئے سودی لین دین جائز نہیں، سب سے آخر میں سودخواری کی وعیدیں نقل کیگئی ہیں،

پانصد دُرِّ نادِر، از جناب محمد حسین خانصاحب بی اے، ناشر جناب سید حمید خان بستی نو جالندھر، چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحے، قیمت درج نہین،

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس مین مختلف صحابہؓ، صوفیہؒ، اور اکابر اسلام کے ایسے پانچ سو مقولے جمع کئے گئے ہین، جو حکمت و موعظت مین ہین، رسالہ کی ترتیب ابواب یا عنوان پر نہین ہے، مقولے ہر قائل کے نام کے نیچے درج کر دئے گئے ہین،

دلیلُ القاریٰ علیٰ کلامِ الباریٰ (عربی) از مولوی ابوالوفا، صاحب، محمود حیدرآبادی، ۸۰ صفحے، قیمت باعتبار کاغذ ۱۲؍ ۸؍ پتہ :- معتمد مجلس احیاء العلوم، حیدرآباد، دکن،

یہ رسالہ علمِ تجوید و قرأت مین ہے، جسمین مختصر طور پر اس کے اصول و قواعد بیان ہوئے ہین،

اربعین عندلیب، از مولوی عبد الوہاب صاحب، عندلیب، ۱۶ صفحے، تقطیع چھوٹی، ۲؍ پتہ، دفتر الواعظ شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد دکن،

"اربعین عندلیب" چالیس حدیثون اور ان کے منظوم ترجمون پر مشتمل ہے، رسالہ کے سرورق پر "امتحان و ابتلاء، صبر و رضا، انس و محبت"، کا عنوان درج ہے، لیکن رسالہ مین مندرجہ احادیث ان سے مختلف موضوع طلب علم، صدق و صفا، اور حسن اخلاق وغیرہ پر ہین، شاید رسالہ کا سرورق بدل گیا ہو،

"س"

جلد ۳۲	ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء	عدد ۴

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۲۴۲-۲۴۴
مسلمانون کی آیندہ تعلیم،	"	۲۴۵-۲۶۵
نفسیات حکیم ناصر خسرو،	پروفیسر معتضد ولی الرحمن ایم اے، استاذ نفسیات جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن،	۲۶۶-۲۸۶
گجراتی زبان اور اسکی تاریخ	مولنا سید ابو ظفر صاحب ندوی مؤلف "تاریخ گجرات"،	۲۸۷-۲۹۴
خالد اور لیلی کا مفروضہ افسانۂ عشق،	مولنا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی، رفیق دار المصنفین	۲۹۵-۳۰۳
برطانوی انجمن ترقی سائنس کا سالانہ اجلاس،	"ع ز"	۳۰۴-۳۰۶
عہد حکومت ایوبیہ کی دو علامات قبر،	"ع"	۳۰۶-۳۰۹
لفظ دیپ کے مشتقات،	"سع"	۳۰۹-۳۱۱
اخبار علمیہ	"ع ز"	۳۱۲-۳۱۵
مسجد نبوی مین نماز تہجد،	حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی،	۳۱۶
آہِ رسا،	جناب حفیظ ہوشیار پوری، بی اے،	۳۱۶-۳۱۷
اسرارِ توحید	مولوی حکیم امداد حسین صاحب توحید ندوی	۳۱۷
مطبوعاتِ جدیدہ	"ز"	۳۱۸-۳۲۰
تاریخ خطیب بغدادی،	نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی	۲۱-۵۵

شذرات

دارالمصنفین سے امسال تین کتابین چھپکر شائع ہونگی، ایک خیام جسمین خیام کے سوانح اور تصنیفات پر ناقدانہ تبصرہ ہے، اور آخر مین اُس کے چھ فلسفیانہ عربی اور فارسی رسالون اور رباعیات کے ایک مستند نسخہ کا ضمیمہ ہے، ضخامت ۵۰۰ سے کچھ زائد ہوگی، دوسری کتاب سیر الصحابہ کی ساتوین جلد ہوگی، اور اسی پر اس وسیع سلسلہ کا خاتمہ ہوگا، اور تیسری کتاب افکارِ عصریہ ہوگی جسمین موجودہ سائنس کے تمام شعبون کے نظریاتی مسائل سہل اور آسان اور دلچسپ عبارت مین لکھے گئے ہین، یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ کی گئی، اور اس خیال سے شائع کیجارہی ہے کہ عربی مدرسون کے نصاب مین داخل ہوسکے، اور عربی خوان طلبہ کو سائنس کے جدید نظریون سے آگاہی ہوسکے،

خوشی کی بات ہے کہ حجاز (مکہ معظمہ) مین "مطبعہ سلفیہ" کے نام سے ایک علمی مطبع قائم ہوا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مفید عربی کتابون کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ازرقی نے جو امام مالک کے ہمعصر ہین، مکہ کی تاریخ لکھی تھی، جو گو یورپ مین چھپ چکی تھی، مگر مدت سے اسکے نسخے مفقود تھے، مطبع مذکور نے اس کے دوبارہ چھاپنے کا اہتمام کیا ہے، حجاز کے مکاتب کے لیے تعلم القرأۃ العربیہ کے نام سے چند ریڈرین چھاپی گئی ہین، اور بعض دوسرے رسالے بھی وہان چھاپے گئے ہین،

اس سلسلہ مین سب سے اہم خبر یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ؒ نے امام مالک کی مؤطا کی جو دو شرحین مسوّیٰ (عربی مین) اور مصفّیٰ (فارسی مین) لکھی تھین، اور جو ہندوستان مین کئی دفعہ چھپ چکی ہین، مگر اس طرح کہ عربی شرح فارسی شرح کے حاشیہ پر، اب عربی شرح مسوّیٰ مستقل طور سے متن مین چھاپی گئی ہے، شروع مین مولنا عبدالوہاب دہلوی مقیم مکہ معظمہ کے قلم سے حضرت شاہ صاحب کے حالات وسوانح لکھے گئے ہین اور مصفّیٰ کے شروع مین شارح نے جو مفید مقدمہ فارسی مین

لکھا تھا، اس کا عربی ترجمہ شامل کیا گیا ہے، کہین کہین مولنا عبید اللہ صاحب سندھی سابق ناظم نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے قلم سے مزید حواشی درج ہین، خوبصورت ٹائپ اور مفید حواشی اور ضمیمون کیساتھ اس کتاب کی اشاعت بہترین خدمت ہی، کتاب ۱۲؍ کی قیمت مین شرف الدین کتبی واولادہ کے مکتبہ واقع بھنڈی بازار بمبئی سے ملیگی،

چونکہ اس کتاب کی اشاعت کے ذمہ دار ہندوستان کے علما ہین، اس لئے ان کی خدمت مین یہ گذارش بیجا نہ ہوگی کہ اگر وہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی دیگر فارسی تصانیف کو عربی جامہ پہنا کر شائع کرین تو ہندوستان کی نیکنامی ایک طرف، اس سے زیادہ یہ کہ شاہ صاحب کے علوم سے دنیائے اسلام فیضیاب ہوگی، اور یہ اسلام کی ایک اہم بالشان خدمت ہوگی؛ شاہ صاحب کی فارسی شرح مصفیٰ درحقیقت ایک مجتہدانہ تصنیف ہے، اس کا ترجمہ بیحد مفید ہوگا، شاہ صاحب کی ازالۃ الخفاء نصف عربی اور نصف فارسی مین ہے، اگر یہ کل عربی مین ترجمہ ہو کر کئی جلدون مین شائع ہو تو بڑی خیر و برکت کی چیز ہوگی، شاہ صاحب کی فوز الکبیر فی علم التفسیر کا فارسی متن اکثر ملتا ہی، اور اب عربی مدرسون مین اکثر زیر درس ہی، مگر اسکا فارسی متن عربی طالبعلمون کیلئے دقت طلب ہی، اس کا ایک عربی متن بھی ہی جو ۱۲۹۵ھ مین آج سے ساٹھ برس پہلے مکہ معظمہ مین، مجد فیروزآبادی کی سفر السعادۃ (عربی) کے حاشیہ پر چھپا تھا، اور آخر مین فتح الخبیر شامل تھی، اب اگر مطبعہ سلفیہ ان دونون رسالون کا یہ عربی متن مستقل طور سے چھاپے تو علوم قرآن کی تفہیم و اشاعت کی راہ مین عظیم الشان خدمت ہوگی،

عین اسوقت جب یہ سطرین زیر تحریر تھین مکہ معظمہ مین دار الحدیث کے قیام کی خوشخبری موصول ہوئی، حرم محترم مین حدیث و قرآن پاک کا درس ہمیشہ سے جاری تھا، اور اس فیض کے سرچشمہ سے پوری دنیائے اسلام سیراب ہوتی تھی، جنگ عظیم کے بعد سے حجاز مین فتنون کا جو سیلاب آیا وہ تمام پچھلی روایات کو بہا کر لے گیا، موجودہ حکومت سرمایہ کی کمی کے باوجود ان روایات کو دوبارہ بہتر صورت مین قائم کرنے کے لیے مقدور بھر کوشان رہتی ہی، حرم محترم کے ہر قسم کے مصارف کا بار اوقاف وعطایا و خیرات کی صورت مین کل عالم اسلام اٹھارہا تھا، اب اس عہد مین اسلامی سلطنتین کچھ تو برباد ہوگئین، اکثر پر عیسائیون نے قبضہ کرلیا، اور جو باقی

مین وہان فاسد قومیت و وطنیت کا وہ زور ہے کہ بین الاسلامی تعلقات کا خاتمہ ہوگیا، اب حرم محترم کے مصارف کی ذمہ داری خاص حجاز کی مفلس حکومت اور یا حاجیون کی جیبون پر ہے، اور ان دونون کا سرمایہ حرمین کے ضروری مصارف کا بار اٹھانے کے ناقابل ہے، یہ صورتِ حال مسلمانانِ عالم کے غور کے لائق ہے،

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اصل مین یہ کہنا ہے کہ مکہ معظمہ مین حدیث و قرآن پاک کے درس کا انتظام اس حکومت موجودہ کے عہد مین دوبارہ قائم ہو رہا ہے، اور دارالحدیث کے پرانے نام سے ایک نئی درسگاہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ سے قائم کیگئی ہے جسمین علوم حدیث و تفسیر کا باقاعدہ درس جاری ہوگا، صحاح ستہ کا دورہ محدثین سلف کے قاعدہ کے مطابق ہوگا، اور عربی زبان و ادب کی تعلیم بھی ضمناً ہوگی تعلیم کی کوئی فیس نہ ہوگی، اور کتابین وغیرہ طلبہ کو مفت ملینگی، بلکہ بعض مستحق طالب علمون کو وظیفے دیئے جائین گے، طریقِ تعلیم مین محدثین کے پرانے طریقِ املا، کو زندہ کیا جائیگا، اور طلبہ کو بحث و تحقیق، اور تقریر و املا کی مشق کرائی جائے گی، اس کے مہتمم حرم کے امام عبدالظاہر ابوالسمح، خزانچی عبداللہ دہلوی، اور ارکان شیخ محمد نصیف، محمد عبدالرزاق حمزہ، عبیداللہ دہلوی، (سندھی؟) عبدالوہاب دہلوی، محمد کامل کردی، محمد راضی، محمد نور فطانی محمد سیاد منتخب ہوئے ہین،

ضرورت ہے کہ حساس دل مسلمان ادھر توجہ فرمائین، اور وہ کام جن کے انجام دینے سے آج سلطنتین اغماض کر رہی ہین، ان کو غریب اپنی جھولیون سے انجام دین، ان مفید کامون کے انجام دینے مین حجاز کے مسلک اور سیاست کی الجھنین مسلمانون کو اپنے فرض سے باز نہ رکھین، کہ حرمین کی خدمات کا فرض سیاسیات اور فرقہ داریون سے بلند تر اور اعلیٰ تر ہے، دارالحدیث کے خزانچی عبداللہ دہلوی صاحب ہین، اور غالباً علی جان صاحب مرحوم کی کوٹھی واقع دہلی کے ذریعہ ہندوستان سے امدادین بھیجی جاسکتی ہین،

تاریخ خطیب پر مولنا شروانی صاحب کا تبصرہ علحدہ رسالہ کی صورت مین چھپ رہا ہے، اس لئے اس کو ضمیمہ کے طور پر آخر مین شائع کیا جا رہا ہے،

مقالات

مُسلمانون کی آیندہ تعلیم

(۲)

اخلاق کی تعمیر تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے، مذہب اور فلسفہ دونون نے اسکو اصولاً مان لیا ہے، کہ انسان بہت سی باتون مین مجبور ہونے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہرحال رکھتا ہے، اور یہی آزادی اوسکی ذمہ داریون کی بنیاد ہے،

غریب کشمکش جبر و اختیار مین ہے،

لیکن انسانون کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہین، اور اُن مین سے ہر ایک یا تو اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھون مجبور محض ہین، اور ان لوازم، خصائص اور اثرات کی بجا آوری پر مضطر ہین جن کے لئے اون کی خلقت ہوئی، آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا، گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی، اور سنکھیا سے موت ہی صادر ہوگی، مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو، اور بدبو، حیات اور ممات دونون صادر ہو سکتی ہین، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہین، اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے،

دوسرے لفظون مین یہ کہیے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرۃً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے، جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے، لیکن انسان تھوڑا اختیار پا کر فعل اور ترک فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اسکی پیدا ہوتی ہے، کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، اور پھر اون کی اغراض کے مطابق اپنے

کام کو پوری مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے، خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے، اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام "تربیت" ہے، اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے، تعلیم کی بڑی غرض وغایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کی جائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہوں جن کیلئے وہ اس دنیا میں آیا یا بھیجا گیا ہے،

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے، اُسی طرح یہ تمام تربیے اخلاق بھی ہے، ملک میں مسلمانوں کی ایک درسگاہ بھی ایسی نہیں ہے جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو، اور جس نے اپنی زندگی کا "مقصد" با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو، اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، کہ تعلیم کی درسگاہوں میں یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے،

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان میں نہایت محدود ہیں، اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود معنی نہیں بلکہ اُن سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے، اخلاق سے مقصود انسان کی قوت نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے، جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کرلے، درس گاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطے کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے، جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب و ہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت ور آب و ہوا کی جگہ ہو، اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی ٹوریم یعنی دارالصحت ہے جہاں فاسد جراثیم ہلاک ہو کر بیمار صحیح و تندرست ہو جاتا ہے،

ہمارے گھروں کی اخلاقی و مزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے، کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول زیادہ صالح، صحیح، اور طاقت بخش ہو تاکہ گھروں کی مسموم فضا سے علحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو، جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق و خصائل کے حامل ہوں اور اس طرح ایک دن وہ آئے، کہ پوری قوم کی قوم ان اخلاق و فضائل سے متصف اور مزین ہو جائے،

۱- **سادگی اور صفائی**:- ہماری درس گاہوں کا فرض ہے، کہ وہ اپنے بچوں کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کریں،۔ صاف ستھرا رہنے کی معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے کے مکان، اور قیمتی فرنیچر اور سامان

کے نہین ہین، افسوس ہو کہ اکثر مسلمانون بچون نے اس کے یہی معنی سمجھے ہین، اس کے دو برے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچون مین پیدا ہین، ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بدلے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہین، اور اس بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گران ہے، اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کونفت بنے ہوئے ہین، دوسرے خود طالب العلم بھی اپنے حوصلے کے مطابق اپنی آمدنی نہ پانے سے ملول وغمگین رہتے ہین جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت برا پڑتا ہے، اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کی یاد اور حل مین صرف ہوتا وہ اُن کے بناؤ سنگار مین، اور جو نہین ہو، اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم مین بسر ہوتا ہو،

ہمارے طالب علمون کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے، ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمھاری عزت تمھارے بیش قیمت کپڑون اور اعلیٰ سامان سے نہین، بلکہ تمھارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہو، طالب علمون کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمایش اور آرایش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو،

مسلمان طالب علمون کو جو مسرف اور نمایش پسند قوم کے افراد ہین خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے کہ اب وہ وقت نہین کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی مین وہ گران نمایشی زندگی اختیار کرین، جو ہم کو اپنے والدین سے ورثہ مین مل رہی ہو، کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی، اور وہ تمول اب سراب ہو، اس لئے اس کے نمایشی فخر وغرور کے اسباب کو بھی اب ختم ہو جانا چاہئے، ورنہ یہ تعلیم ہمارے افلاس مین روز بروز اضافہ کرتی جائے گی، اور قوم کی حالت سر روز بد سے بدتر ہوتی جائیگی، اسکی مثالین آج بہت سے خاندانون مین ملین گی، کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانون کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہو،

دنیا کے دوسرے ملکون سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانون کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہو کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہین، جو روزمرہ کی زندگی مین صد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے مین بہت کم ہین، نیا برین اس کے پاس ہمارے مقابلے مین دولت کی فراوانی ہو، اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ مین ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہین ہمسایہ قوم اپنے چند

بچون کو تعلیم دلاتی ہے، پھر دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کامون کے لئے اپنے بزرگون کی متروکہ جائدادون کو قرض مین رہن رکھکر بیچنے پر اور اس کے خریدنے پر مجبور ہین،

آج کل عام طور سے دیکھا جا رہا ہے کہ ہماری درسگاہین اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات مین بیش از بیش نمائش پسندی مین مبتلا ہین، ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد مین ہماری مسجدین ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال، اور مسجد کا فرش ہماری میزین اور بنچین اور کرسیان تھین، صرف انھی دو مدون کی کفایت کا اندازہ موجودہ گران طریقہ تعلیم سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے، کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدون کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس کے بانیون کی ساری محنت زمین، اینٹ، اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے، اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے

ہمارے دار الاقامون مین سب سے بہتر دار الاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے، جو اپنے طالب علمون کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے، اور ان کے رہنے کیلئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے، حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے، اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی ہے، جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے،

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ سادگی اور صفائی ہے، ہمارے نوجوانون نے صفائی اچھے کپڑون، فیشن ایبل بالون، خوشبو، عطرون اور تیلون کا نام رکھا ہے، حالانکہ وہ حقیقت مین گھر کی صفائی، کمرون کی صفائی، کپڑون کی صفائی، اور بدن کی صفائی کی اصلی دولت سے محروم ہین، طالب علمون کو اس بات کی عادت سکھانی چاہئے کہ وہ کیونکر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھین جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور صفائی اور ستھراپن جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کرین،

۲۔ **جفاکشی**، اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان مین مسلمانون کی آیندہ زندگی موقوف ہے، وہ جفاکشی ہے، ہم نے اسلامی اصطلاحات مین جہاد کا نام سن کر اپنی روشن دماغی کے ثبوت مین کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اے عزیزان محترم! اب وقت ہے، کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھین، اور

برت کرو کھائین، جہاد جہدؔ سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہین، حق کی راہ مین ہم جو تکلیف اوٹھائین، وہ ہمارا جہاد ہے، دنیا کی زندگی سکون پر نہین دائمی حرکت پر قائم ہے، غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہین، کہ ہم جس قدر سکون پائین گے، اسی قدر آرام اوٹھائین گے، پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا تھا:-

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را   دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

لیکن حقیقت مین یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے، راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے:-

فی الحرکۃ برکۃ، جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے، اور جو آنکھین بیدار رہی ہین، وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہین، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود ہی نہین ہوسکتا جبتک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤن پر نہ ٹپکے گا، جو روٹی ہمارے ہاتھ آئیگی، وہ ہمارے احساس کے ذائقہ کو بھی تسکین نہین دے گی،

سست امیرون کی پر لطف غذائین ہی وہ جراثیم ہین، جو اُن کی بیماریون کو پیدا کرتے ہین، ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے، اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے، وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اوسکی صحت کا خزانہ ہوتا ہے،

مسلمانون کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہئے، ان کی طالب علمانہ زندگی مین یہ عادت ایسی پختہ ہوجانی چاہئے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضہ مین کرلین تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہراہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے، وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو، ہر ایک مین یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہوسکتا ہے، پچھلی دولت مندی کا خمار اب تک مسلمانون پر چھایا ہوا ہے، ہماری درسگاہون کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علمون کے یہ ذہن نشین کردین، کہ اب تمھاری زندگی صرف تمھاری محنت جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے، یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے، جس سے نکل کر ساحل تک سلامتی پہنچنا صرف تمھارے ہی ہاتھ پاؤن چلانے پر موقوف ہے،

کون نہین جانتا کہ اس عرصۂ کائنات مین زندگیون کا ایک معرکہ برپا ہے اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے

کیلئے ہاتھ پاؤن مار رہی ہے، قومین اس دوڑ مین مصروف ہین، افراد اس مسابقت مین سرگرم ہین، وہی زندہ اور جیتا رہیگا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتیگا، اور جس نے ہاتھ پاؤن ڈال دئے، اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے مین ڈال دے گی، اور افراد اور قومین اس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائین گی، زندگی کا فلسفہ صرف جدوجہد محنت اور سخت کوشی ہے، بھوک کی برداشت شکم سیری کا سامان ہے، اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے، فاقتل تم احیی ثم اقتل فاحیی ثم اقتل فاحیی،

یہ جو کچھ کہا گیا شاعری نہین روزمرہ کی حقیقت ہے، طالب علمون کو اپنے روزانہ کے ورزشی کھیلون مین کیا یہ راز ہر شام کو علانیہ معلوم نہین ہوتا، کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے، جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا، یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہین، اس میدان مین بھی اسی کی جیت ہے، جو زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش ہے، اکامیابی کی راحت انھین کے لئے ہے، جو اپنے کاروبار مین محنت اور جدوجہد کی تکلیف اوٹھاتے ہین،

تمام قومون مین سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت، اور سب سے زیادہ قابلِ رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے، جس کے ہاتھون مین دوسری قومون کی سلطنت کی باگ ہو، لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو آب پر منکشف نہین کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی، اور یہ قابلِ رشک ہونے کی صلاحیت انکو کتنی محنت کتنی جفاکشی اور کتنی پے درپے جسمانی تکلیفون اور اذیتون کی برداشت کے بعد حاصل ہوئی ہے، محمود نے سترہ حملون مین پنجاب پر قبضہ کیا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوئے کپڑون کو تبدیل نہین کیا، بابر نے کامل پندرہ برس پہاڑون سے سر ٹکرایا، مین نے ان فقرون کو ہمیشہ کہا ہے، اور پھر کہتا ہون کہ بدوؤن کی سختیون کو جھیلے بغیر قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے، جس کو لال قلعے مین شاہجہان کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو، اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیون مین سر مارنا چاہئے، کوہ کنی کے بغیر جوئی شیر کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے،

آج یورپ کی قومین دنیا کے طول و عرض مین سلطنت کا تخت بچھائے کوس لمن الملک بجا رہی ہین، لیکن اپنے
ہیون کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت و جانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت ان
سیب ہوئی ہے، آج تجارتون صنعتون، اور کاریگریون کی زندگی ہے، یہ زندگی کتنی زندگیون کی قربانیون کے بعد
ن ہوئی ہے، کروڑون مزدور کان کنی مین لگے ہین، لاکھون آلات کے بنانے اور چلانے مین مصروف ہین، لاکھون
ِ رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگاپو مین مصروف ہین تب جا کر ان کی قوم کے سر پر سلطنت کا تاج ہے، اور ان کے خزانون
معدنیات، تجارت اور صنعت و حرفت کی دولت ہے،

بابر سے لے کر عالمگیر اوّل تک اور پھر بہادر شاہ اول سے لیکر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ
تک کی زندگیون پر غور و فکر کی نظر ڈالئے، کیا تین سو برس کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہین بتاتی کہ جنھون نے تکلیف
حمت اوٹھائی، اونھون نے تختِ سلطنت پر آرام کیا، اور جنھون نے آرام کی خواہش کی اونھون نے عمر بھر زحمتون
تکلیفون مین بسر کی،

الغرض مسلمان طالب علمون کو اب یہ نکتہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے
ن کی تعلیمی اور علمی دونون زندگیون مین ان کو کامیاب بنا سکتی ہے، جہان قومی سلطنتین اور قومی تعلیم گاہین ہین،
ن کے نظام تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے، کہ ان کے نصابِ تعلیم مین جو اہمیت کتابون کو حاصل ہے، اس
م اہمیت ان کے جسمانی کھیلون اور مختلف ورزشون کو حاصل نہین ہے، میدانی کھیلون کے علاوہ پہاڑون پر چڑھنا
ؤن مین کشتی چلانا، دھوپ مین دوڑنا، ہواؤن مین اڑنا، وہ کون سی جانفشانی ہے، جس کی مشق یہ قومین اپنے
ن بننے والے افراد کو نہین کراتین، انگلستان کی بہترین درسگاہون کے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور یہ نظر آیا ہے،
ن ورزشی کھیلون کی اہمیت وہان تعلیم کے برابر ہی برابر ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہان کی عام تعلیم گاہین بھی تقریباً نیم
ہین، اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمامتر نظری رہتی ہے عملی نہین وہان دور ہو جاتا ہے، مسلمانون کو اگر
رہ ہندوستان کی سلطنت مین حصہ لینا ہے، تو ان کو یہ نکتہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ آیندہ ان کو صرف نظری نہین بلکہ عملی قوم

بننا چاہئو، اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہین،

۲۔ **خود اعتمادی**۔ مسلمانون کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے جس کے بغیر نہ کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہو، اور نہ کوئی قوم خود اعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا، اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام کو شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے، قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظون مین ادا کیا ہے، اذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ (جب عزم کرلے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے، مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو کر گذرنا، اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توحید اور نصرت پر بھروسہ رکھنا،

مسلمانون کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھکر تن تنہا کھڑا ہوتا تھا، اور بحر و براور دشت و جبل کو طے کرکے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا، ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا، اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر مین علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتون اور درس گاہون سے فیض پاکر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بن کر چمکتا تھا، ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا ساز و سامان لیکر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بن کر نکلتا، اور دولت کے جہاز اور کاروان سے لدا پھندا عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہون مین اترتا، ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لیکر نکلتا اور روے زمین کی فضا کو چیر کر کہین نہ کہین اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا،

مسلمانون کا یہ جوہر اٹھارہوین صدی کے ہندوستان مین ان سے کھو گیا سُن کر حیرت ہوگی کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن مین تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار کی فوج سے ہندوستان کو فتح کر ڈالا، اس کی اولاد جب لال قلعے سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے، تو اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا، کہ کس طرح اپنے ہاتھون سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے؛

والدین اپنے بچون کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھتے ہین کہ اس کو تنہا کوئی کام کرنے نہ دین، تنہا راستے مین نہ چلین، راتون کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلین اکمرون مین رات کو تنہا سونے نہ پائین، ایک بڑے عالم باپ کو مین نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہین جانے دیتے تھے کہ یہ کالج مین پڑھنے جانیوالا بچہ کہین آتے جاتے راستے مین موٹرون سے کچل نہ جائے، امیر مسلمانون کے گھرون مین یہ بات دولتمندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے، کہ انائین اور کھلائیان جوان جوان لڑکون سے بھی علیحدہ نہ ہونے پائین، ہم نے اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادون کے واقعے سُنے ہین جن کو اس وقت تک نیند نہین آتی تھی، جب تک ان کی انّا بی بی ان کو پلنگ پر سُلا تی نہ ہون، آپنے ایسے نواب زادون اور امیر زادون کو دیکھا ہوگا، جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے مین جب داخل ہوتے ہین، تو اُن کے ساتھ اُن کو ناگہانی اتفاقات سے بچانیکے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہے،

غریب مسلمانون تک مین یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے، کہ وہ اپنے بچون کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اوٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضا مند ہوتے ہین، یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم اور ارادہ کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کمزور ہوتے ہین، اور اس لئے تعلیم کے زمانہ کے اندر اندر بھی وہ اتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہین چل سکتے اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہین ہوسکتے، الغرض وہ بچپن مین انا اور کھلائی کے تعلیم مین اتالیق اور ٹیوٹر کے، اور ملازمت مین سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہین، زندگی کے ہر مرحلے مین ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلین، ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کرسکتے ہین، کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہین، اُن کی ترقی کا عہد وہ تھا جب بادشاہ کے زیر سایہ امرا کھڑے ہوکر ملک کا انتظام کرتے تھے، اور ان کی تنزلی کا زمانہ جب آیا، تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیرون کے سہارے کھڑے ہوکر تخت پر بیٹھنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیرون نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا، اور بالآخر تخت اور تخت نشین دونون کا خاتمہ ہوگیا،

یورپ کی ترقی یافتہ قومون کے افراد مین آج یہ جوہر ان کی انھین درسگاہون مین پیدا ہوتا ہے، اور اسی کا

یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس پرزے کو جہاں لگا دیجئے وہیں وہ کام دینے لگتا ہے، ایک فرنچ مصنف نے انیگلو سیکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں "سر تقدم الانکلیز السکسونیین"، کے نام سے ہوا ہے، اس میں زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے، کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے، ایک اور فرنچ نے، "بیسوین صدی کا امیل" کے نام سے خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے، کہ ماں کی گود سے لیکر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکوں میں جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کیجائے، وہ خود اعتمادی ہے، ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانوں میں خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا، وہی نپولین کے مقابلے میں ہمارے کام آیا،

مسلمان ہندوستان میں جس تعدادی اقلیت میں ہیں، اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور عملی طاقت سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہماری درسگاہوں کو اس ملک کے مسلمانوں کو آیندہ زندگی بخشنے کے لئے ضرورت ہے، کہ وہ اپنے طالب علموں میں یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کریں تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک میں زندہ رہ سکیں، اور اس مملکت کے نظام حکومت کے قیام اور استواری میں کسی طرح ان سے حکومت وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے،

اساتذہ ہماری درسگاہوں میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہے، وہ استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے، قومی درسگاہوں میں اس انتخاب کا معیار یہ ہے، جو کم تنخواہ لے اور سرکاری درسگاہوں میں یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذ کی سند رکھے، اور یورپین کوالفکیشن تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے، ہندوستان کا کیسا ہی تجربہ کار سے تجربہ کار ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق ہو مگر اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درسگاہ کے دو لفظ نہ ہوں، تو اس کے مقابلے میں بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار اور نوآموز ترجیح پائے گا، ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی آج انگریز، فرنچ اور جرمن استادوں کے ناموں کے جادو میں گرفتار ہے، اور اس کو منہ مانگی تنخواہ دینے میں حاتمانہ فیاضی کیلئے تیار ہے،

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے، بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی

کا کوئی مقصد قرار نہین دیا ہو، اس لئے استادون کے انتخاب کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے، کہ اعلیٰ سند کا کاغذ اور سات سمندر پار کے حکمران اقوام کی گوری شخصیت، انتہا یہ ہو، کہ عربی فارسی اور تصوف کے پڑھانے کیلئے بھی ہم اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہین جبتک پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر راس کے دستخطون کا کاغذ اس کے پاس نہین،

ہم نے اس سے پہلے مسلمانون کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہو، اگر وہ ذہن نشین ہے تو آپ اسکا فیصلہ کرنے مین ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائین گے، کہ استادون کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھ کر ان کی شخصیت مین ان مقاصد کا وجود ہے جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے اگر آپ کسی ایسی دو درس گاہون کا باہم موازنہ کرین جنمین سے ایک ایسے اوستادون کا اسٹاف رکھتی ہے، جو اعلیٰ کاغذی سندون کے تو مالک ہین، مگر ان مقاصد سے سر تا سر خالی ہین، اور دوسری گو اعلیٰ کاغذی سندون کے لحاظ سے کم درجہ ہے، مگر اس کے اوستاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہین، جو اس کے تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہین تو یقیناً عملی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہین زیادہ مفید ہو گی، کیا ہماری نئی اسلامی درس گاہین استادون کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہین کہ ان مین سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت مین مسلمانون کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہو؟ کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنائے گا، اور خود اس کا نمونہ بن کر طلبہ کے سامنے آئے گا؟ ایسے استادون کے زیر تعلیم و تربیت جنمین سے ہر ایک کا قبلۂ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو، اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک محدود ہو، ایسے لڑکون کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہون، قوم پرور ہون، سادہ ہون، جفاکش ہون، اور مسابقت اقوام کی دوڑ مین اپنی برتری دکھا سکین، کہان تک حق بجانب ہے، یہ دیسا ہی ہے جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتون مین جو بو کر گیہون کاٹنے کی امید رکھے اور اس سے بے خبر ہو، کہ ع

گندم از گندم بروید، جو ز جو

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانون کے سامنے پیش کیا جائے، اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنا لین، وہی درحقیقت استادون کے انتخاب کا معیار ہو،

بوریا باف گرچہ بافندہ است، نہ برندش بہ بارگاہ حریر،

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے، کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہین کیا، اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادون کا انتخاب کیا، مثال دیتا ہون، ہم نے عربی پڑھانے کیلئے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا، وہ عربی فیلالوجی اور یورپین عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچون کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوق قومی ہم کو کیونکر عطا کر سکتا ہے، جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہین، بلکہ وہ اس سے منحرف ہے،

ہماری اکثر درس گاہون کے اُستاد صرف پیشہ ور معلم ہین جنھون نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے، ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہین، اور پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہین، کہ وہ آیندہ ہمارے بچون کو ہمارے قومی مقاصد تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کر دین گے،

جامعہ ملیہ کو مین مبارکباد دیتا ہون، کہ اوس نے اپنے استادون کے انتخاب مین اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے، اوس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہین، بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو رکھا ہے، فرض کیجئے کہ اگر اس درس گاہ مین ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے اُستاد کو لاکر رکھ دیا جائے، جو گو یورپ مین اسناد کا بڑا اوٹ اپنے قبضے مین رکھتا ہو، مگر اوس کے تمام تر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہون جن پر اس درس گاہ کی بنیاد ہے، تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب اس کو جامعہ بدر کرنے مین ایک لمحے کیلئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کرین گے؟

پھر کیا ہے کہ ہماری درس گاہون کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تضحیک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین، اور ہمارے وطنی اغراض کی تلبیس کرتے ہین، اور پھر صرف اس لئے یہ گوارا کیا

جاتا ہو، کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے،

جوہر طینت آدم زخمیرِ دگراست تو توقع زگل کوزہ گران می داری،

ارکان جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کر دینا ہے کہ ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت اور وطنیت جدید اور قدیم دونون کی لطیف و معتدل آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہی، اس لئے اساتذہ کے انتخاب مین صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہین کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کر دین، یا وطنیت سے انحراف پسند کر لین، اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ مین معلم نہین باقی رہنا چاہئے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کیلئے رواداری کیون برتی جائے، اگر کوئی درس گاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے، تو در حقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلھاڑی مارتی ہے، بہرحال اس بات کے اظہار مین ہم کو کوئی پس و پیش نہین کہ ہماری یہ نوعمر درس گاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے، اور دعا ہے کہ اس کے کارکنون کو اپنے معیار کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو،

علوم | ہم کو اپنی درس گاہون مین کن علوم کو پڑھنا اور پڑھانا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے، جس پر اب تک مسلمانون نے کیا بلکہ ہندوستانیون نے بھی غور نہین کیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے مین گرفتار ہین، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہین سکتے، ہندوستان مین نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے، ان کو بیان کرنے مین برطانی مُدبرین نے کبھی پس و پیش نہین کیا ہی،

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہو کہ ہندوستانیون کے دلون سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے، اس کے لئے اس کی ضرورت تھی، کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے، یہان تک کہ اس مین خدا کا نام بھی نہ آنے پائے،

۲۔ بنگال کی ابتدائی مثالون سے انگریزون کو یہ دھوکا ہوا، کہ یہ نئی تعلیم عیسائیت کی اشاعت مین معین ہو گی، اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولون کی پوری حوصلہ افزائی ہوئی، اور ان مین انجیل کی تعلیم داخل کی گئی،

۳- انگریزون کو اپنی حکومت کی تنظیم مین ایسے ماتحتون کی ضرورت تھی، جو اُن کے دفترون کے لئے کچے مواد اور مسالون کو ان کے مطالعہ تجویز اور فیصلے کے لئے مرتب کر سکین، اور ان کو ان کی زبان مین معاملے کی صورتِ حال کو سمجھا سکین،

ان وجوہ سے جدید درسگاہون کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا، پھر ان مین صرف انھین علوم کو داخل کیا گیا، جو اس قسم کے ادنیٰ تعلیم یافتون کو ان کے لئے مہیا کر سکے، ایسے محرّرون، کلرکون اور ماتحت افسرون کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہئے، تاکہ وہ ان کی زبان مین سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کر سکین پھر ان کو حساب جاننا چاہئے کہ ان کے دفاتر کے حساب وکتاب کو درست رکھ سکین، چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان مین جاری کی گئی، اُس کی اصلی بنیادیہی دو چیزین ہین، انگریزی اور حساب، اوس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے جس سے مقصود صرف اس قطعۂ ارض کا علم ہے، جہان سے آفتاب کبھی نہین ڈوبتا، اور اوس سے اوس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑون کا جوڑ بھی معلوم ہو، چوتھی چیز تاریخ ہے جس کا مقصد اس ملک کی قومون کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلون مین تازہ رکھنا اور انگریزون نے جیسا کہ وہ کہتے ہین، اس ملک مین ایک منظم، عادل اور متمدن حکومت قائم کرکے اہلِ ملک پر جو احسان کیا ہے، اس کو بار بار دہراتے رہنا، چنانچہ حکومت وقت اپنے اس مقصد مین کامیاب ہوئی، اور اوس نے ہندو مسلمانون کے درمیان بغض وعداوت کی وہ آگ بھڑکادی جو ہماری بہترین کوششون کے باوجود اب تک نہ بجھ سکی،

اعلیٰ تعلیم کے دو حصے ہین، فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس، یہ دونون حصے حد درجہ ناقص ہین، آرٹس مین جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اون کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہون، ابھی حال مین پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد مین جو خطبہ پڑھا، اس مین اونھون نے یہ بالکل بجا کہا ہے:-

"بی، اے یعنی بیچلر آف آرٹس، کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے، وہ کون سا آرٹ ہے، جس مین ایک

بی، اے مہارت حاصل کرتا ہی،

لے دے کر ایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولیٹیکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی اور وکالت کے خیال سے ہی، اور پھر نظری فلسفۂ علوم مین ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہی کہ "نظریات" کو اہمیت دی جائے، اور "عملیات" سے پہلوتہی کی جائے، ہماری ایک بڑی درس گاہ مین سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے، حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا نہین، حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانین کہ ان مین سے کس کا چمڑا ہم کس طرح کام مین لا سکتے ہین،

غرض ان بے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے، کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی زندگی گذارنے کے لئے حکومت وقت کے دست نگر رہین، تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہی، لکھے پڑھے اپاہجون کی تعداد بھی روزافزون ہے، اور چونکہ ہندوستان مین بے کارون کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہین، اسلئے اس کو اپنے طریق تعلیم مین تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہین ہوتی،

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان مین اور خصوصًا مسلمانون مین تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہی، اور اب انقلابات نے ہماری آنکھون سے یہ پردہ اوٹھا دیا ہے، کہ یونیورسٹیون کی یہ تعلیم نوکریون کے حصول مین بھی اب کارآمد نہین رہی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اتنا تک دوڑے چلے جانا کہان تک صحیح ہے، اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریون کا سہارا بھی ہو، تو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ سرکاری نوکریان قومی افلاس کے دور کرنے کا علاج نہین ہین، وہ علوم و فنون جو حصول دولت کے اصلی ذرایع ہین، ان کی تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعًا خارج ہے، عملی کیمسٹری، آلات سازی اور صنائع وحرفت کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دار و مدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی تعلیم یہان ہو، تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہان سکھائی جاتی ہی، مگر دواسازی نہین کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤن کی قیمت مین ہندوستان اپنا سرمایہ انگلستان کو دینے پر مجبور کیون ہو،

اسکول کی پوری تعلیم مین سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے، جغرافیہ طبیعی، حفظان صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتون کے سوا ان کو اور کچھ بتایا نہین جاتا، اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اور ان کو نہین آتا، کالجون کی اعلیٰ تعلیم مین انھین خاکون کو اور زیادہ ابھار دیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت سے گفتگو کرنے کیلئے مین اپنے مین اہلیت نہین پاتا، اس نے تفصیلات کو اپنے سے زیادہ لائق اشخاص کے سپرد کرکے صرف چند سرسری اشارون پر اکتفا کرتا ہون،

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آیندہ جاری رہنا چاہئے؟ کیا ایسا نصاب تعلیم آپ کیلئے زہر نہین جو مذہب، اخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو،؟

۲ ـ کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیار تعلیم کہ ہر ہندوستانی خالص انگریزون کی طرح اس زبان مین لکھ پڑھ سکے، اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے، جس سے اس کے ذریعہ گفتگو، کاروبار اور حصول علم ممکن ہو،

۳ ـ علوم مین ان سائنسون کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکین،

ہمارے بچون کو یہ پڑھایا جاتا ہے، کہ گھڑی سے وقت کیون کر پہچانین، ٹکٹ لے کر ریل پر کیون کر بیٹھین اور ایک موٹر کا عام استعمال کیون کر کرین، تار لکھ کر بابو کے ذریعہ تار کیونکر بھیجین، لیکن یہ نہین پڑھایا جاتا، کہ ہم گھڑی کیون کر بنائین، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالین، پھر لوہے کو کیسے صاف کرین، پھر کیون کر ریل کی پٹریان اور گاڑیان اور پہئے اور انجن بنائین، موٹر کے ٹکڑون اور ان ٹکڑون کو کیسے بنا کر جوڑین، اسی مثال پر دوسری باتون کو قیاس کیجئے،

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہین، اور سمجھتے رہے ہین، کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گران قیمت تعلیم

مین ہم اپنے بچون پر جس قدر صرف کرتے ہین، اکثر ایسا ہو رہا ہے، کہ ان لڑکون کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہو؛
ہمارے لڑکے بی اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور دلولون کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہین، اور ان
کو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس سڑک کے خاتمے پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا، مگر وہ جب وہان پہنچتے ہین، تو دفعۃً
منزل مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے، اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہین، اور اب
سوچتے ہین، ؎

گذری جو گذرنی تھی اب چاہئے کیا کرنا

غور کرتے ہین تو سرکاری نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہین پاتے، اس سے مایوس ہو کر
بعض لوگ تو ذرا اکتر اکر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہین یعنی ایم اے کی تیاری مین لگ جاتے ہین، اور بعض
قانون یاد کرتے ہین، یا ٹرننگ کی فکر کرتے ہین، لیکن اب ٹرننگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے، اور قانون کے میدان مین
جو بھیڑ بھاڑ ہے اوس سے کون بے خبر ہے،

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہو، جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے، آیا اون کے لئے اس طریقۂ
تعلیم مین علوم کی تحصیل کا سامان ہے، اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے، کیا انھون نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم مین
اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہو؟

اب اس مسئلے مین ذرا بھی شک کی گنجایش نہین، کہ ان چند لوگون کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہین، یا
علمی اور تعلیمی پیشے مین زندگی گذارنا چاہتے ہین، بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنی چاہئے، اور اعلیٰ تعلیم کا
فریب نہ کھانا چاہئے، اس تعلیم کے بعد اون کو کسی صنعت و حرفت، تجارت، یا اور دوسرے ذرائع معاش کی طرف
توجہ کرنی چاہئے، اعلیٰ تعلیم مین صرف اونھی کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہون، اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہون،
اس مین شک نہین، کہ موجودہ حکومت نے اس اعلیٰ تعلیم کو اپنے چند ملند عہدون کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کر لیا ہو،
اور ان ہی کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے، مگر غور کے قابل بات ہو کہ یہ چند عہدے ہر صوبے مین

دس میں سے زیادہ نہیں وہ ہزارون اور لاکھون مسلمانون کو نہین مل سکتے، جب چند سال کی دفتر گردی کے بعد بالآخر وہین لوٹ کر آنا ہی، تو پہلے ہی سے وہین جانے کی تیاری کیون نہ کیجائے، ؟

ہمارے یہان تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت اتبک ہی کہ خواہ لڑکے مین مناسبت ہو، یا نہ ہو، اور ان علوم سے اون کو وابستگی ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ ان کو پڑھنا ہے، اور ان مین ان کو کامیاب ہونا ہے، ورنہ آیندہ وہ کسی لائن مین بھی گھس نہین سکتے، اس مجبورانہ طریق تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتون کا اور والدین کے سرمایے کا بے دریغ خون کیا ہے، آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اور مالی فضول خرچی کب تک جاری رہے گی، اور کیا اب بھی وقت نہین آیا، کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک منظم تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کرین اور ان علوم کو چھوڑین جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو، اور ان علوم کو اختیار کرین جن سے قومی تربیت کے بعد حصول زر کا طریقہ سیکھا جائے،

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہین کہا ہی جس کا مقصد علم کا حصول ہے، کہ اس کیلئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے، ہم نے اتبک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونون مقصدون کو ایک تعلیم کے اندر جمع کر دین، اور یہ ناممکن ہی، پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہین ہوسکتی، یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانونمین اس نئی تعلیم کے ذریعے سے کوئی بڑا فلاسفر کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا مورخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ، کوئی بڑا موجد کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا ہسٹارنومر کوئی بڑا مِیتھیمیٹیشین پیدا نہین کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہین پائی، کیونکہ علم کی صبرآزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے چھوٹی پالٹیکس اور سرکاری نوکری کے ذریعہ فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے اور علم کا تقاضا ہی کہ علم کے سوا اوس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو،

تعلیم کی زبان سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے، مین نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے مین اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہین جن کے دُہرانے کی حاجت یہان نہین، اب وقت آگیا ہے، کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے

جو ۱۸۳۵ء مین ہم پر مسلط کی گئی آزادی حاصل کرین، یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی وادبی زبان سیکھنے کی نہین، علوم وفنون خواہ کتنے ہی نئے ہون، اور کسی قوم سے اون کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہین، مسلمانون نے ہندوستان ایران اور یونان کے سب علوم وفنون سیکھے مگراس طرح نہین کہ اونھون نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کردی ہو، بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانون کے علوم وفنون کو خود اپنی زبان مین منتقل کیا، یا دوسرون سے منتقل کرایا، اوراس اپنی زبان کے ذریعے لوگون کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی، آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل ہے، تو کیا کسی بہت سے بہت یورپین قوم کی مثال دی جاسکتی ہے، جس نے اپنی زبان کو چھوڑکر دوسری اعلیٰ قومون کی زبانون کو علوم وفنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو، کل بیت الحکمتہ نے بغداد مین جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دارالترجمہ عثمانیہ مین آج نہین ہوسکتا، جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعے اپنے ہان تعلیم نہین پھیلائی، اور نہ آج ترک تک باین ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنارہے ہین، کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہین، کہ زبان کو قومیت کی تخلیق مین کیا اہمیت حاصل ہے،

۱۹۲۰ء مین فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کراس پر قبضہ کررہا تھا، تو اوس وقت اتفاق سے مین فرانس کے شہر دیشی مین تھا، فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کے جو وجوہ بتارہے تھے، ان مین سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "یہ وہ ملک ہے، جہان فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہین" یہی وہ اسکول ہے، جہان شامی بچون کے دلون مین فرانس کی محبت کا بیج بویا گیا، یہ بیج بڑھا، اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت مین شام مین موجود ہی،

جامعہ کی چاردیواری مین اس اہمیت مین استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہین، جو قومون کی تکوین و تخلیق مین زبانون کو حاصل ہے، مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے، جو پوری قوم کو ایک متحد قوم بناتی ہے، وہ زبان جو کسی قوم مین ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہین ہوسکتی، یہی سبب ہے، کہ جہان تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے، ہماری زبانون کو بہت کم امداد ملی ہے، وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم وفنون کے خزانون

سے محروم ہے، اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے مین بند ہین، جہان تک رسائی بے اس کے ممکن نہین کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان مین سالہاسال تک مہارت حاصل کرلین، پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک بآسانی اس وقت تک نہین پہنچ سکتے، جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل نہ کرلین، مثال یہ ہے' کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان مین سوال دیتے ہین، بچے کو پہلی مشکل یہ ہے' کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے، پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہین سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان مین سمجھ سکتا ہے، اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان مین دہرانے پر تو یقیناً قدرت نہین رکھتا، کہ اس کے لئے اس کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے،،،

ہندوستان مین مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان مین علم کی تحصیل سے معذور ہین، بلکہ یہ کہنا چاہئے، کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہین، ہندوستان زبانون کا دنگل ہے، صوبہ وار زبانون کو چھوڑ کر اردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک مین قائم ہے، ہمارے وطنی بھائیون نے اُس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود مین حاصل ہے، یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو پوری مادری نہ سہی تو علمی وادبی زبان تو ضرور ہی بنالین گے، لیکن مسلمان اب تک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہین، اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے، لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہین، اور دوسری قوم سے مستعار مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہین سمجھ رہے ہین، اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے، تو یہان کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے، اور یہ وہی زبان ہوگی، جس کو ہندو مسلمان کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک مین پیدا کیا ہے،

اب تک ہم اس ساحرانہ فریب نظر مین پھنسے تھے، کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان مین ہو ہی نہین سکتی، مگر یہ سحر اب ٹوٹ رہا ہے، اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے

اس جال کے ایک ایک تار پود کو الگ الگ کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہی کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہین، شراب کو جس پیالے مین بھی پیو وہ شراب ہے، اور تلوار کو جس غلاف مین بھی رکھو، وہ تلوار ہے، سوال ظرف کا نہین مظروف کا ہے۔

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو، دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہی کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمھارے پیچھے آئے گی،

ہم کو اس کا احساس ہے، کہ آج کی گفتگو مین کچھ دل خراش باتین بھی ہین، مگر سنجیدگی سے غور اس پر کرنا ہی کہ یہ سچی باتین ہین، یا نہین، اگر ہین تو زخمون پر کب تک اس ڈر سے نشتر نہ لگایا جائے کہ اس سے بیارون کو تکلیف ہوگی،

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین،

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوون پر آٹھ خطبے (لکچرز) دئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے اون کو بے حد پسند کیا، ان آٹھ لکچرون مین نہایت مؤثر الفاظ مین اور تاریخی دلائل کے ساتھ آنحضرت صلعم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی تعلیمات کا عطر اور خلاصہ پیش کیا گیا ہے، یہ اس لائق ہین کہ مسلمانون کے علاوہ وہ غیر مسلمون مین ہدیۃً تقسیم کئے جاوین اور عربی مدرسون اور مکتبون اور انجمنون مین ان کو پڑھایا جائے، ضخامت ۱۵۰ صفحے، طبع دوم قیمت عہ

رسائل شبلی

مولانا مرحوم کے مختلف علمی مضامین کا پہلا مجموعہ جسمین اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تمدن، مدارس اسلامی اسلامی شفاخانے، کتبخانۂ اسکندریہ مسلمانون کی گذشتہ تعلیم وغیرہ مضامین ہین، ضخامت ۲۸۰ صفحے، قیمت عہ "منیجر"

نفسیاتِ حکیم ناصرِ خسرو

از

پروفیسر معتضد ولی الرحمن، ایم، اے، استاذ نفسیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

(۱)

جس وقت سے انسان نے اپنی حیات ذہنی مین دلچسپی لینا شروع کی ہی، اس وقت سے اس مطالعہ نے دو راستے اختیار کئے ہین، ایک مابعدالطبیعیاتی اور دوسرا علمی (سائنٹفک)، ان مین سے پہلا طریق تفکر دراصل انسان کی مذہبی ضروریات حیات جاودانی کی خواہش وامید، اور حیات جسمانی کے بعد حیاتِ روحانی پر اعتقاد کا نتیجہ تھا، ذہن کے اس مطالعہ کا نام عقلی نفسیات[1] رکھا گیا، دوسرا طریقہ انسان کی عقلی فطرت کا نتیجہ تھا، اس مطالعۂ ذہنی نے بالآخر وہ صورت اختیار کی، جس کو اب عرصے سے تجربی نفسیات[2] کہا جا رہا ہے، ان دونون طریقون کی مزید توضیح یہ کہکر بھی کی جاسکتی ہی، کہ عقلی نفسیاتِ روح کی ماہیت، اور اس کے مبدا و معاد پر بحث کرتی ہے، اس طرح یہ فلسفے کی ایک شاخ ہی، فلسفے مین منجملہ اور مسائل کے مسئلۂ حقیقت پر بھی غور کیا جاتا ہی، فلسفے کی جس شاخ مین یہ بحث ہوتی ہے، اس کو مابعدالطبیعیات کہتے ہین، اب چونکہ روح (اگر یہ فی الواقع موجود ہے) تمام حقائق مین سے اہم ترین ہے، لہذا عقلی نفسیات (روح جس کا موضوع بحث ہے) مابعد الطبیعیات کی بڑی شاخون مین سے ہی، اس کے مقابلے مین تجربی نفسیات واقعاتِ حیاتِ ذہنی (جس صورت مین یہ ہمارے تجربے مین آتے ہین،) پر بحث کرتی ہی، یہ روح کی حقیقی و باطنی ماہیت یا اس کے وجود کے مسئلے سے تعلق نہین رکھتی، بلکہ ان سب کو فرض کر لیتی ہے، دوسرے الفاظ مین روح اس کا اصول موضوعہ[3] ہے مختصراً یون کہنا چاہئے، کہ ان دونون مین فرق

---

[1] Rational Psychology

[2] Empirical Psychology

[3] Postulate

ہے، کہ عقلی نفسیات تو اس سوال کا جواب ہے، کہ "روح کیا ہے،" اور تجربی نفسیات اس سوال کا کہ "ذہن کیا اور کس طرح ام کرتا ہے؟" اپنے اس امتیاز کو باقی رکھنے کے لئے تجربی نفسیات "روح" کے لفظ کو ترک کرکے "ذہن"، "ذات" یا "شعور" کے الفاظ ستیار کرتی ہے، چنانچہ اس کے موافقین فخرًا اور مخالفین طنزًا اس کو "نفسیات بلا روح" کہتے ہین،

مندرجۂ بالا گفتگو سے معلوم ہوا کہ تجربی نفسیات سے مراد وہ مطالعۂ ذہن ہے، جو حیات ذہنی کے واقعات کے ناہدے پر مبنی ہوتا ہے، نہ وہ جو عام مابعد الطبیعیاتی تخیلات سے مستنبط کیا جاتا ہے، اب چونکہ واقعات مشاہدہ اس کا نقطۂ غاز ہین، لہذا یہ مطالعہ علمی (سائنٹفک) ہوتا ہے نہ کہ فلسفیانہ،

حیات ذہنی کے مطالعہ کے تجربی طریقے افلاطون و ارسطو کے وقت سے مستعمل ہین، ان دونون کی تصانیف مین ہنی مظاہر کے متعلق قیمتی بیانات ملتے ہین، ان دونون نے ذہن کی تحلیل کی ہے، اور نفسی اعمال کے مراتب و مدارج عین کئے ہین لیکن تجربی نفسیات پر سب سے پہلا باقاعدہ رسالہ ارسطو نے لکھا، ازمنۂ وسطیٰ مین بھی یہ دلچسپی باقی رہی، اگرچہ یہ بعد الطبیعیاتی نفسیات کے زیر اثر رہی، واقعہ یہ ہے، کہ یہ خصوصیت یونانی، ازمنۂ وسطیٰ اور زمانۂ حال کی نفسیات کے ے حصے مین پائی جاتی ہے، زمانۂ حال کی تجربی نفسیات کا آغاز کہنا چاہئے، کہ جان لاک سے[۱] ہوا، اس کے ہاتھون مین ریہ فلسفہ پر غالب آئی لیکن پھر بھی اس کی نفسیات اس کے فلسفیانہ عقاید ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے، تجربی نفسیات کو اصلی ور آخری آزادی انیسوین صدی کے ربع آخر مین جاکر حاصل ہوئی[۲]

(۲)

مسلمانون مین بڑے بڑے جید فلاسفہ گزرے ہین، کہ جنھون نے ارسطو کے فلسفے کی تشریح مین اپنے اجتہا

---

[۱] جان لاک John Locke؛ ۲۹ راگست ۱۶۳۲ء مین پیدا ہوا، اور ۲۸ راکتوبر ۱۷۰۴ء مین انتقال کیا ایک نی مین یہ پہلا فلسفی تھا، جس نے ماہیت علم کی تحقیق کی طرف توجہ کی جو تحقیق اس نے شروع کی اس کا خاتمہ جاکر کانٹ پر ہوا
[۲] مزید تفصیل کے لیے دیکھو، (Foundations of Psychology کی J. S. Moore) باب اول، اور (Contemporary Psychology Villa) باب اول،

فکر کا ثبوت دیا ہے، اصل مین تو وہ ارسطو کے شارح تھے، لیکن اس شرح مین اونھون نے وہ وہ نکات پیدا کیے اور وہ وہ باتین نکالین، کہ بعض بعض صورتون مین ماتن سے بھی آگے بڑھ گئے،[1] تاہم اس مین شبہ نہین کیا جا سکتا کہ انھون نے فلسفۂ مشائیت کو سمجھنے مین غلطیان کی ہین، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھون نے بعض ایسے مصنفات کو، جو دراصل ارسطو کی نہ تھین، ارسطو کی سمجھا، اور یہ سمجھ کر ان کو اپنی شرح کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ بعض بعض فلاسفہ، مثلاً فارابی، و ابن سینا نے دیدہ و دانستہ یہ کیا کہ بعض بعض مسائل خود گھڑ کر ان کو ارسطو کی طرف منسوب کر دیا، اس جعل سازی کے مختلف وجوہ ہین، کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہین، مولوی محمد یونس فرنگی محلی کا خیال بالکل صحیح ہے، کہ اونھون نے اکثر مسلمان فلاسفہ و متکلمین کو دھوکے مین ڈالا، اور انھین کی تصنیفات کی بدولت بعض ایسے مسائل بھی ارسطو کی جانب منسوب کر دئے گئے، جن کا نام و نشان بھی ارسطو کی کتابون مین نہین ملتا،[2] پھر ایسا بھی ہوا ہے کہ افلاطون اور ارسطو چونکہ فلسفے مین اُن کے خدا تھے،[3] لہذا اونھون نے یہ گوارا نہ کیا، کہ ان کے آپس مین کسی قسم کا تضاد پایا جائے، اس تضاد کو رفع کرنے کیلئے اونھون نے تمام زور تخیل خرچ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس شرح و جانبداری کی وجہ سے متن کا حلیہ بگڑ گیا، حاشا کہ اس سے فلسفہ یا فلاسفۂ اسلام کی تنقیص مقصود نہین، اپنا اپنا طریق فکر ہے، اگر ان کو محض شارح ہی سمجھ لیا جائے، تب بھی ان کی عظمت مین کوئی شبہ نہین، مثل مشہور ہے کہ "یک من نقل را دہ من عقل باید" کچھ جوہر تو ان مین تھا، کہ یہ شارح بنے اور ایسے شارح بنے، کہ

---

[1] (Averroes et L'Averroïsme مصنف Renan) ترجمہ انگریزی ص۵۳، [2] ابن رشد ص۲۹۵ سلسلۂ دار المصنفین تفصیل کے لئے دیکھو ص۲۹۴، ص۳۰۲، [3] چنانچہ فارابی نے اپنا رسالہ الجمع بین رأی الحکیمین افلاطون الالٰہی وارسطوطالیس" ان الفاظ مین شروع کیا ہے،: "وکان ھذان الحکیمان ھما مبدعان للفلسفة ومنشأن لاوائلها واصولها ومتممان لاواخرها وفروعها وعلیهما المعول فی قلیلها وکثیرها والیهما المرجع فی یسیرها وخطیرها وما یصدر عنهما فی کل فن انما هو الاصل المعتمد علیه لخلوه من الشوائب والکدر" .. پھر تھوڑی ہی دور آگے چلکر کہتا ہے: "... ھذین الحکیمین انهما المنظوران فیه والامامان فی ھذه الصناعة" جیسا کہ رسالے کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے، اسمین فارابی نے افلاطون اور ارسطو کو متحد الخیال ثابت کرنیکی کوشش کی ہے، جس مین وہ ہمارے نزدیک بالکل ناکام رہا ہے،

یونانی فلسفے کو ابدالآباد تک زندہ رکھے گئے،[۱]

لیکن باینہمہ عظمت واجتہاد تقریبًا تمام فلاسفۂ اسلام اپنی نفسیاتی تعلیمات مین ارسطو سے آگے نہ بڑھ سکے، ان تمام فلاسفہ مین سے ابن سینا غالبًا اکیلا فلسفی ہے جس نے اپنے نفسیاتی عقاید کو باقاعدہ طور پر مرتب رسالون کی شکل مین بیان کیا ہے،[۲] لکھنے کو دیگر فلاسفہ نے بھی نفس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ سب "عقلی نفسیات" ہے، "تجربی نفسیات" نہین، ابن سینا کی خصوصیت یہ ہے، کہ اوس نے ماہیتِ نفس پر نہین، بلکہ اعمال واحوالِ نفس پر بحث کی ہے، لیکن اوس نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہم ارسطو کی کتاب کا اردو ترجمہ پڑھ رہے ہین، مطلب یہ ہے کہ اس نے تجربی نفسیات کی حد تک کوئی نئی بات بیان نہیں کی، اس خصوص مین ہمارے نزدیک "حجتِ خراسانی" حکیم ناصر خسروان سب پر فائق ہے، یہ خیال رہے کہ اس وقت مابعد الطبیعیات کا ذکر نہین، ذکر نفسیات اور بالخصوص تجربی نفسیات کا ہے، اوراق آیندہ مین ہم حکیم ناصر خسرو کے نفسیاتی عقائد کی توضیح کرین گے، اس کے مطالعہ سے قارئین بطور خود ہمارے بیان کی تصدیق یا تکذیب کر سکین گے،

(۳)

نفس مضمون کی طرف رجوع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ بطور تعارف حکیم ناصر خسرو کے سوانح حیات[۳]

۱؎ اس ضمن مین پروفیسر دیبر کا یہ فقرہ بہت پر معنی ہے، کہ "(Al in more learned Than origina)" دیکھو تاریخ فلسفہ، انگریزی ترجمہ ص ۲۱۰ حاشیہ نمبر ۲ ۲؎ ابن سینا کے نفسیاتی عقائد کے لئے دیکھو:- (Z.D.M.G) بابت ۱۸۷۵ء اس مین ڈاکٹر لانڈوئر (Landeur) نے اس کا ایک رسالہ معہ جرمن ترجمہ کے شائع کیا ہے، اس کے علاوہ کتاب النجاۃ، کتاب الشفاء، اور شہرستانی کی ملل والنحل (مطبوعہ یورپ ص ۴۱۳، ۴۲۹) سے تمام مفصل عقائد معلوم ہو سکتے ہین، ہم آج کل "نفسیات ابن سینا" پر ایک مبسوط رسالہ بزبان انگریزی تالیف کر رہے ہین، جو عنقریب شائع ہوگا، ۳؎ حیات ناصر خسرو کے لئے دیکھو:- تاریخ ادبیاتِ ایران مصنفہ براؤن جلد دوم ص ۲۱۸ ومابعد، ریو (Riew) کی (Calalogue of The Pro. Mss. in Br. Museum)

مختصراً بیان کردئے جائین،

ابومعین الدین ناصر خسرو، یا بقول بعض ابومعین ناصر بن خسرو[1]، القبادیانی المروزی جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، قصبہ قبادیان[2] کا رہنے والا تھا، لیکن پروفیسر اتہ کا قول ہے کہ اس کا وطن بلخ تھا[3]، دلیل اس دعویٰ کی اس نے یہ پیش کی ہے، کہ وہ بلخ مین سکونت پذیر رہا، پھر بقول ڈاکٹر براؤن مشہور "غلط نویس" دولت شاہ کے نزدیک اس کا وطن اصفہان تھا[4]، لیکن سفرنامہ کے شروع ہی مین ناصر خسرو خود اپنے آپ کو "قبادیانی" کہتا ہے[5]، اس کے علاوہ ایک رباعی مین وہ اپنے خراسانی الاصل ہونے کو صاف طور پر بیان کرتا ہے،:-

گرچہ مرا اصل خراسانی است — ازپس پیری و مہی و سری،

دوستی عترت و خانۂ رسول — کرد مرا یمگی و مازندری،

(بقیہ حاشیہ ص ۴) پروفیسر اتہ (The Grundriss der Iranischen Philologie) کی یا محمود غنی زادہ کا مقدمہ سفرنامہ مطبوعہ کاویانی، مندرجۂ بالا خاکہ اسی مقدمہ سے ماخوذ ہے، اور غنی زادہ کے نام سے تمام حوالے اسی مقدمہ کے ہین، [1] غنی زادہ ص ح [2] بقول غنی زادہ قبادیان "قصبہ ایست درحوالی مروشاہجہان (یا مرد کلان، دیکھو "جغرافیہ خلافت مشرقی" مصنفہ لی اسٹرینج، مترجمہ محمد جمیل الرحمن صاحب شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ص ۵۱۶) از توابع خراسان" (ص ۵) لیکن پروفیسر براؤن کے نزدیک "یہ ترمذ اور جیحون کے قریب ایک شہر اور چھاونی کا نام ہے" (ادبیات ایران، جلد دوم ص ۲۲۱، حاشیہ) لی اسٹرینج لکھتا ہے "شہر قبادیان اس دریا کے کنارے آباد ہے، جو دریائے وخشاب کے مغرب مین سب سے پہلے دریائے جیحون مین گرا ہے" (ایضاً ص ۶۸۲) اس طرح یہ ترمذ کے قریب مشرق کی طرف واقع ہے، لی اسٹرینج کا بیان براؤن کے بیان کے مطابق ہے، لیکن غنی زادہ کا بیان بھی غلط نہین، وقت صرف یہ ہے کہ مروشاہجہان ترمذ سے اور آگے مغرب کیطرف واقع ہے، لہذا قبادیان کو ترمذ کے قریب کہنا مروشاہجہان کے قریب کہنے کی نسبت زیادہ قرین صداقت ہے[3]، غنی زادہ ص ح، بحوالہ (Grundriss des Iranischen Philologie) ص ۲۸۱ [4] ادبیات ایران ص ۲۲۵، [5] سفرنامہ مطبوعہ کاویانی ص ۱

لہذا پروفیسر اتہ اور دولت شاہ دونون کے بیانات بداہتہً غلط ہین، یہ ۳۹۴ھ مطابق ۱۰۰۴ء مین پیدا ہوا، اس کے تحصیلِ علم کے متعلق ہمین کچھ معلوم[۱] نہین، زاد المسافرین کے مطالعہ سے اتنا البتہ معلوم ہوتا ہے، کہ اوس کو فلسفے کا بہت شوق تھا، اور فلاسفہ یونان، خصوصًا سقراط، افلاطون، اور ارسطو کی اکثر کتابین اس کے مطالعے مین رہتی تھین، اسی ضمن مین یہ بھی بیان کیا جاتا ہو، کہ وہ بو علی سینا[۲] کی صحبت سے بھی مستفید ہوا تھا، لیکن یہ محقق نہین، سفرنامہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ مکہ کی طرف سفر کرنے سے قبل وہ سلیمان جعفر بیگ داؤد بن میکائیل (جو ایران مین سلطنت سلاجقہ کے مؤسس طغرل بیگ کا بھائی تھا) کے زمانہ مین خراسان مین دیوانی کی کسی خدمت پر مامور تھا، اور شہر کے عمائد مین اس کا شمار ہوتا تھا،[۳] اس کے اکثر اشعار سے اندازہ ہوتا ہو، کہ وہ بہت عیش و عشرت اور عزت و احترام کی زندگی بسر کرتا تھا،

اس کا اپنا قول[۴] ہے، کہ ۴۳۷ھ مین جوزجان مین اوس نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص اسکو شراب پینے سے (جس کا وہ بہت عادی تھا) منع کر رہا ہے، ایسی چیز کا شوق دلا رہا ہے، جس سے ہوش و خرد مین ترقی ہو، اور مکہ کی طرف سفر کرنے کی ترغیب دلا رہا ہے، خواب سے بیدار ہونے کے بعد اس نے ہاتھ منہ دھویا، اور جامع مسجد جا کر نماز پڑھی،

---

[۱] واقعہ یہ ہے کہ ناصر خسرو کی شخصیت مختلف افسانون سے اس طرح ڈھکی ہوئی ہے، کہ اوس کے اصلی سوانح کو معلوم کرنا بہت دشوار ہے، ان تمام افسانون کا ماخذ، بقول ڈاکٹر براؤن، ناصر خسرو کی وہ جعلی خود نگاشتہ سوانح عمری ہے، جو اسکے دیوان مطبوعہ تبریز کا مقدمہ ہو، (ادبیات ایران، جلد دوم ص ۲۱۸) ان ہی افسانون مین سے ایک دلچسپ افسانہ القزوینی نے اپنی کتاب آثار البلاد مین یمگان کے ذکر مین بیان کیا ہے، اس مین ناصر خسرو کو بلخ کا بادشاہ بتایا گیا ہو، جسکو اس کی رعایا نے باہر نکال دیا تھا، لہذا اوس نے یمگان مین جا کر پناہ لی یمگان پہنچ کر اوس نے نہایت حیرت انگیز حمام، باغات اور طلسمی بُت بنوائے، یہ بت اس قسم کے تھے، کہ جو انکی طرف دیکھتا تھا اسکی عقل جاتی رہتی تھی، قزوینی کا بیان ہو کہ یہ حمام اسکے وقت تک موجود تھا، چنانچہ اوس نے اسکو بالتفصیل بیان کیا ہو، (صفحہ ...)

[۲] ابو علی حسین بن عبد اللہ ایران اور مسلمانون کا مشہور فلسفی ۳۷۰ھ مین پیدا ہوا، اور ۴۲۸ھ مین انتقال کیا، [۳] سفرنامہ مطبوعہ کاویانی ص ۲

[۴] ایضاً ص ۳ اسی خواب کے بعد اوس نے اپنے آپ کو حکیم کہنا اور کہلوانا شروع کیا، کیونکہ خواب مین اسکو متنبہ کیا گیا تھا کہ جو شخص بے ہوشی و بے خودی پیدا کرنے والی اشیاء کا استعمال نہین کرتا، بلکہ ہوش و خرد کو بڑھانے کی تدابیر کرتا ہے، اوسکو اصلی معنون مین "حکیم" کہنا چاہیے، وہ بھی خواب کے بعد چونکہ شراب سے تائب ہو چکا تھا، لہذا اس تنبیہ کے مطابق وہ بھی اصلی معنون مین حکیم بن گیا تھا،

[redacted]

اور شراب ترک کرنے مین حضرت باری تعالیٰ سے مدد چاہی" اس کے بعد جمعرات کے دن ۶ جمادی الآخری ۴۳۷ھ کو راہ سفر اختیار کی سب سے پہلے وہ مرو گیا، اپنے عہدے سے مستعفی ہوا، اور ۲۲ شعبان ۴۳۷ھ کو مرو سے روانہ ہو کر ۱۱ شوال کو نیشاپور پہنچا، یہان اکیس روز قیام کر کے دوسری ذی القعدہ کو پھر روانہ ہوا، اور سمنان، ری، اور قزوین سے ہوتا ہوا، آذربائیجان آیا، اور تبریز مین قطران شاعر سے ملاقات کی یہان سے براہ مرند و خوی شہروان پہنچا، اور وہان سے براہ اخلاط بطلیس میافارقین آمد، حران، اور سروح شامات مین وارد ہوا، اور ابھی ابوالعلا معری[1] زندہ تھا، کہ معرة النعمان مین داخل ہوا، لیکن ابوالعلار سے ملاقات نہ کی، اوس نے اپنے سفرنامہ مین ابوالعلار کا ذکر خوب پر لطف پیرایے مین کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

"در آن (یعنی معرة النعمان) مردے بود کہ ابوالعلار معری می گفتند، نابینا بود و رئیس شہر او بود، نعمتی بسیار داشت، و بندگان و کارگران فراوان و خود ہمہ شہر او را چون بندگان بودند و خود طریق زہد پیش گرفتہ بود، گلیمے پوشیدہ و در خانہ نشستہ نیم من نان جوین راتبہ کردہ کہ جز ان ہیچ نہ خورد، و من این معنی شنیدم، کہ در سرائے باز نہادہ است و نواب و ملازمان او کار شہر میسازند، مگر بکلیات کہ رجوع باو کنند، و وے نعمت خویش از ہیچ کس دریغ نہ دارد و خود صائم الدہر و قائم اللیل باشد و بہیچ شغل دنیا مشغول نہ شود، و این مرد در شعر و ادب بدرجہ است کہ افاضل شام و مغرب و عراق، مقرند کہ درین عصر کسے بپایہ او نبودہ است، و نیست، و کتابے ساختہ آن را الفصول و الغایات نام نہادہ، و سخنہا آوردہ است مرموز و مثلہا بالفاظ فصیح و عجیب کہ مردم بر ان واقف نمی شوند، مگر بر بعضی اندک، و ان کسے نیز کہ بروے خواند، چنانکہ او را تہمت کردند کہ تو این کتاب را بمعارضۂ قرآن کردی، و پیوستہ زیادت از دویست کس ز اطراف آمدہ باشند و پیش او ادب و شعر خوانند و شنیدم کہ او را زیادت از صد ہزار بیت شعر باشد، کسی از وے پرسید کہ ایزد تبارک و تعالیٰ این ہمہ مال و نعمت ترا دادہ است، چہ سبب است، کہ مردم را می دہی و خویشتن نمی خوری جواب داد کہ مرا بیش ازین نیست کہ می خورم، و چون من آنجا رسیدم این مرد ہنوز زندہ بود"[2]

[1] ابوالعلا احمد بن عبداللہ المعری مشہور و معروف عالم ہے ۳۶۳ھ مین پیدا ہوا، اور ۴۴۹ھ مین انتقال کیا۔ [2] سفرنامہ مطبوعہ کاویانی ص ۱۵-۱۶

معرۃ النعمان سے نکل کر طرابلس وصیدا ہوتا ہوا فلسطین پہونچا، اور ۵ رمضان ۴۳۹ھ کو وارد بیت المقدس ہوا، دو ماہ بعد مکہ گیا، اور حج سے فارغ ہو کر پھر بیت المقدس لوٹ آیا، یہان سے چاہتا تھا، کہ دریا کے راستے سے مصر جائے، لیکن ہوا مخالف تھی، لہذا مجبوراً خشکی کے راستے تونس سے ہوتا ہوا مصر پہنچا، یہان خلیفہ فاطمی المستنصر باللہ برسر حکومت تھا، مصر کی شکوہ وعظمت اور خلیفہ کے دبدبہ واحتشام سے بہت مرعوب ہوا، اسی وقت اور یہین یہ فرقۂ اسماعلیہ مین داخل ہوا، اور عہد کیا کہ ایران جاکر اس کی تبلیغ کریگا،

غرہ ذی القعدہ ۴۳۹ھ کو دوسری مرتبہ بعزم زیارت مکہ مصر سے روانہ ہوا، اور مدینہ کی زیارت سے مشرف ہوا، ۸ ذی الحجہ کو مکہ پہنچا، لیکن چونکہ وہان قحط پھیلا ہوا تھا، لہذا وہان توقف نہ کیا، بلکہ فوراً ہی مصر واپس چلا آیا، اگلے سال یعنی ۴۴۰ھ مین پھر چونکہ قحط تھا، اور خلیفہ نے حاجیون کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا، لہذا قاضی عبداللہ (جو خلیفہ فاطمی کی طرف سے غلاف کعبہ کا حامل تھا،) کے ساتھ اس کو تیسری مرتبہ مکہ جانا پڑا، اس سال بھی یہ فوراً ہی مصر واپس آگیا، اگلے سال ۴۴۱ھ مین اوس نے حج نہ کیا، بلکہ ۱۴ ذی الحجہ کو مصر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہکر ماہ جمادی الاخری چوتھی مرتبہ مکہ پہنچا، اس مرتبہ قریب چھ ماہ یہان مقیم رہا، اور ۴۴۲ھ مین آخری حج کرکے مختلف مقامات سے ہوتا ہوا، ۲۰ شعبان ۴۴۳ھ کو بصرہ مین آیا، دو ماہ یہان قیام کرکے پھر اسی طرح سیاحت کرتا ہوا، ۸ صفر ۴۴۴ھ کو اصفہان مین وارد ہوا، بیس دن یہان ٹھہرا، اور پھر اور شہرون کی سیر کرتا ہوا، ۲۶ جمادی الاخری ۴۴۴ھ کو اپنے بھائی ابوسعید کے ہمراہ بلخ پہنچا، اور اپنے دوسرے بھائی ابوالفتح عبدالجلیل سے آملا، اس طرح اوس نے پورے سات سال سیروسیاحت مین بسر کئے ہین[۱]

[۱] یہان اس نظریے کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا، جس کو ڈاکٹر ریو (Rieu) جیسے فاضل نے پیش کیا ہے، اور جس کو پرتش (Pertsch) اور فاگنان (Fagnan) کی تائید حاصل ہے، اس کے مطابق ناصر خسرو دو تھے، اور ان دونون کی کنیت ابومعین تھی، ان مین سے ایک شاعر فلسفی اور ساحر تھا اور دوسرا سیاح لیکن شفر (Schefer) اور آتہ کی تحقیق کی روشنی مین یہ نظریہ (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۴ پر)

اس ہفت سالہ سیر و سیاحت میں، بقول غنی زادہ، ناصر خسرو نے "فوق العادۃ" تکالیف اوٹھائیں، چنانچہ اکثر اوس نے "بے آب و علف" بیابانوں میں "اعراب بادیہ نشین" کے درمیان نہایت خطرے میں زندگی بسر کی ہے، ایک مرتبہ تو اوس کو فلج نام ایک مقام پر چار ۴ ماہ قیام کرنا پڑا، یہ مقام ایک بیابان کے وسط میں اس طرح واقع تھا کہ چاروں طرف دو دو فرسنگ تک آبادی کا نام نہ تھا، اس تمام مدت میں اوس نے کھجوریں کھا کھا کر اپنی زندگی کے دن پورے کئے، پھر اس کو ایسے راستے طے کرنے پڑے ہیں، کہ جہاں کے باشندے سالوں پانی کی شکل تک نہیں دیکھتے اسی ہیئت غربی و مفلسی میں وہ بصرہ پہنچا، بصرہ پہنچنے کے وقت جو حالت اس کی تھی، اوس کو اوس نے اپنے سفرنامہ میں بڑے مزے سے بیان کیا ہے[1]

ان تمام تکالیف و مصائب اور تنگی و ترشی کا اثر ناصر خسرو پر یہ ہوا کہ اس کے مزاج میں انتہا درجے کی غربی پیدا ہوگئی، اوس نے تمام دنیا سے قطع تعلق کیا اور بقیہ عمر مذہبی مجادلات کے لئے وقف کردی، اسی زمانہ میں وہ مصر کے خلفائے فاطمیہ کا "داعی و مبلغ آتشین" رہا، لیکن عجیب بات یہ ہے، کہ اوس نے اپنی کسی تصنیف میں بھی اپنے آپ کو "اسماعیلی" نہیں کہا[2]، بلکہ ہر جگہ فاطمی حجت مستنصری، حجت خراسانی یا محض "حجت" کہتا ہے، اوس کے دیوان میں اکثر اشعار اس کی تائید میں ہیں،

لیکن مصر سے واپسی کے بعد جن خیالات کی تبلیغ ناصر خسرو نے کی وہ "عقائد طائفہ اہل سنت" کے منافی تھے اس کے علاوہ امرائے خراسان بھی، کم از کم ظاہراً، خلفائے بغداد کی متابعت کرتے تھے، اور اپنے آپ کو "مولی امیر المومنین" کہتے تھے، لہذا ناصر خسرو کی یہ تبلیغ کسی کو بھی خوش نہ آئی، پھر ان کو یہ بھی اندیشہ ہوا، کہ کہیں ایسا نہ ہو، کہ اس طرح مصر کے خلفائے فاطمیہ کا اثر و نفوذ یہاں زیادہ ہو جائے، نتیجہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۳) قابل قبول نہیں تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد دوم ص ۲۲۴ و ۲۲۵) [1] سفرنامہ ص ۱۲۹،

[2] غالباً یہی وجہ ہی کہ ڈاکٹر رحمان زاد المسافرین کے مقدمہ میں یہ فقرہ لکھ گئے، کہ "در ے اینکہ او از طائفہ شیعہ اسماعیلیہ و مبلغین آنہا بود یا نہ یکے از مشکلات نیست کہ حل آن چندان آسان نیست" ص ج،

اس سب کا یہی ہونا چاہیئے تھا، کہ ناصر خسرو اپنا گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوا، یعنی اوس کو جلاوطن کیا گیا، چنانچہ خود لکھتا ہے:۔

"......... جہاں امت کہ ما را بدین خوانند و بر ما غلبہ کردند و از مسکن و شہر خویش ما را براندند[۹]....."

ایک خیال یہ ہے کہ یہ سب کچھ خلیفہ بغداد کے حکم سے ہوا، چنانچہ اس کے بعض اشعار مین بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہی، علامہ غنی زادہ کی تحقیق یہ ہے، اور اس طرف فضلائے فرنگی مین سے کسی کا ذہن بھی منتقل نہ ہوا کہ خراسان سے جلاوطن ہوجانیکے بعد وہ مدت تک مازندران مین رہا،[۱۰]

ناصر خسرو کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف آرا ہے، اس کے متعلق جو افسانے زبان زد عوام ہین، ان کے مطابق اس کی عمر ۱۴۰ سال کی ہوئی، اور مرنے کے بعد جنون نے اسکو دفن کیا[۱۱]، لیکن تقویم التواریخ کے مطابق اس نے ۴۸۱ھ مین انتقال کیا، علامہ غنی زادہ اس سے بھی متفق نہین،

اس کے مصنفات مین سے جن کتابون کے نام ہم تک پہنچے ہین، وہ حسب ذیل ہین:۔ سفرنامہ، روشنائی نامہ، سعادت نامہ، زاد المسافرین، دیوان اشعار، وجہ دین، بستان العقول، خوان اخوان، دلیل المتحیرین، ان کے علاوہ بعض تذکرہ نویسون نے منطق اور بقول صاحب آتشکدہ فلسفہ کی کتاب اکسیر اعظم، سحر اور علم فوق العادۃ کی کتاب قانون اعظم، فقہ کی کتاب المستوفی، علم یونان کی ایک کتاب دستور اعظم، ایک رسالہ کنز الحقائق، اور ملاحدہ باطنیہ کے نقطہ نظر سے ایک تفسیر القرآن کا بھی ذکر کیا ہی، لیکن آج تک ان مین سے کوئی بھی ہمارے ہاتھ نہین لگی، معلوم مصنفات مین سفرنامہ، روشنائی نامہ، سعادتنامہ اور زاد المسافرین کو مطبع کاویانی جرمنی نے شائع کیا ہی،

اس تعارف کے بعد اب ہم اپنے نفس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہین: ناصر خسرو نے اپنے فلسفیانہ عقائد کو زاد المسافرین مین بہت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہی، ہم نے بھی اس کے نفسیاتی عقائد کے متعلق جو کچھ لکھا ہی، وہ اسی سے ماخوذ ہے، یہ کتاب باعتبار حجم اس کی تمام مصنفات مین سے سب سے بڑی ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ بلحاظ مضمون بھی وہ اسکو

[۹] زاد المسافرین مطبوعہ کاویانی ۱۲۷۹، [۱۰] ص ۲۰، [۱۱] تاریخ ادبیات ایران مصنفہ براؤن جلد دوم ص ۲۱۸،

سب پر فائق سمجھتا تھا، چنانچہ اس کے متعلق لکھتا ہے،[۵۱]

ز تصنیفات من زاد المسافر | کہ معقولات را اصل ست و قانون
اگر بر خاکِ افلاطون بخوانند | ثنا خواند مرا خاکِ فلاطون

یہ کتاب اوس نے ۴۵۳ھ[۵۲] میں خلیفہ فاطمی المستنصر باللہ کے نام سے تصنیف کیا تھی[۵۳] مقصود اس تصنیف کا خ

مصنف کے الفاظ میں یہ ہی:-

"...... پیش از آنکہ بقولے رسیم کہ مقصود ما از تالیف این کتاب آنست و آن مقصود بیان است از آنکہ نفس

چرا بر مثال مسافر است، اندرین عالم و از کجا ہمی آید و کجا ہمی شود، و اندرین سفر زاد او چیست"[۵۴]

اس کو برادر معظم ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن ایم اے پی ایچ ڈی (کینٹب) حال پرنسپل اسمٰعیل کالج اندھیری (بم

کی تصحیح و تحشیہ کے بعد مطبع کاویانی برلین نے ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں شائع کیا، اوراقِ آیندہ کی تدوین کے و

یہی نسخہ راقم کے پیش نظر رہا ہی،

(۴)

زاد المسافرین میں حکیم ناصر خسرو نے اپنے نفسیاتی عقاید کو یکجا اور مسلسل طور پر بیان نہیں کیا، اس کے مض

کی ترتیب اس کی فلسفیانہ تعلیم کے مطابق ہی، لہذا جو خاکہ اس نے اپنے ذہن میں اپنے فلسفہ کا قائم کیا ہی اس ک

جوبات جہان موزون معلوم ہوئی، بیان کردی گئی ہی نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کتاب میں تسلسل اور مضامین و مباحث م

منطقی تعاقب تو پیدا ہو گیا لیکن کسی خاص مبحث کے متعلق اس کے خیالات کو دریافت کرنے کیلئے تمام کتاب کی و

گردانی لازمی ہو گئی لیکن چونکہ دماغ سلجھا ہوا، عقیدہ پختہ اور خیالات میں منطقی ربط ہے، لہذا کتاب کے مختلف صفحات

بلا خیال تقدیم و تاخیر جو کچھ بھی یکجا جمع کر لیا جائے، اسمیں نہ تو تضاد پایا جاتا ہی، نہ خیالات کے تسلسل میں انقطاع اس کی

[۵۱] دیوان مطبوعہ طہران ص ۳۰۳ [۵۲] زاد المسافرین، ص ۲۸۰، [۵۳] ایضاً مقدمہ ص ز ح، [۵۴] ایضاً ص ۳۱۱ اسی مناسبت
اس نے اس کا نام زاد المسافرین رکھا ہی،

تعلیمات کے لئے بھی ہم کو یہی کرنا پڑا ہے، کہ مختلف مقامات سے اس کے خیالات کو منتزع کرکے اُن کو ترتیب دیا ہے، اور ایک خاص سلسلے مین ان کو بیان کیا ہے، لہذا یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اوراقِ آیندہ مین مضامین و مباحث کا جو سلسلہ ہم نے قائم کیا ہی، وہ اصل کتاب سے بالکل مختلف ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے، کہ ہمارے نزدیک ہمارے اختیار کردہ سلسلے سے اس کے نفسیاتی عقائد سہولت کے ساتھ اور واضح طور پر ذہن نشین ہوتے ہین، اور مصنف کے اجتہادِ فکر کا سب سے زیادہ بین ثبوت مہیا کرتے ہین، ہم سب سے پہلے ماہیتِ نفس کو لیتے ہین،

حکیم ناصر خسرو نے نفس کی تعریف اس طرح کی ہے، کہ یہ ایک جوہر ہے کہ جسمین حرکت مطلق ہوتی ہے، جو بذاتِ خود زندہ ہے، صورتون کا مکان ہے، دانش پذیر ہے، جسم کی فنا کے بعد بھی بذاتِ خود قائم رہتا ہے" خداوند علیم" ہے اور جسم نہین[1] اسکا کوئی مکان نہین[2] اور اسکا علم ہمکو بلا واسطہ نہین ہوتا بلکہ اسکے افعال کے ظہور کی وساطت سے ہوتا ہی[3]

اپنی اس تعریف کو اوس نے ماہیتِ نفس کے متعلق مروجہ نظریہ کا ابطال کرکے ثابت کیا ہی، ماہیتِ نفس کے متعلق مروجہ نظریہ[4] تھا کہ نفس کوئی ایسی چیز نہین، جو بذاتِ خود قائم ہو، یہ دراصل اعتدالِ مزاج کا دوسرا نام ہے، اسی اعتدال کی وجہ سے جسم حیوانی زندہ ہے، اور اسی کی بدولت اس سے افعال صادر ہوتے ہین، ثبوت اس نظریہ کا یہ دیا جاتا ہی، کہ جب دیوانگی، بیماری، یا مستی" کی وجہ سے اعتدال باقی نہین رہتا، تو تمام افعال ناقص ہو جاتے ہین، اور جانی اور پہچانی ہوئی چیزون کو نہ وہ جان سکتا ہی، نہ پہچان سکتا ہے، اس کا مطلب صریحاً یہی ہے، کہ چونکہ اعتدال کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے علم و عمل دونون بگڑ جاتے ہین، لہذا ان دونون مین ربط علیت ہی، اس کے علاوہ جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ اعتدال مین ذرا سے فتور ہی سے علم و عمل دونون مین کچھ نہ کچھ فتور واقع ہو جاتا ہی، تو نتیجہ نکالا جا سکتا ہی، کہ جب جسم مین انحلال واقع ہوگا، اور

---

[1] زاد المسافرین ص۲۱، ص۴۱-۴۲-۴۳، ص۴۴، ص۵۵، [2] ایضاً ص۲۷۳، [3] ایضاً ص۲۲۴، [4] ناصر خسرو نے بیان نہین کیا، کہ یہ کس خاص فلسفی کا نظریہ ہے، صرف اتنا لکھا ہے، کہ "گروہے از ضعفائے خلق کہ رنج آموختنِ علم توانستند کشیدن، و لطائفِ مر الصورت خویش توانستند کردن، گفتند ....."، ص ۵۸

معارف:- یہ اطبائے طبِ یونانی کا نظریہ ہے،

یہ بھی ہو جائے گا تو علم و عمل دونوں کلیۃً مفقود ہو جائیں گے اس طرح ثابت ہوا، کہ حیوانات کا علم و عمل اعتدال مزاج کا نتیجہ ہے، اور اعتدال کے ختم ہوتے ہی ان دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اسی کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ جسم کے فنا ہو جانے کے ساتھ ہی نفس بھی فنا ہو جاتا ہے، بالفاظ دگر نفس قائم بذات خود نہیں، بلکہ اپنے قیام کے لئے جسم کا محتاج ہے[۱]

اس نظریہ میں بہت سی باتیں قابل غور ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اعتدال مزاج کسے کہتے ہیں، ؟ ظاہر ہے کہ اس کی تعریف سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی، کہ ایک جسم کے اجزاء مرکبہ علی السویہ ہوں، جسم چونکہ "آب و باد و خاک و آتش" سے مرکب ہے، لہذا اس تعریف کے مطابق اعتدال اس وقت قائم ہوگا، جب یہ چاروں ایک دوسرے کے برابر ہوں، اور کوئی بھی کسی سے کم نہ ہو، اب چونکہ تمام حیوانات بشمول انسان میں علم و عمل ہوتا ہے، لہذا ان سب کے اجسام میں اعتدال کا ہونا ضروری ہے یعنی لازمی ہے، کہ ان سب میں یہ چاروں عناصر ایک دوسرے کے برابر ہوں، اگر یہی صورت ہے، تو ہونا یہ چاہئے تھا، کہ ان سب کا مزاج بالکل ایک ہی سا ہو، اور اس لئے ان سب کا علم و عمل بھی ایک ہی نہج پر ہو لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ نہ تو ان سب کا مزاج ایک ہی سا ہوتا ہے اور نہ ان کا علم و عمل ہی ایک نہج پر ہوتا ہے، انسانوں ہی میں کسی کے مزاج میں گرمی و خشکی کا غلبہ ہوتا ہے، اور کسی کے مزاج میں سردی و تری کا ہم کو یہ بھی معلوم ہے، کہ مزاج کا یہ اختلاف ان ہی عناصر کی کمی و بیشی کا نتیجہ ہوتا ہے، لہذا ظاہر ہے کہ انسانوں کے مزاج میں اعتدال نہیں پایا جاتا، یہی حال اعلیٰ اور ادنے درجے کے حیوانات کا ہے، چنانچہ بعض حیوانات برف میں پیدا ہوتے ہیں اور بعض آگ میں بعض ہوا میں زندہ رہتے ہیں، اور پانی میں مر جاتے ہیں اور بالعکس بعض پانی میں زندہ رہتے ہیں، اور ہوا میں مر جاتے ہیں، وقس علی ہذا یعنی ان کے اجسام میں بھی اعتدال عناصر نہیں ہوتا، نظریہ زیر تنقید کے مطابق اعتدال ہی ان کو زندہ رکھنے والا ہے، اور وہ اسی اعتدال پر ان کا علم و عمل موقوف ہوتا ہے، اور یہ اعتدال، جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہے، غیر موجود ہے، لہذا یہ حیوانات نہ تو زندہ رہنے چاہئیں، اور نہ ان میں علم و عمل ہونا چاہئے لیکن باوجود اس

---

[۱] زاد المسافرین ص ۵۰۱،

عدم اعتدال کے زندہ بھی رہتے ہیں، اوران میں علم وعمل بھی ہوتا ہے، نتیجہ بداہتہً یہ ہے کہ ان کو زندہ رکھنے، اوران میں علم وعمل پیدا کرنے کیلئے اعتدال مزاج کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کیلئے کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے، یہ اجسام چونکہ نفس کی وجہ سے ذی حیات بنتے ہیں، اور اسی سے ان میں علم وعمل پیدا ہوتا ہے، لہذا نفس اعتدال مزاج کا ہم معنیٰ نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ اعتدال مزاج حیوانات کو زندہ رکھنے والا ہے، اور یہ ہر حیوان میں پایا جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ اعتدال مزاج عرض ہوگا، نہ کہ جوہر، اگر یہ نظریہ صحیح ہے، تو صورت حال یہ ہوئی کہ عرض جوہر کو زندہ رکھنے والا ہے، اور حرکت دینے والا ہے، اگر ایسا ہے، تو عرض جوہر ہے، اور جوہر عرض لیکن یہ غلط اور محال ہے، لہذا ثابت ہوا کہ نفس اعتدال طبائع نہیں[1]،

دوسری قابل غور بات یہ ہے، کہ اس نظریے کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا گیا ہے، کہ جب دیوانگی، بیماری یا مستی کی وجہ سے اعتدال میں فساد واقع ہوتا ہے، تو علم ناقص ہوجاتا ہے، لیکن اس ثبوت کو پیش کرتے وقت یہ واقعہ نظرانداز کردیا گیا ہے، کہ صحت وہوش کے عود کرآنے سے جب اعتدال دوبارہ قائم ہوجاتا ہے، تو غائب شدہ علم بھی عود کرآتا ہے، اور ناقص علم کا نقص رفع ہوجاتا ہے، اب اگر ہم اعتدال کو نفس کا ہم معنی، اور اس لئے "مَدار وَ مدِعلم" فرض کرلیں، تو پھر صحت وہوش کے عود کرآنے کے وقت صورت حال کچھ ایسی ہوگی :- اعتدال خراب ہوجانے کا مطلب یہ ہے، کہ طبائع حیوانی کے عناصر میں سے بعض فاسد ہوگئے ہیں، لہذا جو عناصر کہ صحیح وسالم رہے، وہ اس اعتدال کے بگڑجانے کی وجہ سے بے علم ہوگئے، صحت وہوش کے عود کرآنے سے اعتدال دوبارہ قائم ہوجانے کا مطلب صرف اسی قدر ہوسکتا ہے، کہ فاسد عناصر کی جگہ نئے عناصر پیدا ہوگئے، یہ نئے عناصر ان عناصر کے علم سے بداہتہً بے خبر ہیں، جو فاسد ہوگئے تھے، اس سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ پہلے اعتدال کے وقت جو علم موجود تھا، وہ نئے اعتدال کے وقت نہ ہونا چاہئے، لیکن ہمارا تجربہ ومشاہدہ اس کے خلاف ہے، یعنی بیمار شخص اپنی بیماری سے صحت پانے کے بعد اپنے گذشتہ علم کو بجنسہٖ پالیتا ہے، یہی حالت دیوانہ ومست کی ہوتی ہے، ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھنے سے ظاہر ہے، کہ ہم اعتدال کو نفس نہیں کہہ سکتے،

[1] زادالمسافرین ص ۵۹، ۶۰

صرف اتنا البتہ کہہ سکتے ہیں، کہ اعتدال نفس کا ایک خادم ہے، اور یہ تمام علم اعتدال میں نہیں، بلکہ نفس میں تھا، اور یہی نفس معقول و مصنوع کی تمام لطیف صورتوں کا معدن ہی، اس لحاظ سے اعتدال کے بگڑ جانے سے علم کا ناقص یا غائب ہو جانا، اور اعتدال کے دوبارہ قائم ہو جانے سے علم کا عود کر آنا ایسا ہی ہے، جیسا کہ ہمارا کوئی خادم بیمار ہو جاتا ہے، تو جو کام کہ اس کے تفویض ہی، وہ ناقص یا ختم ہو جاتا ہے اور اس خادم کے تندرست ہو جانے کے بعد وہ خاص کام پھر ٹھیک ہونے لگتا ہے، یہ امر تو ثابت شدہ ہے، کہ نفس اپنے معلومات کو کسی وجہ سے گم کر دینے کے بعد دوبارہ حاصل کر لیتا ہے یہی امر اس حقیقت پر دال ہے کہ بیماری وغیرہ کی وجہ سے ذاتِ نفس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ اگر یہ خلل واقع ہوتا تو گم شدہ علم ہمیشہ کیلئے تباہ ہو جاتا، اب بیماری ایک درجے کی موت ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ موت سے بھی نفس کا علم تباہ نہیں ہوتا یعنی یہ کہ نفس میں کوئی فساد نہیں ہوتا، اس کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ فسادِ جسم سے ذاتِ نفس میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا نفس بذاتِ خود قائم ہے، اور اعتدال کا ہم معنی نہیں[۵۱]

پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہی، کہ جسم حیوان میں برابر تحلیل جاری رہتی ہے، اسی وجہ سے سیری کے بعد بھوک لگتی ہے پس ایک ایسی چیز کہ جس کے اجزا برابر کم ہوتے رہیں کس طرح معتدل رہ سکتی ہے، لیکن دہری کہتا ہے کہ جو اعتدال جسم حیوانی میں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ تحلیل ہی سے پیدا ہوتا ہے، اب اگر ایسا ہی، تو لازم آتا ہے کہ کبھی تو حیوان میں زندگی کم ہو، اور کبھی زیادہ اور یہ محال ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ بھوک کے وقت جو حالت انسان کی ہوتی ہے، وہ اس حالت سے مختلف ہوتی ہے، جو سیری کے وقت اس کی ہوتی ہے، اب اگر حالتِ سیری حالتِ اعتدال ہے، تو حالتِ گرسنگی لازماً حالتِ عدم اعتدال ہوگی، اب چونکہ اعتدال ہی سے حیوانات کی زندگی قائم رہتی ہے، لہذا بحالتِ سیری تو ان میں زندگی ہوگی، اور بحالتِ گرسنگی عدم زندگی یعنی بھوک کی حالت میں وہ حیوان مردہ ہوگا، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ حیوان بھوک کی حالت میں زندہ رہتا ہی، لہذا ثابت ہوا کہ نفس اعتدالِ طبائع کا دوسرا نام نہیں[۵۲]

اسی سلسلے میں ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے، اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ اعتدالِ طبائع ہی نفس ہے، تو ایک سوال

[۵۱] زاد المسافرین ص ۶۱، [۵۲] ایضاً ص ۶۲،

یہ پیدا ہوتا ہے، کہ آخر وہ کون سی چیز ہے کہ جو اجزائے طبائع کو اس طرح برابر کر دیتی ہے کہ وہ معتدل ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے کل سے بھی جُدا نہیں ہوتے؟ جواباً اگر کہا جائے کہ یہ اجزائے طبائع خود بخود جُدا ہو جاتے ہیں، اور پھر خود بخود ہی ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں، تو پھر ہونا یہ چاہئے کہ تمام طبائع فی الجملہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں، کیونکہ یہ تمام اجزار کلیات میں سے ہیں، اور کل جسم خود اپنے اجزار کے سوا اور کیا ہے،؟ لیکن فی الواقع ہوتا یہ ہے کہ کل طبائع میں سے بعض اجزا، تو مل جاتے ہیں، اور بعض بدستور جُدا رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اجزار کو ملانے والی کوئی اور قوت ہے۔ توضیح اس کی یوں کی جاسکتی ہو کہ سب جانتے ہیں کہ آدمی کی صورت نطفہ ہی میں بن جاتی ہے، اور نطفہ مفعول ہے، اب ہر مفعول کیلئے اس کی اپنی ذات کے علاوہ کسی اور ذاتِ فاعل کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ یہ محال ہے، کہ ایک ہی ذات خود اپنی ہی فاعل ہو اس وجہ سے کہ اس طرح جو چیز کہ زمانۂ آیندہ میں آنے والی ہے، وہ اپنے وجود سے قبل موجود ہو جاتی ہے یعنی ایک ہی چیز موجود بھی ہو جاتی ہے اور معدوم بھی، جو بداہتہً محال ہے، پس واجب ہو کہ نطفہ میں ایک ایسی قوت ہے، جو ذاتِ نطفہ کے ہر جزو کی نگہداشت کرے، اوسکو ایک خاص صورت دے، اور ایک موزوں مقام میں اوسکو جگہ دے کہ اس کے لائق غذا مہیا کرے، اور اس طرح اس کو زندہ رکھے، دوسرے الفاظ میں یہ قوت جسم نہ ہوگی، بلکہ اس جسم (نطفہ) کی نگہبان اور صورت گر ہوگی، اس دعوی پر دلیل یہ لائی جاسکتی ہے، کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ نطفہ بذاتِ خود اپنی ذات کا صورت گر ہے، کیونکہ یہ ایک ہی جوہر کے اجزار سے مرکب ہی، اور ان میں سے کوئی بھی جزو اس قابل نہیں کہ دوسرے باقیماندہ اجزار کی صورت گری کر سکے، پھر یہ بھی روا نہیں کہ اس کے تمام اجزار خود اپنی ذات کے لئے فاعل بھی ہوں اور منفعل بھی، کیونکہ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے، یہ محال ہے، ماحصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ تمام کا تمام نطفہ مفعول اور صورت پذیر ہے، اسی سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، کہ نطفہ میں کوئی ایسی چیز لازمی ہے، جو اس کے لئے فاعل اور صورت گر ہے، اور اسی سے یہ بھی لازم آتا ہے، کہ یہ چیز جسم نہ ہوگی، کیونکہ اگر یہ جسم ہے تو یہ اسی نطفہ کا ایک جزو ہے، اور اس لئے مفعول ہے، اس طرح آخری نتیجہ یہ ہے کہ نطفہ میں جو صورت گر ہے، وہ جسم تو نہیں لیکن جوہر ضرور ہے، کیونکہ عرض جسم میں کوئی صورت پیدا ہو نہیں کر سکتا، اس وجہ سے کہ عرض قائم بالذات نہیں ہوتا، اور جو چیز کہ قائم بالذات نہیں، اس کا کوئی فعل نہیں ہوتا

لیکن جو چیز کہ نطفہ کو صورت دیتی ہے اس کا فعل ہوتا ہے، لہذا یہ عرض نہین، اور چونکہ یہ عرض نہین لہذا یہ لازمًا جوہر ہے، اگر مندرجۂ بالا بیانات سے معترض کو تشفی نہ ہوتی ہو یعنی اوس کو شبہہ ہو کہ انسان یا دیگر حیوانات کے نطفہ مین ایک جوہر ایسا ہوتا ہے جو اس نطفہ کو صورت دیتا ہے، اوسکی نگہداشت کرتا ہے، اسکی غذا مہیا کرتا ہے، اور اس کو زندہ رکھتا ہے، تو اوس کو چاہیے کہ نباتات کے بیجون اور اُن کی جڑون پر غور کرے، کیونکہ ان مین بھی اسی قسم کی قوت ہوتی ہے، اور اُن مین یہ قوت ایک جوہر ہے، جو اُس جسم کو صُورت دیتا ہے، جس کے ساتھ وہ پیوست ہے۔[1]

اس طرح یہ ثابت ہوا کہ حیوانات کے نطفہ مین یا نباتات کے بیجون اور اُن کی جڑون مین ایک جوہر ہوتا ہے، اسی جوہر کو ہم نفس کہتے ہین۔ یہ جوہر یعنی نفس ابداعی ہوتا ہے۔[2] اب جو چیز کہ ابداعی ہوتی ہے، وہ کسی اور چیز کا جزو نہین ہوتی، اور اس کی قوت بھی مُتناہی نہین ہوتی، اس کا ثبوت بھی نطفہ اور بیجون پر غور کرنے سے ملتا ہے، ان دونون مین یہ قوت بے نہایت ہوتی ہے، چنانچہ گندم کے ایک دانہ سے اتنی گندم پیدا ہوتی ہے، کہ اوس سے زمین اور آسمان پُر ہو سکتے ہین، اور اس تمام گندم کے ہر دانے مین وہی قوت ہوتی ہے، جو اس پہلے دانے مین تھی، جس سے کہ یہ سب گندم پیدا ہوئی، اب اگر نفس اعتدال ہے اور اعتدال نہ گرم ہوتا ہے نہ سرد، نہ تر ہوتا ہے، نہ خشک نہ گران ہوتا ہے نہ سبک، تو ظاہر ہے، کہ جانورون مین اعتدال نہین ہوتا، کیونکہ ان سب کا حال جُدا جُدا ہے، لہذا اُن مین نفس بھی نہین ہوتا، اور اگر ان مین نفس نہین ہوتا، تو ان مین یہ جوہر ابداعی بھی نہین ہوتا لیکن یہ سب خلاف واقعہ ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو ان مین توالد و تناسل بھی نہ ہوتا،[3]

اس نظریۂ اعتدال مین اس پر بھی غور نہین کیا گیا کہ اگر جانورون کے طبائع متکافی الاجزاء ہوتے، تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ

---

[1] زاد المسافرین ص۲۴۰، [2] دیکھو ص۲۹۵ جہان ناصر خسرو نے تفصیل کے ساتھ نفس کے جوہر ابداعی ہونے کو ثابت کیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے، کہ اس صفحہ پر جو بحث ناصر خسرو نے نفس کے جوہر ابداعی ہونے کے متعلق کی ہے، اس مین نفس مطلق (تعریف کیلئے دیکھو ص۲۲۹) کو نہین، بلکہ نفس ناطقہ کو جوہر ابداعی کہا ہے، حالانکہ اوپر جو بحث ماہیت نفس کے متعلق ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ صرف نفس ناطقہ نہین بلکہ نفس مطلق جوہر ابداعی ہے، [3] ایضًا ص۲۴۲،

وہ نہ زمین پر ہوتے، نہ آسمان پر، اُن کو نہ تو خاک پر قرار آنا چاہئے تھا، نہ پانی میں، نہ آگ میں، نہ ہوا میں، کیونکہ ان عناصر میں سے ہر ایک کی طبیعت اعتدال کے منافی ہے، لیکن خود ہمارا یہ حال ہے کہ ہم خاک پر رہتے ہیں، اس کا مطلب صریحاً یہ ہے کہ ہم میں اجزائے خاکی کا غلبہ ہے، یعنی ہم میں اعتدال نہیں، پھر اگر جانوروں کے طبائع متکافی الاجزا ہوتے تو اُن میں سے بخارات بھی خارج نہ ہونے چاہئے تھے، کیونکہ بخارات صرف اس وقت پیدا ہوتے ہیں، جب پانی پر آگ کا غلبہ ہو جاتا ہے، یہی اس بات کی دلیل ہے، کہ اُن کے مزاج میں گرمی تری پر غالب ہے، اس حالت میں ان میں اعتدال کس طرح قائم رہ سکتا ہے، اسی طرح اگر نفس اعتدال ہے، تو اور جانوروں کے طبائع متکافی الاجزاء ہیں، تو پھر حیوانات محض چھونے سے گرم کیوں ہو جاتے ہیں، ؟ کیا وجہ ہے کہ زمین تو ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اور ہوا، آگ اور پانی اُن کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے، ؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان میں بادی اور آتشی اجزاء تو کم ہیں اور آبی اور خاکی اجزاء زیادہ ؟ اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے، تو یہ معتدل اور ان کے طبائع کے اجزاء متکافی کس طرح ہو سکتے ہیں، ؟ لہذا معلوم ہوا کہ نفس اعتدال نہیں، ان تمام باتوں کے علاوہ اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اگر نفس اعتدال ہے، اور ہر جانور (بشمول انسان) کی طبیعت معتدل ہے، تو حالت یہ ہے کہ انسان تو بات کرنے والا اور عقلمند ہے لیکن دوسرے جانوروں میں بات کرنے کی قابلیت ہے اور نہ ان میں عقل ہے، اگر نفس اعتدال ہوتا، تو ہر جانور میں بلا امتیاز یہ صفات پائی جانی چاہئے تھیں، اب اگر بات کرنے والے اور عقلمند جانور (انسان) کی طبیعت کو معتدل کہا جائے تو ظاہر ہے کہ بے سخن اور بے عقل حیوان کی طبیعت معتدل نہیں ہو سکتی، لیکن حالت یہ ہے کہ معتدل اور غیر معتدل دونوں طبیعت والے جانور زندہ ہیں، لہذا ظاہر ہے کہ ان کو زندہ رکھنے والا اعتدال نہیں، بلکہ کوئی اور چیز ہے یہی کوئی اور چیز نفس ہے[۵]

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جسم حیوانی میں کوئی مخصوص جگہ ایسی نہیں، جسے طبیعت کا ظرف، یا مستقر کہا جا سکے، یہ اس کے تمام جسم میں پراگندہ ہوتی ہے، کسی جگہ گرمی زیادہ ہوتی ہے، مثلاً دل میں کہ معدن حرارت جسمانی ہے، کسی

[۵] زاد المسافرین ص ۶۵، ۶۶

جگہ سردی کا غلبہ ہوتا ہے، مثلاً انگلیون کے سرون پر جہان سردی کی وجہ سے ناخن سخت ہوگئے ہین، کسی جگہ تری غالب ہوتی ہے، مثلاً معدے مین جہان ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے کسی جگہ خشکی کی زیادتی ہے، مثلاً ہڈیون مین اب قابل غور بات یہ ہے کہ جس جسم کی ترکیب اس قدر متفاوت ہو، اور جس کے طبائع کے اجزا اس قدر مختلف و متفرق ہون، اس کو معتدل کہنا کہان تک صحیح ہو سکتا ہے، پھر چونکہ تمام جسم حیوانی مین یہ طبائع پیدا ہوتے ہین، اور تحلیل کی وجہ سے یہ مٹ بھی جاتے ہین لہذا ظاہر ہے کہ کوئی چیز ہونی چاہیئے، جو ان طبائع کی ترکیب و تقسیم کرے خود طبائع کا ایک جزو تقسیم کرنے کا اتنا ہی کم اہل ہے جتنا کہ اس تقسیم کو قبول کرنے کا، اس کے علاوہ یہ بھی محال ہے، کہ قاسم و مقسوم ایک ہی جوہر سے ہون، اگر کہا جائے کہ گرمی وہ چیز ہے، جو ان طبائع کو تمام جسم مین تقسیم کرتی ہے، تو سوال ہوتا ہے کہ گرمی کو کون سی چیز تقسیم کرتی ہے، ؟ وقس علیٰ ہذا، مختصر یہ کہ اس طرح پھر لازم آتا ہے، کہ ایک ہی جسم بالذات، فاعل بھی ہو، اور مفعول بھی، اور ہم اوپر دیکھ چکے ہین، کہ یہ محال ہے، نتیجہ یہ کہ کوئی چیز ہے، جو ان طبائع کو تقسیم و ترکیب کرتی ہے، اور یہ چیز طبائع کے علاوہ کوئی اور جوہر ہے، اس وجہ سے کہ جسم کے اندر طبائع تو مفعول ہے، لہذا کسی وقت ہو سکتا ہے، کہ یہ جوہر جسم سے خارج ہو جائے، اور اس طرح یہ طبائع پراگندہ ہو جائین[1]

یہان تک جو گفتگو نفس کے متعلق ہوئی ہے، اس سے بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، کہ نفس اعتدال طبائع نہین، اب ثبوت طلب امر یہ ہے کہ زندگی ہمارے اجسام کے لئے عرضی ہے، عرضی وہ چیز ہوتی ہے، جو کبھی تو ایک چیز مین موجود ہو، اور کبھی نہ ہو، اب ہمارے جسم کبھی تو زندہ ہوتے ہین، اور کبھی زندہ نہین ہوتے، لہذا ہماری تعریف کے مطابق اجسام کی زندگی عرضی ہے، پھر کسی چیز کے عرضی یعنی ایسی چیز سے پیدا ہوتے ہین، کہ وہ معنی اس دوسری چیز مین جوہری ہون، چنانچہ جب ٹھنڈا لوہا آگ مین رکھا جاتا ہے، تو گرم ہو جاتا ہے، اب گرمی آگ کیلئے جوہری ہے، جب لوہا آگ مین ڈالا جاتا ہے، تو اس مین یہ عرضی گرمی پیدا ہو جاتی ہے، جو آگ کے لئے جوہری ہے، بعینہٖ یہی حال ہمارے اجسام کا ہے، جب ہمارے اجسام زندہ ہوتے ہین، تو ان مین ایک ایسی چیز ہوتی ہے، جس کیلئے زندگی جوہری ہے، اسی چیز کی جوہری زندگی سے ہمارے

[1] زاد المسافرین ص ۶۹، ۷۰

ام اپنی عرضی زندگی اخذ کرتے ہیں، ہم اسی چیز کو جس کے لئے زندگی جوہری ہے نفس کہتے ہیں، اس طرح ہم کو ایک ایسی ل جاتی ہے، جو نہ صرف بذاتِ خود زندہ ہے، بلکہ جو ایک جوہر کو زندگی بخشنے والی بھی ہے، اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یز جوہر ہے نہ کہ عرض، پھر ہم نے دیکھا کہ جس چیز کیلئے زندگی عرضی ہے، وہ تو فانی ہے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز یلئے زندگی جوہری ہے، وہ غیر فانی ہے، یہ بھی اس سے قبل[۱] واضح کیا جاچکا ہے کہ جسم میں حرکتِ قسری[۲] کے سوا اور ئی حرکت نہیں ہوتی، اور یہ حرکت کسی ایسی چیز سے پیدا ہوتی ہے، جو بذاتِ خود متحرک بالارادہ[۳] ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ م کی حرکتِ قسری نفس سے پیدا ہوتی ہے جس کی حرکت ارادی[۴] ہے، اس کے علاوہ زندہ جوہر متحرک ہوا کرتا ہے اور نفس لکہ زندہ ہے، لہٰذا لازم آیا کہ حرکتِ مطلق صرف اُس نفس کیلئے ہے جس کیلئے زندگی جوہری ہے[۵]

انسان "صورتہائے نطقی و کتابتی و صنعتی" کو اُن کے مخصوص ہیولیٰ پر پیدا کرتا ہے، محسوس صورتوں کو قوتِ تخیلہ ذریعہ اس ہیولیٰ سے منتزع کرکے قوتِ حافظہ میں محفوظ کرتا ہے، اور معلومہ صورتوں کو اپنے نفس میں اس طرح دیتا ہے، کہ ایک معلومہ صورت اور کسی دوسری معلومہ صورت میں غلط ملط نہیں ہوتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس صورتوں کا مستقر و مکان ہے، اس قول کی توضیح اس طرح بھی ہوسکتی ہے، کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو پہلی مرتبہ دیکھتا ، تو اس کو پہچانتا نہیں، اس وجہ سے کہ اس کی قوتِ متخیلہ نے اس صورت کو اس کے ہیولیٰ سے مجرد نہ کیا تھا، اور لئے اس کے حافظے نے اس کو محفوظ نہ کیا تھا، لیکن جب وہ اس کو دوبارہ دیکھتا ہے، تو اس کو پہچان لیتا ہے،" س ہے کہ پہلے تجربے کے بعد اس نے اس کی مجرد صورت کو محفوظ کرلیا تھا، دوسرے تجربے کی مجرد صورت کو چونکہ وہ پہلے بے کی مجرد صورت کے مشابہ پاتا ہے، لہٰذا وہ کہتا ہے، کہ یہ وہی چیز ہے،" اسکو وہ شناخت کہتا ہے، دوسرے الفاظ

۱؎ دیکھو زاد المسافرین ص ۴۵ ۲؎ یعنی وہ حرکت جو اندر مطبوعات آید، و مرآں را بر خلاف طبع آں بجنبانند چون حرکت سنگے کہ ما ورا سوئے ہوا بر اندازیم، تا بقہر سوئے ہوا بر شود و بطبع فرود آید، (ایضاً ص ۳۹، ۴۰) ۳؎ حرکتِ قسری را پدید آرندہ النست کہ متحرک است، بحرکتِ ارادی (ایضاً ص ۴) ۴؎ اما حرکتِ ارادی مرحرکتِ جانوران را گفتند کہ ایشان بحرکاتِ ملتف متحرک اند، (ایضاً ص ۴) ۵؎ (ایضاً ص ۷۶، ۷۹)

مین نفس حواس کی وساطت سے معلومہ صورتون کو قبول کرتا ہے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے، کہ نفس "صورتہائے علمی" کے لئے ہیولیٰ ہی بعینہٖ اس طرح جیسے جسم "صورتہائے صناعی" کیلئے ہیولیٰ ہے، پھر جسم مختلف صورتین قبول کرتا ہے، چنانچہ پانی، آگ ہوا، خاک افلاک، کواکب وغیرہ جسم ہی کی مختلف صورتین ہین لیکن جسم کی یہ مختلف صورتین بغیر حرکت کے پیدا نہین ہوتین، اور اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے کہ جسم مین بذاتِ خود کوئی حرکت نہین ہوتی، لہذا ظاہر ہے کہ جسم کو حرکت دینے والی ایک ایسی چیز ہے جسمین بذات خود حرکت ہوتی ہے، یہ بھی دکھایا جا چکا ہی کہ نفس ہی ایسی چیز ہے، جسمین حرکت ذاتی ہوتی ہے، اور یہ حرکت ارادی ہوتی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ نفس جسم کو صورت دیتا ہے یعنی نفس "خداوندِ صنعت" ہی، پھر چونکہ جسم مین حرکت نہین ہوتی، اور نفس معدنِ حرکت ہے، لہذا ثابت ہوا کہ نفس جسم نہین[1]

اس تمام لمبی چوڑی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مین ایک جوہر ہے، جو بذاتِ خود زندہ ہے، اور مرنے والا نہین جس کی حرکت ذاتی ہے، جو مجرد صورتون کا مکان ہے، "خداوندِ صنعت" ہے، "دانش پذیر" ہے جسم کی فنا کے بعد باقی رہنے والا ہے، اور جسم نہین، اسی جوہر کو ہم نفس کہتے ہین،[2]

(باقی)

[1] زاد المسافرین ص ۶۹، ۷۰، [2] ایضاً ص ۷۱،

گجراتی زبان اور اوس کی تاریخ،

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی،)

(۲)

زبانِ گجراتی کے قواعد، زبان اور قواعد ایک دوسرے سے جدا نہین کئے جا سکتے ہین، گرامر (قواعد) زبان کی کنجی ہے، اس مختصر مضمون مین ہم گجراتی زبان اور گجراتی لٹریچر کا ذکر کر رہے ہین، اور اگر ہم اس کی گرامر کے متعلق کچھ لکھین تو بیجا نہ ہوگا. ابتدا مین گجراتی زبان کی کوئی گرامر نہ تھی، بہت پُرانے زمانہ مین سدھراج "جے سنگھ" کے زمانہ مین ہیمچند نے گرامر لکھی تھی، لیکن وُہ پُرانی گجراتی زبان، یا اپابھرنست کے لئے تھی، اس کا موجودہ گرامر سے بہت کم تعلق ہے، گجرات مین ہم توسیع تعلیم کیلئے پادریون یعنی (مشنریون) کے ممنون ہین، پُرانی کتابون کو جمع کرنا، اور اُن کی طباعت و اشاعت یہ سب اُوُنھین لوگون کے محنت و مشقت کا نتیجہ ہے، گجراتی زبان کی سب سے پہلی گرامر بھی ایک انگریز مشنری کی محنت کا نتیجہ ہے، گجراتی ابجد کے حروف سنسکرت زبان سے لئے گئے ہین، پہلے حروف پر لکیر کھینچی جاتی تھی، جیسا کہ "دیوناگری" مین کرتے ہین، مثلاً "گائے کالی چھے، (یہ گائے کالی ہے) الفاظ بھی جدا جدا نہین لکھے جاتے تھے، لکیر کھینچنے کی عادت رفتہ رفتہ غائب ہوتی گئی، لیکن بنیون کی اب تک یہ عادت ہے کہ وہ تجارتی حروف اور بہی کھاتون مین لکیر کھینچتے ہین،

گجراتی ابجد کے حرفِ علت اور صحیح حسب ذیل ہین، الفاظ،

اَ، آ، اِو، اُو، اے، اَے، او، اَو، ام، اہا،

حروفِ صحیح،

ک، کھ، گ، گھ، انگ، + چ، چھ، جہ، جھ، نا + ٹا، ٹھ، ڈ، ڈھ، انا، ت، تھ، د، دھ، ڑان + پ، پھ، ب، بھ، ما،

یا، را، لا، وا، سا کھا، شا، ھجر گیان،

حروف علت دو قسم کے ہین، طویل اور مختصر، اے، اَیَ، اُو، اَو، ام، اہ مختصر حروف علت ہین اور باقی طویل ہین،

گجراتی زبان کی شاعری،

گجراتی مین شاعری کا بھی بڑا حصہ ہے، اور پندرہوین صدی عیسوی سے لیکر آج تک بہت سے گجراتی کے شاعر پیدا ہوئے ہین،

گجراتی کے قدیم شاعرون کے نام نرسینھ، میران اور بھالان ہین،

نرسینھ کے نثر نگری کے بعض مقامات قابل اعتراض ہین، اور میران کی نظمین زیادہ تر اخلاقی ہین،

میران اور نرسینھ کا ایک اور ہمعصر بھالان نامی تھا، یہ گو اتنا مشہور نہ تھا، جتنا کہ وہ دونون تھے، تاہم وہ بڑا عالم تھا، ایسے زمانہ مین جب کہ ہندوستان کے کسی صوبہ کی زبان کو سنسکرت تصانیف کے ترجمہ کا فخر حاصل نہ تھا، بھالان نے سنسکرت کے مشہور و معروف، آومان، بانا، بھاٹ کی کادمبری، کا ترجمہ گجراتی نظم مین کیا تھا، اس مین کوئی شک نہین کہ سنسکرت نثر کا ترجمہ گجراتی نظم مین کرنا، بہت دشوار کام تھا، بھالان کی تصانیف بہت ہین،

اس عہد کے چند اور شاعر بھی ہین، مثلاً بھما، (۱۴۸۵ء) اور پدمنا بھا، وغیرہ، پدمنا بھا نے ایک تاریخی نظم لکھی ہے جسے "کھاندے پربھاندھا" کہتے ہین، اور گجراتی لٹریچر مین بہت بے نظیر ہے، یہ تصنیف حال ہی مین دستیاب ہوئی ہے، اور شائع کر دی گئی ہے، اس مین علاء الدین خلجی کا گجرات پر حملہ کرنا، کھانادکا اوس کو اپنے ملک مین سے گذرنے دینے سے انکار کرنا، اور اوس کے بعد جنگ کا ہونا، کھانادکے لڑکے ویرام اور شہزادی کے عشق کی ابتدا، اور فوجون کے کوچ کرنے کی تفصیلات، شہر کا فتح ہونا، مسلمان عورتون کا اپنی شکست پر آہ وزاری کرنا، شہزادی فیروزہ کی ناکامی، یہ تمام واقعات تفصیل وار اور پُرجوش طریقہ پر بیان کئے گئے ہین، زبان "بھالان" سے زیادہ پُرانی معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تصنیف مقبول ہونے سے اس کی اصلی شکل ایک دوسرے سے بیان کرنے مین گم نہ ہونے پائی، یہ تصنیف حال ہی مین دستیاب ہوئی ہے[1]

[1] اس مین واقعات سب فرضی ہین، ابو ظفر،

سولھوین صدی کا زمانہ مقابلۃً ایسا زمانہ ہے جسمین کوئی لٹریری تصنیف نہ تھی، سولھوین صدی گجراتی لٹریچر مین ضعیف ترین اور بدترین زمانہ ہے، لیکن اس کے بعد سترھوین صدی کا زمانہ گجراتی کی تاریخ مین بہترین زمانہ سمجھا گیا ہی، فلاسفر آکھو لا، پریمانند .... اور شراس "قصہ گو" جیسے بڑے شاعرون نے اسی صدی مین ترقی کی ہے،

"آکھو" احمد آباد کے ایک مالدار سُنار (زرگر) نے سوسائٹی سے تنگ آکر اپنی تمام زندگی "اصلی گرو" کی جستجو کیلئے وقف کر دی جب کبھی اور جہان کہین وہ سادھوون کی جماعتون مین گیا، اوس نے اوس کو ذلیل ترین حالت مین پایا، اور اوسے کوئی اصلی گرو نہ مل سکا، اس کی جو کچھ آرزو تھی، وہ یہ تھی، کہ اوسے ایسا نیک اوستاد ہاتھ لگے، جو اوسے صحیح راستہ دکھائے، اور وہ اسی تلاش مین روانہ ہوا، بنارس اور الہ آباد کی جاترا کو جاتے ہوئے راستہ مین اوس نے جے پور مین گوکل ناتھ کے یہان قیام کیا، جو وشنو کے ولبھ چاریا مندر کے سردار تھے، چونکہ مالدار تھا، اوس کی آؤ بھگت (خاطر تواضع) خوب ہوئی لیکن یہ عالم بزرگ نقلی بادشاہون سے دھوکا نہین کھا سکتا تھا، اُس کی روحانی خواہشین تشنہ لب تھین، وشنو نقطۂ نظر کے سادھوؤن سے واقف تھا، اوسے ایک قابل گرو کے ملنے سے مایوسی ہوئی، ایک دفعہ بنارس کے قریب ایک جھونپڑی مین اوس نے ایک سنیاسی کو صرف ایک ہی طالب علم کو ویدانتا فلاسفی کے اصول بیان کرتے ہوئے سُنا، ایک ایسے پُر (مقدس) شہر مین جہان چھوٹے سے چھوٹا گرو بھی ایک سو چیلے جمع کر سکتا ہے، یہ بہت ہی غیر معمولی واقعہ تھا، "آکھو" تعلیم کے وقت جھونپڑی کی پتلی دیوارون کے پیچھے چھپ کر اُس کے لکچر (وعظ) کو بہت توجہ کے ساتھ سننے لگا، اس طرح سے کئی دن گذر گئے، اس کے شاگرد کا یہ معمول تھا، کہ پڑھنے والے کے الفاظ کا جواب گُن گُن کر یا سر ہلا کر دیدیا کرے، اور اور اس طرح سے اس کی ہمت افزائی ہو، اور اوسے یہ بتایا جائے کہ اوس کا شاگرد بیدار ہے، اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہی اوسے وہ سُن اور سمجھ رہا ہے، اوسکی تمام کوششون کے باوجود یہ خاص سامع روز سو جایا کرتا تھا، اور چونکہ یہ ضروری تھا کہ پڑھنے والے کی دلچسپی کو قائم رکھا جائے، آکھو دیوار کے پیچھے سے اوس کا جواب دیدیا کرتا تھا، اس حرکت نے گرو کو چوکنا کر دیا، اور تلاش کرنے پر اوس نے دیکھا کہ "آکھا" ہے، اُس سے اس عجیب حرکت کی وجہ دریافت کی گئی، اور

اوس نے جو کچھ واقعہ تھا، بیان کیا، اور درخواست کی کہ اوسے شاگرد بنالیا جائے، اپنی اس خواہش کے ثبوت مین اوس نے وہ تمام کتھا (قصہ) کہہ سنایا، جو اوس نے گذشتہ بارہ[۱۲] مہینون تک سنا تھا، سوامی کو اس کا یقین ہوگیا، کہ اوس سے اوس کو عقیدت بہت ہے، اوس نے اوس کو اپنا چیلہ بنالیا، آکھا نے ویدانتک فلاسفی پر ملکہ حاصل کرلیا، احمدآباد واپس لوٹتے وقت وہ اپنے پُرانے گرو، گوکل ناتھ سے جو ایک متمول وشنو مہاراج تھا، ملنے گیا، اس ملاقات سے اُس کا مقصد یہ دیکھنا تھا، کہ اب جب کہ وہ دنیاوی دولت سے جدا ہوچکا ہے، اور صرف تعلیم ہی کی دولت اوس کے پاس تھی، اوس کی آؤبھگت کیسے ہوتی ہے، اُس کا خیر مقدم پہلے جیسا نہین کیا گیا، اور مہاراج نے تو اوسے پہچانا تک بھی نہین کہ وہ آکھا ہے، آکھا اس سے بہت ہی برہم ہوا، اور اوس نے حسب ذیل نظم لکھی،

"مین نے گوکل ناتھ کو اپنا گرو بنایا، اور یہ ایسا تھا جیسے پُرانے بیل پر لگام لگانا، جو کھانا ضرور ہے لیکن اس آنکس کا جواب نہین دیتا ہے جو اوسے لگایا جاتا ہے، گرو تمھاری دولت کو تم سے لے لیتا ہے، مگر تمھارے قلب کی بے چینی و بیقراری کا کوئی علاج نہین کرتا ہے، ایسے گرو سے کیا نیکی کا کام ہوسکتا ہے"

وہ اس دنیا کی مکاری اور فریب سے تنگ آگیا تھا، اوس نے اس دنیا کو حقیقی ہستی کی تلاش کرنے کیلئے ترک کردیا، اوس نے بہت سے پاڑھے لکھے ہین جن مین اوس نے دنیا اور اوس کے طریقون کے متعلق بہت سے مفید سبق سکھائے ہین، اوس نے ویدانتک فلاسفی کے اصولون کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے، دراصل ایک بہت مشکل کام تھا، اس کے مضمون کو نظم کرنے سے مشکل سے اوس کے طرز ادا مین کوئی دلفریبی پیدا ہوئی ہو، اوس کی زبان توشستہ ہے نہ مسجع، اس کی زبان مین نزاکت و لطافت نہین ہے، اوسے زبان سے کوئی خاص انس نہین ہے، وہ نہین چاہتا تھا، کہ اوسے کوئی شاعر کہے، ۱۶۳۶ء اور ۱۷۳۴ء مین بڑودہ مین گجراتی کا ایک اور فدائی گذرا ہے، گجرات کی زبان اور لٹریچر کو گمنامی کی دلدل سے نکالنے والا دراصل وہی ہے، "نرسنہہ" کی طرح یہ بھی چودہ یا پندرہ سال کی عمر تک اَن پڑھ تھا، اسکا نام پرمانند تھا،

ابتدا مین پریمانند اپنے مضامین کو ہندی زبان مین لکھتا تھا، ہندی اوس وقت کے زمانہ کے عالمون اور تہذیب یافتہ لوگون کی مانی ہوئی زبان تھی، اس کے گرو رامچرن نے اوسے اپنی مادری زبان گجراتی مین نظمین لکھنے

کی ہدایت کی، یہ اوسے بہت ناگوار گذرا، اور اس وقت اوس نے یہ عہد کرلیا، کہ جب تک وہ گجراتی زبان "بجارنگے کی زبان" کے دھبّے کو اپنی مادری زبان کے سر سے مٹا نہ دیگا، اور اوس کو ترقی نہ دے لیگا، سر پر پگڑی نہ رکھے گا، ان ایام میں برہمنوں کے لئے پگڑی سر پر نہ رکھنا بہت بدتہذیبی تھی، پریمانند کو اپنی زبان کو ترقی دینے کا عشق ہوگیا تھا، اوس نے اپنے اس عہد پر ہر حالت میں پابند رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا، جو کام پریمانند نے گجراتی لٹریچر کے لئے کیا، وہ آج تک بہت قیمتی اور بے نظیر ہے، اوس نے ایک ادبی مجلس قائم کی، اور خود اس کا صدر بنا، اس مجلس کے ہر ایک ممبر کے ذمہ خاص کام تھا، ہندوستان کی ہر ایک زبان کی خصوصیات کو شامل کرنے کیلئے اوس نے ملکی زبانوں کے مطالعہ کا کام اپنے جماعت کے چند چیدہ ماہروں کے سپرد کیا، چند عورتیں بھی جو ہمدردی کا مادہ رکھتی تھیں، اس مجلس کی ممبر تھیں،

ان کام کرنے والوں میں سے چھ اشخاص اپنا نام کرگئے ہیں، ان میں سے ایک خود شاعر کا لڑکا ویرولبھ تھا، باپ اور بیٹے دونوں کو اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کا بہت ہی عشق تھا، ولبھ اپنے باپ کو اپنا گرو سمجھتا تھا، اور اپنی تصانیف کی افتتاحیہ نظموں میں شکریہ میں اس کا نام درج کرتا تھا، وہ اپنے اور گرو کی مدح سرائی اس قدر کرتا تھا، کہ وہ اوس کو نہ صرف ایک بڑا بلکہ افضل ترین شاعر کہتا تھا، "ولبھ" کے سپرد ہندی زبان کی خوبیوں کو شامل کرنے کا کام تھا،

اس کے شاگردوں میں سے دوسرا شاگرد "سُنشور" تھا، جو سنسکرت زبانوں کے مطالعہ کرنے اور اس کی خصوصیات کو گجراتی زبان میں شامل کرنے میں مصروف تھا، اوس نے بعض سنسکرت تصانیف کا ترجمہ کیا ہے، مثلاً "اکھا" یہ پریمانند بھی نہیں چاہتا تھا، کہ لوگ اسے شاعر کہیں، اوس نے اپنی نظموں میں کبھی اپنے کو شاعر نہیں لکھا ہے، وہ اپنے کو سادہ طور پر صرف بھٹ پریمانند کہتا تھا، کہا گیا ہے کہ پریمانند نے اپنی آخری عمر میں (بھگوت گیتا) کا (دسواں باب) دساما اسکندا کے ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا، چونکہ اوسے یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قوا روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں، اور یہ کام ناتمام رہے گا، اس لئے اوس نے اپنے چار بہت زیادہ ترقی یافتہ شاگردوں کو بُلا کر باقی حصہ کے ترجمہ کرنے کا کام اُن کے سپرد کیا، اُن کا امتحان لیا گیا، تمام شاگردوں نے اپنے اپنے ترجمے شاعر کو پیش کئے، لیکن ترجمہ کے آخر میں، اُن میں سے ہر ایک نے سوائے "سُندر" کے اپنے تئیں شاعر لکھا، کیونکہ اس وقت کے نظم لکھنے والوں کی ہمیشہ یہی عادت تھی، "سُندر" کے حق میں فیصلہ ہوا، گو کہ اُس کا ترجمہ بہت

کم درجہ کا تھا، اس کے مشہور و معروف اوستاد کی دم مرگ وصیت ترجمہ کی تکمیل کا کام اس کے سپرد کیا گیا، اُن ایام مین جیسا کہ آج بھی ہے، لیکن اتنی اچھی حالت مین نہین، پُرانے پڑھنے والون کی جماعت تھی، "جو گاگریا بھٹ" یا "مان بھٹ" کہلاتی تھی، یہ پڑھنے والے برہمن ہوتے ہین، جو پڑھتے وقت تال دینے کے لئے ایک تنگ گلے کے تانبے کو جسے "گاگر" یا "مان" کہتے ہین، بجاتے ہین؛ ایسی کتھا یا بیان شہرون اور شالون کے ساتھ سادہ اور دلچسپ زبان مین بڑے مجمع کے سامنے گلیون مین پڑھا جاتا ہے، عوام پر ان کتھاؤن کا اثر بہت ہوتا تھا، ان پڑھ عوام کو پُران کی تعلیم اسی طرح دیجاتی تھی، "مہابھارت" اور "رامائن" کا جو کچھ تھوڑا بہت علم عوام کو ہے، وہ مان بھٹ ہی کی شخصیت کا نتیجہ ہے، پریمانند، خود "مان بھٹ" تھا، وہ کتھا کے لئے نظمین لکھتا تھا، اور بڑے مجمع کے روبرو اونھین پڑھتا تھا، وہ مہابھارت اور بھگوت سے مضامین انتخاب کر کے خود اپنے آکھیان یا کتھا نظم کرتا تھا، رانا یاگوا، آرکھا، ہرن نالاکھین وغیرہ اس کی بعض اس قسم کی تصانیف ہین، جن کے مضامین پُران کے کتھا مین سے انتخاب کئے گئے ہین، اس کی تمام تصانیف مین سے "نالاکھیان" بہت زیادہ مقبول عام تصنیف ہے، نہ صرف یہی کہ وہ مقبول عام ہے، بلکہ گجراتی شاعری کی تصانیف مین سے بہترین تصنیف ہے، چیتر مہینے مین "اوکھاہرن" کے پڑھنے کی آوازین اگر ہر ایک گھر مین نہین تو قریب قریب ہر ایک قصبہ اور گاؤن مین سنائی دیتی ہین، مختلف مقامات سوسائٹی کے رسوم و رواج، حرکت کرنے والی اور غیر حرکت کرنے والی دونون چیزون کی تصویر لفظون مین کھینچنا، اور مردون اور عورتون کے کیرکٹر کی تشریح کرنے کے متعلق پریمانند کے جو بیانات ہین، وہ تمام تشبیہات اور استعارون سے جڑے ہوے اور "النکار" (بدائع) سے پُر ہین، اس مین اس کا کوئی ثانی نہین ہے، اور وہ گجراتی زبان پر مستقل طور پر حکمرانی کرتا ہے، پریمانند کی زبان نہایت ہی شیرین اور نازک ہے، اب تک کوئی شخص اس کی طرز تحریر کی نقل اُتارنے مین کامیاب نہین ہوا ہے، اوس نے خدا کی حمد اور بہت سے بزرگون کی تعریف مین نظمین لکھی ہین، اوس نے نرسنہہ کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، پریمانند بہترین شاعرون مین سے اعلی درجہ کا شاعر ہے،

"سامل بھٹ"، جو پریمانند کا حریف اور ہمعصر تھا، دنگنگر کا (جسے اب گومتی پور کہتے ہین) جو احمد آباد کے قرب و جوار مین ہے، باشندہ تھا، بحیثیت شاعر کے وہ پریمانند کے مقابلے مین دوسرے درجہ کا شاعر ہے، یہ دونون شاعر

ایک دوسرے کے بڑے حریف تھے، پریمانند کی یہ عادت تھی، کہ وہ پُرانے "پرانون" سے مضامین انتخاب کرتا تھا، اور سامل نے خود اپنی خیالی قصّون کو نظم کیا تھا، ان دونون شاعرون کے درمیان ادبی بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے، پریمانند خود تو ان مین حصہ نہ لیتا تھا، مگر اس کے لڑکے ولبھ کو ان سے بہت دلچسپی تھی، سامل ہی نے گجراتی لٹریچر مین قصہ نویسی کا طریقہ جاری کیا ہے، یہ بیجا نہ ہوگا، اگر ہم اوسے گجرات کا سوفٹ (SUFET) کہین، قصے ناول کے پیش خیمہ ہوتے ہین، سامل کے مضمون کی خواتین کا کیرکٹر، نازک، عالمانہ اور ظریفانہ ہے، سامل کے قصون مین رقاصہ عورتون کا بہت کچھ حصہ ہے، وہ مذہبی جماعتون کے درمیان کوئی فرق نہین سمجھتا ہے، اور سوسائٹی کے آپس کے رشتون کی پروا نہین کرتا ہے، لیکن وہ اس قایل ہے، کہ اخلاقی قواعد کی سختی کے ساتھ پابندی کرے، ایک نیا بنیرد ک ٹوک کے کسی رقاصہ سے شادی کر سکتا ہے اور اوس پر بھی اس کے کیرکٹر اور چال چلن مین کوئی دھبہ نہین آتا، وہ اپنی چارون بیویون کا مساویانہ طور پر خیال رکھتا ہے اور وہ اس کی خدمت بہت ہی اچھی طرح کرتی ہین، چار بیویان آپس مین ایک دوسرے کو بہن خیال کرتی ہین، وہ مردون کی طرح بہادر اور نڈر ہوتی ہین، عورتون کے کیرکٹر مین مردون کی اصلی فطرت دکھائی گئی ہے، سامل کی عورتین گو جوان ہین مگر بوڑھون کی سی عقل رکھتی ہین، اس کے مرد اور عورتون کے ویسے ہی جذبات ہوتے ہین، جب کہ وہ ایک دوسرے کے عاشق ہوتے ہین، اور اون کے عشق کا انجام یہ ہوتا ہے، کہ اُن کی شادی ہو جاتی ہے، اور وہ جب شادی کرتے ہین، تو یا تو محض ذوق کے خاطر یا حُسن یا سچے عشق کی وجہ سے ایسا کرتے ہین، لیکن وہ اکثر والدین کی مرضی کے خلاف ایسا کرتے ہین، "انگد وستی" "پدماوتی" "نند بتریسی" "سہاسن بتریسی" یہ اسکی بعض بہت مقبول کتابین ہین، اس کی زبان سادہ ہے، لیکن بہت ہی پُر اثر ہے اوس نے گجراتی زبان پر گہرا نقش چھوڑا ہے، اس کے "چھپّون" (ایسی نظم جسمین چھ مصرعے ہوتے ہین) نے اوس کی یاد کو ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا ہے، اوس کی طرز تحریر خود اوس کی طرز تحریر ہوتی ہے یعنی اوس کی زبان سادہ، مصرعے سادہ، نیک عادات کے متعلق سادہ کہانیان وہی سچا شاعر ہے، جو سادہ زبان مین تعلیم دے سکتا ہے، ایک مالدار کنبی بیتل رکھیلدا اس نام "سامل" کا مربّی تھا،

اوس صدی کے چھوٹے چھوٹے شاعرون کی تعداد اس قدر تھی، کہ اُن کو نظر انداز نہین کیا جا سکتا، اٹھارہوین،

صدی کی ابتدا مین ایک شاعر گذرا ہے جس کا نام دلپہ بھٹ تھا، اور جو مہا دیوی کا فدائی تھا، اوس نے تُسبھی چارا ھمانگے نام سے بہت سے گربے لکھے ہین، وہ پڑھا لکھا نہ تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مہا دیوی اس کے پُر خلوص عقیدت سے اس قدر خوش ہوئی، کہ اُس دیوی نے اپنی دیوی شکتی سے اُسے علم کی نعمت سے سرفراز کر دیا، اُس صدی مین کوئی مشہور و معروف شاعر نہین ہوا ہے،

"بھوجا بھگتا" ایک بھگت شاعر تھا، جو انیسوین صدی مین گذرا ہے، اس کا جنم پٹے دار یا کُنبی گھر مین ہوا ہے، جو علم سے بے بہرہ تھا، وہ بھگت تھا، اوس نے بہت سے صوفیانہ بھجن لکھے ہین، اوس نے اپنے زمانہ کے تمدنی رسم و رواج پر بہت ہی سختی سے نکتہ چینی کی ہے، ساحل کے چپے چپے پر تم داس کے باڑے "نرسنگھ" کے صبح کے ترانے (پربھاتیان) اور بھجو کے بھجن یہ سب بہت شہرت رکھتے ہین، اوس نے تجرد اور مکر کی کو بہت ہی بیدردی کے ساتھ بدنام کیا ہے، اوس کی زبان شہریون کی طرح شایستہ نہین ہے لیکن پر خلوص ضرور ہے، وہ نہ تو پڑھا لکھا تھا، نہ شایستہ و مُہذّب تھا،

ایک اور شاعر گردھار ہے، وہ ۱۷۸۶ء مین پیدا ہوا، اور ۱۸۵۲ء مین مرگیا، راماین کو گجراتی زبان مین لکھنے والا وہی ایک مقبول شخص مانا جاتا ہے، اور اوس کی اس گجراتی زبان مین راماین کو بہت سے لوگ پڑھتے ہین،

سچانند سوامی نے جو جماعت گجرات اور کاٹھیا واڑ مین قائم کی، اور (جو دراصل اجودھیا سے آئی تھی) گو وہ بہت پُرانی جماعت ہے لیکن دونون صوبون مین اس کے بہت زیادہ پیرو ہوگئے تھے، سچانند کے عقیدت کے اس صدی مین بھی بہت لوگ ملتے ہین، اور ان مین دو اشخاص برہمانند اور نشکو لانند بہترین لوگون مین سے ہین، برہمانند کی قوالی کو آج بھی لوگ بہت ذوق و شوق کے ساتھ گاتے ہین،

(باقی)

یادِ ایام

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلما، کی تاریخ گجرات جس مین وہان کے علما، ومشائخ اور علوم وفنون کی ترقیان بھی بیان کیگئی ہین، اب اوس کے دوبارہ اڈیشن مین مرحوم مصنف کی مختصر سوانح عمری کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے،

حجم ۷۲ صفحے، قیمت عہ/،

"منیجر"

ایک یورپین اہل قلم کی ہرزہ سرائی

خالد اور لیلیٰ کا مفروضہ افسانۂ عشق،

از مولنا شاہ معین الدین احمد صاحب رفیق دار المصنفین،

یورپین اہل قلم کا یہ نہایت قدیم اور خوشگوار مشغلہ ہے کہ جب وہ اسلامی تاریخ پر قلم اوٹھاتے ہین، تو ان کی بازبین نظر عموماً اونھین بے سروپا افسانون اور مشتبہ واقعات پر پڑتی ہے، جنھین تھوڑی سی حاشیہ آرائی اور رد و بدل سے اسلام اور مسلمانون کے خلاف کوئی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہو، اس خوشگوار مشغلہ کے ماتحت حال مین ایک اہل قلم مسٹر گرہیم لوئیس نے جو شرقیات پر ایک سلسلۂ مضامین ارقام فرمارہے ہین، ۲۷ راگست ۱۹۳۳ء کے السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا مین ایک مختصر مضمون کے ساتھ اسلام کے فاتح اعظم حضرت خالد بن ولیدؓ اور ان کی فرضی معشوقہ لیلیٰ کا ایک مرقع دیا ہے،

اس مرقع مین حضرت خالدؓ ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرہ مین جو اپنی سجاوٹ کے اعتبار سے کسی مشرقی بادشاہ کا ایوان نشاط معلوم ہوتا ہے ایک مکلف کوچ پر تشریف فرما ہین، پیرون کے نیچے ایک نفیس پا انداز ہے، کمرہ کے دروازون پر نہایت مکلف پردے اور چھت مین قندیلین آویزان ہین، بخورات کا دھوان کمرہ کی فضا، کو معطر کررہا ہے پاس ہی ایک وعدہ عالی شاہی پیچوان لگا ہوا ہے، اور ایک منقش میز پر فواکہات اور (غالبًا) شراب کی صراحی اور بلوری جام قرینہ سے رکھے ہوئے ہین، اور خالد کے بالمقابل ان کی معشوقہ نیم استادہ ہے، اور دونون ایک دوسرے کو مست و مخمور نگاہون سے دیکھ رہے ہین،

اس مرقع کی نیچے ایک طویل نوٹ یا مختصر مضمون کی شکل مین اس مرقع کی تشریح ہے، اس کا خلاصہ آگے آتا ہے پہلے مین مسٹر گرہیم کی اس خوش مذاقی کی داد دیتا ہون کہ اونھون نے ایک خشک اور جنگجو عرب سردار کو جو تہذیب و معاشرت کی نفاستون کا کیا ذکر ان کی ابجد سے بھی واقف نہین ہے، اور جس کی ساری زندگی میدان جنگ کے خارزارون مین گذری ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ مین جو اپنی سجاوٹ اور سامان آرایش کے لحاظ سے جہانگیر کی بزم نشاط معلوم ہوتا ہے، بٹھادیا ہے، صرف

اسی پر بس نہین کیا، بلکہ ایک ہیجان بھی جس کا اس زمانہ مین وجود بھی نہ تھا محض لطف مجلس کے لئے تازہ کرکے لگادیا، اگر خالد کے بجائے اونھون نے ہندوستان کے مغل فرمانرواؤن یا بغداد کے عباسی خلفار مین سے کسی کو مرقع مین دکھایا ہوتا تو کھپ بھی جاتا، خالد کو اس رنگ مین دکھانا ایسا ہی ہے جیسے مسیح کے کسی حواری کو ہوائی جہاز مین بٹھا کر پیرس کی سیر کرادینا،

بہرحال اس کے نیچے جو تشریحی مضمون دیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان مالک بن نویرہ خالد بن ولید کے ساتھ شریک جنگ ہی پھر آپس مین بگڑ جاتی ہے، اور دونون اپنی اپنی جماعت بناکر ایک دوسرے سے لڑجاتے ہین، خالد مالک کو شکست دیکر مع اس کی حسین وجمیل بیوی لیلیٰ کے گرفتار کرکے قید کردیتے ہین، لیلیٰ شوہر کی رہائی کی سفارش لیکر خالد کے خیمہ مین آتی ہی، خالد اسکے حسن وجمال کو دیکھکر مسحور ہوجاتے ہین، اور مالک کو قتل کرکے لیلیٰ کے ساتھ شادی کرلیتے ہین، اور اس فریفتگی کے نتیجہ مین عکبرا کے معرکے مین شکست کھاجاتے ہین،

اس افسانہ کو تقویت دینے کیلئے ایک اور افسانہ شامل کیا جاتا ہی کہ لیلیٰ کی اسیری کے زمانہ مین ایک بدو سردار موجہ بھی اس کا شریک قید ہے، بدو اس کے چھڑانے کو آتے ہین، اور لیلیٰ کو قتل کرڈالنا چاہتے ہین، لیکن موجہ لیلیٰ کے تیر عشق کا نشانہ بن چکا ہے، اس لئے بدؤن کو روک دیتا ہے، اور لیلیٰ کی شمع جمال سے نظر افروزی کے لئے قید کو رہائی پر ترجیح دیتا ہے رفتہ رفتہ لیلیٰ کے حسن وجمال کا شہرہ دور دور تک پھیل جاتا ہے، اور اوس کے حسن وجمال پر عبدالرحمن (ابن ابی بکر) فریفتہ ہوجاتے ہین، اور اسے حاصل کرکے اس مین اتنا محو ہوتے ہین، کہ اپنی تمام بیویون سے رُخ پھیر لیتے ہین، اور لیلیٰ کو گھر کی ملکہ بنا دیتے ہین، لیکن لیلیٰ اپنے مقتول شوہر کی یاد مین روز بروز نڈھال ہوتی جاتی ہے، اور اس کا سارا حسن وجمال رخصت ہوجاتا ہی، اس وقت عبدالرحمن کا طرز عمل اس کے ساتھ بدلجاتا ہے، اور اس کے ساتھ بے اعتنائی شروع کردیتے ہین، اور لیلیٰ اپنے گھر لوٹ جاتی ہے، اور بقیہ زندگی گوشۂ عزلت مین بسر کرتی ہے،

اس فرضی افسانہ سے حسب ذیل نتائج مضمون نگار کے پیش نظر ہین،

(۱) تاریخ اسلام کا نامور سپہ سالار اور فاتح اعظم جو رسول اللہ صلعم کا صحابی ہی، اپنے ایک شریک جنگ سے لڑجاتا ہے (۲) اور اوس کی بیوی کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو کر شوہر کو قتل کرکے بیوی سے شادی کرلیتا ہے، (۳) اور ایک عورت کے حسن وجمال مین اپنے منصبی فرائض کو بھول جاتا ہی، اور عکبرا کے معرکہ مین اسے شکست ہوتی ہی، (۴) پھر ایک دوسرے صحابی

عبدالرحمٰن خالد کے رقیب بنتے ہیں، اور لیلیٰ پر قبضہ کر لیتے ہیں، (۵) لیکن ان کا عشق لیلیٰ کے ظاہری حسن و جمال پر تھا، اس لئے جب اوس کے حسن پر زوال آتا ہے، تو عبدالرحمٰن کا عشق بھی زائل ہو جاتا ہے، اور لیلیٰ ان کی بے اعتنائی سے دل شکستہ ہو کر بقیہ زندگی عزلت میں بسر کرتی ہے، اس طرح ایک حسین عورت کی زندگی دو مسلمانوں کی بوالہوسی سے برباد ہو جاتی ہے،

لیکن اوپر کے واقعات میں سے ایک واقعہ بھی صحیح نہیں ہے، بعض تو بالکل بے بنیاد ہیں، بعض میں کسی قدر واقعیت ہے، لیکن انھیں مسخ کرکے بہت بدنما بنا دیا گیا ہے، بعض غلط مقدمات قائم کرکے اس سے غلط نتائج نکالے گئے ہیں، اور بعض مختلف واقعات کو محض بدنما بنانے کیلئے باہم ملا دیا گیا ہے، اب ان سب کی حقیقت ملاحظہ ہو،

مالک بن نویرہ جس پر اس افسانہ کی ساری عمارت کھڑی کیجاتی ہے، درحقیقت مقتول ہونے کے وقت مسلمان ہی نہ تھا، اور اگر تھا بھی تو خالد کے علم و یقین میں نہ تھا، اسکی تاریخ یہ ہے، کہ وہ بنی حنظلہ کے سرداروں میں تھا، آنحضرت صلعم کے آخری زمانہ میں مشرف باسلام ہوا، آپ نے اس کے رتبہ اور اعزاز کو برقرار رکھنے کیلئے بنی حنظلہ کا محصل زکوۃ و صدقات مقرر فرما دیا، اور وہ اپنے قبیلہ سے صدقات اور زکواۃ وصول کرکے مدینہ بھیجتا تھا، (اصابہ ج ۵ ص ۳۶)

اس کے قبول اسلام کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مالک ان مسلمانوں میں نہ تھا، جو اسلام کے ضعف اور غربت کے زمانہ میں اسلام لائے تھے، بلکہ اوس کا شمار مؤلفۃ القلوب یعنی ان مسلمانوں میں تھا، جو اوس زمانہ میں مسلمان ہوئے، جب بغیر اسلام قبول کئے ہوئے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تھا جیسا کہ خود اس نے ایک موقع پر جسکا ذکر آگے آئیگا اُس نے اپنی تاخیر اسلام کا اعتراف کیا ہے،

قبول اسلام کے بعد چند دنوں تک مالک بن نویرہ بنی حنظلہ کے صدقات بھیجتا رہا، آنحضرت صلعم کی وفات اور حضرت ابوبکرؓ کی مسند نشینی کے بعد جب ارتداد کا فتنہ اوٹھا، اور مرتد قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، اوس وقت مالک بن نویرہ نے بھی زکوٰۃ بھیجنی بند کر دی، بظاہر نظر یہ سوال ہوتا ہے کہ اوس نے تنہا زکوٰۃ بند کی تھی، لیکن اسلام پر قائم رہا ہوگا، لیکن اولاً اس کی کوئی صورت نہیں، اسلام کے ہر رکن کا انکار اسلام کا انکار ہے، اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے منکرین زکوٰۃ اور مرتدین میں کوئی فرق نہیں کیا، اور دونوں کے خلاف یکساں جہاد کیا، لیکن مالک کے متعلق حافظ ابن حجر نے بہ تصریح لکھا ہے کہ اوس نے زکوٰۃ وصول کرنی بند کر دی اور اپنے قبیلہ والوں سے صاف صاف کہدیا کہ مجھکو زکوٰۃ وصول کرنیسے کوئی تعلق نہیں، تم جانو تمہارا کام جانے، اور جس قدر وصول شدہ

رقم اوس کے پاس جمع تھی، وہ اپنے قبیلہ میں واپس کر دی، اور ان اشعار میں اپنے ارتداد کا اظہار کیا،

فقلت خذوا اموالکم غیر خائف ولا ناظر فیما یجئی من الغد

پس میں نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ تم بلا خوف و خطر اور بلا کل کو سوچے ہوئے اپنا مال واپس لے لو،

فان قام بالدین المحوق قائمٍ اطعنا وقلنا الدین دین محمد،

اگر کل کوئی اس جھاڑ و پھرے ہوے دین کو لیکر پھر کھڑا ہوا، تو ہم مطیع ہو جائیں گے اور دین محمدی کی صداقت کا اقرار کر لیں گے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تنہا منکر زکوٰۃ ہی نہ تھا، بلکہ اسلام سے بھی برگشتہ ہو گیا تھا (دیکھو اصابہ ابن حجر جلد ۵ ص۳۶)

مالک نے ارتداد پر بھی اکتفا نہیں کی، بلکہ فتنۂ ارتداد کے سلسلہ میں جب عرب کے بعض حصوں میں مدعیان نبوت اٹھے، اور ایک خام عقل اور خیرہ سر عورت سجاح بنت حارث نے نبوت کا دعوی کیا، اور قبیلہ بنی ہذیل نے اس کا ساتھ دیا، اوس وقت مالک بھی سجاح کی دعوت پر اس کے ساتھ ہو گیا، (طبری ص۱۹۱) سجاح نے مشہور مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے شادی بھی کر لی تھی، لیکن اسکے ساتھ نبھ نہ سکی، ایک عورت اتنے بڑے دعوی کو کبتک نباہ سکتی تھی، اس لئے چند ہی دنوں کے بعد وہ یہ تماشہ ختم کر کے اپنے قبیلہ میں لوٹ گئی، اس وقت مالک کو اپنے کئے پر بڑی پشیمانی ہوئی، اور وہ سخت گھبرایا (طبری ص۱۹۱) اسکے بعد مورخین کے بیانات مختلف ہو جاتے ہیں، بعض مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے، کہ مالک اسی حالت میں مارا گیا، چنانچہ مورخ بلاذری لکھتا ہے، کہ خالد بن ولید جو فتنۂ ارتداد کے استیصال پر مامور تھے، بہت سے قبائل کو مطیع بناتے ہوئے، بطاح اور بعوضہ بنی حنظلہ کی آبادیوں میں پہنچے، اور ان سے لڑکر ان کی جماعت منتشر کی، اور مالک بن نویرہ مارا گیا، پھر مالک بن نویرہ کا تعارف کراتے ہیں، کہ وہ رسول اللہ صلعم کی جانب سے بنی حنظلہ کے صدقات کا عامل تھا، رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد اوس نے کام چھوڑ دیا، اور بنی حنظلہ سے کہا تم جانو تمہارا کام جانے اس روایت کے بعد دوسری روایت یہ لکھتے ہیں کہ خالد کو بطاح اور بعوضہ میں کوئی نہیں ملا، اس لئے مرتدین کی تلاش میں اونھوں نے تھوڑی تھوڑی فوج ادھر ادھر بھیجدی، ایک دستہ ضرار بن ازور کی ماتحتی میں بھیجا، یہ دستہ مالک بن نویرہ اور اسکے ساتھ ایک جماعت کو گرفتار کرکے لایا، خالد نے اونھیں قتل کرا دیا، (بلاذری ص۱۰۵)

اوپر کا بیان بلاذری کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک حالت ارتداد یا کم از کم انکار زکوٰۃ کے سلسلہ میں مارا گیا،

دوسری روایت طبری کی ہے، اوس کے مطابق مالک سجاح کی واپسی کے بعد پشیمان ہوکر پھر مسلمان ہوگیا، لیکن جن اسباب کی بنا پر اور جن حالات مین دوبارہ وہ اسلام لایا وہ طبری ہی کے الفاظ مین سنو، وہ لکھتے ہین، کہ سجاح کی واپسی کے بعد جب مالک بن نویرہ کا کھیل بگڑ گیا، اس وقت مالک نے اپنے قبیلہ کو یہ کہکر منتشر کر دیا کہ ہم کو جب شروع مین اسلام کی دعوت دی گئی اوس وقت بھی ہم نے اُس کے قبول کرنے مین تاخیر کی، اور اس تاخیر سے ہم نے کوئی فلاح نہین پائی، مین نے اس پر غور کیا، مجھے نظر آرہا ہے کہ مسلمانون کے حالات بغیر سیاست برتے ہوئے ان کے موافق ہو جائین گے، اور جب بغیر سیاست برتے ہوئے کسی قوم کے حالات اس کے موافق ہوتے جا رہے ہون، تو ان کا مقابلہ نہ کرنا چاہئے، اس لئے تم لوگ منتشر ہو جاؤ، اور اس امر (مذہب اسلام) مین داخل ہو جاؤ، (طبری ص ۱۹۲۴)

طبری اور ابن اثیر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ مالک اپنی ناکامی کے بعد بھی برضا و رغبت اور تائب ہوکر اسلام نہین لایا تھا، بلکہ جب اوس نے دیکھا کہ مسلمان فتنۂ ارتداد کے دبانے مین کامیاب ہوتے جاتے ہین، اور اس پر اڑے رہنا ہلاکت ہے، تو وہ ع کافر نتوان گشتن ناچار مسلمان شو کے اصول پر مسلمان ہوگیا،

بہرحال مالک کے دوبارہ اسلام لانے کی صورت مین بروایت طبری اس کے مقتول ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ جب خالد بن ولید فزارہ، غطفان اور اسد وطے وغیرہ کے قبائل سے نپٹتے ہوئے بطحہ جہان مالک کا قبیلہ آباد تھا پہنچے اوس وقت مالک ان سب کو منتشر کر چکا تھا، خالد نے یہان پہنچکر مختلف سمتون مین فوجی دستے پھیلا دئے اور ہدایت کر دی، کہ جو لوگ اسلام نہ لائین، اونھین گرفتار کر لیا جائے، اور جو مزاحمت کرے اوسے قتل کر دیا جائے، حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت تھی، کہ اسلامی فوجین جہان منزل کرین، وہان پہلے اذان دین، اگر مرتد قبائل سے اوس کے جواب مین اذان کی آواز آئے تو مسلمان ہاتھ روک لین اور اگر اذان کی آواز نہ آئے تو حملہ کر دین، جو لوگ اسلام قبول کر لین ان سے زکوٰۃ مانگی جائے اگر وہ زکوٰۃ ادا کر دین تو ان کا اسلام صحیح سمجھا جائے ورنہ اُن سے جنگ کی جائے؛

بطاح مین اسلامی فوجین منتشر ہونے کے بعد ایک دستہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھ چند بنی ثعلبہ کو گرفتار کرکے خالد کے پاس لایا، لیکن ان قیدیون کے اسلام کے بارہ مین لوگون کی شہادت مختلف تھی، ابوقتادہ انصاری کی شہادت تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہین، اور انھون نے اذان دیکر نماز پڑھی ہے، لیکن دوسری شہادتین اوس کے خلاف تھین، رات کا وقت تھا، اس

اس اختلاف کا فیصلہ خالدؓ نے صبح تک کے لئے ملتوی کر دیا، اور جو لوگ گرفتار ہو کر آئے تھے، وہ قید کر دئے گئے، رات کو ٹھنڈک زیادہ تھی، خالدؓ نے قیدیوں کو سردی سے بچانے کیلئے فوج میں منادی کرادی کہ ادفئوا اسراکم یعنی اپنے اپنے قیدیوں کو گرم کرو، دفٔ کے معنی گرمی پہنچانے کے ہیں، اور بعض قبیلوں کی لغت میں دف قتل کے استعارہ میں بھی استعمال ہوتا تھا، اس لئے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی، کہ قتل کرنے کی منادی ہے، اس غلط فہمی میں مالک اور ان کے چند ساتھی قتل کر دیئے گئے، خالدؓ شور سن کر خیمہ سے باہر نکلے تو انھیں اس غلط فہمی کا علم ہوا، اس وقت بجز حسرت و افسوس کے اور کیا کر سکتے تھے، چنانچہ یہ کہکر خاموش ہو گئے کہ قضائے الٰہی کو کوئی نہیں روک سکتا، (طبری ص ۱۹۲۴، ۱۹۲۵)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مورخین مالک کے دوبارہ اسلام لانے کے بھی قائل ہیں، وہ بھی اس کے غلط فہمی میں مارے جانے کے معترف ہیں، اس لئے عورت کو وجہ قتل قرار دینا قطعاً صحیح نہیں ہے، کسی مورخ یا ارباب سیر نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، بعض بڑے بڑے محدثین اور ارباب سیر پہلی یعنی حالتِ ارتداد میں مارے جانے کے قائل ہیں، حافظ ابن عبد البر کا بھی یہی فیصلہ ہے، اسی لئے اونھوں نے اپنی کتاب استیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں مالک کے حالات نہیں لکھے ہیں، مالک کے بھائی متمم کے حالات میں ضمناً صرف اسقدر لکھدیا ہے، کہ اوس کے بھائی مالک کے حالتِ اسلام اور ارتداد میں مارے جانے کے بارہ میں اختلاف ہے، لیکن وہ خود حالتِ ارتداد ہی میں مارے جانے کے قائل ہیں، ورنہ مالک کے حالات ضرور لکھتے، جن جن ارباب سیر نے اس کے حالات لکھے ہیں، اونھوں نے موافق اور مخالف دونوں قسم کی روایتیں جمع کر دی ہیں، اس سے کم از کم مالک کا اسلام مختلف فیہ ضرور ثابت ہوتا ہے،

اب رہ گیا مالک کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کا سوال تو یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ان کا یہ فعل نہ صرف یہ کہ قابلِ مذمت نہیں ہے بلکہ لائقِ ستایش ہے، اگر مالک کے حالتِ ارتداد میں مارے جانے کی روایت تسلیم کر لی جائے، تو ظاہر کہ حضرت خالدؓ کا مقصد اس شادی سے یہ تھا، کہ اس خاندان کو اسلام پر مضبوط کیا جائے اور مالک کے اثرات بد کا ازالہ کیا جائے اگر کوئی یہ شبہہ کرے کہ خالد ہی نے کیوں شادی کی کسی اور مسلمان کے ساتھ کیوں نہ کر دی، تو اوسے مالک کی بیوی کے رتبہ پر غور کرنا چاہیئے، مالک بنی حنظلہ کا سردار تھا، اس لئے اس کی بیوی کے لئے سرداری سے رشتہ موزوں تھا، جس کا اسلام نے ہمیشہ

لحاظ رکھا، اس لئے خالد نے اُسے اپنے حبالۂ عقد میں لینا مناسب سمجھا، بہرحال ان تاریخی حقائق نے خالد کے حسن و عشق کے افسانہ کو بالکل باطل کر دیا،

غالباً اس حسن و عشق کی کہانی کی بنیاد مرقسطہ کے ایک مسلمان مصنف ثابت بن عاصم کی کتاب الدلائل پر قائم کیجاتی ہے جس کو چوتھی صدی ہجری میں اندلس میں مرتب کیا گیا تھا، اور جس کا مرتب شرابی تھا (معجم البلدان ذکر سرقسطہ) حافظ ابن حجر نے اس حکایت کو تردید کے لئے اپنی کتاب اصابہ میں نقل کیا ہے، اور اس کا بے بنیاد ہونا ظاہر کیا ہے، وہ حکایت یہ ہے کہ ثابت کہتے ہے کہ جب خالد نے مالک کی حسین و جمیل بیوی کو دیکھا تو مالک نے بیوی سے کہا کہ تو نے مجھے مار ڈالا، یعنی میں تیری وجہ سے قتل کیا جاؤں گا، یہ روایت نقل کر کے حافظ ابن حجر اس کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں کہ خالد نے کسی عورت کی وجہ سے مالک کو قتل نہیں کیا تھا، یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ مالک کے سوءِ ظن کے بعد اس کے قتل کا واقعہ پیش آگیا، (اصابہ جلد ۵ ص ۳۷)

اور اگر اس حکایت کی روایتی حیثیت معلوم ہو جانے کے بعد کسی کو اس کی صداقت پر اصرار ہو، تو بھی خالد پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا اسلئے کہ مالک نے ایک سوءِ ظن کا اظہار کیا تھا اتفاق سے مالک کے قتل کا واقعہ پیش آگیا اس سے حقیقۃً خالد کی بدنیتی کہاں سے ثابت ہوتی ہے،

درحقیقت اس واقعہ کو بدنما بنانے میں مالک کے بھائی متمم کے دلدوز مرثیوں کو بڑا دخل ہے، متمم کو مالک کے ساتھ بڑی محبت تھی اس کی موت نے متمم کو دیوانہ بنا دیا تھا، اور اس عالمِ دیوانگی میں اس نے مالک کے ایسے دردانگیز مرثیے لکھے، کہ سننے والے بیقرار ہو جاتے تھے، اسی زمانہ میں حضرت عمرؓ کے محبوب بھائی حضرت زیدؓ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کو ان کی موت کا شدید قلق تھا، اس اشتراکِ غم کی وجہ سے حضرت عمرؓ متمم کے مرثیوں سے بہت متاثر ہوئے،

ایک مرتبہ متمم حضرت عمرؓ کے پاس آیا، حضرت عمرؓ نے اس کی دردانگیز حالت دیکھ کر فرمایا، تم کو بھی اپنے بھائی کی موت کا کس قدر شدید قلق ہے، مالک نے کہا، مرض کی وجہ سے ایک آنکھ کے آنسو خشک ہو گئے تھے، مالک کے غم میں جب سے وہ اشکبار ہوئی ہے آجتک آنسو نہیں تھمے، حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ غم و الم کی آخری حد ہے، کوئی مرنے والے کا اتنا غم نہیں کرتا، اگر میں بھی شاعر ہوتا تو زید کا مرثیہ کہتا، متمم نے کہا کہ امیر المومنین اگر میرا بھائی بھی یمامہ کی جنگ میں شہید ہوا ہوتا، تو میں کبھی نہ روتا، اس کی اس تعزیت پر حضرت عمرؓ کو بڑی تسلی ہوئی، (ابن سعد ج ۳ ق اول ص ۲۷۵) متمم کے ان دلدوز مرثیوں نے حضرت عمرؓ کو اتنا متاثر کیا، کہ مالک کی بیوی کے ساتھ خالد کے عقد کا معاملہ حضرت ابو بکرؓ کے سامنے پیش ہوا، آپ نے دفعِ شر کے خیال

سے خالد کو اس کے علحدہ کرنے کا حکم دیا، یہ اصل واقعہ ہے جس کو آب ورنگ دے کر کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے، بدؤون کے سردار موجہ کے عشق کا افسانہ بھی فرضی ہے، اور محض خالد کے افسانہ کو تقویت دینے کے لئے گڑھا گیا ہے، عکبرا کی جنگ کی شکست بھی بے بنیاد ہے، فتح و شکست کا سوال الگ رہا، اس نام کی سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی، جن شاذ لڑائیون مین خالد کو عارضی شکست بھی ہوئی، وہ کسی عورت کی وجہ سے نہیں بلکہ فطری تھی، جہان انھون نے بہت سے میدان سرکئے ایک آدھ مین شکست بھی کھا گئے

اس مضمون کا دوسرا ٹکڑا کہ مالک کی بیوی کے حسن و جمال کا شہرہ اتنا بڑھا کہ مدینہ مین عبد الرحمن بن ابی بکر اس پر فریفتہ ہو گئے، وغیرہ وغیرہ اس شکل مین جو مضمون نگار نے لکھی ہے، بالکل غلط ہے، لیلیٰ نامی ایک عورت سے عبد الرحمن کی محبت کا واقعہ حکایات عرب مین ضرور ملتا ہے، لیکن اولاً وہ چندان قابل وثوق نہیں ہے، اس لئے کہ یہ واقعہ زبیر بن بکار کی زبانی مروی ہے، (استیعاب ج ۲ ص ۴۰۵ و اصابہ جلد ۴ ص ۱۷۰) زبیر بن بکار جاہلیت اور عرب کے اخبار و ایام و حکایات اور کہانیون کے مصنف ہین، وہ کوئی مستند مورخ، یا ثقہ محدث نہین ہین، ان کی روایات زیادہ تر ایام و انساب عرب کے متعلق ہین، محدثین مین اون کا کوئی پایہ نہین، وہ واقدی اور مدائنی اور کلبی سے کچھ اونچے ہین، اونکے بیان مین بہت سی منکر روایتین بھی شامل ہو جاتی تھین، (تہذیب التہذیب ج ۳ ص۳۱۳) ایسی حالت مین عبد الرحمن اور لیلیٰ کی محبت کی روایت پر پورا اعتماد نہین کیا جا سکتا، تاہم اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی دونون واقعون یعنی جو مضمون نگار نے لکھا ہے، اور جو زبیر کے افسانہ مین ہے کوئی مناسبت نہین، عبد الرحمن کو جس لیلیٰ سے محبت تھی، وہ مالک کی بیوی نہ تھی، بلکہ ایک دوسری عورت تھی، معلوم نہین مضمون نگار نے مالک کی بیوی کا نام لیلیٰ کہان سے لکھا ہے، اس کا نام لیلیٰ کسی تاریخ مین نہین ملتا، طبری اور ابن اثیر وغیرہ نے ام تمیم لکھا ہے، اور اس کے باپ کا نام منہال تھا، اور عبد الرحمن کو جس عورت کے ساتھ محبت بیان کی جاتی ہے، اوس کا نام لیلیٰ اور اس کے باپ کا نام جودی تھا، دونون کے وطن بھی مختلف ہین، منہال کا وطن بطیحہ عراق تھا، اور جودی دمشق کا ایک عرب غسانی سردار تھا، ان دونون کو ایک لکھنا، انتہا درجہ کی خیانت اور بد دیانتی ہے،

بہرحال عبد الرحمن اور لیلیٰ کی محبت کے واقعہ کی صحت کی صورت مین اس کا واقعہ یہ ہے کہ عبد الرحمن تجارت کے سلسلہ مین شام آیا جایا کرتے تھے، اسی زمانہ مین ان کی نظر لیلیٰ پر پڑ گئی، لیلیٰ بہت حسین و جمیل عورت تھی، عبد الرحمن کو اوس سے

محبت ہوگئی، ان کی محبت حضرت عمرؓ کو بھی معلوم تھی، اس لئے جب شام پر فوج کشی ہوئی، تو آپ نے ہدایت کر دی کہ اگر لیلیٰ بنت جودی ہاتھ آئے تو عبد الرحمن کے حوالہ کر دی جائے، چنانچہ جب دمشق فتح ہوا تو لیلیٰ عبد الرحمن کو دیدی گئی، متقدمین نے صرف اسی حد تک یہ واقعہ لکھا ہے، (دیکھو استیعاب ج ۲ ص ۴۰۵) اور اس مین کوئی بدنمائی نہین ہے،

اس کے بعد جس قدر زمانہ گذرتا گیا اس واقعہ کے آب و رنگ مین اضافہ ہوتا گیا، چنانچہ اصابہ مین اس کی یہ شکل ہوگئی، کہ لیلیٰ بنت جودی کے حاصل ہونے کے بعد عبد الرحمن کو اس کے ساتھ اتنی شیفتگی بڑھی، کہ اوس کو اپنی دوسری بیویون پر ترجیح دینے لگے، حضرت عائشہؓ نے عبد الرحمن کو اس پر ملامت کی، لیکن اونھون نے کوئی توجہ نہین کی، پھر کچھ دنون کے بعد عبد الرحمن کا طرز عمل لیلیٰ کے ساتھ بدل گیا، اور اوس پر زیادتی کرنے لگے، لیلیٰ نے حضرت عائشہؓ سے شکایت کی، اونھون نے عبد الرحمن سے کہا تم نے دونون حالتون مین افراط و تفریط سے کام لیا، (اصابہ ج ۴ ص ۱۶۹)

ابن اثیر جزری اس پر اور اتنا اضافہ کرتے ہین، کہ جب لیلیٰ نے حضرت عائشہؓ سے عبد الرحمن کی بدسلوکی کی شکایت کی، تو اونھون نے عبد الرحمن سے کہا کہ تم نے لیلیٰ کے ساتھ محبت اور نفرت دونون مین افراط اور تفریط سے کام لیا، یا تم اوس کے ساتھ منصفانہ سلوک کرو، ورنہ اوس کو اس کے گھر پہنچا دو، عبد الرحمن نے لیلیٰ کو اس کے گھر پہنچا دیا (اسد الغابہ جلد ۳ ص ۳۰۶)

بہرحال تین کتابون مین یہ واقعہ تین طریقون سے ملتا ہے، اور ان مین جو اقدم ہے، اس مین صرف محبت کا ذکر ہے، باقی محبت مین افراط و تفریط اور اوس کے بعد لیلیٰ سے بے اعتنائی، اور اس کے گھر پہنچانے وغیرہ کا کوئی ذکر نہین ہے اس لئے یہ سب متاخرین کی حاشیہ آرائی معلوم ہوتی ہے، بہرحال اگر ان مین سے پہلا صحیح مانا جائے، جو تقدم زمانی کے اعتبار سے یقیناً سب مین زیادہ مستند ہے، تب تو کوئی اعتراض کی گنجائش ہی نہین رہ جاتی، عبد الرحمن کو ایک عورت سے محبت ہوئی، اور اوس کے ساتھ اونھون نے شادی کر لی، اس مین کوئی مذہبی یا اخلاقی قباحت نہین ہے، اور اگر آخری روایت بھی صحیح مان لی جائے، تب بھی عبد الرحمن پر کوئی مذہبی الزام عائد نہین ہوتا، ان کو ایک عورت سے محبت تھی، اس کے ساتھ اونھون نے شادی کر لی، لیکن پھر کسی سبب سے نبھ نہ سکی، اور پہلی محبت باقی نہ رہی، اور اپنی بہن کے کہنے پر لیلیٰ کو اس کے گھر پہنچا دیا،

تلخیص و تبصرہ

برطانوی انجمن ترقی سائنس کا سالانہ اجلاس

برطانوی انجمن ترقی سائنس کا سالانہ اجلاس ۶ ستمبر ۳۳ء کو لیسسٹر (انگلستان) مین منعقد ہوا، اس کے صدر سر فریڈرک ہاپکنس (Sir Frederick Hopkins) تھے، اس اجلاس کی متعدد نشستین ہوئین جنمین مختلف ماہرین سائنس نے اپنے جدید خیالات اور نظریے پیش کئے، اس اجلاس مین تقریبًا بیس ہزار سائنس دانون نے شرکت کی، اس اجلاس کی مختصر روداد اور خطبون کے مختصر خلاصے اسٹیٹسمین مین آئے ہین، جنھین ذیل مین ملخص پیش کیا جا[تا ہے]

صاحب صدر نے اپنے خطبہ کے آخری حصہ مین علم الحیوان (Biology) کی اہمیت پر زور[دیا] اور بتایا کہ بہبود انسانی سے اس کا کیا تعلق ہے، اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا، کہ آج کل جو کتابین سائنس [پر] شائع ہوتی رہتی ہین، اُن میں سے اکثر و بیشتر مین علم الحیوان کا یا تو ذکر ہی نہین آتا، یا اگر آتا بھی ہے، تو محض نام کیلئے اس[کی] اہمیت کو واضح کرتے ہوئے صدر موصوف نے فرمایا:۔

"سر والٹر فلیچر نے جنکی وفات سے قوم گذشتہ سال ایک روشن خیال صاحب فکر سے محروم ہو گئی ہے، اپنے [اس] قول سے لوگون کو حیرت مین ڈال دیا تھا کہ ہم اسی حد تک امن و ترقی حاصل کر سکتے ہین جس حد تک فن مملکت کے طریقون مین علم الحیوان کی حقیقت کی رہنمائی اختیار کرین، فن مملکت اور علم الحیوان کا باہمی تعلق اکثر سامعین کے لئے ایک نئی چیز تھا، چند سال ہوئے کیمبرج کے فلسفی ڈاکٹر براڈ (Broad) نے سائنس کی غیر مساوی ترقی پر افسوس کا اظہار کیا تھا، یعنی غیر نامیاتی (Inorganic) نیچر پر تو ہمین بہت کچھ [قابو] حاصل

ہو گیا ہے، لیکن علم الحیوان اور نفسیات سے ہم نسبۃً بے خبر ہیں، بہرحال ضرورت ہے کہ فرد اور مملکت دونوں کی رہنمائی کیلئے علم الحیوان کی حقیقت پر آج بھی زور دیا جائے، اپنے پر مغز اور بلیغ خطبۂ صدارت میں سر الفرڈ ایونگ نے خاص طور پر زور دیکر ہمیں یہ بتایا تھا، کہ انسان کے ہاتھ میں نیچر کی حکومت دیدی گئی ہے، قبل اس کے کہ وہ اپنی ذات پر حکومت کرنا معلوم کرے، اسمیں جو خطرات شامل ہیں، موصوف نے ہمیں اُن سے متنبہ کر دیا تھا، اور اس میں جو صداقت موجود ہے، اس سے وہ حضرات ناواقف نہیں ہیں جنکی کوششوں سے انسان نیچر پر روز بروز زیادہ قدرت حاصل کرتا جاتا ہے،

انجمن کے اجلاس کی ایک دوسری نشست میں جس میں تین ہزار سائنس دان موجود تھے، ایک ماہر سائنس مسٹر ڈفن (A. F. Dufton) نے اس دلچسپ نظریہ کا اعلان کیا، کہ جو لوگ اپنے والد کے سن کہولت میں پیدا ہوتے ہیں، اون کی استعداد بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے، موصوف نے اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان کیا کہ جن والدین کی عمریں (۴۵) سال سے زیادہ تھیں شہرت کے اعتبار سے اُن کے بچوں کا تناسب دوسرے بچوں کے مقابلہ میں دوگنا تھا، اسی طرح ۶۰ سال سے زیادہ عمر والوں کے بچوں کا تناسب لیاقت اور شہرت کے لحاظ سے دس گنا، اور (۷۰) سال سے زیادہ عمر والوں کے بچوں کا پچاس گنا تھا، اس نظریہ کی جانچ کی غرض سے مسٹر ڈفٹن نے رائل سوسائٹی، اور پارلیمنٹ کے ممبروں، اور مدارس نسواں کی اُستانیوں کو خطوط لکھے تھے، ان سب کے جوابات کا خلاصہ یہی تھا، کہ ممتاز اشخاص کا بڑا حصہ انھی لوگوں پر مشتمل ہے، جن کے والدوں کی پیدایش کے وقت پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے، چنانچہ اس نظریہ کی تصدیق میں موصوف نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی مثال پیش کی اور بتایا کہ آپ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر (۱۰۰) سال اور حضرت سائرہ کی (۹۰) سال تھی،

اسی طرح ڈاکٹر ہنری کیمبل (Dr. H. Campbell) نے اپنے خطبہ میں تعدد ازدواج کے مسئلہ پر سائنس کے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی، اور فرمایا کہ سرداروں میں جو لوگ سب سے زیادہ شجاع اور ذہین ہوتے تھے وہی سب سے زیادہ شادیاں کرتے تھے، اور اپنے بعد سب سے زیادہ اولاد چھوڑ جاتے تھے، موجودہ تہذیب میں تعدد ازدواج کو قائم کرنے میں دقتیں ضرور ہیں، لیکن بہتر اولاد پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے اسکی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے،

بڑے آدمیون کی بہت زیادہ لڑکیاں شادی نہین کرتین، اور ممتاز اشخاص کی بہت بڑی تعداد لاولد مرجاتی ہے، کچھ عرصہ سے لوگون کے قوائے ذہنی مین انحطاط نمایان ہورہا ہے، جسکی وجہ یہ ہے، کہ جو لوگ دماغی حیثیت سے بلند ہین اُن مین اوسط پیدایش کم ہوتا جاتا ہی، اور جن کے قوائے ذہنی اعلیٰ نہین ہین، اُن مین بڑھتا جاتا ہی" ڈاکٹر ہرسٹ (HURST) نے اس رائے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ذہین خاندانون مین اوسطِ پیدایش کی روز افزون تخفیف کے باعث موجودہ تہذیب خطرہ مین ہے، موصوف کی رائے ہے، کہ حکومت کو اس معاملہ مین مداخلت کرنی چاہئے، اور ایسے خاندانون کیلئے وظیفے مقرر کر دینے چاہئین، تاکہ جو ذہین بچے پیدا ہون، والدین ان کی پرورش کی طرف سے مطمئن ہو جائین،

"ع ز"

عہدِ حکومتِ ایوبیہ کی دو علاماتِ قبر

پہلی صدی ہجری مین قبرون پر علامتین سنگ مرمر وغیرہ کی لمبی لمبی تختیون کی صورت مین قائم کی جاتی تھین، اسی لئے آج بھی ان کو لوحِ مزار کہا جاتا ہی، چنانچہ اس قسم کے چار ہزار لوحِ مزار دارالآثار عربیہ مین موجود ہین جن مین ایک قدیم ترین لوحِ مزار ۳۱ھ کی اور دوسری ۷۱ھ کی ہے، چالیس لوحِ مزار دوسری صدی کے اخیر کی ہین، جن کی تاریخین ۱۷۴ھ، ۱۸۰ھ، ۱۹۰ھ سے لیکر سلطنتِ فاطمیہ کے آخری زمانہ یعنی ۵۶۴ھ تک ختم ہوتی ہین، اسی طرح اس دارالآثار مین بہ ترتیب ہر سنہ کی ایک یا اس سے زیادہ لوحِ مزار ہے، جن سے خط کوفی کی ترقی کی تاریخ معلوم ہوسکتی ہی، لیکن سلطنتِ فاطمیہ کے زمانہ مین لوح کے بجائے سنگ مرمر کے ستونون کا رواج ہوا، جن پر تحریرین یا تو کھودی جاتی تھین، یا ابھرے ہوئے حروف مین لکھ دی جاتی تھین، چنانچہ دارالآثار عربیہ مین اس قسم کی قدیم ترین علامتِ قبر احمد بن علی بن حسن الہواری کی ہے جس کی تاریخ ۵۰۹ھ ہے، اس کے بعد اگرچہ لمبی لمبی تختیون کا رواج کلیۃً موقوف نہین ہوا، تاہم سلطنتِ ایوبیہ اور اوس کے بعد سلطنتِ ممالیک مین ستونون نے بہت زیادہ رواج پایا، اور اس قسم کے دو ستون جو ۱۹۲۳ء مین زمین کے اندر سے کھود کر نکالے گئے ہین، جن مین پہلا ستون ڈیڑھ میٹر اور بیس سینٹیمیٹر بلند ہے، اور اوس کا قطر تیس سینٹیمیٹر کا ہے، اور اوس کے ایک طرف ۱۳ سطرون مین خط نسخ ایوبی

مین یہ عبارت منقوش ہے:۔

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، (۲) کل من علیہا فان ویبقا (کذا) (۳) وجہ ربک ذو الجلال،

(۴) والاکرام ھذا قبر، (۵) المعتز بشبابہ الموخوذ (کذا) (۶) من بین اھلہ واترابہ الحسن (۷) الصوغ

الحسن السیرۃ (۸) الحسن السریرۃ الامیر الاجل، (۹) زین الدین ابن الامیر المجاھد المرابط (۱۰) الحاج

الی بیت اللہ حسام الدین (۱۱) الحاجب لولو توفی یوم الاحد (۱۲) ثالث عشر صفر سنہ ثمان تسعین (۱۳) و خمس

مائۃ رحمہ اللہ ورحم من ترحم علیہ۔

دوسری طرف خطِ کوفی شجر کے اوبھرے ہوئے حروف مین ایک سطر مین یہ عبارت منقوش ہے، "الدائم

الباقی اللہ" اس کے نیچے ایک ہار کے وسط مین ایک طاق لٹکا ہوا ہے، جس کے نیچے اسی قسم کے خط مین یہ عبارت ہے "الملک للہ"

دوسرے ستون کی بلندی ایک میٹر اور اسی سنٹیمٹر کی ہے، اور اس کا قطر ۲۰ سنٹیمٹر ہے، اور اوس کے ایک طرف

خطِ نسخ ایوبی کے اوبھرے ہوئے حروف مین ۱۷ سطرون کی یہ عبارت ہے:۔

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۲) للہ العزۃ والبقاء وله (۳) ما ذرا وما برا وعلی خلقہ (۴) کتب

الفناء وفی رسول (۵) اللہ اسوۃ وعزاء، فمن کان (۶) یرجوا (کذا) لقاء ربہ فلیعمل (۷) عملا صالحا و

لا یشرک (۸) بعبادۃ ربہ احدا، ھذا، (۹) قبر الفقیر الی رحمۃ ربہ (۱۰) الزکی عبد الوھاب (۱۱) ابن

عبد الکریم بن محمد (۱۲) بن الشیعوت، (؟) الدمشقی (۱۳) توفی ثالث ربیع الآخر (۱۴) سنہ ست وستمائۃ

(۱۵) رحم اللہ من قرا وہ (۱۶) ودعا لہ بالرحمہ (۱۷) والمغفرۃ ولجمیع المسلمین۔

دوسری طرف اوبھرے ہوئے خطِ کوفی مین دو سطرون مین یہ عبارت ہے:۔

(۱) انعم المسکن (۲) لمن احسن۔

ان دونون کے نیچے ایک کھدا ہوا طاق ہے، جس کے نیچے خطِ ایوبی مین یہ آیت کھدی ہوئی ہے،

"کل نفس ذائقۃ الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامۃ فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ

فقد فاز وما الحیوٰة الدنیا الا متاع الغرور"

پہلے ستون کی تاریخ سنہ ۵۹۸ھ اور دوسری کی سنہ ۶۰۶ھ ہے، اس لئے یہ دونون سلطنتِ ایوبیہ کے زمانے کے ہین اور بطورِ علامت قبر کے قائم کئے گئے ہین،

ان مین پہلے ستونون پر فنی اور تاریخی دونون حیثیون سے بحث کیجا سکتی ہے، فنی حیثیت سے اس ستون مین دو قسم کی تحریرین ہین، ایک طرف تو نقاش نے تاریخی عبارت خطِ نسخ ایوبی مین لکھی ہے، اور دوسری طرف کو کوفی تحریر سے ترتیب دیا ہے، جسکی وجہ یہ ہے، کہ سلطنتِ فاطمیہ کے زمانے مین خطِ کوفی نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی لیکن جب ایوبیون نے اون پر غلبہ پایا، تو سلطان صلاح الدین نے شیعیت کو مٹا کر صرف احیائے سُنت ہی نہین کیا، بلکہ اون کے طرزِ حکومت مین بھی بہت سی تبدیلیان کین، اور اوس کا اثر فنونِ لطیفہ تک پہنچا، اور خطِ کوفی مشہور خطِ نسخ ایوبی کی شکل مین بدل گیا،

لیکن اس ستون مین یہ دونون خط استعمال کئے گئے ہین، معمولی تحریرین تو خطِ نسخِ ایوبی کا استعمال کیا گیا ہی اور زیب و زینت کا کام خطِ کوفی سے لیا گیا ہی،

تاریخی حیثیت سے اس ستون پر جو عبارت جنائزیہ اور تعظیمی القاب منقوش ہین، اون پر حسبِ ذیل نظر ڈالی جا سکتی ہے، پہلی صدی کی علاماتِ قبر پر اس قسم کی جو عبارتین منقوش ہوتی تھین، اون سے توحید، رسالت، جنت و دوزخ اور حشر و نشر وغیرہ کی تصدیق کا اظہار ہوتا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا، کہ متوفی مسلمان ہے، اور شریعت کے تمام اصول و عقائد کو مانتا ہے، لیکن جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلام عام طور پر پھیل گیا، تو یہ طرزِ عبارت بدل گیا، اور اس قسم کی عبارتین منقوش ہونے لگین، جو متوفی کی مدح و ثنا اور تعظیمی القاب پر بھی مشتمل ہوتی تھین، اور اون سے متوفی کے اعزہ و اقارب کو تسلی حاصل ہوتی تھی، سب سے پہلی علامتِ قبر جس پر اس قسم کے تسلی بخش الفاظ موجود ہین، دار الآثار عربیہ مین سنہ ۲۷۹ھ کی موجود ہے،

اگر متوفی بچپن یا جوانی مین انتقال کرتا تھا، تو علامتِ قبر پر ایسی عبارتین منقوش کی جاتی تھین جن سے اوس کے

بچپن یا جوانی کا اظہار ہوتا تھا، مثلاً "اللھم ان فلانا توفی طفلا علی فطرۃ الاسلام" و "ھذا قبر المنتزع بشبابہ" اس کے بعد اوسکی اور اسکے والد کی مدح و ثنا ہوتی تھی اور خوش قسمتی سے اس علامتِ قبر میں تعظیمی القاب ایسے شخص کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، جو تاریخی حیثیت سے بالکل گمنام ہے، البتہ اس کا باپ لولو حاجب ایک تاریخی حیثیت رکھنے والا آدمی ہے، اور مقریزی نے اوس کا تذکرہ کیا ہے، اور اوس کے حالات لکھے ہیں،

دوسری علامتِ قبر پر بھی جو عبارت منقوش ہے، وہ خطِ نسخ ایوبی میں ہے، اور اس خط کی امتیازی خصوصیتیں اوس سے صاف طور پر نمایاں ہیں، اور اوس کی عبارت خبائزیہ سے متوفی کی شانِ تقشف ظاہر ہوتی ہے، مثلاً "الفقیر الی رحمۃ ربہ" "یا رحم اللہ من قرا دعا بالرحمۃ" وغیرہ فقروں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ متوفی ایک زاہد و متورع شخص تھا، اگرچہ تاریخوں میں اوس کا تذکرہ نہیں ملتا، اور اوسکی شہرت و گمنامی کا حال معلوم نہیں ہوتا،

قرآن مجید کی جو آیتیں اس پر منقوش ہیں، اون سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اون سے عمل صالح اور زہد و تقشف اختیار کرنیکی ترغیب ہوتی ہے، مثلاً "فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحاً" و "کل نفس ذائقۃ الموت" وغیرہ آیتیں ایک مناسبتِ خاص سے انتخاب کیگئی ہیں، اور وہ مناسبت متوفی کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، غالباً وہ صوفیہ میں سے ہونگے،

"ع"

چند الفاظ کی اصلیت

لفظ دیپ کے مشتقات

دفتر، دبیر، دوات، دبستان، دیوان،

دفتر، دبیر، دوات، دبستان اور دیوان عربی، فارسی، ترکی، اور دوسری مشرقی زبانوں میں، بلکہ دبستان کو چھوڑ کر بقیہ الفاظ ہماری زبان میں بھی مستعمل ہیں، اب تک ان لفظوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان میں کا ہر لفظ الگ مادہ سے مشتق ہے، اور یہ کہ خود مستقل طور پر عربی میں یہ تمام الفاظ یقیناً فارسی سے آئے ہیں، مگر خود فارسی میں بھی انکی ٹھیک اصلیت کا پتہ نہیں چلتا تھا، قدیم فارسی زبان کی تحقیقات اور علم لغت (فیلالوجی) نے جو ترقی کی ہے، اوس سلسلہ میں ان الفاظ کی اصلیت کا بھی پتہ چلایا گیا ہے، فارسی رسالہ ایرانشہر کے سال اول شمارہ ۸ میں اس پر ایک تحریر چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، اوس کی تلخیص درج ذیل ہے:-

نقد فاز وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور "

پہلے ستون کی تاریخ ۵۹۵ھ اور دوسری کی ۶۰۶ھ ہے، اس لئے یہ دونوں سلطنت ایوبیہ کے زمانے کے ہیں اور بطور علامت قبر کے قائم کئے گئے ہیں،

ان میں پہلے ستونوں پر فنی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے بحث کیجا سکتی ہے، فنی حیثیت سے اس ستون میں دو قسم کی تحریریں ہیں، ایک طرف تو نقاش نے تاریخی عبارت خطِ نسخ ایوبی میں لکھی ہے، اور دوسری طرف کو کوفی تحریر سے ترتیب دیا ہے جسکی وجہ یہ ہے، کہ سلطنتِ فاطمیہ کے زمانے میں خط کوفی نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی لیکن جب ایوبیوں نے اون پر غلبہ پایا، تو سلطان صلاح الدین نے شیعیت کو مٹاکر صرف احیائے سنت ہی نہیں کیا، بلکہ اون کے طرزِ حکومت میں بھی بہت سی تبدیلیاں کین، اور اوس کا اثر فنون لطیفہ تک پہنچا، اور خط کوفی مشہور خط نسخ ایوبی کی شکل میں بدل گیا،

لیکن اس ستون میں یہ دونوں خط استعمال کئے گئے ہیں، معمولی تحریریں تو خط نسخ ایوبی کا استعمال کیا گیا ہے اور زیب و زینت کا کام خطِ کوفی سے لیا گیا ہے،

تاریخی حیثیت سے اس ستون پر جو عبارت جنائزیہ اور تعظیمی القاب منقوش ہیں، اون پر حسبِ ذیل نظر ڈالی جاسکتی ہے

پہلی صدی کی علامات قبر پر اس قسم کی جو عبارتیں منقوش ہوتی تھین، اون سے توحید، رسالت، جنت و دوزخ اور حشر و نشر وغیرہ کی تصدیق کا اظہار ہوتا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا، کہ متوفی مسلمان ہے، اور شریعت کے تمام اصول و عقائد کو مانتا ہے، لیکن جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلام عام طور پر پھیل گیا، تو یہ طرز عبارت بدل گیا، اور اس قسم کی عبارتیں منقوش ہونے لگیں، جو متوفی کی مدح و ثنا، اور تعظیمی القاب پر بھی مشتمل ہوتی تھین، اور اون سے متوفی کے اعزہ و اقارب کو تسلی حاصل ہوتی تھی، سب سے پہلی علامت قبر جس پر اس قسم کے تسلی بخش الفاظ موجود ہیں، دار الآثار عربیہ میں ۲۷۹ھ کی موجود ہے،

اگر متوفی بچپن یا جوانی میں انتقال کرتا تھا، تو علامت قبر پر ایسی عبارتیں منقوش کی جاتی تھین جن سے اوس کے

بچپن یا جوانی کا اظہار ہوتا تھا، مثلاً اللھم ان فلانا توفی طفلا علی فطرۃ الاسلام او ھذا قبر النور یشیابہ" اس کے بعد اوسکی والد کی مدح وثنا ہوتی تھی، اور خوش قسمتی سے اس علامت قبر میں تعظیمی القاب ایسے شخص کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، جو تاریخی حیثیت سے بالکل گمنام ہے، البتہ اس کا باپ لولو حاجب ایک تاریخی حیثیت رکھنے والا آدمی ہے، اور مقریزی نے اوس کا تذکرہ کیا ہے، اور اوس کے حالات لکھے ہیں،

دوسری علامت قبر پر بھی جو عبارت منقوش ہے، وہ خط نسخ ایوبی میں ہے، اور اس خط کی امتیازی خصوصیتیں اوس سے صاف طور پر نمایاں ہیں، اور اوس کی عبارت خبائزیہ سے متوفی کی شان تقشف ظاہر ہوتی ہے، مثلاً "الفقیر الی رحمۃ ربہ" "رحم اللہ من قرا لہ دعا بالرحمۃ" وغیرہ فقروں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ متوفی ایک زاہد و متورع شخص تھا، اگرچہ تاریخوں میں اوس کا تذکرہ نہیں ملتا، اور اوسکی شہرت و گمنامی کا حال معلوم نہیں ہوتا،

قرآن مجید کی جو آیتیں اس پر منقوش ہیں، اون سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اون سے عمل صالح درزہد و تقشف اختیار کرنیکی ترغیب ہوتی ہے، مثلاً "من کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا" "کل نفس ذائقۃ الموت" وغیرہ آیتیں ایک مناسبت خاص سے انتخاب کیگئی ہیں، اور وہ مناسبت متوفی کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، غالباً وہ صوفیہ میں سے ہونگے،

چند الفاظ کی اصلیت

"ع"

لفظ دیپ کے مشتقات

دفتر، دبیر، دوات، دبستان، دیوان،

دفتر، دبیر، دوات، دبستان اور دیوان عربی، فارسی، ترکی، اور دوسری مشرقی زبانوں میں، بلکہ دبستان کو چھوڑکر بقیہ الفاظ ہماری زبان میں بھی مستعمل ہیں، ابتک ان لفظوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان میں ہر لفظ الگ مادہ سے مشتق ہے، اور یہ خود مستقل ہیں، عربی میں یہ تمام الفاظ یقیناً فارسی سے آئے ہیں، مگر خود فارسی میں بھی انکی ٹھیک اصلیت کا پتہ نہیں چلتا تھا، قدیم فارسی زبان کی تحقیقات اور علم لسانیات (فیلالوجی) نے جو ترقی کی ہے، اوس سلسلہ میں ان الفاظ کی اصلیت کا بھی پتہ چلا یا گیا ہے، فارسی رسالہ ایرانشہر کے سال اول شمارہ ۶ میں ایک تحریر چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، اوس کی تلخیص درج ذیل ہے :-

فارسی قدیم میں جو شاہان ہخامنشی کے زمانہ میں رائج تھی، "دیپ" کے معنی لکھنے اور خط کھینچنے کے تھے اور یہ لفظ سنسکرت کے لیپ اور لیپی کا مرادف تھا جن کے یہی معنی ہیں، داریوش (دارا) کے کتبوں میں اوسکو "دیپیں" لکھا ہے جس سے کتبوں کے خطوط مراد لئے گئے ہیں اگرچہ یہ خطوط خط میخی (مسماری) میں ہیں، جو لکھے نہیں گئے، بلکہ کھودے گئے ہیں لیکن چونکہ اوس زمانہ میں دستور تھا، کہ خطوط کھود کر ان میں سونے کا پانی یا رنگ بھر دیتے تھے، اور اس طرح گویا خطوط کو دوبارہ لکھ دیتے تھے، اس لئے "دیپیں" کا لفظ خط اور نوشتہ کے معنی کیلئے مناسب تھا، جو داریوش نے استعمال کیا،

اب دیکھو "دیپ" سے کتنے الفاظ مشتق ہوتے ہیں،

۱- دفتر، یہ لفظ عربی نہیں بلکہ فارسی ہے، اور اسی دیپ سے نکلا ہے، قدیم یونانی مورخوں نے اسکو "دیپترا" اور "دفترا" لکھا ہے، کتزیاس ایک یونانی مؤرخ جو ۴۱۵ ق م میں گرفتار ہو کر ایران آیا، اور سترہ سال تک ایرانی دربار میں طبیب رہا تھا، اوس نے تاریخ ایران میں (جس کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے،) لکھا ہے کہ ایرانی سلطنت کے سالناموں کو "دفترا" کہتے ہیں، مشہور یونانی مؤرخ ہیرودوٹ نے بھی لکھا ہے کہ یہ لفظ مغربی ایشیا میں کتاب اور خط کے معنی میں استعمال ہوتا تھا،

۲- دبیر- (لکھنے والا) ابتداءً اوس شخص کو کہتے تھے، جو لکھنے سے آشنا ہوتا تھا، کیونکہ قدیم زمانہ میں لکھنا بہت عام نہ تھا، بعد میں جب لکھنے کا زیادہ رواج ہوا تو دبیر اوس کو کہنے لگے جو لکھنے کے علاوہ مضمون آفرینی پر بھی قادر ہو، (یعنی منشی) اور "دبیرستان" کے معنی "مکتب" کے ہیں، (مکتب کا مطلب وہ جگہ ہے، جہاں لکھنا سکھایا جاتا ہو،)

۳- دوات (لکھنے کا سامان) یہ غور کرنے کی بات ہے، کہ عثمانی ترک دوات کو "دویت" لکھتے اور پڑھتے ہیں جو اصل لفظ (دیپ) سے بہت قریب ہے،

۴- دبستان (مکتب) بعض ناواقف سمجھتے ہیں کہ دبستان، ادبستان یا ادابستان کا مخفف ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، دبستان اوس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں لکھنا سکھایا جاتا ہو، اور اس طرح یہ "مکتب" کا مرادف ہے،

یہ نکتہ خیال میں رہنا چاہیے کہ قدیم زمانہ میں مدارس میں صرف لکھنا اور پڑھنا تبلایا جاتا تھا، کتاب نہیں ہوتی تھی، جس سے درس دیا جاتا، کیونکہ علوم بھی مدون و مرتب نہ تھے، اس لئے اگر کوئی شخص نوشت و خواند سے آشنا ہو جاتا، صاحب ہنر و صنعت سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بعض قوموں میں ابتدائی مدارس کا ایسا نام موجود ہے، جس سے صرف لکھنے کے معنی ظاہر ہوتے ہیں،

۵۔ دیوان یعنی وہ جگہ جہاں تحریریں اور اوراق محفوظ رہتے ہون، بالفاظ دیگر "دفترخانہ" شاہان ساسانی کے زمانہ مین حکومت کے دفترخانہ کو دیوان کہتے تھے، کیونکہ خراج، مالیات اور صادرات حکومت کے تمام دفاتر یہین محفوظ رہتے تھے، بعد مین خود اون دفاتر اور اوراق کو دیوان کہا گیا، پھر اشعار کے مجموعہ کا یہی نام رکھا گیا، عربون نے اس لفظ کو ایرانیون سے لیکر مختلف مشتقات پیدا کئے، مثلاً دواوین اور تدوین، پھر لاطینی قومون نے اوس کو عربون سے لیکر دوانہ (Douane) کرلیا، جو فرانسیسی مین آج بھی ادارہ کرک (چنگی کے محکمہ) پر اطلاق ہوتا ہے، پہلوی مین یہ لفظ "اتیون" (ادیوان) اور ارمنی مین اتیان ہے، فخری نے آداب السلطانیہ مین عربون کے ایرانیون سے دفترداری کے سیکھنے کا تذکرہ کیا ہے، (اس کے بعد فخری کی عبارت کا فارسی ترجمہ ہے اور حاشیہ پر فتوح البلدان بلاذری کے مطالعہ کی بھی سفارش کی گئی ہے)

حضرت عمرؓ کے عہد مین ان دفاتر کے ادارہ یعنی محاسبات خارج وصادر (آمد و خرچ کے حسابات) کو دیوان کہتے تھے، جو آج کل کی وزارت مالیہ کا قائم مقام تھا، (شاید اسی بنا پر) عثمانی ترک بھی قدیم زمانہ مین وزیر مال یا مستوفی کو "دفتر دار" کہتے تھے،

بعد مین جب خلافت مبدل بہ سلطنت ہوگئی اور ہر محکمہ وسیع پیمانہ پر قائم کیا گیا، تو سلطنت کے ہر ادارہ کیلئے ایک دیوان کی بنیاد رکھی گئی، مثلاً دیوان رسائل، دیوان کتابت، دیوان فوج، دیوان برید، وغیرہ جو آج کل کے وزارت خانون کی ابتدائی تشکلین تھین، ان دائرون کا صدر صاحب دیوان کہلاتا تھا، اس طرح لفظ "دیوان" اپنے تنگ معنی (دفترخانہ) سے نکلکر حکومت کے ادارہ اور محکمہ تک وسیع ہوگیا، عثمانی ترکون نے قلم کے معنی مین اسی قسم کی تبدیلی کی ہے، پہلے دفترخانہ کو "قلم اوطہ سی" یعنی قلم (تحریر) کا کمرہ کہتے تھے، کبھی کبھی اطاق کا لفظ حذف ہوجاتا، اور صرف قلم دفترخانہ اور ادارہ کے معنی مین مستعمل ہوتا تھا، آج بھی کہتے ہین "از قلم می آیم" "بقلم می روم"، فلان در قلم مستخدم است، "سیح"

معارف یہی **لفظ دیوان** ہے، جس کے معنی پہلے تحریرون اور یادداشتون کے بحفاظت رکھنے کا مقام تھا، جس کو آج دفتر اور آفس کہتے ہین، ہماری زبان مین اس کے معنی اوس صاحب منصب کے ہوگئے ہین، جو سرکاری مالی کاغذات اور حسابی تحریرون کا ذمہ دار ہوتا ہو، یعنی جسکے متعلق مالیات کا حساب کتاب ہوتا ہو، آجکل کی اصطلاح مین اوسکو وزیر مال کہہ سکتے ہین اور اسی سے ترقی کرکے بعض ہندی ریاستون مین دیوان کے معنی مطلق وزیر کے ہوگئے ہین، غور کیجئے کہ الفاظ کس طرح اپنا قالب اور چولا بدلا کرتے ہین،

اخبار علمیہ

ٹرکی کی نئی یونیورسٹی

مانچسٹر گارڈین کا نامہ نگار مقیم قسطنطنیہ لکھتا ہے کہ یکم اگست ۳۳ء کو استنبول کی ہفتا د سالہ یونیورسٹی جو دار الفنون کے نام سے مشہور تھی، توڑ دی گئی، اور اُس کی جگہ ایک نئی یونیورسٹی قائم کی جا رہی ہے، پہلے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ نئی یونیورسٹی انگورا میں قائم کی جائے لیکن بعد میں طے پایا کہ وہان ایک دوسری یونیورسٹی قائم کی جائے گی، فی الحال قسطنطنیہ کے قدیم جامعہ کو توڑ کر از سرِ نو جدید اصولون پر قائم کر دیا جائے، چنانچہ اس جدید یونیورسٹی کو جدید اصولون پر قائم کرنے کی خدمت ایک سوئس پروفیسر کو تفویض ہوئی ہے، جو اپنا کام تین سال مین انجام دین گے، اس یونیورسٹی کا مقصد نوجوان ترکون کے لئے دنیا کے جدید علوم و فنون کے تمام فوائد مہیا کر دینا ہے، اسمین چار شعبے اور آٹھ صیغے رکھے گئے ہین، وہ چارون شعبے لٹریچر، سائنس، قانون اور طب کے ہین، اور صیغے حسب ذیل تقسیم پر مشتمل ہین،

۱- انقلاب ترکی، (۲) معاشیات و عمرانیاتِ قومی، (۳) جغرافیہ، (۴) ترکیات، (۵) نفسیات، (۶) علمِ کیمیا (۷) برقی علمِ حیل (۸) اسلامیات،

دینیات کا صیغہ جو قدیم یونیورسٹی مین تھا توڑ دیا گیا ہے، اور اوسکی جگہ اوس سے وسیع تر اسلامیات کا صیغہ قائم کر دیا گیا ہے، ان کے علاوہ غیر ملکی زبانون کا بھی ایک صیغہ ہے، اور جامعہ کے طلبہ کے لئے کم سے کم دو غیر زبانون مین جو آج کل رائج ہین، دستگاہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے، تقریبًا پچاس غیر ملکی پروفیسر مقرر کئے گئے ہین، انگریزی اور جرمن زبان پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جائے گا، اور غیر ملکی زبانون کی تعلیم ثانوی مدارس مین بھی جاری کیجائے گی

ان ترمیمات کی بنا پر قدیم یونیورسٹی کے جو پروفیسر کثیر تعداد میں علٰحدہ کر دئے گئے ہین، ان سے مترجمین کی ایک جماعت قائم کیجا رہی ہے، یہ لوگ تمام دنیا کے علوم و فنون کی اعلیٰ تصانیف اور یورپ کے جدید علوم کی بہترین درسی کتابون کا ترجمہ جدید ترکی زبان میں کرینگے،

نسل انسانی کی قدامت

سر آرتھر اسمتھ ووڈ ورتھ مشہور انگریز ماہر انسانیات نے حال مین بین الاقوامی انجمن ارضیات، واشنگٹن کے سامنے بیان کیا ہے، کہ جنوبی مشرقی افریقہ کے علاقہ تنگا نائیکا (Tanganyika) مین ڈاکٹر لیکی نے چند ماہ پیشتر انسانی ہڈیون کے جو ٹکڑے پائے ہین، اُن سے صرف اسی قدر نہین معلوم ہوتا، کہ نسل انسانی کی موجودہ قسم بہت قدیم ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ انسان کی جائے پیدائش افریقہ ہی مین ہے، موصوف کی رائے ہے کہ نسل انسانی کی عمر دس لاکھ سال نہین بلکہ دو کرور سال ہے، یہ دونون رائین اُن خیالات کے خلاف ہین جو ابتک اس مسئلہ مین قائم تھے، اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ نسل انسانی کو انسانی یا نصف انسانی حالت مین آئے ہوئے تقریبًا دس لاکھ برس ہوئے، تنگا نائیکا کی انسانی ہڈیون کی قدامت کا تعین بعض جانورون کی ہڈیون کی قدامت سے کیا جاتا ہے، یہ جانور اب نا پید ہین، لیکن اون کی ہڈیان انسانی ہڈیون سے ملتی جلتی ہین، سر آرتھر کے نظریہ کی تائید ایک اور نظریہ سے بھی ہوتی ہے، جو ڈاکٹر ہیتھیو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے،

قدیم نظریات کے رو سے انسان کی آفرینش یورپ یا ایشیا مین ہوئی ہے، ایک دوسرے سائنس دان گرگیری میسن، ماہر اثریات پنسلوینیا یونیورسٹی میوزیم (امریکہ) نے ایک بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے، اون کو اس امر کی شہادت مل رہی ہے، کہ نسل انسانی کی ابتدا یورپ، ایشیا، افریقہ مین نہین، بلکہ امریکہ مین ہوئی، انسانی شکل کے بندر جو ہانڈوراس (وسطی امریکہ) مین پائے جاتے ہین، اور ٹار سیس (Tarsius) نامی ایک جانور کی ہڈیان، جو ویومنگ (شمالی امریکہ) مین پائی گئی ہین، یہ دونون پروفیسر میسن کے خیال مین انسان سے ملتے جلتے ہین، اور ممکن ہے کہ انسانی ارتقا کی ابتدائی کڑیان ہون، پروفیسر موصوف ان بندرون کے مطالعہ کے لئے وسطی امریکہ گئے ہوئے ہین،

زحل پر نیا داغ

بحری رصدخانہ واشنگٹن کے نوجوان ہیئت دان مسٹر جان ولیس (John Willis) نے اب سے دو ماہ قبل ستیارہ زحل کے خطِ استوا پر ایک بڑا سفید داغ دریافت کیا ہے، یہ داغ تقریباً بتیس ہزار میل لمبا اور بارہ ہزار میل چوڑا ہے، اگرچہ یہ داغ ہمارے کرۂ ارض سے بہت زیادہ بڑا ہے، لیکن زحل کی وسعت کے لحاظ سے جس کے خطِ استوا کا طول پچھتر ہزار میل ہے، یہ وسیع خطہ زحل کی زردی مائل سطح پر محض ایک بڑے سفیدہ کی طرح معلوم ہوتا ہے، اس داغ کی دریافت کا فخر اول اول ایک برطانوی شخص ول ہے (Will Hay) نامی کو ہوا تھا، لیکن اس تحقیق کی شہرت اُسی وقت ہوئی جب ولیس نے بحری رصدخانہ واشنگٹن میں اُسے بطور خود دریافت کرکے تمام دنیا میں اس کا اعلان کیا،

سالمہ کی مقدار

انگریز ماہر طبیعیات مسٹر ایسٹن (Aston) نے سالمہ (Molecules) کی کثرت مقدار کے متعلق تخمینہ کیا ہے، کہ اگر ایک گلاس پانی کے سالموں پر کوئی ایسا نشان بنا دیا جائے، جس سے وہ پہچانے جاسکیں اور یہ پانی سمندر میں ڈال دیا جائے، تو اس کے سالمے بالآخر کرۂ ارض کے تمام آبی حصوں میں برابر برابر پھیل جائیں گے، اور پھر اگر کسی مقام سے ایک گلاس پانی نکالا جائے، تو اُس میں اُن نشان شدہ سالموں میں سے دو ہزار سے زیادہ سالمے موجود ملیں گے

لکڑی کی شکر

پروفیسر ایرک ہیگ لنڈ (Prof. Erik Haegglund) نے حال میں حکومت سوئڈن کے سامنے لکڑی سے شکر پیدا کرنے کی ایک تجویز پیش کی ہے جسمیں بیان کیا ہے، کہ ۱۵ لاکھ ٹن خشک لکڑی سے دس لاکھ ٹن شکر ہائڈروکلورک ایسڈ (نمک کا تیزاب) کے ذریعہ سے تیار ہو سکتی ہے، لیکن یہ شکر انسانوں کی

غذا مین استعمال نہین کی جاسکتی، پروفیسر مذکور کی تجویز ہے، کہ ایک ایسے چوپایون کو کھلا سکتے ہین، اور الکحل خمیر (YEAB6) اور موٹر کا تیل بنانے مین استعمال کر سکتے ہین،

غیر مرئی تار

نازک برقی سامان کی حفاظت کیلئے پلاٹینم کا ایک ایسا باریک تار بنایا گیا ہی جس کی دبازت انسانی بال کی دبازت کا تیسوان حصہ ہی، ایک انچ کی وسعت مین ایسے (۱۲۳۰۰) تار ایک دوسرے سے ملا کر رکھے جا سکتے ہین، ایک پونڈ پلاٹینم مین (۲۵۱۰۰۰۰۰) فٹ لمبا تار تیار ہو جائے گا، یعنی اوسکا طول کرۂ ارض کے نصف قطر سے بقدر (۵۰۱۰) میل زیادہ ہوگا

بیخوابی کا علاج،

جرمنی کے ایک طبیب ڈاکٹر مارلوتھ نے اپنے ملک والون کے لئے بیخوابی کے علاج کیلئے کچھ ہدایتین شائع کی ہین جو ہر ملک کیلئے مفید ثابت ہونگی، یہ ہدایتین بیخوابی کے مستقل مریضون کے لئے نہین ہین، بلکہ صرف اُن کے لئے ہین جنھین خارجی اثرات کے باعث نیند نہین آتی، ڈاکٹر موصوف نے حسب ذیل دفعات مین اس شکایت کے اسباب اور اسکو رفع کرنیکے طریقے بتائے ہین،: مثلاً شور و غل کی آوازون سے دور رہنا، سونے سے پہلے زیادہ نہ کھانا، سونے وقت دلچسپ قصّون کو نہ پڑھنا، کھیل تماشون سے قوت متخیلہ و برانگیختگی سے بچانا، فکر، رنج، غصہ یا دوسرے تردّدات سے پرہیز کرنا وغیرہ، اسی طرح وہ کہتا ہی، بیخوابی کا بہترین علاج یہ ہی کہ زندگی خوش اوقات طریقہ پر بسر کیجائے، یا اگر کتاب بہت زیادہ دلچسپ ہو، تو شب مین نیند لانے کیلئے اُسوقت تک پڑھی جائے، جب تک آنکھین تھک کر نیند نہ ہونے لگین، شام کو کافی ورزش کر لینے سے بھی شب مین نیند اچھی آتی ہی، اور نیند لانیکا ایک عمدہ طریقہ یہ ہی کہ بستر پر لیٹ کر اپنے بدن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دے اور آنکھ بند کر کے یہ خیال کرے کہ نیند آ رہی ہی، دوسری طرف فرانس کے ایک طبیب نے بیخوابی کی شکایت رکھنے والون کیلئے ایک مختلف علاج پیش کیا ہی، اس کا خیال ہی کہ سوتے وقت اگر سر شمال کی جانب اور پیر جنوب کی طرف رکھا جائے، تو نیند بہت اچھی آتی ہے سبب یہ ہے کہ مقناطیسی رو شمال سے جنوب کی طرف بہتی ہی، اور اس طرح سونے مین آسانی اور آزادی کے ساتھ جسم کے اندر سے گذر جائیگی، جس سے سکون اور آرام ملیگا، پیرس کے ایک اخبار کا بیان ہی کہ اس نظریہ کی اشاعت کے بعد عام طور پر لوگون نے اس پر عمل شروع کر دیا ہے اور اس سے فائدہ محسوس کر رہے ہین،

"ع ز"

ادبیات

مسجد نبوی مین نماز تہجد

(از حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی)

وہ شہر پاک مدینہ، وہ پچھلی رات کا وقت وہ زخمۂ دلِ مسلم، بلالؓ کی آواز،
کسی کا صدق سے وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو ہر ایک قال سے ظاہر ہوا حال کی آواز،

وہ رات، شرحِ گلیمِ سیاہِ مُزّمِّل وہ نور اس مین سِراجاً مُنیرا کی تفسیر،
سیاہ پردۂ گردون پہ دستِ قدرت نے قلم سے نور کے کھینچی ہے نور کی تصویر،

یقین ہے دل کو کہ اب بالیقین دیکھتے ہین نظر ذرا سی جھپک پر ہے کان آہٹ پر،
اُدھر، وہ لب کا اشارہ کہ میری بات سُنو جھجک کے حُسن کا کہنا، "اِدھر بھی ایک نظر"

وہ پاک جائے محل وَاذکرِ اِسمَ ربِّکَ کا وہ وقتِ خاص، تَبَتَّل اِلَیہِ تَبتِیلا
نظر کے سامنے، مامورِ رَتِّلِ القُرآن دعا وہ صدق سے مِصداقِ اَقوَمُ قِیلا

یہین تو کھلتے ہین، اسرارِ سورۂ الحمد خدا کی حمد، محمد کے ساتھ ہوتی ہے،
یہان نمازِ تہجد ہمیشہ ہوتی ہے، مخاطبِ فَتَہَجَّد[1] کے ساتھ ہوتی ہے،

آہِ رسا

(از جناب حفیظ ہوشیار پوری بی، اے)

رازِ سربستہ محبت کے زبان تک پہنچے، بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہان تک پہنچے،
کیا تصرّف ہے ترے حُسن کا اللہ! اللہ! جلوے آنکھون سے اُتر کر دل و جان تک پہنچے،

[1] فتہجد بہ نافلۃ لک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً۔

تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا، — سرحدِ عقل سے گذرے تو یہان تک پہنچے،

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے، — دیکھنے والے کہان سے ہین کہان تک پہنچے،

کھل گیا آج نگاہین ہین نگاہین اپنی — جلوے ہی جلوے نظر آئے جہان تک پہنچے،

آہ! وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے، — ہائے وہ بات کہ رک رک کے زبان تک پہنچے،

کس کا دل ہے کہ سُنے قصۂ فرقت میرا — کون ہے جو مرے اندوہِ نہان تک پہنچے،

خلش انگیز تھا، کیا کیا تری مژگان کا خیال — ٹوٹ کر دل مین یہ نشتر رگِ جان تک پہنچے،

نہ پتہ سنگِ نشان کا نہ خبر رہبر کی، ! — جستجو مین تری دیوانے یہان تک پہنچے،

نہ غبارِ رہِ منزل ہے، نہ آوازِ جرس، — کون مجھ رہروِ گم کردہ نشان تک پہنچے،

صاف تو ہین ہے یہ دردِ محبت کی حفیظ، — حسن کا راز ہو، اور میری زبان تک پہنچے،

اسرارِ توحید

از مولوی حکیم امداد حسین صاحب توحید ندوی، منشی فاضل، ادیب فاضل، اردو ٹی ہیڈ اورنٹیل ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول، سیالکوٹ

(۱)

کہتے ہین مجھے خموش رہتا ہون مین، — چپ چاپ سبو بدوش رہتا ہون مین،

دل دورِ تلاش مین نکل جاتا ہے، — پھر منتظرِ سروش رہتا ہون مین،

---

(۲)

موجین اٹھتی ہین، دل مین طغیانی ہے، — یارب میرا آس پاس برفانی ہے،

آہون مین اثر عطا ہو، گھلا دون مین، — دنیا دیکھے یہ شعلہ افشانی ہے،

---

(۳)

اسلام سے درگذر نہین ہونے کا، — تم لاکھ بچو مفر نہین ہونے کا،

ہے پیش اسمبلی مین قانونِ طلاق، — فطرت ہے اگر مگر نہین ہونے کا،

---

(۴)

آؤ کرین مل کے آشنا کی باتین، — کچھ دل کی ہون کچھ ہون دلربا کی باتین،

سنتا رہتا ہون اُن کو مل جاتا ہے — کرتے رہتے ہین جو خدا کی باتین،

مطبوعات جدیدہ

اسلامی عقائد اور اون کے ماخذ (بزبان انگریزی) از پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے، اسلامیہ کالج کلکتہ، حجم ۱۶۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی، خوشخط ٹائپ مین، قیمت مجلد للعہ، پتہ:- جناب سید ظہیر الدین، بی، اے، نمبر ۴ سید اسمٰعیل لین کلکتہ،

یہ رسالہ انگریزی زبان مین "مسلم تھاٹس اینڈ اٹس سورس" کے نام سے ہی، اس مین اسلام کے مختلف فرقون اور مسلکون، معتزلہ اور اشاعرہ، صوفیہ، اور فلاسفہ کے عقائد اور خیالات محققانہ اور سلیس انداز مین بیان کئے گئے ہین، نیز دلائل سے اون مستشرقین کی تردید کی گئی ہی جنھون نے اسلام اور اسلامی فرقون پر دوسرے مذاہب اور دوسرے غیر مسلم گروہون کے عقائد کی خوشہ چینی کا الزام لگایا ہی، امید ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کی انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کے سنجیدہ علمی حلقون مین وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیگی، کتاب کی قیمت کسی قدر کم رکھی جاتی تو مناسب تھا،

چہار مقالہ (فارسی) تالیف نظامی عروضی، ناشر رام نراین لال، کٹرا روڈ، الہ آباد، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۴ صفحے، لکھائی چھپائی خوشخط ٹائپ مین، قیمت مجلد عہ،

نظامی عروضی کی چہار مقالہ، محمد بن عبد الوہاب قزوینی کے وسیع و طویل حواشی کے ساتھ ۱۹۰۹ء مین ایک ضخیم جلد مین گب میموریل کی جانب سے شائع ہوئی تھی، لیکن قیمت کی زیادتی اور نسخہ کے بآسانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے طلبہ کو اس کے عام بازاری نسخون سے کام لینا پڑتا تھا، مولوی محمد رفیع صاحب (فاضل دیوبند) شکریہ کے مستحق ہین، کہ قزوینی کے شایع کردہ نسخے مین سے محض اصل متن کو ایک مختصر کتابی شکل مین چھپوانے کا اہتمام کیا، اب وہی نسخہ سستے دام مین دستیاب ہوسکتا ہے، مولوی صاحب موصوف نے قزوینی کے تعلیقات مین سے اختلافِ نسخ کے حصّہ کو اس مین شامل کرلیا ہی، اور ابتدا

مین دو صفحون کا دیباچہ لکھا ہی جسمین نظامی کے سوانح حیات اور چہار مقالہ کا سرسری تعارف ہی،

موازنۂ ہلال وصلیب، مولفہ جناب محمد عبد السمیع خان صاحب نکہت، شاہجہان پوری، بی اے

حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۰۷ صفحے، قیمت :- ۱۲؍ مولف سے بتوسط اسسٹنٹ سکریٹری انجمن اسلام ہارن بائی روڈ، فورٹ نمبر ا بمبئی سے طلب کرین،

موازنۂ ہلال وصلیب ہمارے نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنی رجحانات مین خوشگوار تبدیلی پیدا ہونیکے آثار کے طور پر دیکھی جاسکتی ہو، اس رسالہ مین نوجوان مؤلف نے اسلامی تمدن اور یورپ پر اوس کے اثرات کو دلپذیر انداز مین پیش کیا ہے، اور اس سے مقصود یورپ کی موجودہ خیرہ کن تمدنی ترقیون سے مبہوت مسلمانون کو بیدار کرنا ہے کہ آج یورپ مین علم وفن کے جو چکاچوند پیدا کردینے والے مناظر ہمین دکھائی دے رہے ہین وہ ہماری ہی تعمیر کی ہوئی عمارت پر مزید نقش ونگار ہین، مؤلف نے اوس کو عیسائی دنیا کے ممتاز مؤرخین، لیبان، میکیب، ارنلڈ، جوزف ہیل اور اسکاٹ وغیرہ کی تالیفات سامنے رکھکر مرتب کیا ہے، اور اون کی شہادتون سے اسلامی تمدن کے برکات دکھائے ہین، کتاب آٹھ دس ابواب مین ہو جنمین تقریباً اسلامی مدنیت کے اکثر شعبون کا اجمالی خاکہ سامنے آگیا ہو،

افسانۂ نواب جمیل الشان، از جناب عبد الرؤف صاحب عباسی اڈیٹر حق لکھنؤ، حجم ۸۰ صفحے، قیمت ۸؍ پتہ :- منیجر جدید برقی پریس، اشتیاق منزل نمبر ۴۳ ہیوٹ روڈ، لکھنؤ،

"نواب جمیل الشان" لکھنؤ کے ایک وثیقہ دار نواب ہین، نوابی کے کارخانے بگڑ چکے ہین، پر آن بان ابھی تک قائم ہو، عیش ونشاط کے اوسی طرح دلدادہ ہین، مصاحبین کا جھرمٹ بھی رہتا ہے، پیری مین عشق کی سوجھتی ہو، لکھنؤ کی ایک طوائف کے گرویدہ ہوتے ہین، بدایون کے ایک "سرکار" رئیس سے مقابلہ ہوتا ہو، اسی ضمن مین نواب صاحب کے ایک ہم عمر عزیز خاص اور بچپن کے ساتھی نواب نیاز حسین سے تعارف ہوتا ہو، یہ بڑے داؤ پیچ کے آدمی نکلتے ہین ان مین اور پولیس مین خوب خوب ذہنی مقابلہ ہوتا ہو اور عیاریون اور سازشون کے عجیب عجیب دلچسپ واقعات سامنے آتے ہین جسمین لکھنؤ کی اس طوائف کی ذہانت کے دلچسپ مظاہرے بھی ہوتے ہین اور انکا بوالہوسی وہوسناکی کے نتائج بد سامنے آتے ہین، وہی طوائف درس نصیحت دیتی ہو اور فریب کا پردہ آپسے آپ چاک ہوجاتا ہو، قصہ کے پلاٹ کا یاد دہانی ...

واقعات پر مبنی ہو انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے اس افسانہ پر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے شروع میں وقیع مضمون دیباچہ لکھا ہے

کیمیاگر اور دوسرے افسانے از جناب محمد مجیب صاحب بی اے آکسن حجم ۵۰ صفحے قیمت درج نہیں، پتہ: منیجر صاحب جامعہ ملیہ بک ڈپو قرولباغ دہلی،

جناب محمد مجیب صاحب نے اپنے ان افسانوں کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں کیمیاگر اور دوسرے افسانے کے نام سے مرتب کیا ہے، ان مختلف افسانوں میں معاشرتی زندگی کے کسی نہ کسی ایک خاص پہلو یا معاشرتی زندگی کے کسی ایک اصلاحی خیال کو کسی ایک مرتب واقعہ کی شکل میں پیش کیا ہے، اور یہی ان افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے، یوں عمومی دلچسپی کے لحاظ سے بعض افسانے اچھے خاصے دلچسپ اور سبق آموز ہیں، لیکن کہیں کہیں پر محض اپنے اصلاحی خیالات سمجھانے کیلئے افسانہ میں ان کو اس اصرار اور تکرار کے ساتھ موضوع گفتگو بنایا ہے، کہ جمالیاتی پہلو غائب ہونے کے علاوہ شاید نظریاتی عنوان بحث بھی گم ہو کر رہ گیا ہے،

تاریخ الاسلام کا پہلا نمبر از جناب مولوی سید محمد میاں صاحب دیوبندی، ناشر منیجر کتب خانہ اعزازیہ دیوبند ضلع سہارنپور، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے، لکھائی چھپائی بچوں کے مناسب، قیمت درج نہیں،

مؤلف نے مختصراً اسلامی تاریخ پر رسائل کا ایک سلسلہ طلبہ کیلئے لکھنا شروع کیا ہے، اوس کا یہ پہلا حصہ ہے، اس میں آنحضرت صلعم کی ہجرت تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، رسالہ درسی کتاب کے طور پر مکالمہ کی شکل میں قلمبند کیا گیا ہے پھر ہر سبق کا خلاصہ چند سطروں میں دیدیا گیا ہے، رسالہ بچوں کیلئے مفید ہوگا،

کلید عربی (پہلا حصہ) مؤلفہ مولوی قاری خلیل احمد صاحب لکھنوی (فاضل دینیات) حجم بہ ترتیب چھوٹی
و
کلید قرأت تقطیع کے ۲۹ و ۴۵ صفحے قیمت ہر ایک کی سالم ۳ر پتہ:- بشیری بکڈپو نمبر ۳۱، کتاب خانہ شریف مونٹ روڈ مدراس،

مولوی قاری خلیل احمد صاحب نے عربی زبان کے سکھانے کیلئے انگریزی ریڈروں کے طرز پر "کلید عربی" کے نام سے اس کے چند حصے لکھے ہیں جن میں کا پہلا حصہ پیش نظر ہے، اسمیں جملوں کے ذریعہ سے عربی بنانے اور صرف و نحو کے مسائل مستحضر کرنیکی کوشش کیگئی ہے، اس پہلے حصہ میں ثلاثی مجرد صحیح کو استعمال کرایا گیا ہے، اور آخر میں نحو و صرف کے چند قواعد اور گردانیں درج ہیں،

کلید قرأت فن تجوید میں ہے، اس میں اولاً قرآن مجید کو ترتیل سے پڑھنے اور فن تجوید کے حاصل کرنیکی ضرورت دکھائی گئی ہے پھر اس فن کے عمومی قواعد سلیس انداز میں سمجھا کر بیان کئے گئے ہیں،

"س"

ضمیمہ

تاریخ خطیب بغدادی

ابو حنیفۃ النعمان بن ثابت

گذشتہ سے پیوستہ

از نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی

النعمان[1] بن ثابت، ابو حنیفہ تیمی امام صاحب الرای، فقیہ اہل عراق، انس بن مالک[2] کو دیکھا، عطا بن ابی رباح نافع مولی ابن عمر، حماد بن ابی سلیمان، ہشام بن عروہ، علقمہ بن مرثد وغیرہم سے سماعت حدیث کی، عبداللہ بن المبارک، وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون، ابو یوسف القاضی، محمد بن حسن وغیرہم نے اُنسے روایت کی، نسب کی بابتہ منجملہ دیگر مختلف روایتون کے امام صاحب کے پوتے اسمٰعیل بن حماد کی روایت ہے کہ ہم ابنای فارس سے ہین، غلامی نے کبھی ہم کو مس نہین کیا (اہل البیت ادری بمانی البیت، شروانی)

ولادت ۸۰ھ، حلیہ میانہ قد، خوشرو، خوش لباس، عطر کا استعمال بکثرت کرتے کہ مکان سے برآمد ہونے پر فضا معطر ہو جاتی، نیک صحبت، بڑے کرم کرنے والے، اپنے بھائیون کے دلی غمخوار، خوش بیانی مین فائق، شیرین آواز، بلند ہمت

---

[1] واضح ہو کہ خطیب بغدادی نے امام صاحب کے حال مین پورے ستر صفحے لکھے ہین، مضمون ذیل مین مذاق حال کے مناسب مضامین اقتباس کرکے لکھے گئے ہین (شروانی) [2] دیکھو اسکی تائید مین تذکرۃ الحفاظ امام ذہبیؒ جلد اول، تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر العسقلانیؒ الجزء العاشر مرآۃ الجنان امام یافعیؒ، امام یافعی چار صحابۂ کرام کی روایت کے قائل ہین، (شروانی)

علم | فقہ حاصکر سیکھی، حماد بن ابی سلیمان کے حلقۂ درس مین ان کے سوا کوئی اور استاد کے سامنے نہ بیٹھتا، دس برس انکی صحبت مین رہے، ایک موقع پر اپنی جگہ ان کو بٹھا کر حماد باہر گئے، یہ لوگون کے سوالون کا جواب دیتے رہے، ایسے مسئلے بھی آئے جو استاد سے نہ سُنے تھے، استاد کی واپسی پر مسائل مذکور خدمت مین پیش کئے جو ساٹھ تھے، استاد نے چالیس سے اتفاق کیا، بیس سے اختلاف، شاگرد نے قسم کھائی کہ ساری عمر حاضر رہونگا، چنانچہ استاد کی وفات تک ساتھ رہے، کل زمانۂ رفاقت اٹھارہ برس تھا، استاد کے بیٹے اسمٰعیل کہتے ہین کہ ایک بار والد سفر مین گئے اور کچھ دن باہر رہے، واپسی پر مین نے پوچھا، ابا جان! آپ کو سبسے زیادہ کس کے دیکھنے کا شوق تھا (ان کا خیال تھا کہین گے بیٹے کے دیکھنے کا) کہا ابوحنیفہ کے دیکھنے کا، اگر یہ ہوسکتا کہ مین کبھی نگاہ ان کے چہرہ سے نہ اٹھاؤن تو یہی کرتا،

محمد بن فضیل عابد بلخی نے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ نے بیان کیا کہ مین امیرالمومنین خلیفہ منصور کے پاس گیا تو پوچھا تم نے علم کس سے حاصل کیا، مین نے کہا حماد سے انھون نے ابراہیم (نخعی) سے انھون نے عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن العباس سے منصور نے سنکر کہا خوب خوب، ابوحنیفہ تم نے بہت مضبوط علم حاصل کیا، وہ سبکے سب طیبین وطاہرین تھے، سب پر اللہ کی درود،

دوسری روایت مین ہے کہ خلیفہ منصور سے عیسیٰ بن موسیٰ نے کہا کہ یہ (ابوحنیفہ) آج دنیا کے عالم ہین، پوچھا نعمان! علم کس سے حاصل کیا، جواب دیا، اصحاب عمرؓ سے عمر کا، اصحاب علیؓ سے علی کا، اصحاب عبداللہ سے عبداللہ کا، اور ابن عباس کے زمانہ مین اُن سے بڑھکر عالم روئے زمین پر نہ تھا،

اعمش نے ایکبار ابو یوسف سے پوچھا تمہارے رفیق ابوحنیفہ نے عبداللہ کا قول عتق الامۃ طلاقہا کیون ترک کیا، جواب دیا کہ اس حدیث کی بنا پر جو آپنے بواسطۂ ابراہیم و اسود عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ بریرہ جب آزاد کی گئین تو ان کو اختیار دیا گیا، اعمش یہ سنکر تعجب مین رہ گئے اور کہا ابوحنیفہ بہت زیرک ہین، ان اباحنیفۃ لفطن،

عبادت و ورع | عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ مین نے کوفہ پہنچکر پوچھا کہ کوفہ والون مین سبسے زیادہ پارسا کون ہے؟ لوگون نے کہا ابوحنیفہ، ان کا یہ بھی قول ہے کہ مین نے ابوحنیفہ سے زیادہ کوئی پارسا نہین دیکھا، ما رأیت احدا

اورع من ابی حنیفۃ - تیسرا قول ہے کہ مین نے کسی کو ابوحنیفہ سے زیادہ پارسا نہین پایا، حالانکہ دُرّون سے، مال و دولت سے اُن کی آزمایش کیگئی (اپنے زمانہ مین امام صاحب کے سب سے زیادہ عابد و پارسا ہونے کی تائید مین اور بھی متعدد قول خطیب نے نقل کئے ہین) سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ ہمارے وقت مین کوئی آدمی مکہ مین ابوحنیفہ سے زیادہ نماز پڑھنے والا نہین آیا، اُن کا یہ بھی قول ہے کہ وہ نماز اول وقت ادا کرتے تھے، ابومطیع کا قول ہے کہ مین قیام مکہ کے زمانے مین رات کی جس ساعت مین طواف کو گیا ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کو طواف مین مصروف پایا، ابوعاصم کا قول ہے کہ کثرتِ نماز کی وجہ سے ابوحنیفہ کو لوگ میخ (وتد) کہنے لگے تھے،

شب بیداری و قرآن خوانی یحیٰی بن ایوب الزاہد کا قول ہے کہ کان ابوحنیفۃ لا ینام اللیل، ابوحنیفہ شب بیدار تھے، اسد بن عمر کا قول ہے کہ ابوحنیفہ شب کی نماز مین ایک رکعت مین پورا قرآن ختم کر دیتے تھے ان کے گریہ وزاری کی آواز سُنکر پڑوسیون کو رحم آنے لگتا تھا، ان کا یہ بھی قول ہے کہ یہ روایت محفوظ ہے کہ انھون نے جس مقام پر وفات پائی وہان سات ہزار کلام مجید ختم کئے تھے، ابوالجویریہ کا قول ہے کہ صحبتُ حماد بن ابی سلیمان ومحارب بن دثار وعلقمۃ بن مرثد وعون بن عبد اللہ وصحبتُ ابا حنیفۃ فما کان فی القوم رجل احسن لیلا من ابی حنیفۃ، لقد صحبت اشہرا فما منہا لیلۃ وضع فیہا جنبہ، مین حماد بن ابی سلیمان، محارب بن دثار، علقمہ بن مرثد اور عون بن عبد اللہ کی صحبت مین بیٹھا ہون اور ابوحنیفہ کی صحبت مین بھی رہا ہون مین نے اس جماعت مین کسی کو ابوحنیفہ سے بہتر شب گذار نہین پایا، مین مہینون ان کی صحبت مین رہا، اس تمام زمانے مین ایک رات بھی پہلو لگاتے نہین دیکھا، مسعر بن کدام کا قول ہے کہ مین ایک رات مسجد مین داخل ہوا، تو کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز کان مین آئی، جس کی شیرینی دل مین اتر کر گئی، جب ایک منزل ختم ہوئی تو مجھ کو خیال ہوا کہ اب کوع کرین گے، انھون نے ایک تہائی قرآن پڑھ لیا، نصف ختم کیا، اسی طرح پڑھتے رہے کہ کلام مجید ایک رکعت مین ختم ہوگیا، مین نے دیکھا تو وہ ابوحنیفہ تھے، خارجۃ بن مصعب کہتے ہین کہ خانۂ کعبہ مین چار امامون نے پورا قرآن پڑھا ہے، عثمان بن عفان، تمیم داری، سعید بن جبیر، اور ابوحنیفہ، زائدہ کہتے ہین کہ ایک رات مین نے ابوحنیفہ کے ساتھ عشا کی نماز مسجد مین پڑھی

آدمی نماز پڑھ کر چلے گئے، ابو حنیفہ کو معلوم نہ ہوا کہ مین مسجد مین ہون، حالانکہ تنہائی مین ایک مسئلہ مین اُن سے پوچھنا چاہتا تھا، انھون نے کھڑے ہوکر نماز مین قرآن مجید پڑھنا شروع کیا، مین انتظار مین کھڑا سنتا رہا کہ فارغ ہون تو مسئلہ پوچھون، پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہنچے (فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ) تو اس کو بار بار پڑھنا شروع کیا، اسی آیت کی تکرار مین صبح ہوگئی، یہانتک کہ مؤذن نے فجر کی اذان دیدی، یزید بن الکمیت جو برگزیدہ لوگون مین سے ہین (وکان من خیار الناس) کہتے ہین، کہ ابو حنیفہ کے دل مین اللہ تعالیٰ کا خوف شدید تھا، ایک رات امام نے عشا کی نماز مین سورۂ اذا زلزلت پڑھی، ابو حنیفہ جماعت مین تھے، جب نماز ختم کرکے آدمی چلے گئے، تو مین نے دیکھا کہ ابو حنیفہ فکر مین غرق بیٹھے ہین، تنفس جاری ہے، مین نے دل مین کہا چپکے سے اٹھ چلو، ان کے شغل مین خلل انداز نہ ہو، چنانچہ قندیل روشن چھوڑ کر مین چلا آیا، اس مین تیل تھوڑا تھا، طلوعِ فجر کے وقت جب مین مسجد مین پھر آیا تو مین نے دیکھا کہ ابو حنیفہ اپنی داڑھی پکڑے کھڑے ہین، اور کہہ رہے ہین، یا من یجزی بمثقال ذرۃ خیر خیرا و یا من یجزی بمثقال ذرۃ شر شراً، اجر النعمان عبدك من النار و ما یقرب منها من السوء وادخلہ فی سعۃ رحمتك، اے ذرہ بھر نیکی کا اچھا بدلہ دینے والے اور اے ذرہ بھر برائی کا بدلہ دینے والے اپنے بندہ نعمان کو آگ سے اور اسکے لگ بھگ عذاب سے بچائیو، اور اپنی رحمت کی فضا مین داخل کیجیو، مین نے اذان دی، آکر دیکھا تو قندیل روشن تھی اور وہ کھڑے ہوئے تھے، مجھکو دیکھکر کہا کیا قندیل لینا چاہتے ہو، مین نے کہا صبح کی اذان دے چکا، کہا جو دیکھا ہے اس کو چھپانا، یہ کہکر صبح کی سنتین پڑھین اور بیٹھ گئے، مین نے تکبیر کہی تو جماعت مین شریک ہوئے، ہمارے ساتھ صبح کی نماز اول شب کے وضو سے پڑھی، القاسم بن معین کا بیان ہے کہ ایک رات ابو حنیفہ نے نماز مین یہ آیت پڑھی (بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر) بلکہ ان کا وعدہ قیامت پر ہے، اور قیامت بڑی آفت اور بہت تلخ ہے، تمام رات اس کو دہراتے رہے، اور شکستہ دلی سے روتے رہے،

عبادتِ شب اور کلام کی تلاوت کے متعلق خطیب نے اور بھی بہت سی روایتین لکھی ہین، نمونہ کے لئے

اوپر کے بیان کافی ہین، یہ بھی خیال ہے کہ ہم پست ہمت مردہ دل ان کو اپنے حال پر قیاس کرکے مبالغہ اور بے اصل تصور نہ کر بیٹھین،

قیس بن ربیع کا قول ہے کہ ابوحنیفہ پرہیزگار، فقیہ، محمود خلائق تھے، جو اُن کے پاس التجا لیجاتا اس کے ساتھ بہت سا سلوک کرتے، بھائیون کے ساتھ بکثرت احسان کرتے، انھی کا قول ہے کہ ابوحنیفہ مال تجارت بغداد بھیجتے، اس کی قیمت کا مال کوفہ منگواتے، سالانہ منافع جمع کرکے شیوخ محدثین کے لئے ضرورت کی چیزین خریدتے، خوراک اور لباس غرض جملہ ضروریات کا انتظام کرتے، اس سے جو روپیہ بچتا وہ نقد جملہ سامان کیساتھ یہ کہکران کے پاس بھیجتے کہ "اس کو خرچ کرو اور سوائے اللہ کے کسی کی تعریف نہ کرو اس لیے کہ مین نے اپنے مال مین سے تم کو کچھ نہین دیا، یہ اللہ کا تمھارے معاملے مین مجھ پر فضل ہے، کہ تمھاری قسمت کا نفع ہوا، یہ وہ فیض ہے جو اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے تم کو پہنچاتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ بخشتے اس مین دوسرے کی قوت کا کیا دخل ہو سکتا ہے" ابویوسف کا قول ہے کہ ابوحنیفہ ہر سائل کی حاجت پوری کرتے تھے، ابوحنیفہ دربار کے عطیون سے ہمیشہ بچتے رہے، خلیفہ منصور نے ان کو بدفعات تیس ہزار درہم دیئے، انکار مین برہمی کا اندیشہ تھا، کہا امیرالمومنین مین بغداد مین غریب الوطن ہون، اجازت دیجئے کہ خزانہ شاہی مین یہ رقم میرے نام سے جمع ہوتی رہے، منصور نے منظور کیا وفات تک یہ رقم خزانے مین رہی، بعد وفات جب منصور نے یہ حال سنا اور یہ بھی سنا کہ امام صاحب کی حفاظت مین لوگون کے پچاس ہزار درہم امانت کے تھے جو بعد وفات بجنسہ واپس دیئے گئے، تو اس نے کہا ابوحنیفہ میرے ساتھ چال چل گئے، امانت داری مسلم تھی، وکیع کا قول ہے، کان واللّٰہ ابوحنیفۃ عظیم الامانۃ وکان اللہ فی قلبہ جلیلا وکبیرا، واللہ ابوحنیفہ بڑے امین تھے، اللہ کی جلالت اور کبریائی ان کے دل مین بھری ہوئی تھی، ان کا یہ بھی قول ہے کہ جب ابوحنیفہ اپنے بال بچون کیلئے کپڑے بناتے تو ان کی قیمت کے برابر صدقہ کر دیتے، اور جب خود نیا کپڑا پہنتے تو اسکی قیمت کی برابر شیوخ علما کے لئے لباس تیار کراتے، جب کھانا سامنے آتا تو اول اپنی خوراک کی مقدار سے دونا نکال کر کسی محتاج کو دیدیتے، صفائی معاملہ اس واقعہ سے معلوم ہوگی، ایک بار کپڑے

کے تھانوں میں سے ایک تھان میں نقص تھا، اپنے شریک حفص کو ہدایت کی کہ جب یہ تھان بیچو تو اس کا عیب جتا دینا
وہ بھول گئے، سارے تھان بک گئے، یہ بھی یاد نہ رہا کہ عیب والا تھان کسکے ہاتھ فروخت کیا، ان کو معلوم ہوا تو سارے
تھانوں کی قیمت خیرات کردی، خود حفص کے بیٹے علی نے یہ روایت کی ہے، ابن صہیب کا قول ہے کہ ابوحنیفہ اکثر یہ
اشعار پڑھا کرتے تھے،

عطاء ذی العرش خیر من عطائکم — وسیبه واسع یرجی وینتظر
انتم یکدر ما تعطون منکم — والله یعطی بلا من ولا کدر

عرش کے مالک کی بخشش تمھاری بخشش سے بہتر ہے، اور اس کا جود بہت وسیع ہے کہ سب اس کے امیدوار
و منتظر ہیں، تمھاری بخشش کو تمھارا احسان جتانا مکدر کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا میں نہ احسان رکھنا ہے نہ کدورت

وفورِ عقل، زیرکی اور باریک نظری

یہ عنوان خطیب نے مستقل قائم کیا ہے، عبداللہ بن مبارک نے سفیان ثوری سے کہا کہ اے
ابوعبداللہ! ابوحنیفہ غیبت سے کس قدر دور بھاگتے ہیں، میں نے کبھی ان کو کسی کی غیبت کرتے
نہیں سنا، سنکر کہا، واللہ ابوحنیفہ کی عقل اس سے بڑھکر ہے، کہ وہ اپنی نیکیوں پر ایسی بلا مسلط کریں جو ان کو
فنا کر دے، علی بن عاصم کا قول ہے کہ اگر ابوحنیفہ کی عقل روئے زمین کے آدھے آدمیوں کی عقل سے تولی
جائے تو اس کا پلہ بھاری رہیگا، خارجہ بن مصعب نے ایک موقع پر ابوحنیفہ کے ذکر کے سلسلے میں کہا کہ میں نے
ایک ہزار علما دیکھے ہیں ان میں تین یا چار عاقل پائے، ان میں سے ایک ابوحنیفہ ہیں، یزید بن ہارون کا قول ہے
کہ میں نے بہت آدمی دیکھے کسی کو ابوحنیفہ سے زیادہ عاقل، زیادہ فاضل اور زیادہ پارسا نہیں پایا، محمد بن عبداللہ
انصاری کا قول ہے کہ ابوحنیفہ کی عقل ان کے کلام، ارادہ، نقل و حرکت سے عیاں ہوتی تھی، کان ابو حنیفہ
یتبین عقله من منطقه و مشیئته و مدخله و مخرجه،

ایک بار ابوحنیفہ خلیفہ منصور کے پاس گئے، حاجب ربیع نے (جسکو ان سے مخالفت تھی) کہا ابوحنیفہ
حاضر ہیں جو خلیفہ کے دادا عبداللہ بن عباس کی مخالفت کرتے ہیں، ان کا قول تھا کہ قسم کھا کر انسان اگر ایک دن

یا دو دن کے بعد استثناء کر دے تو جائز ہے، یہ کہتے ہیں کہ نہیں وہی استثناء جائز ہوگا جو قسم کے ساتھ ساتھ کیا جاوے، ابوحنیفہ نے کہا، امیرالمومنین، ربیع کا خیال فاسد یہ ہے کہ آپکی فوج پر آپکی بیعت کی پابندی نہیں، اس لئے کہ وہ آپ کے سامنے عہد کرتے ہیں، گھر جا کر اس سے استثناء کر لیتے ہیں، لہذا بیعت کا حلف باطل ہوجاتا ہے، منصور یہ سنکر ہنس پڑا اور کہا دیکھو ربیع! ابوحنیفہ کے منھ مت لگ، باہر نکل کر ربیع نے شکایت کی کہ تم نے تو میرا خون ہی بہایا تھا، ابوحنیفہ نے کہا تم نے میرے قتل کا سامان کیا تھا میں نے تم کو بھی بچا لیا، اور اپنی جان بھی بچائی، عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ میں نے حسن بن عمارہ کو دیکھا کہ ابوحنیفہ کی رکاب تھامے ہوئے کھڑے تھے، واللہ ہم نے کوئی انسان نہیں دیکھا کہ جو فقہ میں تم سے زیادہ بالغ النظر ہو یا زیادہ صابر ہو یا زیادہ حاضر جواب ہو، تم اپنے وقت کے مسلم پیشوا ہو، تم پر جو اعتراض کرتے ہیں وہ حاسد ہیں،

حق پر استقامت سہل بن مزاحم کا قول ہے کہ دنیا ابوحنیفہ کے قدموں پر گری انھوں نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، اس کے لینے پر کوڑوں کے ذریعہ سے مجبور رکئے گئے، مگر قبول نہ کیا، دو مرتبہ ابوحنیفہ نے حق کی حفاظت پر جسمانی تکلیفیں برداشت کیں، اول مرتبہ بنو امیہ کے زمانے میں، جب ابن ہبیرہ عامل کوفہ نے کوفہ کی قضا کا عہدہ قبول کرنے پر ان سے اصرار کیا، انکار پر تو کوڑے لگوائے، بالآخر چھوڑ دیا، ہر روز دس کوڑے مارے گئے، ایکدن کوڑے لگنے کے دوران میں روئے، چھوٹنے کے بعد رونے کا سبب کسی نے پوچھا تو کہا کہ مجھ کو اپنی والدہ کے صدمہ کا خیال آیا جو کوڑوں سے زیادہ ایذا رسان تھا، اس پر رویا، احمد بن حنبل اپنی مصیبت کے بعد جب ابوحنیفہ کی مصیبت کا ذکر کرتے روتے اور ان کے لئے رحمت کی دعا کرتے، دوسری مرتبہ خلیفہ منصور نے اسی عہدہ کے قبول کے لئے بغداد بلایا، اور اصرار کیا، ابوحنیفہ انکار کرتے رہے، خلیفہ نے قسم کھا کر کہا کہ کرنا ہوگا، انھوں نے انکار پر قسم کھائی، یہ بھی مکرر ہوا، حاجب ربیع نے موقع پا کر کہا کہ ابوحنیفہ امیرالمومنین بار بار قسم کھاتے ہیں، پھر بھی تم انکار کئے جاتے ہو، جواب دیا، امیرالمومنین کو قسم کا کفارہ دیدینا مجھ سے زیادہ آسان ہے، بالآخر منصور نے قید کا حکم دیدیا، دوران قید میں ایکدن بلا کر پھر فرمایش کی، انھوں نے کہا " اصلحك الله امير المومنين ما انا اصلح للقضاء، خدا امیرالمومنین کا

بھلا کرے، مین عہدۂ قضا کی صلاحیت نہین رکھتا، منصور نے کہا تم جھوٹے ہو، جواب دیا خود امیر المومنین نے میری تصدیق کردی، کہ مجھ کو جھوٹا کہا، اگر مین فی الواقع جھوٹا ہون تو عہدۂ قضا کے قابل نہین، اور اگر سچا ہون تو مین کہہ چکا کہ مجھ مین یہ صلاحیت نہین، منصور نے یہ سنکر پھر قیدخانہ بھیجدیا، اسی قیدخانہ مین چھ دن علیل رہکر ۱۵۰ھ مین وفات پائی، ستر برس کی عمر تھی، ابن جریج نے خبرِ وفات سنکر انا للہ پڑھی، اور کہا اتی علم ذھب، کیسا علم اُٹھ گیا،

فقہ ابو حنیفہ | اس کا بھی مستقل باب ہے،

حدیث:۔ لا تقوم الساعة حتی یظھر العلم" کی تفسیر مین حسن بن سلیمان نے کہا ہے کہ وہ علم ابو حنیفہ کا علم ہے، اور وہ شرح جو انھون نے احادیث کی کی ہے، خلف بن ایوب کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا، آپنے صحابہ کو پہنچایا، صحابہ نے تابعین کو تابعین کے بعد ابو حنیفہ اور اُن کے اصحاب کو ملا اس پر کوئی خوش ہو یا ناراض،

ابن معینہ کا قول ہے کہ میری آنکھ نے ابو حنیفہ کا مثل نہین دیکھا،

ایک موقع پر عبد اللہ بن مبارک نے کہا ابو حنیفہ اللہ کی ایک نشانی تھے، کسی نے کہا خیر کی یا شر کی؟ کہا خاموش، شر کے واسطے غایۃ اور خیر کے واسطے آیۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ کہکر یہ آیت پڑھی "وجعلنا ابن مریم وامہ آیۃ" ابن مبارک کا یہ قول بھی ہے، کوئی مجلس ابو حنیفہ سے زیادہ با وقار نہ تھی، اُنکی شان فقہا کی تھی، نیک طریقہ، خوبصورت، خوش لباس تھے، ہم ایک روز جامع مسجد مین تھے، ایک سانپ ابو حنیفہ کی گود مین آپڑا، لوگ ڈر کر بھاگ گئے، ان کو مین نے دیکھا کہ بدستور بیٹھے رہے، سانپ کو جھٹککر پھینکدیا، اُن کا یہ قول بھی ہے کہ اگر اللہ نے میری مدد ابو حنیفہ اور سفیان کے ذریعے سے نہ کی ہوتی تو مین عام آدمیون کی طرح ہوتا، لولا ان اللہ اغاثنی بابی حنیفة وسفیان کنت کسائر الناس، عبد اللہ بن مسعود کے پڑوتے قاسم سے کسی نے کہا کہ کیا تم ابو حنیفہ کے تلامذہ مین داخل ہونا پسند کرتے ہو، جواب دیا ان کی محفل سے

زیادہ فیض رسان کوئی مجلس نہین ہے، چلو تم بھی چلکر دیکھ لو، چنانچہ وہ شخص ان کے ساتھ گیا، مجلس مین بیٹھا تو وہین کا ہورہا اور کہا مین نے اس سے بہتر صحبت نہین پائی،

عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ مین اوزاعی سے ملنے شام گیا، بیروت مین اُن سے ملاقات ہوئی، مجھ سے کہا کہ اے خراسانی کوفہ مین یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے، یہ سنکر مین مکان پر آیا، ابوحنیفہ کی کتابین نکالین اور ان مین سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر نکالے، اس مین تین دن لگ گئے، تیسرے روز ان کے پاس پھر گیا، وہ مسجد کے مؤذن بھی تھے، امام بھی، میرے ہاتھ مین کتاب دیکھکر کہا یہ کیا ہے، مین نے ہاتھ بڑھاکر حوالہ کردی، انھون نے ایک مسألہ پر نظر ڈالی جسپر لکھا تھا، قال النعمان، اذان کہکر کھڑے کھڑے پہلا حصہ پڑھ لیا، پڑھکر کتاب آستین مین رکھ لی، پھر تکبیر کہکر نماز پڑھی، نماز پڑھکر کتاب نکالی اور سب پڑھ لی، دیکھکر کہا یہ نعمان بن ثابت کون ہین، مین نے کہا ایک شیخ ہین جنسے عراق مین ملاقات ہوئی تھی، کہا بڑی شان کے شیخ ہین، جاؤ اور اُن سے بہت سا فیض حاصل کرو، مین نے کہا یہ وہی ابوحنیفہ ہین جنسے مجھکو آپ نے روکا تھا، مسعر بن کدام کا قول ہے، کوفے مین صرف دو آدمیون پر مجھکو حسد ہے، ابوحنیفہ پر اُن کے فقہ کی وجہ سے اور حسن بن صالح پر اُن کے زہد کی وجہ سے، ابراہیم سے روایت ہے، کہ ایک بار ہم مسعر بن کدام کے پاس بیٹھے تھے کہ ابوحنیفہ وہان سے گذرے، تھوڑی دیر ٹھہرکر مسعر کو سلام کیا، اور چلے گئے، کسی نے کہا ابوحنیفہ کس قدر جھگڑالو ہین، یہ سنکر مسعر سنبھلکر بیٹھ گئے، اور کہا سمجھکر بات کرو، مین نے ابوحنیفہ کو جس کسی سے بحث کرتے دیکھا اونہی کو غالب پایا، اسرائیل کا قول ہے کہ نعمان اچھے آدمی تھے، اُن سے زیادہ کسی کو وہ حدیثین یاد نہ تھین جنمین فقہ ہے، نہ ان سے زیادہ کسی نے کاوش کی تھی، نہ اُن سے زیادہ حدیث کی فقہ کا کوئی جاننے والا تھا، انھون نے حدیثین حماد سے یاد کی تھین، اور خوب یاد کی تھین، اسی لئے خلفا و امرا، وزرا نے ان کی عزت کی، جو شخص فقہ مین ان سے بحث کرتا اس کی جان مشکل مین پڑجاتی، مسعر کا قول تھا کہ جو کوئی اپنے اور اللہ کے درمیان ابوحنیفہ کو واسطہ کریگا، مجھکو امید ہے کہ اس کو خوف نہ ہوگا، اور اُس نے احتیاط کا حق ادا کردیا ہوگا، عبدالرزاق کا بیان ہے کہ ہم معمر کے پاس تھے کہ ابن المبارک پہنچے، ان کے آنے پر معمر نے کہا، مین کسی شخص کو نہین جانتا جو فقہ پر ابوحنیفہ

سے زیادہ معرفت کے ساتھ کلام کر سکے، یا اُن سے زیادہ قیاس پر اور لوگوں کے لئے فقہ کی راہیں کھولنے پر قادر ہو،
نہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو اسپر خائف پایا کہ اللہ کے دین میں کوئی بات بے تحقیق داخل کریں، ابو جعفر کا قول ہے کہ میں نے
ابو حنیفہ سے زیادہ فقیہ اور پارسا کسی کو نہیں دیکھا فضیل بن عیاض کا قول ہے، ابو حنیفہ مرد فقیہ تھے فقہ میں معروف
پارسائی میں مشہور، بڑے دولتمند، ہر صادر و وارد کے ساتھ بہت سلوک کرنے والے شب و روز صبر کے ساتھ تعلیم میں
مصروف رہتے، رات اچھی گذارنے والے، خاموشی پسند، کم سخن، جب کوئی مسائلہ حلال یا حرام کا پیش آتا تو کلام
کرتے اور ہدایت کا حق ادا کر دیتے، سلطانی مال سے بھاگنے والے، ابن صباح نے ابن مکرم کی حدیث پر فضیل بن
عیاض کا یہ قول اور زیادہ کیا ہے، جس وقت کوئی مسئلہ اُن کے سامنے آتا تو اس کے باب میں اگر کوئی صحیح حدیث ہوتی
تو اس کی پیروی کرتے، اگرچہ وہ صحابہ یا تابعین کی حدیث ہوتی ورنہ قیاس کرتے اور بہت اچھا قیاس کرتے، ابو یوسف
کا قول ہے، میں نے حدیث کے معنی یا حدیث کے فقہی نکات جاننے والا ابو حنیفہ سے زیادہ نہیں دیکھا، ان کا یہ بھی
قول ہے کہ میں نے جس مسائلہ میں ابو حنیفہ سے مخالفت کی اور پھر غور کیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ ان کا مذہب آخرت کی نجات کے
واسطے زیادہ کارآمد تھا، میں اکثر حدیث کی جانب جھکتا حال یہ تھا کہ وہ حدیث صحیح میں مجھ سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے،
ان کا یہ بھی قول تھا کہ میں ابو حنیفہ کے لئے اپنے باپ سے پہلے دعا کرتا ہوں، حماد بن زید کا قول ہے کہ میں نے حج کا
ارادہ کیا، اور ایوب کے پاس رخصت ہونے گیا، انھوں نے کہا، میں نے سنا ہے کہ اہل کوفہ کے فقیہ مرد صالح یعنی
ابو حنیفہ، اس سال حج کو آئیں گے، جب ان سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا، ابوبکر بن عیاش کا قول ہے کہ سفیان کے بھائی
عمر بن سعید کا انتقال ہوا تو سفیان کے پاس ہم تعزیت کے لیے گئے، مجلس آدمیوں سے بھری ہوئی تھی، عبد اللہ بن
ادریس بھی وہاں تھے، اسی عرصے میں ابو حنیفہ مع اپنی جماعت کے وہاں پہنچے، سفیان نے ان کو دیکھا تو اپنی جگہ خالی
کی، کھڑے ہو کر ان سے معانقہ کیا، اپنی جگہ اُن کو بٹھایا، خود سامنے بیٹھے، یہ دیکھکر مجھ کو سخت غصہ آیا، ابن ادریس نے
مجھ سے کہا، کمبخت دیکھتا نہیں، ہم یہاں تک بیٹھے رہے کہ آدمی متفرق ہو گئے، اب میں نے سفیان سے کہا کہ اے ابو عبد اللہ
آج آپنے ایک ایسا کام کیا جو مجھکو برا معلوم ہوا، نیز ہمارے دوسرے ساتھیوں کو، پوچھا کیا بات، میں نے کہا آپکے

پس ابوحنیفہ آئے ان کے لئے آپ کھڑے ہوئے اپنی جگہ بٹھایا، ان کے ادب مین مبالغہ کیا یہ ہم لوگون کو ناپسند ہوا، لہاتم کو یہ کیون ناپسند ہوا، وہ علم مین ذی مرتبہ شخص ہین، اگر مین اُن کے علم کے لئے نہ اٹھتا توان کے سن وسال کے لئے اٹھتا، اور اگر ان کے سن وسال کے لیے نہ اٹھتا توان کی فقہ کے واسطے اٹھتا، اگر فقہ کے لئے نہ اٹھتا توان کے تقویٰ کے واسطے اٹھتا، راوی کا بیان ہے کہ انھون نے مجھکو ایسا ساکت کیا کہ جواب نہ بن آیا، ابومطیع کا قول ہے کہ مین نے کسی محدث کو سفیان ثوری سے زیادہ فقیہ نہین دیکھا، ابوحنیفہ ان سے بھی زیادہ فقیہ تھے، یزید بن ہارون نے اس سوال کے جواب مین کہ دونون مین کون زیادہ فقیہ ہے، کہا سفیان ثوری حفظِ حدیث مین بڑھے ہوئے ہین، ابوحنیفہ فقہ مین، ایسا ہی ایک قول ابوعاصم نبیل کا ہے،

ابن المبارک کا قول ہے کہ اگر حدیث معلوم ہو اور رائے کی ضرورت ہو تو مالک، سفیان، اور ابوحنیفہ کی رائے ماننی چاہئے، ابوحنیفہ کی نظر زیرکی مین ان سے بہتر اور باریک تر ہے، فقہ مین زیادہ گہری جاتی ہے، اور وہ ان تینون مین زیادہ فقیہ ہین، ان کان الاثر قد عرف واحتیج الی الرای فرای مالک وسفیان وابی حنیفۃ وابو حنیفۃ احسنھم وادقھم فطنۃ واغوصھم علی الفقہ وھو افقہ الثلاثۃ،

محمد بن بشر کا قول ہے کہ مین ابوحنیفہ اور سفیان ثوری دونون کے پاس جاتا تھا، جب ابوحنیفہ کے پاس جاتا پوچھتے کہان سے آئے، سفیان کا نام سنکر کہتے، تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو کہ اگر آج علقمہ اور اسود زندہ ہوتے توسفیان کے محتاج ہوتے، جب سفیان سوال کے جواب مین سنتے کہ ابوحنیفہ کے پاس سے آیا ہون، تو کہتے تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو جو روئے زمین پر سب سے زیادہ فقیہ ہے، عبداللہ بن داؤد الخریبی کا قول ہے کہ اہل اسلام پر واجب ہے کہ نماز کے بعد ابوحنیفہ کے حق مین اس حفاظت کے صلے مین جو انھون نے سنت اور فقہ کی کی ہے، دعاے خیر کرین، نضر بن شمیل کا قول ہے کہ لوگ علم فقہ سے غافل تھے، ابوحنیفہ کی عقدہ کشائی تشریح وتلخیص نے چونکا دیا، یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ مین نے یحیی القطان کو کہتے سنا، ہم اللہ کا نام لے کر جھوٹ نہ بولینگے ہم ابوحنیفہ کی رائے مین سے اکثر چیزین اختیار کر لیتے ہین، یہ بھی ان کا قول یحییٰ بن معین نے نقل کیا ہے کہ ہم

خدا کا نام لیکر جھوٹ نہ بولین گے، ابو حنیفہ سے بہتر رائے ہم نے کسی کی نہین پائی، اور ہم نے ان کے اکثر اقوال اختیار کرلیے ہین، یحییٰ بن معین کہتے ہین، کہ یحییٰ بن سعید (قطان) فتوی مین کوفیون کے قول کی جانب جاتے تھے، اور کوفیون کے اقوال مین سے ابو حنیفہ کا قول لیتے تھے، اور اُن کے معاصرون مین سے ان کی رائے کا اتباع کرتے تھے، امام شافعی کے حسب ذیل اقوال فقہ حنفی کے متعلق نقل کئے ہین،

الناس عیال علی ابی حنیفۃ فی الفقہ — لوگ فقہ مین ابو حنیفہ کے محتاج ہین،

ما رأیت افقہ من ابی حنیفۃ — مین نے ابو حنیفہ سے بڑھکر فقیہ نہین دیکھا،

جو شخص فقہ مین متبحر ہونے کا ارادہ کرے وہ ابو حنیفہ کا محتاج ہے،

کان ابو حنیفۃ ممن وفق لہ الفقہ — ابو حنیفہ ان لوگون مین سے تھے جنکو فقہ مین حق کے ساتھ موافقت بخشی گئی ہے،

جو شخص فقہ سیکھنا چاہے اسکو ابو حنیفہ اور ان کے شاگردون کا دامن پکڑنا چاہئے، اس لئے کہ سارے انسان فقہ مین ابو حنیفہ کے محتاج ہین،

یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ میرے نزدیک قرأت حمزہ کی قرأت ہے اور فقہ ابو حنیفہ کی فقہ ہے، سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ میرا گمان یہ تھا کہ ۲ چیزین کوفے کے پل کے اودھر نہ جائنگی، مگر وہ آفاق پر چھا گئین، حمزہ کی قرأت، اور ابو حنیفہ کی رائے، جعفر بن الربیع کا قول ہے، پانچ سال مین ابو حنیفہ کے پاس رہا اُن سے زیادہ خاموش آدمی مین نے نہین دیکھا، جب کوئی مسئلہ پیش آتا اس وقت کھلتے اور سیل دریا کی طرح روان ہوتے حکم بن ہشام الثقفی سے کسی نے ابو حنیفہ کی نسبت رائے پوچھی تو انھون نے کہا، ابو حنیفہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلے سے نہین نکالتے تھے جب تک کہ وہ خود اسی دروازہ سے نہ نکل جائے، جس سے وہ داخل ہوا تھا، وہ بہت بڑے امین تھے، ہمارے سلطان نے چاہا کہ اُن کو خزانے کی کنجیان سپرد کردے، نہ ماننے کی صورت مین دُرون کی دھمکی دی، انھون نے انسانی عذاب کو بمقابلہ اللہ کے عذاب کے پسند کیا، ابن مزاحم کا قول ہے، ابو حنیفہ اکثر یہ کہا کرتے

ے، اللھم من ضاق بنا صدرہ فان قلبی بنا قد اتسعت لہ، بار الٰہا جو لوگ ہماری طرف سے تنگدل
ہیں، ہمارے دل ان کے لئے کشادہ ہیں، حسن بن زیاد اللؤلوی کا قول ہے، مین نے ابوحنیفہ کو یہ کہتے ہوئے سنا
ہ اقوال رائے ہیں، اور وہ ہماری قدرت کی بہترین صورت ہے، جو اس سے بہتر بیان کرے وہ ہم سے زیادہ باصواب ہے،
وکیع کا قول ہے کہ ایک روز مین ابوحنیفہ کے پاس گیا تو وہ سر جھکائے ہوئے غور کر رہے تھے، مجھ کو دیکھکر کہا کہاں سے
آئے، مین نے کہا، شریک کے پاس سے، یہ سنکر سر اٹھایا اور یہ شعر پڑھے،

ان یحسدونی فانی غیر لائمھم قبلی من الناس اھل الفضل قد حسدوا

فدام لی ولھم مابی ومابھم ومات اکثرنا غیظاً بما یجد

اگر لوگ مجھ پر حسد کرتے ہیں تو کرین مین انکو ملامت نہین کرنے کا، مجھ سے پہلے بھی انسانون مین سے اہل فضل
پر حسد کیا گیا ہے، وہ اپنے حال پر قائم رہین، مین اپنے حال پر، ہم مین سے اکثر حالات پر غصہ کھا کر مر گئے ہین، یہ بیان کرکے
وکیع نے کہا کہ میرا گمان ہے کہ شریک کی طرف سے کوئی بات ابوحنیفہ کے کان تک پہنچی تھی،

ایک اور قول جو اس موقع کے مناسب ہے ہم تاریخ خطیب کے ایک دوسرے مقام سے (امام ابویوسف کے
حالات مین سے) یہان نقل کرتے ہین،

ایک روز وکیع کی مجلس مین کسی نے کہا ابوحنیفہ نے خطا کی، وکیع نے کہا ابوحنیفہ کس طرح خطا کر سکتے ہین حالانکہ
ابویوسف و زفر جیسے صاحب قیاس، اور یحیی بن زائدہ اور حفص بن غیاث اور حبان اور مندل جیسے حافظان حدیث،
اور القاسم بن معن سا لغت اور ادب کا جاننے والا، اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و پارسا ان کے
ساتھ ہین جس کے ایسے ہمنشین ہون وہ غلطی نہین کر سکتا اگر کبھی غلطی کر جائے اس کے جلیس رد کر دینگے،

جرح | ۴۴ صفحات پر مناقب بیان کرنے کے بعد خطیب نے وہ اقوال لکھے ہین جو امام صاحب کے خلاف کہے گئے
ہین، ان اقوال کو نقل کرنے سے پہلے خطیب نے یہ تمہید بیان کی ہے،

والمحفوظ عند نقلۃ الحدیث عن ھؤلاء المذکورین منھم فی ابی حنیفۃ خلاف

ذلک وکلام مهم فیه کثیر لامور شنیعة حفظت علیه یتعلق بعضها باصول الدیانات

وبعضها بالفروع نحن ذاکروها، بمشیة الله ومعتذرون علی من وقف علیها وکره

سماعها بان ابا حنیفة عندنا مع جلالة قدرہ اسوة غیرہ من العلماء الذین دونا ذکرہم

فی هذا الکتاب واوردنا اخبارہم وحکینا اقوال الناس فیہم علی تباینها والله الموفق للصواب

"ناقلانِ حدیث کے یہاں ائمۂ مذکورین کے ایسے اقوال بھی ابوحنیفہ کے متعلق محفوظ ہین جو بیانِ بالا کے خلاف ہین، اور انھون نے ان کی بابتہ کلام بہت کیا ہے، اس کلام کے باعث وہ امور شنیعہ ہین جو ان کے متعلق محفوظ ہین ان مین سے بعض تو اصول دین کے متعلق ہین، بعض فروع کے متعلق، ہم انشاء اللہ ان کا ذکر کرینگے، جو لوگ اسکو سنکر ناپسند کرین ان سے ہم معذرت کرتے ہین کہ ہم ابوحنیفہ کی جلالتِ قدر کے قائل ہین تاہم ان کو اس بارہ مین دوسرے علماء کی طرح سمجھتے ہین کہ ان کے خلاف جو باتین بیان کی گئی ہین، ان کو بھی ہم بیان کر دین، جیسا کہ ہم نے دوسرے علماء کے ذکر مین کیا ہے،

اس تمہید کے بعد اقوال خلاف بیان کئے گئے ہین جو ۵ صفحات پر پھیلے ہوئے ہین،

یہ امور شنیعہ جیسا کہ خود خطیب نے بیان کیا ہے بعض تو ان مین سے عقائد کے متعلق ہین بعض فروع کے متعلق

عقائد کے متعلق حسب ذیل اقوال ہین،

یہودی، مشرک، زندیق، دہری، صاحب ہوا، ان سے کفر سے دوبار توبہ کرائی گئی، مرجیہ جہمی، خلق قرآن کے قائل، اصحاب ابوحنیفہ کا شبیہ بالنصاری ہونا،

فروع کے متعلق حسب ذیل اقوال ہین،

خروج علی السلطان، تقیہ کرنا، زنا کا حلال کر دینا، ربوٰ کا حلال کر دینا، خونریزی حلال کر دی، سنن کی کساد بازاری کی، علیٰ ہذا القیاس،

یہ واضح رہے کہ جرحین سب کی سب غیر مفسر اور غیر مبین السبب ہین، ان کے راویون کی عدالت کی توثیق

خطیب نے نہین کی ہے، یہ دونون امر اصولاً لازم ہین،

مناسب ہوگا، کہ امام صاحب پر جو جرحین کیگئی ہین اس موقع پر ایک تحقیقی نظر اُن پر ڈالی جائے، بحث کے دو پہلو ہو سکتے ہین، نقلی و عقلی، نقلی بحث یہ ہے کہ خود خطیب ان جرحون کی ذمہ داری لینے پر تیار نہین، چنانچہ انکے نقل کرنے سے پہلے جو تمہید لکھی ہے وہ اس کی شاہد ہے جرحین نقل کرنے کی معذرت یہ کی ہے کہ چونکہ وہ روایت کیگئی ہین اور تمام علما کے متعلق وہ موافق و مخالف امور کی نقل کرتے آئے ہین، اسلئے ان اقوال کو بھی نقل کرتے ہین، اسکے ساتھ امام صاحب کی جلالتِ قدر کو مانتے ہین، ظاہر ہے کہ اگر مذکورہٗ بالا جرحون مین سے فرع یا عقائد کے متعلق ایک جرح بھی ان کے نزدیک ثابت ہوتی تو جلالت قدر درکنار امام صاحب کی قدر بھی ان کے دل مین نہ ہونی چاہئے تھی، اس کے علاوہ جرحین نقل کرنے کے ساتھ ساتھ جابجا ان کے تردیدی اقوال بھی نقل کرتے جاتے ہین، حالانکہ جرح مین تعدیل کے ذکر کا موقع نہ تھا کہ باب تعدیل و مناقب ختم ہو چکا تھا، مثلاً خلق قرآن کے عقیدہ کے روایت بیان کرنے کے بعد امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا ہے، لم یصح عندنا ان اباحنیفۃ کان یقول القرآن مخلوق، ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہین کہ ابوحنیفہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل تھے، اس کے بعد جوزجانی اور معلی بن منصور کا قول نقل کیا ہے "یقولان ما تکلم ابوحنیفۃ ولا ابویوسف ولا زفر ولا محمد ولا احد من اصحابھم فی القرآن وانما تکلم بشر المریسی و ابن ابی داؤد فھؤلاء شانوا اصحاب ابی حنیفۃ۔ ان دونون کا قول تھا کہ نہ ابوحنیفہ نے نہ ابویوسف نے نہ زفر نے نہ محمد نے اور نہ اورکسی نے ان مین سے قرآن مین کلام کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ بشر مریسی اور ابن ابی داؤد نے کلام کیا ہے، اور اصحاب ابوحنیفہ کو بدنام، خود امام صاحب کا ایک قول نقل کیا ہے، ایک بار عبد اللہ بن المبارک ابوحنیفہ کے پاس گئے، پوچھا کہ تم لوگون مین یہ کیا چرچا ہو رہا ہے، جواب دیا ایک شخص جہم نامی کا چرچا ہے، پوچھا کیا کہتا ہے، کہا کہتا ہے، القرآن مخلوق، انھون نے سنکر یہ آیت پڑھی، کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا، جنت اور نار کے غیر موجود ہونے کی جرح نقل کر کے خطیب کہتے ہین کہ قول بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ خود راوی

ابومطیع اس کا قائل تھا، ابوحنیفہ نہ تھے، امام احمد بن حنبل کی طرف جو جرح امام صاحب کے کذاب ہونے کی منسوب ہے اس کو نقل کرکے لکھا ہے کہ یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ آیا ابوحنیفہ ثقہ ہین، قال نعم ثقۃ ثقۃ، کہا ہان ثقہ ہین ثقہ ہین، دوسرا قول اُن کا یہ نقل کیا ہے، کان ابوحنیفۃ ثقۃ لایحدث بالحدیث الا ما یحفظ ولا یحدث بما لا یحفظ، ابوحنیفہ ثقہ تھے، وہی حدیث روایت کرتے جو ان کو بخوبی یاد ہوتی اور جو بخوبی یاد نہ ہوتی، اسکو روایت نہ کرتے، ان مراتب پر غور کرنے کے بعد صرف یہی راے قائم ہوسکتی ہے کہ خطیب نے مخالف اقوال نقل کرنے مین اپنا مورخانہ فرض ادا کیا ہے، خود اُن کے وہ قائل نہ تھے، یا یہ کہئے کہ وہ خود ان کی رائے نہ تھی،

اس کے بعد ہم اصول حدیث کی مستند کتابون سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہین، کتاب[ا] المغنی للشیخ طاہر پٹنی صاحب مجمع البحار کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو، جو جرح بالا کا جواب شافی ہے، یہ واضح رہے کہ یہ نیز بعد کے آنے والے جوابات کسی حنفی کے لکھے ہوے نہین ہین، سب غیر حنفیون کے ہین، ترجمہ ملاحظہ ہو،

"امام ابوحنیفہ کی طرف ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہین جنسے ان کی شان بالاتر ہے، وہ اقوال خلق قرآن، قدر، ارجا، وغیرہ ہین، ہم کو ضرورت نہین کہ ان اقوال کے منسوب کرنے والون کے نام لین، یہ ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ کا دامن ان سے پاک تھا، اللہ تعالیٰ کا ان کو ایسی شریعت کا دینا جو سارے آفاق مین پھیل گئی، اور جسنے روے زمین کو ڈھک لیا، اور ان کے مذہب و فقہ کا قبول عام ان کی پاکدامنی کی دلیل ہے، اگر اسمین اللہ تعالیٰ کا سر خفی نہ ہوتا، نصف[۲] یا اس کے قریب اسلام ان کی تقلید کے جھنڈے کے نیچے نہ ہوتا، یہان تک کہ ہمارے زمانے تک جسکو ساڑھے چارسو برس ہوچکے،

[ا] شیخ موصوف نے یہی عبارت مجمع البحار کے خاتمے مین بھی نقل کی ہے،

[۲] ملاعلی قاری نے مرقاۃ المفاتیح مین اپنے زمانے کے (یعنی گیارہوین صدی کے) حنفیون کا اندازہ بر بنا رآبادی روم اور ماوراء النہر اور ہندوستان کے کل اہل اسلام مین دو ثلث ہونے کا کیا ہے، اور یہ قرین قیاس ہے، (دیکھو کتاب مذکور کا میرے یہان کا قلمی نسخہ ورق ۱۲ صفحہ دوم)

(معلوم ہوتا ہے کہ کاپی نویس نے تسعمائة کو اربعمائة کر دیا ہے) ان کے فقہ کے مطابق اللہ کی عبادت ہو رہی ہے، اور اُن کی رائے پر عمل ہو رہا ہے، اس میں اُن کی صحت کی اوّل درجے کی دلیل ہے، اور ابو جعفر طحاوی نے (جو ان کے مذہب کے سب سے زیادہ اخذ کرنے والوں میں ہیں) ایک کتاب مسمّیٰ بہ عقیدہ ابو حنیفہ لکھی ہے، یہی عقیدہ اہل سنت کا ہے، (خاکسار شروانی کہتا ہے کہ عقائد نسفی بھی اس کی تائید میں پیش کیجا سکتی ہے، جو آج عقائد کی مدار علیہ کتاب ہے) اس میں کوئی عقیدہ ان عقیدوں میں سے موجود نہیں جو ابو حنیفہ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، طحاوی نے اس کا سبب بھی لکھا ہے کہ کیوں وہ قول اُن کی طرف منسوب کئے گئے، ہم کو ان کے ذکر کرنے کی اسلئے حاجت نہیں کہ ابو حنیفہ کی شان کا آدمی اور ان کا مرتبہ جو اسلام میں ہے اس کا محتاج نہیں کہ انکی طرف سے کوئی معذرت کیجائے" (المغنی صفحہ ۳۳۴ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی، حاشیہ تقریب التہذیب)

خیال بالا کی تائید خود خطیب نے بھی کی ہے، وہ اپنی اصولِ حدیث کی کتاب الکفایہ فی علم الروایہ میں جرح کے قاعدہ کے تحت امام مالک بن انس و امام سفیان ثوری سے شروع کر کے یحییٰ بن معین تک ایک طبقہ قائم کرتے ہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں، "اور جو اصحاب بلندیِ ذکر، استقامتِ حال، اور صداقت کی شہرت اور بصیرت و فہم میں اصحاب بالا کی مثل ہوں اُن کی عدالت کی بابت سوال نہیں کیا جاسکتا" اسی سلسلے میں یہ روایت لکھی ہے کہ امام احمد بن حنبل سے اسحٰق بن راہویہ کی بابت سوال کیا گیا تو جواب میں کہا کہ کیا اسحٰق بن راہویہ کی شان کے آدمی کی نسبت سوال کیا جاسکتا ہے، ایسا ہی ایک قول یحییٰ بن معین کا ابو عبید کے بارہ میں روایت کیا ہے، (دیکھو الکفایہ فی علم الروایۃ صفحہ ۱۱۳ و ۱۴۴، میرے کتبخانے کا قلمی نسخہ) کتاب مذکور میں خطیب نے یہ روایت کر کے کہ جرح وہی مقبول ہوگی جو شرح کر دی ہو لکھا ہے کہ یہی قول ہمارے نزدیک صحیح ہے، اور یہی مذہب حفاظ حدیث میں اماموں کا ہے، یہ لکھکر امام بخاری و امام مسلم وغیرہما کے احتجاج کی مثالیں دی ہیں (دیکھو الکفایہ صفحہ ۱۱۲) اب اس قاعدے کی کسوٹی پر اگر ان جرحوں کو آپ کسیں گے جو خطیب نے تاریخ میں امام اعظم کے متعلق غیر مشرح نقل کی ہیں تو صاف عیاں ہو جائیگا کہ وہ خود ان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں، اسلئے کہ جب اس طبقے کی عدالت سوال سے بالاتر ہے جس میں اسحٰق بن

راہویہ ہیں تو امام صاحب کی عدالت تو اس سے بدرجہا بالاتر ہے، جب اسحٰق بن راہویہ کی شان کے آدمی کی نسبت تقول امام احمد بن حنبل سوال نہیں کیا جاسکتا ہے تو امام اعظم کی شان تو اس سے بہت زیادہ ارفع ہے،

شیخ الاسلام سبکی نے کتاب طبقات الشافعیہ میں ایک لطیف بحث جرح وتعدیل کے متعلق لکھی ہے، جسکا خلاصہ یہ ہے، "جرح وتعدیل کا ایک ضروری ونافع قاعدہ . . . . . ہمارے نزدیک قول صواب یہ ہے کہ جس کی امامت وعدالت ثابت ہو اور جسکی تعدیل وتزکیہ کرنے والے بہت ہوں، جرح کرنے والے نادر اور اس بات کا قرینہ ہو کہ سبب جرح تعصب مذہبی وغیرہ ہے، تو ہم جرح کی طرف التفات نہ کریں گے، تعدیل کو مان لیں گے، ورنہ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے اور ہم جرح کو تعدیل پر علی الاطلاق مقدم کرنا شروع کر دیں تو کوئی امام المرادین میں سے اسکی زد سے نہ بچیگا، اس لئے کوئی امام نہیں جس پر طعن کرنے والوں نے طعن نہ کیا ہو اور اسکی وجہ سے ہلاک ہونے والے ہلاک نہ ہوئے ہوں، عبدالبر کہتے ہیں، صحیح اس معاملے میں یہ ہے کہ جس شخص کی عدالت اور علم میں اسکی امامت اور علم کی جانب توجہ ثابت ہو اس کے متعلق ہم کسی کے قول کیجانب التفات نہ کریں گے، مگر اُس صورت میں کہ صاف عادل جرح قانون شہادت کے مطابق مستند ہو، ان کا استدلال یہ ہے کہ سلف میں بعض کا کلام بعض پر رہا ہے بعض حالتوں میں وہ تعصب یا حسد پر مبنی ہے بعض صورتوں میں تاویل واختلاف اجتہاد اسکا باعث ہوا ہے، حالانکہ جس کی نسبت کلام کیا جاتا ہے وہ اس سے پاک ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ تاویل واجتہاد کی بنیاد پر ایک نے دوسرے پر تلوار چلوادی ہے،

اس کے بعد ابن عبدالبر نے معاصرین کی جماعت کے ایک دوسرے کی نسبت کلام کرنے کا ذکر اور کہا ہے کہ اسکی طرف التفات نہ کیا جائے، اسی بحث میں یحییٰ بن معین کی جرح کا ذکر آتا ہے جو امام شافعی اور کہا ہے کہ یہ ابن معین کے لیے ناپسندیدہ اور عیب تھا اسی سلسلے میں یحییٰ بن معین کے متعلق امام احمد بن حنبل قول نقل کیا ہے، "هو لا يعرف الشافعي ولا يعرف بالقول الشافعي ومن جهل شيئا عاداه" شافعی کو جانتے ہیں اور نہ شافعی کے کلام کو سمجھتے ہیں، اور قاعدہ ہے کہ انسان جو نہیں سمجھتا اس کا دشمن ہو جاتا

گے جاکر لکھتے ہین کہ کسی نے ابن المبارک سے کہا کہ فلان شخص ابو حنیفہ پر اعتراض کرتا ہے، انھون نے یہ شعر پڑھا،

حسدوا ان رأوک فضلک اللہ   بما فضلت بہ النجباء

لوگون نے یہ دیکھکر تجھ سے حسد کیا کہ اللہ نے تجھ پر وہ نوازش کی جو شرفا پر ہوتی ہے،

اور یہ وہ اصول ہے جس پر تمام علما کا اجماع ہے، چنانچہ ان کا قول ہے کہ جرح جب تک مفسر نہ ہو مقبول ہوگی، شیخ الاسلام سید المتاخرین تقی الدین ابن دقیق العید نے اپنی کتاب الاقتراح مین لکھا ہے کہ اعراض لمسلمین حفرۃ من حفر النار وقف علی شفیرھا طائفتان من الناس، المحدثون والحکام، مسلمانون کی عزتین جہنم کے گڑھون مین سے ایک گڑھا ہین جس کے کنارہ پر دو گروہ کھڑے ہوئے ہین، ایک محدثین دوسرے حکام، ہمارے پاس دو اصول ہین جنکو ہم پکڑے رہین گے، جب تک کہ ان کے خلاف قطعی یقین نہ ہوجائے ایک اصول اس امام مجروح کی عدالت ہے جس کی عظمت قائم ہو چکی ہے، دوسرا اصول جارح کی عدالت جو جرح کرتا ہے، لہذا ایسے امام کی جرح کی جانب توجہ نہ کیجائیگی نہ اس جرح سے وہ مجروح کیا جائے گا، اس قاعدہ کو یاد رکھو یہ بہت ضروری قاعدہ ہے" انتہی طبقات الشافعیہ خلاصۃً- جز اول (مطبوعہ مصر مطبع الحسینیہ) ص۱۸۸-۱۸۸،

امام سبکی کے آخر الذکر قاعدے کی تائید امام نووی نے بھی اپنے رسالہ اصول حدیث التقریب کی نوع الثالث والعشرین مین کی ہے، حافظ ابن صلاح نے لکھا ہے "جکی عدالت اہل نقل یا ان کی امثال اہل علم مین مشہور ہو اس کے ثقہ اور امین ہونے کی تعریف عام ہو تو اس کی عدالت پر کسی کی شہادت کی ضرورت نہین، یہی مذہب صحیح شافعی کا ہے، اور اسی پر فن اصول فقہ مین اعتماد ہے، ابو بکر خطیب نے یہی قول اہل حدیث کا نقل کیا ہے، اور ایسے بزرگون کی مثال مین مالک، شعبہ، سفیانین، اوزاعی، لیث، ابن المبارک، وکیع، احمد بن حنبل، یحیی بن معین، وامثالہم کے نام لئے ہین، صرف ان لوگون کی عدالت سے سوال کیا جائیگا جنکا حال مخفی ہو، . . . . رہی جرح وہ صرف ایسی مقبول ہوگی جو مشرح ہو اور طالبین کے لیے اس کا سبب بیان کیا گیا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس مین مختلف الخیال ہین، کہ کون سی بات جارح ہے اور کونسی نہین، ان مین سے کوئی کسی ایسی وجہ کی بنیاد پر جرح کردیتا ہے

راہویہ ہین تو امام صاحب کی عدالت تو اس سے بدرجہا بالاتر ہے، جب اسحٰق بن راہویہ کی شان کے آدمی کی نسبت ا
امام احمد بن حنبل سوال نہین کیا جاسکتا ہے تو امام اعظم کی شان تو اس سے بہت زیادہ ارفع ہے،

شیخ الاسلام سبکی نے کتاب طبقات الشافعیہ مین ایک لطیف بحث جرح وتعدیل کے متعلق لکھی ہے، جو
یہ ہے، "جرح وتعدیل کا ایک ضروری ونافع قاعدہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے نزدیک قول صواب یہ ہے کہ جس کی ا
وعدالت ثابت ہو اور جسکی تعدیل وتزکیہ کرنے والے بہت ہون، جرح کرنے والے نادر اور اس بات کا قرینہ ہو کہ
جرح تعصب مذہبی وغیرہ ہے، تو ہم جرح کی طرف التفات نہ کرین گے، تعدیل کو مان لین گے، ورنہ اگر یہ درو
کھولدیا جائے اور ہم جرح کو تعدیل پر علی الاطلاق مقدم کرنا شروع کردین تو کوئی امام ائمۂ دین مین سے اسکی زد سے
بچیگا، اس لئے کوئی امام نہین جس پر طعن کرنے والون نے طعن نہ کیا ہو اور اسکی وجہ سے ہلاک ہونے والے ہلاک
نہ ہوئے ہون، عبدالبر کہتے ہین، صحیح اس معاملے مین یہ ہے کہ جس شخص کی عدالت اور علم مین اسکی امامت اور ع
جانب توجہ ثابت ہو اس کے متعلق ہم کسی کے قول کیجانب التفات نہ کرین گے، مگر اس صورت مین کہ صاف
جرح قانون شہادت کے مطابق مستند ہو، ان کا استدلال یہ ہے کہ سلف مین بعض کا کلام بعض پر رہا ہے بع
حالتون مین وہ تعصب یا حسد پر مبنی ہے، بعض صورتون مین تاویل واختلاف اجتہاد اسکا باعث ہوا ہے، حا
جس کی نسبت کلام کیا جاتا ہے وہ اس سے پاک ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ تاویل واجتہاد کی بنیاد پر ایک نے دو
پر تلوار چلوادی ہے،

اس کے بعد ابن عبدالبر نے معاصرین کی جماعت کے ایک دوسرے کی نسبت کلام کرنے کا ذکر
اور کہا ہے کہ اسکی طرف التفات نہ کیا جائے، اسی بحث مین یحیٰی بن معین کی جرح کا ذکر آتا ہے جو امام شافعی
اور کہا ہے کہ یہ ابن معین کے لیے ناپسندیدہ اور عیب تھا، اسی سلسلے مین یحیٰی بن معین کے متعلق امام احمد بن حنبل
قول نقل کیا ہے، "ھو لا یعرف الشافعی ولا یعرف بالقول الشافعی ومن جھل شیئا عاداہ" و
شافعی کو جانتے ہین اور نہ شافعی کے کلام کو سمجھتے ہین، اور قاعدہ ہے کہ انسان جو نہین سمجھتا اس کا دشمن ہوجاتا۔

گے جاکر لکھتے ہین کہ کسی نے ابن المبارک سے کہا کہ فلان شخص ابوحنیفہ پر اعتراض کرتا ہے، انھون نے یہ شعر پڑھا،

حسدوا ان رأوک فضلک اللہ بما فضلت بہ النجباء

لوگون نے یہ دیکھکر تجھ سے حسد کیا کہ اللہ نے تجھ پر وہ نوازش کی جو شرفا پر ہوتی ہے،

اور یہ وہ اصول ہے جس پر تمام علما کا اجماع ہے، چنانچہ ان کا قول ہے کہ جرح جب تک مفسر نہ ہو مقبول نہ ہوگی، شیخ الاسلام سید المتاخرین تقی الدین ابن دقیق العید نے اپنی کتاب الاقتراح مین لکھا ہے کہ اعراض المسلمین حفرۃ من حفر النار وقف علی شفیرھا طائفتان من الناس، المحدثون والحکام، مسلمانون کی عزتین جہنم کے گڑھون مین سے ایک گڑھا ہین جس کے کنارہ پر دو گروہ کھڑے ہوئے ہین، ایک محدثین دوسرے حکام، ہمارے پاس دو اصول ہین جنکو ہم پکڑے رہین گے، جب تک کہ ان کے خلاف قطعی یقین نہ ہوجائے، ایک اصول اس امام مجروح کی عدالت ہے جس کی عظمت قائم ہوچکی ہے، دوسرا اصول جارح کی عدالت جو جرح کرتا ہے، لہذا ایسے امام کی جرح کی جانب توجہ نہ کیجائیگی نہ اس جرح سے وہ مجروح کیا جائے گا، اس قاعدہ کو یاد رکھو کہ بہت ضروری قاعدہ ہے " انتہی طبقات الشافعیہ خلاصۃً۔ جز اول (مطبوعہ مصر مطبع الحسینیہ) صفحہ ۱۸۸،

امام سبکی کے آخر الذکر قاعدے کی تائید امام نووی نے بھی اپنے رسالہ اصول حدیث التقریب کی نوع الثالث والعشرین مین کی ہے، حافظ ابن صلاح نے لکھا ہے " جسکی عدالت اہل نقل یا ان کی امثال اہل علم مین مشہور ہو اس کے ثقہ اور امین ہونے کی تعریف عام ہو تو اس کی عدالت پر کسی کی شہادت کی ضرورت نہین، یہی مذہب صحیح شافعی کا ہے، اور اسی پر فن اصول فقہ مین اعتماد ہے، ابوبکر خطیب نے یہی قول اہل حدیث کا نقل کیا ہے، اور ایسے بزرگون کی مثال مین مالک، شعبہ، سفیانین، اوزاعی، لیث، ابن المبارک، وکیع، احمد بن حنبل، یحیی بن معین، وامثالہم کے نام لئے ہین، صرف ان لوگون کی عدالت سے سوال کیا جائیگا جنکا حال مخفی ہو، . . . . رہی جرح وہ صرف ایسی مقبول ہوگی جو مشرح ہو اور طالبین کے لیے اس کا سبب بیان کیا گیا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان آپس مین مختلف الخیال ہین، کہ کون سی بات جارح ہے اور کونسی نہین، ان مین سے کوئی کسی ایسی وجہ کی بنیاد پر جرح کردیتا ہے

جس کا وہ معتقد ہوتا ہے، حالانکہ فی الواقع وہ وجہ جرح نہین ہوتی، پس لازم ہے کہ سبب جرح بیان کیا جائے، تاکہ دیکھا جاسکے کہ آیا وہ جرح ہے بھی یا نہین، یہ کھلا ہوا اصول فقہ اور اصول فقہ مین مسلم ہے،

خطیب نے کہا ہے کہ یہی مذہب حفاظ حدیث مین اماموں کا ہے، جیسے کہ بخاری و مسلم وغیرہما ہیں، اسی لئے بخاری نے ایسی ایک جماعت سے روایت کی ہے جس پر ان سے قبل جرح ہو چکی تھی، مثلاً عکرمہ مولی ابن عباس رضی اللہ عنہ یہی عمل مسلم و ابو داؤد کا ہے، انتہی (مقدمہ ابن صلاح نوع ۲۳)

اصول مذکورہ بالا کی بنیاد پر ائمہ رجال نے اپنی کتابوں مین امام اعظم کے متعلق جرح کو غیر مقبول قرار دیکر اس کا نقل کرنا بالکل متروک کر دیا ہے، چنانچہ ذیل کے مستند ائمہ رجال کی کتابیں اسکی شاہد ہیں،

۱۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظم کے صرف حالات و مناقب لکھے ہیں، جرح ایک بھی نہیں لکھی، جو مختصر مناقب موضوع کتاب کے مطابق لکھ سکے ان کو لکھکر کہتے ہین کہ مین نے امام اعظم کے مناقب میں ایک کتاب جداگانہ لکھی ہے،

۲۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب مین جرح نقل نہین کی، حالات و مناقب لکھنے کے بعد ختم کلام اس دعا پر کیا ہے، مناقب ابی حنیفۃ کثیرۃ جداً فرضی اللہ عنہ و اسکنہ الفردوس آمین ۔" امام ابو حنیفہ کے مناقب بہت کثرت سے ہیں، ان کی جزا مین اللہ ان سے راضی ہو اور فردوس مین ان کو مقام بخشے، آمین"

۳۔ امام ممدوح نے تقریب التہذیب مین بھی کوئی جرح نقل نہین کی،

۴۔ حافظ صفی الدین خزرجی نے خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال مین صرف مناقب لکھے ہیں، جرح کا ذکر نہیں امام صاحب کو امام العراق و فقیہ الامۃ کے لقب سے یاد کیا ہے، واضح ہو کہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال کے مطابق چار کتابوں کے مطالب ہیں، خود خلاصہ، تذہیب امام ذہبی، تہذیب الکمال امام ابو الحجاج المزی، اور الکمال فی اسماء الرجال امام عبد الغنی المقدسی۔ اس طرح یہ مسلک جرح و تعدیل کے چار اماموں کا متفقہ مسلک ہے،

کتاب الکمال کی بابت حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب کے خطبے مین لکھتے ہین: کتاب الکمال فی اسماء الرجال…… من اجل المصنفات فی معرفۃ حملۃ الآثار وضعًا واعظم المعولات فی بصائر ذوی الالباب وقعًا، خطبے کے آخر مین مؤلف الکمال کی بابت لکھا ہے، ھو واللہ العدیم النظیر المطلع النحریر۔ تہذیب الاسماء واللغات مین امام نووی نے سات صفحے امام صاحب کے حالات مین لکھے ہین جنکا اکثر حصہ تاریخ خطیب بغدادی سے ماخوذ ہے، صرف مناقب لکھے ہین، جرح کا ایک لفظ نقل نہین کیا، مرآۃ الجنان مین امام یافعی شافعی نے امام صاحب کے حالات مین جرح نہین لکھی، حالانکہ تاریخ خطیب کے حوالے متعدد دیئے ہین، اس سے صاف واضح ہے کہ خطیب کی منقولہ جرح ان کی نظر مین ثابت نہ تھی، فقیہ ابن العماد الحنبلی نے اپنی کتاب شذرات الذہب مین صرف حالات ومناقب لکھے ہین، جرح نقل نہین کی؛

خلاصہ۔ مذکورۂ بالا مستند پندرہ کتابون کے، (جنمین سے پانچ اصول حدیث کی ہین، اور دس رجال کی) بیان سے صاف واضح ہے کہ جن امامون کی عدالت اور جلالتِ مرتبہ اہل علم واہل نقل کے نزدیک ثابت ہے ان کے مقابلے مین کوئی جرح مقبول ومسموع نہین، ایسے ائمہ کا جو طبقہ متاؔ امیش کیا گیا ہے وہ امام مالک سے لے کر امام اسحٰق بن راہویہ تک ممتد ہے، اصولِ حدیث کے فیصلے کا ماخذ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، حافظ ابن عبدالبر، و شیخ الاسلام ابن دقیق العید کے اقوال ہین، یہ بھی تصریح ہے کہ یہی مذہب و مسلک فن اصول فقہ مین معتمد اور اہل حدیث وحفاظ حدیث کا مقبول عام مذہب ہے، اسی اصول کے اثر سے متاخرین ائمۂ رجال نے امام اعظم کے متعلق جرح کا ذکر اپنی کتابون مین بالکل ترک کر دیا؛

غالبًا اس قدر بحث نقلی پہلو کے اثبات کے لیے کافی ہے، نقلی بحث کے بعد عقلی و مورخانہ بحث ملاحظہ ہو:

ہم اوپر بیان کر چکے ہین کہ امام صاحب کے متعلق خطیب بغدادی نے جس قدر جرحین نقل کی ہین، ان کا مآلِ کار خود ان کے قول کے مطابق صرف دو پہلو ہین، اصول دین کے متعلق یا فروع کے متعلق، ان جرحون کا وزن و اثر آپ نقلی بحث مین پڑھ چکے ہین، امام صاحب کے جو حالات و واقعاتِ زندگی خطیب نے نقل کئے

ہین ان کی نسبت کسی کی جرح نقل ہی نہین کی، لہذا وہ واقعات وحالات بجاے خود قائم ہین،

کسی تاریخی ہستی کی نسبت راے قائم کرنے کی مضبوط ترین بنیاد اس کے واقعات وحالات ہو سکتے ہین، اسی اصول پر ہم یہان بحث کرتے ہین،

امام صاحب کے جو حالات خطیب نے لکھے ہین ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصرین مین بہت سے اوصاف کے لحاظ سے فائق تھے، سب سے بڑا شرف اُن کی تابعیت تھی، اس کے بعد ان کی وہ عقل وفہم تھی جو قدرت نے ان مین مہات دین حل کرنے اور نکاتِ شریعت سمجھنے کی ودیعت رکھی تھی، دیکھو خطیب نے انکی "وفور عقل، تیز فہمی و باریک نظری" کے بیان کے لیے جداگانہ باب قائم کیا ہے، علی بن عاصم کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ اگر ابو حنیفہ کی عقل نصف اہل دنیا کی عقل سے تولی جائے تو ادنہی کا پلہ بھاری رہتا۔ خارجہ ابو مصعب ایک ہزار عالمون سے مل کر یہ فیصلہ کرتے ہین کہ ان مین جو تین یا چار عاقل تھے ان مین ایک ابو حنیفہ تھے، یزید بن ہارون بہت سے انسانون کو دیکھنے کے بعد کہتے ہین کہ مین نے ابو حنیفہ سے زیادہ عاقل کوئی نہین پایا، اوپر تم سن چکے کہ امام اعمش نے انکی تیز نظری کا اعتراف کیا تھا، ان کے کاروبار تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا، اس سلسلہ مین ان کی امانت، حوصلہ، حسن معاملہ، تدبیر، وغیرہ اوصاف تاجرانہ کی تصدیق واقعات کرتے ہین، "حسن معاملہ" کا باب مستقل خطیب نے قائم کیا ہے، خشیتِ الٰہی ثابت ہے، اپنے زمانہ مین سب سے زیادہ پارسا اور عابد ہونا ان کا مسلم ہے، حسنِ معاشرت، پاکیزہ صحبت، جود وسخاوت، بلند نظری، اولوالعزمی، مخلوق کی ہمدردی وغمخواری، اظہار حق مین جرأت، سلطانی عطایا سے بے نیازی، علم وعلما، کی بے غرضانہ خدمت عظیم، اور اس خدمت کی بدولت اپنے استاد امام وقت حماد بن ابی سلیمان کی نظر مین اولاد سے زیادہ عزیز ہونا، یہ وہ اوصاف ہین جنین کسی نے کلام نہین کیا، انہی اوصاف کے اجتماع نے ان کو معاصرین کے طبقے مین بہت بلند کر دیا تھا، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ وہ محسود الخلائق تھے، اور یہ ان کی محسودیت اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ ان کے حالات مین اس کا ذکر نمایان و مستقل ہے، قیس بن الربیع ان کے ذکر مین کہتے ہین، کان ابو حنیفۃ رجلا ورعا فقیھا محسوداً،

ابو حنیفہ مرد پارسا فقیہ و محسود تھے، تم حضرت ابن المبارک کا پڑھا ہوا شعر امام سبکی کے بیان میں پڑھ چکے جس میں معترض کے اعتراض کا منشا حسد ظاہر فرمایا ہے، خود امام صاحب نے جو شعر پڑھے تھے وہ شاہد ہیں کہ ان کے پاکیزہ قلب پر حاسدین کے حسد کا صدمہ تھا، حسن بن عمارہ کا قول ہے کہ لوگ ابو حنیفہ کی نسبت جو کلام کرتے ہیں، ان کا منشا حسد ہے، تفقہ میں ان کی فضیلت مسلم تھی، حضرت عبداللہ بن المبارک نے حسن بن عمارہ کا وہ قول نقل فرمایا ہے، جو وہ امام صاحب کی رکاب تھامے ہوئے کھڑے تھے، اس میں یہ بھی تھا کہ تم سے زیادہ بلیغ کلام فقہ میں کسی نے نہیں کہا، امام شافعی کے اقوال اس بارہ میں آپ پڑھ چکے، امام محمد بن حسن کے حالات میں امام احمد بن حنبل کا اعتراف پڑھ چکے، کہ دقت نظر امام محمد سے حاصل کی،

ان اوصاف کا دوگونہ اثر ہوا، امام صاحب کی احکام شرعیہ کی تحقیق اور ان کا اجتہاد معاصرین کی فہم سے بالاتر ثابت ہوا، فہم کی نارسائی باعث ہوئی اختلاف کا، اختلاف نے جرح کا رنگ اختیار کیا، اسی پر مبنی ہے، وہ جرح جو اہل حق نے امام صاحب کے متعلق اصول دین و فروع کی بنیاد پر کی ہے، تم اوپر اصول حدیث کا مسلمہ قاعدہ پڑھ چکے کہ اختلاف اجتہاد جس جرح کا منشا ہو وہ جرح نامقبول ہے، امام احمد بن حنبل نے فیصلہ فرما دیا۔ ومن جھل شیئاً عاداہ؟

دوسرا اثر حسد کے رنگ میں نمایاں ہوا، اصول حدیث نے دوسرا فیصلہ یہ صادر کیا کہ جو جرح حسد کے اثر سے ہو وہ بھی غیر مسموع ہے،

نظر کو بلند تر کیجئے کہ کیا امت مرحومہ کا سواد اعظم (جس کی تعداد کا اندازہ نصف یا دو ثلث اہل اسلام کیا گیا ہے) ایک یہودی زندیق یا مشرک کے تابع ہو گئی اور اپنی دنیا و آخرت کو اس کے دامن سے باندھ دیا، اگر معاذ اللہ ایسا ہوا تو خود اسلام کے اثر پر کلام کرنا ہوگا،

کوئی فہم سلیم جو نارسائی یا حسد سے مکدر نہ ہو کبھی باور نہ کریگی کہ ہزارہا علمائے ربانی اس ڈیڑھ ہزار برس کے زمانے میں امت مرحومہ میں اس تعلیم کے اثر سے پھیلے جو ایک ایسے شخص کے دل و دماغ سے نکلی جس کے

اوصاف جارحین نے بیان کئے ہین، ہمارا قلم بار باران کے اعادہ سے تحاشی کرتا ہے، علماء ربانی سے بڑھکر گروہا گروہ اولیائے کرام تعلیم بالا پر عمل کرکے مراتب قرب پر فائز ہوئے، ولایت کے دو بڑے سلسلون چشتی اور نقشبندی کے اکابر مذہب حنفی کے پیرو تھے،

سب سے بالاتر یہ بحث ہے کہ امام محمد سے لیکر علامہ ابن عابدین تک فقہا کی ہزارون کتابین فروع حنفی مین اور امام طحاوی، امام نسفی وغیرہما کی تصانیف عقائد مین حاضر ہین، ان کی بنیاد پر ثابت کیا جائے کہ جو عقائد و مسائل مجروحہ امام صاحب کی جانب منسوب کئے گئے ہین وہ کہان ہین، آج کرورون حنفی مختلف ممالک مین موجود ہین ان مین سے کوئی خلق قرآن، ارجاء وغیرہ عقائد یا حلت زنا وغیرہ مسائل فروعی کا قائل ہے؟ جواب یہی ہے کہ ایک بھی نہین، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بنیاد جرح یا غلط فہمی ہے یا حسد اور ان دونون بنیادون پر جو عمارت قائم ہوگی ظاہر ہے وہ قائم و دیرپا نہین رہ سکتی تھی، چنانچہ یہی ہوا، سو فہم اور حسد کے غبار کے چھٹ جانے کے بعد اصول حدیث و علم رجال دونون نے بالاتفاق ان جرحون کے بے اصل اور غیر مقبول ہونے کا فیصلہ صادر کردیا،

موقع ہے کہ اس سلسلے مین فقہ حنفی کی تاریخی حقیقت سے بھی بحث کیجائے، آپنے اوپر خلف بن ایوب کا قول پڑھا کہ اللہ تعالی سے علم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا، حضرت سید المرسلین سے صحابۂ کرام کو، صحابۂ کرام سے تابعین کو، تابعین سے امام ابوحنیفہ کو،

حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین من رب العالمین مین اس کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے، اس کے مطالب خلاصۃً لکھے جاتے ہین،

"علماء امت دو قسم مین منحصر ہین، ایک حفاظ حدیث..... جنھون نے دین کے خزانون کی حفاظت کی اور اس کے چشمون کو تکدر و تغیر سے پاک صاف رکھا، انھی کی کوششون کا اثر تھا کہ جن لوگون کی طرف اللہ پاک کی جانب سے بہتری بڑھی وہ پاک چشمون پر وارد ہوئے..... دوسری قسم فقہائے اسلام ہین جنکے اقوال پر مخلوق مین فتوی کا دار و مدار ہے، یہ گروہ استنباط احکام کے ساتھ مخصوص ہے، انھون نے قواعد

حلال و حرام کے انضباط کا اہتمام کیا وہ زمین پر آسمانوں کے تاروں کی مثال ہیں کہ ان کی وجہ سے تاریکی میں بھٹکنے والے ہدایت پاتے ہیں، کھانے پینے سے بھی زیادہ انسان اُن کے محتاج ہیں، اور اُن کی اطاعت نص کے رو سے ماں باپ سے بھی زیادہ فرض ہے، ایک روایت میں 'اولی الامر' سے مراد علماء ہیں، دوسری میں امراء. سب سے اول سید المرسلین ہی نے تبلیغ کے منصب شریف کو ادا کیا، آپ کے بعد صحابہ نے، اس بارہ میں بعض صحابہ مکثر تھے بعض متوسط، بعض مقل، صحابہ میں سے جن کے فتوی محفوظ ہیں وہ ایک سو کچھ اوپر تیس تھے، ان میں مرد اور بی بی دونوں شامل ہیں، انہیں سے جن کے فتوے کثیر ہیں وہ (حضرات) عمرؓ بن خطاب، علیؓ بن ابی طالب، عبداللہؓ بن مسعود، عائشہ ام المومنین، زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن عباسؓ، اور عبداللہ بن عمرؓ ہیں، ان میں سے ہر ایک کے فتووں سے ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے،

مسروق کا قول ہے کہ میں صحابہ کی صحبت میں رہا، ان کا علم چھ کو پہنچا، علیؓ، عبداللہ، عمرؓ، زید بن ثابت، ابوالدرداءؓ، اُبی ابن کعب (رضی اللہ عنہم اجمعین) ان چھ کا علم دو کو پہنچا، علیؓ و عبداللہؓ،[1]

یہ بھی مسروق کا قول ہے کہ صحابہ کی مثال پانی کے تالابوں کی ہے، ایک ایسا تالاب ہے جس سے ایک سوار سیراب ہو، ایک ایسا جس سے دس سوار سیراب ہوں، ایک ایسا جس سے روے زمین کے آدمی سیراب ہو جائیں عبداللہ (بن مسعود) انہی میں سے ہیں، جن چار سے قرآن حاصل کرنے کا ارشاد نبوی ہوا اور ان میں ابن ام عبد کا نام اوّل لیا، اعمش نے ابراہیم سے یہ روایت نقل کی ہے، کہ جب کسی معاملے میں (حضرت) عمرؓ و عبداللہؓ جمع ہو جاتے تھے تو وہ اونکی برابر کسی کو نہ سمجھتے تھے، اگر دونوں میں اختلاف ہوتا تو عبداللہ کے قول کو زیادہ پسند کرتے اس لئے کہ وہ زیادہ باریک بین تھے، لانہ کان الطف،

ابن مسعودؓ کے متعلق (حضرت عمرؓ کا) قول ہے، کنیف مُلاء علما - علم سے بھرا ہوا ایک تھیلا ہے،

ابو موسیٰ کا قول ہے کہ عبداللہ کی ایک مجلس میں بیٹھنا ایک سال کے عمل سے زیادہ میرے نفس میں تاثیر کرتا ہے،

[1] امام نووی التقریب اصول حدیث میں لکھتے ہیں، صحابہ کا علم چھ پر منتہی ہوا، عمرؓ، علیؓ، اُبیؓ، زیدؓ بن ثابت، ابوالدرداءؓ، ابن مسعودؓ، اس کے بعد ان چھ کا علم علی و عبداللہ پر منتہی ہوا، (دیکھو التقریب النوع ۴۳)

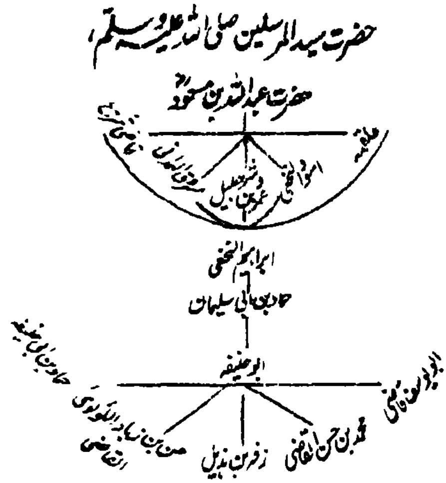
. . . . . . علیؓ بن ابی طالب علیہ السلام کے احکام و فتاوی پھیلے مگر خدا شیعون کو . . . . کرے انھون نے ا
بہت سا علم ان پر جھوٹ باندھکر فاسد کر دیا، اس لیے صحیح روایتون مین ان کی وہی حدیث یا فتوی معتبر خیال کرتے ہ
اہلبیت یا اصحاب عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ سے پہنچا ہے، خود حضرت کو اس کا شکوہ تھا کہ اُن کے علم کے حامل نہیں
قال ان ھٰھنا علما لو اصبت لہ الحملہ یہان بڑا علم ہے اگر لینے والے اس تک پہنچین[1] محمد بن جریر طبری
ہے کہ حضرت عمرؓ کے اصحاب مین سے ایک بھی ایسا نہ ہوا جس نے ان کے فتاوی اور مذاہب فی الفقہ لکھے ہون
ابن مسعود کے، وہ اپنا قول اور مذہب قول عمرؓ کے مقابلے مین ترک کر دیتے تھے، ان کی مخالفت کسی مسائل
کرتے تھے، دین اور مذہب امت مین اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ، اصحاب زید بن ثابت، اصحاب عبداللہ بن عمرؓ اور اصحاب
ابن عباسؓ سے پھیلا، انہی چارؓ کے اصحاب سے سارے آدمیون کو علم پہنچا، صحابہ کے بعد انکے تلامذہ . . . . کوفہ مین علقمہ بن قیس النخعی ا
ابن شرحبیل، مسروق الہمدانی، قاضی شریح . . . تھے، یہ سب کے سب اصحاب علیؓ و عبداللہ بن مسعودؓ ہین، اور اکابر
سے ہین، اکابر صحابہ کی موجودگی مین فتوی دیتے تھے اور وہ اسکو جائز رکھتے تھے،

اس طبقے کے بعد ابراہیم نخعی و عامر الشعبی و سعید بن جبیر . . . . ہوئے ان کے بعد حماد بن ابی سلیمان
المعتمر، سلیمان الاعمش اور مسعر بن کدام، ان کے بعد محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی . . . . . . سفیان ثور
ابوحنیفہ ہوئے . . . . . ان کے بعد حفص بن غیاث، وکیع بن الجراح اور اصحاب ابوحنیفہ مثل ابو یوسف ا
زفر بن ہذیل، حماد بن ابوحنیفہ، حسن بن زیاد القاضی اور محمد بن حسن قاضی رقہ ہوئے" (انتہی اعلام الموقعین خلا
شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے بھی حجۃ اللہ البالغہ مین یہ بحث لکھی ہے، حافظ ابن قیم اور شاہ صاحب
بحث مین تفصیل اور اجمال کا فرق ہے،

---

[1] اس قول کی تائید امام مسلم نے مقدمۂ صحیح مسلم مین کی ہے، لکھا ہے کہ المغیرہ ان روایتون مین سے جو حضرت علیؓ سے کیجاتین
رہ روایت قبول کرتے جو اصحاب عبداللہ بن مسعود کی سند سے ہوتی، یہ بھی لکھا ہے کہ اصحاب علی نے ان کا علم ف
(دیکھو مقدمہ صحیح مسلم حاشیہ قسطلانی ج ۱ صف ۱۲)

اقوال بالا کی بنیاد پر فقہ حنفی کا سلسلہ حسب ذیل بصورت شجرہ قائم کیا جاسکتا ہے،



فقہ حنفی پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ رجال فقہ موصوف کے حالات مختصراً بیان کردیئے جائیں جنسے ان حضرات کا مرتبہ علمی و عملی معلوم ہوسکے،

یہ آپ معلوم کرچکے ہیں کہ فقہ کے مرجع کل آنحضرتؐ کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ[1] کنیت ابو عبدالرحمن، قدیم الاسلام، اُن سے پہلے صرف پانچ حضرات اسلام لاچکے تھے، اسلام لانے کے وقت عمر کا تخمینہ بیس سال کے قریب ہوتا ہے، مشرف باسلام ہونے کے وقت ہی تعلیم قرآن کی التجا میں کی ارشاد ہوا انک لغلام معلم، بے شک وشبہہ تم نوجوان معلم ہو، ستر سورتیں خود ذات اقدس سے حفظ کیں، پہلے شخص ہیں جنھوں نے آنحضرتؐ کی طرف سے کفار قریش کو قرآن مجید (سورۂ الرحمن) حرم میں سنایا، سخت زحمت اٹھائی، کفار منہ پر تھپڑ مارتے تھے اور یہ سورۂ الرحمن سنائے جاتے تھے، کسی نے اس تکلیف پر اظہار افسوس کیا تو فرمایا کہو تو پھر سنادوں اب کفار سے زیادہ کوئی میری نظر میں ناچیز نہیں، یہ گویا پہلا سبق سعی کا تھا،

اسلام سے مشرف ہونے کے بعد بھی حضرت سرور عالمؐ نے انکو اپنی خدمت سے مخصوص کرلیا تھا اذن عام تھا کہ پردہ اٹھا کر خدمت میں چلے آئیں، راز کی باتیں بھی سنیں، مگر جب کہ روک دیئے جائیں، باہر تشریف آوری کے

[1] ان حالات کا ماخذ، طبقات ابن سعد، تاریخ الخطیب، اسد الغابہ، الاستیعاب، الاصابہ، اعلام الموقعین، نزہۃ الابرار فی الاسامی والاخبار مصنفہ شیروانی،

وقت نعلین مبارک پہناتے، عصالیکر دائین جانب آگے چلتے، مجلس کے قریب پہنچکر نعلین مبارک اتارکر بغل مین رکھ لیتے، عصا پیش کرتے، مراجعت کے وقت بھی یہی عمل ہوتا، واپسی پر اول حجرہ مین داخل ہوتے، وضو کے وقت مسواک پیش کرتے، صحابۂ کرام مین صاحب النعلین والسواک والسواد اُن کا لقب تھا، یعنی نعلین مبارک، مسواک اور راز کے محافظ، سفر مین بستر مبارک، طہارت کا پانی، مسواک، نعلین مبارک ان کی تحویل مین رہتین، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جب یمن سے مدینہ طیبہ پہنچے ہین، تو کثرت باریابی دیکھکر حضرت ابن مسعودؓ اوران کی والدہ کو اہلبیت سمجھے، دو بار ہجرت کی، ایک بار حبشہ کو، دوبارہ مدینہ منورہ کو، تمام غزوون مین شریک ہوے، بدر مین ابوجہل کا سرخود اس کی تلوار سے کاٹا، جو صلے مین عطا ہوئی، ضعیف الجثہ تھے ایک موقعہ پر ان کی باریک پنڈلیان دیکھکر صحابۂ کرام ہنس پڑے، تو آپ نے فرمایا عبداللہ قیامت کے دن میزان مین احد سے بھی زیادہ بھاری ہونگے، دوسری روایت مین ہے کہ عبداللہ کا ایک پانون اُحد سے زیادہ بھاری ہوگا جنت کی بشارت پائی

۳۲ھ مین مدینہ منورہ مین وفات پائی، حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، بقیع مین دفن ہوئے

حضرت ابودرداءؓ نے خبر وفات سنکر کہا، ماترک خلفہ مثلہ اپنا مثل نہین چھوڑ گئے، عمر کچھ اوپر ساٹھ برس کی ہوئی، لباس عمدہ سپید پہنتے تھے، عطر بہت لگاتے، رات مین عطر کی خوشبو سے پہچان لئے جاتے، دولتمند تھے، نوے ہزار درہم ترکے مین چھوڑے، بیس ہزار درہم خزانۂ خلافت مین جمع تھے، وہ بھی ورثار کو ملے،

حضرت سرور عالم اُن سے قرآن مجید پڑھوا کر سنتے تھے، حیات مبارک کے سال آخر مین جب حضرت جبرئیل نے رمضان مین دوبار کلام مجید آپ کو سنایا تو یہ بھی حاضر تھے، اسطرح اخیر نسخ و تبدیل سے آگاہی کا موقع ملا۔ ارشاد نبوی ہے، کہ جس کو یہ محبوب ہو کہ قرآن اسی طراوت وتازگی سے پڑھے جیساکہ وہ نازل ہوا ہے تو اسکو چاہئے کہ ابن ام عبد کی قرأت سے پڑھے، ارشاد ہے وتمسکوا بعھد ابن ام عبد، ابن مسعودؓ کی ہدایت اور حکم کو مظبوط پکڑے رہو، جن چار صاحبون سے قرآن سیکھنے کا حکم فرمایا گیا ان مین اول ان کا نام لیا، باقی تین صاحب یہ ہین، (حضرت) معاذ بن جبلؓ، اُبَیّ بن کعبؓ اور سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ، حافظ قرآن تھے صحابۂ کرام مین

ان کا اقرب الی اللہ وسیلہ ہوتا، اور اقربھم زلفی (سب سے زیادہ اللہ سے قریب) ہونا مسلم تھا، ہیئت ظاہری، سیرت اور طریقے مین اور شان و وقار مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ متشابہ تھے، اسیطرح علقمہ حضرت ابن مسعودؓ سے مشابہ تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت مین حضرت عمارؓ بن یاسر کو امیر کوفہ اور ان کو وزیر و معلم بنا کر بھیجا۔ اہل کوفہ کو اس موقع پر لکھا، مین ان دو صاحبون کو بھیجتا ہون جو نجباء صحابہ سے ہین، اور اہل بدر ہین ان کی اقتدا اور اطاعت کرو اور حکم مانو، عبد اللہ بن مسعودؓ کو مین نے قسم ہے رب کی اپنے اوپر ایثار کرکے تمھارے پاس بھیجا ہے، ان کی نسبت حضرت عمرؓ کا قول ہے، کُنیف ملاء علمًا - ایک تھیلا ہین علم سے بھرے ہوئے یہ قول تین بار مکرر فرمایا، حضرت علیؓ کا قول ہے " قرأ القرآن فاحل حلاله وحرم حرامه ففقیه الدین عالم السنة " - ابن مسعود نے قرآن پڑھکر جو اس مین حلال تھا اس کو حلال کیا اور جو حرام تھا اسکو حرام کیا دین کے فقیہ ہین، سنت کے عالم، امام شعبی کا قول ہے، ماکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افقه من صاحبنا عبد اللہ بن مسعود، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مین ہمارے استاد عبد اللہ بن مسعودؓ سے بڑھکر کوئی فقیہ نہ تھا،

روایت حدیث بہت کم کرتے تھے، الفاظ حدیث مین سخت احتیاط کرتے تھے جس وقت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے نکلتا کانپ اٹھتے، فرماتے تھے لیس العلم بکثرة الروایة ولکن العلم الخشیة، علم کثرت روایت کو نہین کہتے بلکہ علم خدا سے ڈرنے کو کہتے ہین، عمرو بن میمون کا قول ہے کہ مین ایک برس عبد اللہ بن مسعود کے پاس رہا، ایک دن بھی انھون نے رسول اللہ کی حدیث کی روایت نہین کی، نہ یہ کہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صرف ایک بار حدیث بیان کی اور ان کی زبان پر لفظ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاری ہوا، بیقرار ہوگئے، مین نے دیکھا کہ ان کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا، الفاظ بالا کہکر یہ الفاظ کہے، انشاء اللہ اما فوق ذاک واما قریب من ذاک او دون ذاک انشاء اللہ یا اس سے بڑھکر یا اس کے قریب یا اس سے کم، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے حدیث سنی، حضرات ابن عباسؓ، ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ نے منجملہ دیگر صحابہ کے ان سے حدیث سنی، تابعین مین علقمہ، اسود، مسروق، ابو وائل شقیق، شریح وغیرہم

حالات بالا پر ایک نظر حضرت ابن مسعودؓ کے حسب ذیل اوصاف نمایان ہین، قدیم الاسلام ہونا، ابتدا سے انتہا تک ذات اقدس سے قرب تام اور شرف خدمت معتمد و محرم اسرار ہونا، وفور علم و شان معلمی و خوبی تعلیم، حافظ و اعلم بکتاب اللہ ہونا، علم و فقہ و سنت مین فوقیت اور تفقہ مین باریک نظری، قرب الٰہی و وسیلہ الی اللہ ہونے مین امتیاز، ہیئت ظاہری، سمت اور طریقے مین اور شان و وقار مین سب سے زیادہ آپ سے مشابہ ہونا، آنحضرتؐ کا ارشاد تمسکوا بعہد ابن ام عبد ابن مسعود کی ہدایت اور حکم کو مضبوط پکڑے رہو، حضرت عمرؓ کا ان کے علم و تفقہ پر اعتماد کلی، اہل کوفہ کو ان کی اقتدا، اطاعت اور ان کے حکم ماننے کا امر، حضرت علیؓ کی ان کے علم کتاب و فقہ و سنت کی توثیق، فقہ مین باریک نظری، روایت حدیث کی تقلیل اور حفاظت الفاظ مین احتیاط،

یہ تم سُن چکے کہ تمام صحابۂ کرام کے علم کے حامل چھ حضرات تھے، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین، یہ بھی سُن چکے ہو کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا علم حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے شاگردون کے پاس رہا، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ان سے حدیث سنی مسروق کا قول پڑھ چکے کہ چھ کا علم دو کو پہنچا، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کو، یہ بھی سُن چکے کہ حضرت علیؓ کا علم وہی محفوظ رہا جو اہل بیت اطہار کے سینون مین رہا یا حضرت ابن مسعودؓ کے، نتیجہ ظاہر یہ کہ علم صحابہ کے مرجع اخیر اور خزینہ دار حضرت ابن مسعودؓ تھے، رضی اللہ عنہ،

اس خلاصۂ حالات سے حضرت ابن مسعودؓ کے وجود کی عظمت علم و تعلیم کی جلالت ثابت ہوتی ہے، اسی کا اثر تھا جو خطیب نے لکھا ہے کہ فبث عبد الله فیھم علما کثیرا وفقہ منھم جماعۃ غفیرا، عبد اللہ نے اہل کوفہ مین علم بکثرت پھیلایا، اور گروہ کثیر کو فقیہ بنا دیا، حضرت ابن مسعودؓ کے شاگردون کی بابۃ حافظ ابن قیم کا قول پڑھ چکے کہ اکابر تابعین سے تھے، اور اکابر صحابہ کی موجودگی مین فتوی دیتے تھے جس کو وہ حضرات جائز رکھتے،

علقمہ بن قیس نخعی ہین، التابعی الکبیر الجلیل الفقیہ البارع، بڑی شان کے جلیل القدر تابعی فقہی عقل و دانش مین فائق، کان من الربانیین، علماے ربانی مین سے تھے، اجمعوا علی جلالتہ وعظم محلہ

و وفور علمه وجميل طريقته، ان کی جلالتِ شان، عالی قدری اور خوبیِ طریقہ پر اجماع ہے، ابراہیم النخعی کا قول ہے، کان علقمة يشبه بابن مسعود، علقمہ ابن مسعود سے مشابہ تھے (تہذیب الاسمائنووی) دیکھو عہد اسلام کی سیر حاصلی، ان کے دو بھتیجے، اسود اور عبدالرحمٰن بلند مرتبہ تابعی ہیں، اور ایک نواسہ ابراہیم نخعی، ایک گھر میں چار عالی قدر تابعی!

مسروق الہمدانی | اتفقوا على جلالته وتوثيقه وامامته، ان کی جلالت، امامت اور ثقہ ہونے پر اجماع ہے، حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھی، حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ سے ملاقات کی، امام شعبی کے استاد ہیں (۔۔۔۔۔)

اسود النخعی | تابعی فقیہ امام صالح، حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کو دیکھا، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ و حضرت عائشہؓ وغیرہم سے روایت کی، اتفقوا على توثيقه وجلالته۔ ان کے ثقہ ہونے اور جلالت پر اتفاق ہے، اسی حج اور عمرے علحدہ علحدہ کئے، (" " ")

عمرو بن شرحبیل | الہمدانی، امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے ان سے روایت کی ہے، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے روایت کی، (خلاصہ تذہیب) ثقہ عابد تھے (تقریب التہذیب)

شریح القاضی | زمانۂ نبوت پایا، حضوری سے مشرف نہ ہوئے، حضرت عمرؓ نے ان کو قاضی کوفہ مقرر کیا، وہاں ساٹھ برس تک قاضی رہے، حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا انت اقضى العرب تم عربوں میں قضا میں فائق ہو، ان کی روایتوں کے حجت ہونے اور اُن کے ثقہ ہونے اور دین و فضل پر اور ذکاوت پر اتفاق ہے، نیز ان کے سب سے زیادہ عالم قضا ہونے پر (تہذیب الاسماء)

ابراہیم النخعی | تابعی جلیل القدر، حضرت عائشہؓ کی خدمت میں باریاب ہوئے، ان کے ثقہ ہونے، جلالت شان اور فقہ میں فائق ہونے پر اتفاق ہے، شعبی نے اُن کی وفات کے وقت فرمایا ما ترك احدًا اعلم منه وافقه، انھوں نے اپنے آپ سے زیادہ عالم اور فقیہ نہیں چھوڑا، اعمش کا قول ہے، کان النخعی صیرفی الحدیث، نخعی حدیث کے نقاد تھے، (" " ")

حماد بن ابی سلیمان | اشعری کوفی ہیں، ابواسمٰعیل کنیت، حضرت انس اور ابن المسیب اور ابراہیم سے روایت کی
ان سے .... ابوحنیفہ اور شعبہ نے، ثقہ امام مجتہد سخی و جواد تھے، ابواسحٰق کا قول ہے کہ وہ شعبی سے فقہ میں فائق تھے

فقہ حنفی پر ایک نظر،

(۱) بیان بالا سے واضح ہو چکا کہ جس علم صحابۂ کرام کے مرجع آخر و خزینہ دار حضرت ابن مسعودؓ تھے، وہ تا
کبار کو پہنچا، ان سے ابراہیم نخعی کو، ان سے حماد بن ابی سلیمان کو، ان سے امام ابوحنیفہ کو، ان سے ابویوسف و محمد بن حسن
وغیرہ ہا تلامذہ کو، یہی وہ علم تھا جس کی تدوین و ترویج کا اہتمام اکابر صحابۂ کرام نے اہتمام کتاب اللہ کے بعد اس زما
میں کیا جبکہ روایت حدیث قلیل تھی، بلکہ روکی جاتی تھی، خلفائے راشدین کا دور اسی کے اہتمام میں صرف ہوگیا
اعظم اور انکے تلامذہ کی کوششوں نے اس علم دین کو مدون و مرتب کرکے ایک ایسا آئین شریعت ملک و ملت کے
سامنے رکھدیا جو حق و ہدایت کی قوت سے دنیائے اسلام کی عبادات و معاملات کی ضرورتوں اور حاجتوں کو
کرتے اور دنیائے اسلام میں پھیلنے کے لیے تیار اور آمادہ تھا، اس علم کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ چار پشت تک تابعین
سینوں میں رہنے کے بعد امت کو ملا، اس کا نتیجہ بدیہی یہ ہے کہ امام اعظم کا علم صحابۂ کرام کے علم کا مجموعہ ہے اور وہ فقہ حنفی

(۲) مذہب اسلام روئے زمین کے انسانوں کے لیے آخری دین الٰہی ہے، اس کا اعلان ہے کہ اللہ اور ا
رسول غالب رہیں گے، یہ بھی اس کا اعلان ہے کہ وہ تمام ادیان پر حق و ہدایت کی قوت سے غالب رہیگا، اور
کہ حزب اللہ کا طرۂ امتیاز غلبہ ہے،

اسلام کے فرق باطلہ کے باطل ہونے کی بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ کبھی دیرپا غلبہ روئے زمین پر نہ پا
ان کا کارنامہ یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح انھوں نے اپنے وجود کو قائم رکھا، مثال کے لیے دیکھو فرقۂ باطنیہ کی تاریخ
مذاہب حقہ میں سب سے زیادہ غلبہ مذہب حنفی کو ابتدا سے آج تک حاصل رہا ہے، مورخین و محدثین اس کے
کو زمین پر چھا جانے سے تعبیر کرتے ہیں، امام سفیان بن عیینہ کا قول تم نے پڑھا ہے کہ ابوحنیفہ کی رائے آفاق تک
وقد بلغ الآفاق، خطیب نے امام ابویوسف کے حالات میں لکھا ہے، وبث علم ابی حنیفة فی اقطار

نھون نے ابوحنیفہ کا علم زمین کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارے تک پہنچادیا،

تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ شیخ طاہر پٹنی صاحب مجمع البحار نے المغنی مین فقہ حنفی کا وصف سارے آفاق مین پھیلنا
اور روئے زمین کو ڈھک لینا لکھا ہے، ان کے الفاظ ہین " العلم المنتشر فی الآفاق وعلم طبق الارض
بھی لکھا ہے کہ اگر مذہب وفقہ حنفی مین اللہ تعالی کا سرِّ خفی نہ ہوتا تو نصف یا اس کے قریب اسلام اُس کے تقلید
کے جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہوجاتا، ملا علی قاری سنہ دو ثلث اہل اسلام کا گیارہوین صدی ہجری مین حنفی ہونا لکھا ہے،

اس کی قوتِ ظہور اور خوبیِ تدوین وکمالِ ترتیب کا اندازہ اس سے کرو کہ امام اعظم کی وفات کے ٹھیک
سولہ برس بعد خلیفۂ بغداد ہادی کے عہد مین امام ابو یوسف سنہ ۱۶۶ مین قاضی مقرر ہوتے ہین، وہ قوت ان کے
علم مین ہو کہ عہد اسلام مین اول مرتبہ قاضی القضاۃ کی طیلسان ان کے وجود پر راست آتی ہے، اور فقہ حنفی روئے زمین
پر کارفرما بنجاتی ہے، ہارون الرشید کی خلافت کے شایان قاضی القضاۃ اول امام ابو یوسف ہی ٹھہرے، خلافت
عباسیہ کے بعد جتنی ایسی قوتین برسرکار آئین جنکی قوت اور غلبہ کو بین الاقوام اور بین الممالک مرتبہ حاصل ہوا وہ قریبًا
سب کے سب حنفی تھین، مثلاً آل سلجوق، آل عثمان، عالمگیری ہندوستان بجائے خود ایک برّاعظم تھا، یاد تازہ کرو حافظ
ابن قیم کے اس بیان کی کہ مسروق کا قول ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کا علم وہ خلیج ہے کہ اگر اس پر روئے زمین کے تشنہ کام
وارد ہوجائین تو سیراب ہوسکین، ملاؤ اس کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی کا کشف کہ نظر کشفی مین دوسرے مذاہب
حیاض وجداول کی شکل مین منکشف ہوتے ہین، مذہب حنفی بشکل دریائے زخار جو عرش سے گر رہا ہے، دوسرے
مذاہب حقہ عمومًا یا ملک سے مخصوص رہے یا نسل سے، بین الاقوامی مرتبہ کمتر پا سکے،

اسلام کی قوت وحقانیت کی کھلی ہوئی دلیل اس مین ہے کہ اس کے احکام مین مختلف ممالک ومختلف نسلہائے
انسانی کی ضرورتون کا لحاظ پایا جاتا ہے، اور ان کے حامل مذاہب حقہ ہین، اگر کبھی یہ بحث لکھی جائے کہ مذاہب
اربعہ مختلف ممالک اور مختلف نسلون مین کس مناسبت سے پھیلے تو علم نفسیات کا دلچسپ باب ہوگا،

دیکھو تابعین وتبع تابعین کے دور مین ہزارون نہین تو سینکڑون صاحب مذہب امام ومجتہد تھے، جنکے

مذاہب پھیلے، اور مضمحل ہو گئے، بالآخر متبوع چار ہی رہے،

ان میں بھی جو شیوع و غلبہ مذہب حنفی کو رہا ظاہر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں غلبہ و ظہور کی جو قوت و برق حق وہدیٰ کی مدد سے تھی اس کا وافر حصہ مذہب حنفی میں ودیعت تھا، اور یہی وہ خفی سر الٰہی ہے جس کو شیخ طاہر پٹنی مذہب حنفی کی کامیابی و غلبہ کا سبب بتاتے ہیں، ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، عام طور پر مذہب حنفی اور مذہب مالکی کی کامیابی کا سہرا امام ابویوسف اور امام یحییٰ بن یحییٰ المصمودی کے سر باندھا جاتا ہے کہ ان کا وجود نہ ہوتا تو شیوع حاصل نہ ہوتا، یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں امام ان دونوں مذہبوں کے شیوع و رواج کا زبردست ذریعہ بنے لیکن یہ صحیح نہیں کہ ان کے شیوع اور ترویج کی علت تامہ وہ دونوں ہیں، اس پر غور کرنا چاہئے کہ تعلیم سے شاگرد پیدا ہوتے ہیں، تصانیف پیدا ہوتی ہیں نہ یہ کہ استاد کی تعلیم کی خوبی شاگرد پیدا کرتا ہے، شخصی کوششوں سے فروغ و رواج تعلیم ضرور ہوتا ہے مگر عالمگیر غلبہ و ظہور جو صدیوں تک قائم و باقی رہے وہ خود اس تعلیم کی اندرونی قوت و اثر ہی سے ہو سکتا ہے، بالآخر کامل شاگردوں کا وجود بھی تو قوت و خوبی تعلیم کا منت کش ہے، امام ابویوسف اور امام یحییٰ بھی مذہب حنفی و مالکی کی قوت کا ثبوت ہیں[1]۔

نتیجۂ واقعات بالا یہ ہے کہ محدثین کرام کی شہادت و توثیق کے بموجب امام ابوحنیفہ کا علم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا علم تھا جو تیئیس برس کی ضمنیتِ تام اور قرب خاص میں مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست حاصل کیا گیا، اور جو بالآخر تمام صحابۂ کرام کے علم کا مجموعہ بنا، اور چار پشت تک تابعین کبار و کرام کے سینوں سے گذر کر امام اعظم کے تلامذۂ رشید کو پہنچا اور انھوں نے عالم اسلام کو پہنچایا، اور جو آخر تک فقہائے عظام کی کوششوں سے ایک عالم کے واسطے سرمایۂ اعمال حسنہ بنا ہوا ہے، اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اقرب الی اللہ وسیلۃً تھے لہذا خالق اکبر جل جلالہ کی بارگاہ میں اس کے عاجز بندوں کے لیے وسیلۂ عظمیٰ ہے، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک،

(باقی)

---

[1] خاکسار اس حصہ مضمون و حصہ جرح کی نگارش میں مفتی سید عبداللطیف صاحب استاد جامعہ عثمانیہ کے مشورہ کا دل سے ممنون ہے اگر وہ مشورہ نہ ہوتا تو حق یہ ہے کہ حق بحث اس جامعیت سے ادا نہ ہوتا، شروانی،

جلد ۳۲ | ماہ رجب المرجب ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۳ء | عدد ۵

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۳۲۲-۳۲۴
قاضی ابو یوسف،	نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی،	۳۲۵-۳۳۰
نفسیات حکیم ناصر خسرو،	پروفیسر معتضد ولی الرحمن ایم اے، استاذ نفسیات جامعہ عثمانیہ	۳۳۱-۳۴۵
فردوسی کا رزمیہ کلام،	جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی،	۳۴۶-۳۵۴
مقبرۂ شاہ بیگم،	مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی الٰہ آبادی	۳۵۵-۳۶۷
گجراتی زبان، اور اس کی تاریخ،	مولوی ابو ظفر صاحب ندوی سابق استاذ اردو و فارسی مہایالے کالج احمد آباد	۳۶۸-۳۷۵
پدماوت کا مصنف کون تھا؟	مولانا سعید انصاری، رفیق دار المصنفین،	۳۷۶-۳۸۰
طریق معاش کا انتخاب،	"ع ز"	۳۸۱-۳۸۳
یورپ مین اوسط پیدایش کے انحطاط کا اقتصادی اثر،	"	۳۸۴-۳۸۶
سرطان کے علاج مین ترقی،	"	۳۸۶-۳۸۷
یونان کے آثار قدیمہ،	"	۳۸۸-۳۹۰
اخبار علمیہ،	"	۳۹۱-۳۹۴
خون جگر،	حضرت جگر مراد آبادی،	۳۹۵
قطعات امجد،	حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی،	۳۹۵-۳۹۶
رنگ حسرت،	جناب جلیل قدوائی، ایم اے،	۳۹۶
مطبوعات جدیدہ،	"ض"	۳۹۷-۴۰۰

شذرات

ناظرین یہ سنکر خوش ہونگے کہ اعلیحضرت فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کی سرکار عالی مقدار نے دار المصنفین کو یہ اعز
بخشا ہے کہ اسکو اپنی ضرورت کے لیے فقہ حنفی کے رو سے ایک ضابطۂ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین کا حکم دیا ہے، چنانچہ
حکم والا کی تعمیل کیگئی، اور سابق دولت عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح، یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مستند کتب فقہ حنفی کے حوا
سے مرتب کیا گیا ہے، اب عنقریب اُسکا مسودہ صاف ہوکر سرکار عالی کے ملاحظہ مین پیش ہوگا، اور اس کے بعد شاید منتخب مجلس
علما رکے سپرد ہو، کہ وہ اس پر نظر ثانی کرے،

اعلیحضرت نادر خان شاہ افغانستان کے عہد مین جو تعلیمی و علمی ترقیان افغانستان مین روز افزون ہیں، اب ان
ترتیب و تنظیم کی تجویز زیر غور ہے، اور ایک کابل یونیورسٹی کی تکمیل عمل مین آرہی ہے، اور ساتھ ہی تراجم و تالیفات کے دائر
بھی وجود مین آرہے ہین، اور غالبًا انھین امور مین مشورہ کی غرض سے ہندوستان سے چند اصحاب کو دار السلطنت آن
کی دعوت افغانستان کی حکومت کی طرف سے دی گئی ہے،

یہ تعلیمی و علمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اور اڈیٹر معارف کو موصول
ہوئی ہے، خدا کرے کہ اس علمی وفد سے اس دولت خداداد کی جسکا خداداد ہونا کئی دفعہ تاریخ مین ثابت ہوچکا ہے، کوئ
مفید خدمت انجام پاسکے، اور جس طرح اس کا ملک خداداد ہے، اسکا علم و تمدن بھی خداداد ثابت ہوسکے،

یہ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کی بعض اہم تصنیفات اس وقت شائع ہوئین، جب وہ ہندوستان سے باہر تھ

سیرۃ عائشہؓ جب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تو لندن میں تھا، سیرۃ النبیؐ کی دوسری جلد جب شائع ہوئی، تب بھی لندن میں تھا، چنانچہ اس کا مقدمہ بھی وہین بیٹھکر لکھا گیا ہے، سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد جب چھپی ہے تو مؤلف سلطان ابن سعود اور شریف علی کے محاذ جنگ کے جدہ مین تھا، اور اسکا مقدمہ وہین سے لکھکر ہندوستان بھیجا گیا، اب جب **خیام** کی اشاعت کی باری آرہی ہے تو پھر جلا وطنی کے سامان ہین، کیا حسن اتفاق کے سوا ان دو واقعون مین کوئی منطقی ربط و لزوم بھی ہے؟

آجکل بعض جماعتون نے مسئلۂ قضا کی تحریک و اشاعت کی کوششین ازسرنو ع کی ہین، یہ حسن اقدام مبارک ہے لیکن اس سے پہلے کہ اس کیلئے قدم اٹھایا جائے ضرورت اسکی ہے کہ مسلمان مجالس اور انجمنون کے اتحاد و تعاون کی طرف قدم اٹھایا جائے، حکومت صرف قومی قوت کو مانتی ہے، اور قوم مین قوت صرف اتحاد سے پیدا ہو سکتی ہے، ڈر ہے کہ اتنی اہم اور ضروری تحریک بھی ہمارے اختلافات باہمی کے نذر ہو جائے۔

جہانتک اس تحریک کی تاریخ کا تعلق ہے یہ سب سے پہلے ۱۹۱۱ء مین معارف کے صفحات مین مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کے وقت پیش کیگئی اور اسکے بعد جمعیۃ العلمار کے خطبۂ صدارت کلکتہ اور جمعیۃ العلمار کی تجاویز اور معارف کے شذرات مین بار بار پیش کیجاتی رہی، یوپی گورنمنٹ نے ۱۹۲۷ء مین (سر) جسٹس سلیمان کی صدارت مین بعض مسلمان ارکان کونسل اور بعض علمار کی مجلس اس غرض سے قائم کی تھی کہ نکاح و طلاق کے درج رجسٹر ہونے کے امکان پر غور کیا جائے، اس مجلس نے متعدد نشستون مین اس کام کو انجام دیا، اور صوبہ کے اکثر ممتاز علما اور معززین کی شہادتین قلمبند کیگئین، اس کمیٹی کے ایک ممبر ڈاکٹر شفاعت احمد خان بھی تھے، علمار مین مولنا کفایت اللہ صاحب، مولنا قطب الدین عبدالوالی صاحب، مولنا نعیم الدین صاحب مرادآبادی اور یہ خاکسار اور بعض دوسرے اصحاب بھی تھے، اس سلسلہ مین کمیٹی کے ممبرون مین کچھ اختلافات تھے جنکی بنا پر ہم مین سے بعض اصحاب نے اپنا اختلافی نوٹ الگ پیش کیا تھا،

اختلافی نوٹ کی تحریر کی خدمت خاکسار کو سپرد ہوئی تھی، اور مولنا کفایت اللہ صاحب، مولنا قطب الدین عبدالوالی صاحب اور چودھری رشید الدین صاحب رئیس بارہ بنکی نے اسکی تائید فرمائی تھی، اس اختلافی نوٹ مین مسئلۂ قضا کی اہمیت ضرورت اور

اس کے قیام کی تدابیر پر مدلل بحث تھی، یہ تحریر رپورٹ مین شامل ہو کر گورنمنٹ مین پیش ہوئی، مگر تعجب ہے کہ پنجاب کے صوبہ کی گورنمنٹ نے اور نہ کونسل نے اپنی اس تحریک و تجویز کی خبر لی، ممکن ہوا تو آیندہ معارف مین ہم اس تحریر کو پیش کرنے کی کوشش کرینگے، تاکہ مسئلہ مذکور کے اکثر پہلو سامنے آجائین،

فلسطین مین ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سال دو سال سے چل رہی ہے، اور سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جو فلسطین کے اسلامی جسم کا دماغ اور روح ہین، وہ اس تجویز کو عمل مین لانے کیلئے پوری طرح منہمک ہین، اور کئی مہینون سے ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہین، موصوف سے ہمکو موتمر اسلامی مکہ معظمہ کے زمانہ سے ذاتی تعارف حاصل ہے، اور انکے اخلاص اور درد ملت مین ذرہ برابر بھی شک نہین، لیکن انکی خدمت مین صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہندوستان مین انگریزی سلطنت کے استیلاء کے بعد مسلمانون کو ایک اسلامی یونیورسٹی کے تخیل مین ہر ملکی ضرورت اور سیاسی تغیر سے الگ رکھکر تعلیم کے وادی تیہ مین چالیس برس تک سرگردان رکھا گیا، کہین تاریخ کا اعادہ اسی طرح بنی اسرائیل کے بدلہ مسلمانان فلسطین کو تو (جو اب ہماری ہی طرح انگریزی تحت و اقتدار مین ہین) ہر طرف سے موڑ کر اس وادی مین نہین لے چل رہا ہے، فَتَنَبَّہ،

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے گذشتہ اجلاس مین ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ اس یونیورسٹی کے کالجون مین لڑکون اور لڑکیون کی مخلوط تعلیم کی اجازت دیجائے، وائس چانسلر صاحب کی تحریک سے یہ تجویز علمی مجلس کے سپرد کردیگئی ہے کہ وہ اسکا مناسب فیصلہ کرے، وہ فیصلہ کیا ہوگا، اس کی خبر نہین،

اس موقع پر یہ گذارش بیجا نہ ہوگی کہ ہم اپنے طور و طریق اور طرز تمدن کو خیرباد کہکر جن قومون کی ریس کرنا چاہتے ہین، پہلے انھین سے پوچھنا چاہئے کہ آیا وہ اسکو اپنے تمدن کے حق مین زندگی سمجھ رہی ہین یا موت، بہرحال جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا، تاہم ہماری چیخ پکار اگر سنگدل کو رحمدل نہین بنا سکتی ہے، تب بھی جبتک جسم مین زندگی ہے، چوٹ لگنے پر دل سے آہ! تو ایکدفعہ نکل ہی جائیگی،

خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی نے اردو امتحانات اور ڈگریون کے مسئلہ مین ایک قدم آگے بڑھایا ہے، ایکدن یہ حقیقت بھی تسلیم کرلیجائے گی کہ اردو زبان بھی دوسری زبانون کی طرح یہ حق رکھتی ہے کہ اسکو بھی اعلیٰ معیاری امتحانون مین جگہ دیجائے

مقالات

قاضی ابو یوسف

بسلسلۂ تبصرۂ تاریخ خطیب بغدادی،

یعقوب بن ابراہیم ابو یوسف القاضی شاگرد ابو حنیفہ، نسب یہ ہے، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بجیر بن المعاویۃ الانصاری (حضرت سعدؓ صحابی ہین، اون کی مان حبتہ صحابیہ، سعد احد کے دن (حضرت) رافع بن خدیجؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ مین پیش ہوئے، کمسنی کی وجہ سے بھرتی نہین ہوئے

تحصیل علم | ابو یوسف ۱۱۳ھ مین پیدا ہوئے، گھر مفلس تھا، حدیث اور فقہ کی تحصیل کا شوق تھا، حدیث کی روایت منجملہ دیگر مشائخ کے یحییٰ بن سعید الانصاری، سلیمان الاعمش، ہشام بن عروہ، عطار بن السائب لیث بن سعد سے کی، محمد بن حسن احمد بن حنبل یحییٰ بن معین وغیرہم نے ان سے روایت کی، بغداد مین سکونت اختیار کر لی تھی،

ایک روز ابو حنیفہ کی محفل مین بیٹھے تھے کہ انکے والد وہان پہنچ یا باپ کے ساتھ ہو لئے، باپ نے کہا کہ ابو حنیفہ کے قدم بر قدم مت رکھو، ان کو تو پکی پکائی ملتی ہے تمھین پیٹ پالنے کی ضرورت ہے، انھون نے یہ سنکر طلب علم مین کمی کر دی، ان کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ نے میری جستجو کی، بیٹھ رہنے کے بعد پہلی بار مین ان کے پاس پہنچا تو پوچھا آنا کیون چھوڑ

ہشام بن عروہ ابو اسحٰق شیبانی عطار بن السائب اور انکے طبقے سے سماع حدیث کیا اکبر شیوخ حصین بن عبد الرحمٰن ہین، ان سے محمد بن حسن احمد بن حنبل، بشر بن الولید یحییٰ بن معین اور اور بہت لوگون نے سماعت حدیث کی،

یحییٰ بن معین کا قول ہے، ابو یوسف صاحب حدیث وصاحب سنت تھے، (امام) احمد کا قول ہے ابو یوسف حدیث مین صاحب انصاف تھے، ذہبی کا قول ہے کہ مین نے ابو یوسف اور محمد بن حسن کے حالات علٰحدہ کتابون مین لکھے ہین، تذکرۃ الحفاظ للذہبی،

مین نے کہا کہ پیٹ کی فکر اور باپ کی فرمانبرداری کی وجہ سے، یہ کہکر مین بیٹھ گیا، آدمی چلے گئے، تو ایک تھیلی مجھ کو دی اور کہا اس کو خرچ کرو، جب ختم ہوجائے تو اطلاع کرنا، پڑھنا مت چھوڑو، مین نے دیکھا تو سو درم تھے اب مین نے پابندی سے پڑھنا شروع کیا، چند روز کے بعد سو درم اور عنایت ہوئے، حالانکہ مین نے اشارۃً بھی ختم ہونے کا ذکر نہین کیا تھا، اسی طرح بے طلب عنایت ہوتی رہی، یہانتک کہ مین آسودہ حال ہوگیا، ایک روایت کے موجب باپ نے چھوٹا چھوڑا تھا، مان درس سے اٹھالی جاتی تھین ایک روز ابوحنیفہ نے اون سے کہا، نیک بخت! جا، یہ علم سیکھ کر فالودہ روغن پستہ کے ساتھ کھائے گا، یہ سنکر وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئین، جب قاضی القضاۃ ہوگئے تو ایک بار خلیفہ ہارون رشید کے دسترخوان پر فالودہ پیش ہوا، خلیفہ نے اون سے کہا، یہ کھاؤ، یہ روز روز نہین تیار ہوتا ہے پوچھا، امیرالمومنین کیا ہے، کہا فالودہ اور روغن پستہ، یہ سنکر ابویوسف ہنس پڑے، خلیفہ نے پوچھا، کیون ہنسے، کہا بخیر، امیرالمومنین کو اللہ تعالیٰ زندہ وسلامت رکھے، ہارون الرشید نے اصرار کیا تو اونھون نے واقعۂ بالا بیان کیا سنکر خلیفہ کو حیرت ہوئی اور کہا علم دین و دنیا مین عزت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ابوحنیفہ پر رحمت فرمائے وہ عقل کی آنکھون سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو ظاہری آنکھون سے نظر نہین آتا،

امام اعظم کی صحبت مین

سترہ برس تک ابوحنیفہ کی صحبت مین حاضر رہے ایک بار اس زمانہ مین سخت بیمار ہوگئے، امام صاحب نے آکر دیکھا تو واپسی مین اُن کے دروازے پر متفکر کھڑے ہوگئے، کسی نے سبب پوچھا، تو کہا یہ جوان مرگیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اوٹھ جائے گا،

ابویوسف کا قول ہے کہ دنیا مین کوئی چیز مجھکو ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کی مجلس سے زیادہ محبوب نہ تھی، ابوحنیفہ سے بڑھکر فقیہ اور ابن ابی لیلیٰ سے اچھا قاضی مین نے نہین دیکھا،

خطیب کا قول ہے کہ ابوحنیفہ کے شاگردون مین دو شاگرد سب سے زیادہ ممتاز تھے، ابویوسف اور زفر، عمار کا قول ہے کہ ابوحنیفہ کے شاگردون مین ابویوسف کی مثال نہ تھی، اگر وہ نہوتے تو نہ کوئی ابوحنیفہ کو جانتا، نہ ابن ابی لیلیٰ کو، وہی تھے جنھون نے ان کا علم پھیلایا، اور اون کے اقوال کو دور دور پہنچایا، طلحہ کا قول ہے، ابویوسف کی شان

مشہور علم وفضل بلند تھا، ابو حنیفہ کے شاگرد تھے، فقہ مین اپنے معاصرین مین سب سے بڑھکر، اون سے بڑھکر اون کے زمانے مین کوئی نہ تھا، علم وحکمت وریاست وقدر مین انتہا رکو پہنچے ہوئے تھے، وہ پہلے شخص ہین جنھون نے ابو حنیفہ کا علم زمین کے کنارون تک پہنچا دیا، اصول فقہ کی کتابین لکھین، مسائل کا نشر املاکے ذریعے سے کیا،

ایک بار اعمش نے اون سے ایک مسئلہ دریافت کیا، جواب سنکر کہا، یہ کہان سے کہتے ہو، کہا فلان حدیث سے جو آپ سے روایت کی ہے، اعمش نے ہنسکر کہا کہ یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، کہ تمھارے باپ کی شادی بھی نہ ہوئی تھی، یعنی اوس کے آج معلوم ہوئے،

امام مزنی سے کسی نے اہل عراق کی بابت پوچھا، ابو حنیفہ کی بابت کہا "سیدہم" اون کے سردار، ابو یوسف کی بابت کہا اتبعہم للحدیث، ان مین سب سے زیادہ حدیث کے پیرو، محمد بن حسن سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے، زفر سب سے زیادہ قیاس مین تیز،

ہلال بن یحیٰ کا قول ہے، کہ ابو یوسف تفسیر، مغازی، ایام عرب کے حافظ تھے، فقہ ان کے علوم مین اقل العلوم تھی،

ایک بار ابو حنیفہ کے سامنے ابو یوسف اور زفر نے کسی مسائے پر بحث کی، ظہر تک جاری رہی، اور ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرتا رہا، ظہر کے وقت ابو حنیفہ نے زفر کی ران پر ہاتھ مار کر کہا، جس شہر مین ابو یوسف ہون، اوس کی ریاست کی ہوس مت کرو،

ایک بار ابو حنیفہ نے اپنے شاگردون کی بابت کہا، یہ چھتیس مرد ہین، اون مین سے اٹھارہ عہدۂ قضا کی اہلیت رکھتے ہین، چھ فتویٰ دینے کی، دو ایسے ہین جو قاضیون کو پڑھا سکتے ہین، یہ کہکر ابو یوسف اور زفر کی طرف اشارہ کیا،

ایک بار ابو حنیفہ (جو فراست مین ممتاز تھے،) نے داؤد طائی سے کہا کہ تم عبادت کے ہو رہوگے، ابو یوسف سے کہا، تم دنیا کی طرف مائل ہوگے، اسی طرح زفر وغیرہ کی نسبت رائے ظاہر کی، جو کہا تھا، واقعات نے وہی ثابت کیا،

لطیفہ:۔ ایک شخص ابو یوسف کی صحبت مین خاموش بیٹھے رہتے تھے ایک بار اونھون نے کہا تم بولتے کیون نہین کہا بہت اچھا، روزہ کب افطار کرنا چاہئے، کہا جب آفتاب غروب ہو، بولے، اگر آفتاب آدھی رات تک غائب نہو تو یہ سنکر ابو یوسف ہنس پڑے، اور کہا تمھارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا، تمھاری زبان کھلوا کر مین نے خطا کی،

عہد قضا | خلیفہ ہادی نے ۱۶۶ھ مین بغداد کا قاضی مقرر کیا، ہارون الرشید نے اپنی خلافت مین بحال رکھا اسلام مین وہ اوّل شخص ہین، جو قاضی القضاۃ[1] ہوئے، سترہ برس تک قاضی القضاۃ رہے،

اُن کے قاضی ہونے کے عہد مین ایک بار امیر المومنین ہادی کے ایک باغ پر کسی نے اُن کی عدالت مین دعویٰ کیا، بظاہر خلیفہ کا پہلو زبردست تھا، مگر واقعہ اوس کے خلاف تھا، امیر المومنین نے کسی موقع پر اُن سے پوچھا، کہ تم نے فلان باغ کے معاملے مین کیا کیا، جواب دیا، مدّعی کی درخواست یہ ہے، کہ امیر المومنین کی حلفیہ شہادت اس پر لیجائے کہ اون کے گواہون کا بیان سچا ہے، ہادی نے پوچھا کیا اون کی یہ درخواست واجبی ہے، جواب دیا کہ ابن ابی لیلی کے فیصلے کے مطابق صحیح ہے، خلیفہ نے کہا اس صورت مین باغ مدّعی کو دلا دو، یہ ابو یوسف کی ایک تدبیر تھی،

وفات | ۵ ربیع الاوّل یا ربیع الآخر باختلاف قولین ۱۸۲ھ مین انتقال کیا، انتقال کے وقت انھتّر برس کی عمر تھی،

وفات کے وقت کہا، کاش مین اوس فقر کی حالت مین مرتا، جو شروع مین تھی، اور قضا کے کام مین نہ پھنستا، خدا کا شکر ہے اور اسکی یہ نعمت ہے کہ مین نے قصداً کسی پر ظلم نہین کیا، اور نہ ایک فریق معاملے کی، دوسرے کے مقابلے مین پروا کی، خواہ وہ بادشاہ تھا یا بازاری، وفات کے وقت یہ قول بھی منقول ہے، بارالہا! تو خوب جانتا ہے، کہ مین نے کسی فیصلے مین جو تیرے بندون کے درمیان کیا خود رائی سے کام نہین لیا، تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کی پیروی کی کوشش کی، جہان مجھکو اشکال پیش آیا، ابو حنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان

---

[1] ابن عبد البر کا قول ہے، میرے علم مین کوئی ایسا قاضی سوائے ابو یوسف کے نہین، جس کا حکم مشرق سے مغرب تک سارے آفاق مین روان رہا ہو، شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی،

مین واسطہ کیا، اور واللہ وہ میرے نزدیک اون لوگون مین سے تھے، جو تیرے حکم کو پہچانتے تھے، اور کبھی جانکر حق کے دائرے سے نہین نکلتے تھے، یہ بھی موت کے وقت ان کی زبان پر تھا، بارالہا! تو جانتا ہی کہ مین نے جانکر حرام نہین کیا اور نہ جانکر کوئی درم حرام کا کھایا،

اون کی علالت کے دوران مین معروف کرخی نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ مین نے سنا ہے، ابو یوسف زیادہ علیل ہین، تم اون کی وفات کی خبر مجھکو دینا، راوی کا بیان ہے کہ مین دار الرقیق کے دروازہ پر پہنچا، تو ابو یوسف کا جنازہ نکل رہا تھا، دل مین کہا کہ اب معروف کرخی کو خبر کرنے جاتا ہون تو نماز جنازہ نہ ملیگی، چنانچہ نماز مین شریک ہو کر اون کے پاس پہنچا اور خبر وفات سنائی، اون کو سخت صدمہ ہوا، بار بار انا للہ پڑھتے تھے، مین نے کہا یا ابا محفوظ! آپ کو نماز جنازہ مین شریک نہ ہونے کا اس قدر صدمہ کیون ہے. کہا مین نے خواب مین دیکھا کہ مین جنت مین داخل ہوا ہون دیکھتا ہون کہ ایک محل تیار ہوا ہے، اس کا بالائی حصہ مکمل ہو چکا، پردے آویزان کر دیے گئے. غرض ہر طرح پورا ہو چکا، مین نے پوچھا یہ کس کے لئے تیار ہوا ہے، لوگون نے کہا ابو یوسف کے واسطے، مین نے کہا یہ مرتبہ اونھون نے کیون کر پایا، جواب ملا اچھی تعلیم دینے اور اوس کے شوق کے صلے مین اور لوگون نے جو اذیت پہنچائی اوس کے صلے مین،

شجاع بن مخلد کا قول ہے کہ ہم ابو یوسف کے جنازے مین شریک ہوئے، عباد بن العوام بھی ہمارے ساتھ تھے، مین نے اون کو یہ کہتے سُنا، کہ اہلِ اسلام کو چاہیئے کہ ابو یوسف کی وفات پر ایک دوسرے کے ساتھ تعزیت کرین[1]،

---

[1] خلیفہ ہارون الرشید جنازہ کے آگے آگے چلتے تھے نماز جنازہ خود اونھون نے پڑھائی، مقابر قریش مین ام جعفر زبیدہ کی قبر کے پاس دفن کیے، محمد بن جعفر کا قول ہے، ابو یوسف کی شان مشہور فضل ظاہر تھا، اپنے زمانے مین سب سے زیادہ فقیہ تھے، اون سے بڑھکر کوئی نہ تھا، علم، حلم، ریاست، قدر وجلالت مین انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، العبر مین لکھا ہے، ابو یوسف جواد اور سخی تھے، ابو حاتم کا قول ہے، ان کی حدیث لکھی جائے انتہیٰ ابن اہدل کا قول ہے کہ اکثر علما، ابو یوسف کی فضیلت وعظمت کے قائل تھے ابن عبد البر کا قول ہی، ابو یوسف فقیہ عالم حافظ تھے کثیر الحدیث ۱۲ شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی .ھ،

وفات سے پہلے کہتے تھے کہ سترہ برس ابوحنیفہ کی صحبت مین رہا، سترہ برس دنیا کے کام مین رہ چکا، میرا گمان ہے کہ اب میری موت قریب ہے، اس قول کے چند مہینے کے بعد وفات پائی،

ان کے بیٹے یوسف غربی بغداد کے قاضی تھے،

مناقب وجرح ابن کامل کا قول ہو، کہ یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اور علی مدینی اون کے ثقہ فی النقل ہونے پر متفق ہین یحییٰ بن معین کا قول ہے، کہ ابویوسف اصحاب حدیث کی جانب مائل تھے، اور اون کو دوست رکھتے تھے اور مین نے اون سے حدیثین لکھی ہین، امام احمد بن حنبل کا قول ہے، کہ حدیث مین میرے پہلے استاد ابویوسف ہین، اون کے بعد مین نے اورون سے حدیث لکھی، ابن مدینی کا قول ہے، کہ ابویوسف صدوق تھے،

خطیب بغدادی نے اپنا مورخانہ فرض امام ابویوسف کے حالات مین بھی جرح کے متعلق ادا کیا ہو، اور متواتر روایتین جرح کی نقل کی ہین، اسی کے ساتھ اثنائے بیان مین بعض جرحون کا جواب بھی دیا ہے، جرح سب کی سب غیر مفسر اور غیر مبین السبب ہین، موادِ جرح وہی ہے، جو امام اعظم اور امام محمدؒ کی نسبت جرحون کا ہے، یعنی مرجئی ہونا وغیر ذالک، مذکور الصدر دونون امامون کے ذکر مین اس پر جو بحث مجمل و مفصل ہو چکی وہی یہان بھی کی جاسکتی ہے، اعادہ تحصیل حاصل، یا لاحاصل، متاخرین ائمۂ رجال نے امام ابویوسف کے متعلق بھی جرح متروک کر دی ہے، صرف مناقب و تعدیل لکھی ہے،

مثلاً دیکھو تذکرۃ الحفاظ امام ذہبیؒ، اور شذرات الذہب ابن عماد الحنبلیؒ،

متقدمین مین سے امام ابن قتیبہ نے معارف مین نہ امام اعظم پر جرح کی ہے اور نہ ابویوسف پر، حالانکہ دوسرے رجال پر جرح کرتے ہین،

نفسیاتِ حکیم ناصر خسرو

(۲)

از

پروفیسر معتقد ولی الرحمٰن ایم اے، استاد نفسیات جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن،

(۵)

یہ نفس جس کی تعریف کی کوشش ادھر کی گئی ہے، تین مدارج مین پایا جاتا ہے، اوّل نفسِ نباتی دوم نفس حیوانی، اور سوم نفسِ ناطقہ[۱]، نفس نباتی مین غذا حاصل کرنے، اپنی نسل کی افزائش کرنے، اور اپنے ہی طرح کے بچے پیدا کرنے کی قوتین ودیعت کی گئی ہین، بلکہ کہنا چاہیے کہ ان ہی تین قوتون کے مجموعے کو نفس نباتی کہتے ہین، نفس حیوانی حیوانات مین ہوتا ہو، اس مین محسوسات کے اخذ کرنے، صورتون کا تخیل کرنے، اور خود اپنے اختیار سے حرکت کرنے کی قوتین ہوتی ہین، ان تینون قوتون کے مجموعے کو نفس حیوانی کہا جاتا ہے، نفس ناطقہ کی وجہ سے اجسام انسانی مین نطق، تدبیر، احتراز تمیز وغیرہ کی قوتین پیدا ہوتی ہین، یہ قوتین انسان کیلئے مخصوص ہین، ان کے مجموعے کو نفس ناطقہ کہتے ہین، ان نفوس مین سے ہر ایک نفس مین تولید بالمثل کی قوت ہوتی ہے، اس کے علاوہ آخری نفوس مین اپنی مخصوص قوتون کے علاوہ ماقبل کے نفس کی قوتین بھی ہوتی ہین، چنانچہ نفس حیوانی مین محسوسات کو اخذ کرنے وغیرہ کی قوتون کے علاوہ نفس نباتی کی بھی تمام قوتین ہوتی ہین، اسی طرح نفس ناطقہ مین اپنی مخصوص قوتون کے علاوہ نفس حیوانی کی تمام قوتین بھی ہوتی ہین، یعنی یہ کہ نفس ناطقہ نفس کی تمام امکانی قوتون کا حامل ہوتا ہو، اب ہم ان مین سے ہر ایک پر علٰحدہ علٰحدہ غور کرین گے[۲]

---

[۱] ان کو حکیم ناصر خسرو نے علی الترتیب نامی، حسی اور ناطقہ بھی کہا ہے، دیکھو صفحہ ۲۲۹، [۲] زاد المسافرین صفحہ ۲۹۰، صفحہ ۱۹۱،

جو مزاج کہ گرمی، سردی، خشکی و تری کی وجہ سے اجسامِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے، وہ نفسِ نباتی کے لئے بمنزلۂ بنیاد و ہیولیٰ کے ہے، اور تمام قواے نباتی یعنی غذا کا حاصل کرنا افزائشِ نسل، اور تولید بالمثل، اجرامِ فلکی کی تاثیر کا نتیجہ ہیں، ثبوت اس کا یہ ہے کہ یہ قوتیں، جو اس مزاج میں ہوتی ہیں، کلیات یعنی "ارکانِ چہارگانہ" میں موجود نہیں، لہذا یہ کلیات سے نہیں، بلکہ کسی اور چیز سے حاصل ہوتی ہیں، اب اجرامِ علوی کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز نہیں کہ جس کے آثار اور جس کی قوتیں ان طبائع کلیات تک پہنچتی ہوں، اور جن کا رخ ان کی طرف ہو، یہی اجرام ہیں، جو اجسامِ سفلی کو محیط ہیں، اور جو اپنی قوتوں کو نیچے کی طرف ان تک ایصال کرتے رہتے ہیں، چنانچہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، کہ سورج کی شعاعیں اور گرمی زمین تک پہنچتی ہے، ان ہی اجرامِ علوی کی حرکت کا ثبات مذکورۂ بالا تین قواے نباتی کے ہم معنی ہے، اور خود یہ حرکت غیر محسوس اور جسم کو حرکت دینے والی ہے، لہذا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان تین قوتوں کا وجود اجرامِ علوی اور اجرامِ سفلی میں ان اجرامِ علوی کی حرکات کا نتیجہ ہے، یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر کلیاتِ طبائع اس تاثیر کو قبول کر لیتے، تو تمام طبائع نباتی ہو جاتے، کیونکہ اگر ایک چیز "الف" کا ایک جزو، دوسری چیز "ب" کے ایک جزو کو قبول کر لیتا ہے، تو کل چیز "الف" کُل چیز "ب" کو قبول کر لیتی ہے، لیکن معترض نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ احاطۂ افلاک اور اجرامِ علوی دونوں "معدنِ لطائف" ہیں، اور اجرامِ سفلی پر ان کا اثر ہوتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ ان میں کوئی ایسی قوت ہو، جو ان تمام اجسام تک پہنچے، نہ ایسی جو بعض تک تو پہنچے اور بعض تک نہ پہنچے "مدبرِ حکیم" اور "صانعِ علیم" نے ان اجسام کو "مکانہائے معلوم" میں ایک خاص ترتیب سے مرتب کیا ہے، اور ان ہی کی وساطت سے ان میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا ہے، اجرامِ علوی سے آنے والے اثرات اُس مزاج کی تلاش کرتے ہیں، جو عدل سے حاصل ہوا ہے، اور مزاج کی قابلیت قبول کے مطابق اس کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ اس مزاج کے بعض حصوں کے ساتھ تو یہ اثرات پیوست ہوں، اور بعض کے ساتھ نہ ہوں، کیونکہ اگر یہ اثرات ایک جزو کے ساتھ پیوست ہوں، اور دوسرے کے ساتھ نہ ہوں، تو جب یہ اجزا ایک ترکیب میں جمع ہوتے ہیں، تو مقدم الذکر جزو مؤخر الذکر جزو پر ظلم کرتا ہے اور یہ صانعِ حکیم کے عدل کے منافی ہے، پھر اگر کسی مزاج کے اجزائے طبائع متکافی نہیں ہوتے، تو روح (جو عنایتِ الٰہی

کا اثر ہے،) اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوتی، کیونکہ یہ روا نہیں کہ "عدل و اثر و عنایتِ الٰہی" سے کوئی چیز ان طبائع کے ساتھ پیوست ہونے کے لئے مرکزِ عالم کی طرف آئے، اور ایک چیز دوسری کے مقابلے میں زیادہ حصہ حاصل کرے اور اسکو حاصل کرنے میں ایک دوسری پر ستم کرے، اس کے علاوہ جب کسی مزاج کے اجزائے طبائع متکافی نہیں ہوتے، تو قوی ضعیف پر ستم کرتا ہے، لہذا اس ستم کی وجہ سے "عنایتِ الٰہی" اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوتی، لہذا ثابت ہوا کہ مزاج طبائع (جو انسان کے جسم کے لئے بنایا گیا ہے) کے اندر روحِ نباتی اجرامِ علوی سے آتی ہے، اور یہی مزاج اس روح کیلئے بمنزلہ بنیاد و ہیولی کے ہے[1]، یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ جب مزاج معتدل نہیں ہوتا، تو روح اس کے ساتھ کیوں پیوست نہیں ہوتی، روحِ نباتی[2]، جس کو یہ تینوں قوتیں حاصل ہیں، اس مزاج کو ہیکلِ مردم کے بنانے کے لئے پیدا کرتی ہے، اور یہی روحِ نباتی روحِ حیوانی کے لئے بمنزلہ بنیاد و ہیولی کے ہو جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ روحِ حیوانی میں بھی روحِ نباتی کے ذریعہ اجرامِ علوی کی تاثیر سے یہ خاص مزاج پیدا ہوتا ہے، یعنی یہ کہ روحِ نباتی روحِ حیوانی میں حس، خیال، اور خود اپنی مرضی کے مطابق حرکت کا باعث ہوتی، اور روحِ حسی کہلاتی ہے[3]،

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مزاج میں روحِ حیوانی کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ روحِ حیوانی روحِ ناطقہ کیلئے موزوں بنتی ہے، یا نہیں، اور یہ کہ اس مزاج میں روحِ ناطقہ کی پیدائش بھی اجرامِ فلکی کی تاثیر سے ہوتی ہے یا نہیں، پھر ایک اور دریافت طلب امر یہ بھی ہے، کہ ایک ایسے مزاج میں "جو ہیکلِ مردم کی اصل ہے، ان تینوں ارواح میں سے ہر ایک ایک خاص نسبت میں پائی جاتی ہے، یا "ہیکلِ مردم" میں روحِ ناطقہ کے پیدا ہونے کا حال روحِ نباتی اور روحِ حیوانی کے پیدا ہونے کے حال سے مختلف ہے، اصلیت یہ ہے کہ روحِ نباتی اور روحِ حیوانی، دونوں غذا حاصل کرنے، اپنی افزائش کرنے، اور خود اپنے نسل کو پیدا کرنے کے لحاظ سے تو ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ روحِ حیوانی میں حرکتِ انتقال ہوتی ہے، یہ اپنے دشمن کو پہچانتی

---

[1] حکیم ناصر خسرو کا یہ تمام استدلال صاف نہیں، [2] آیندہ ہر جگہ خیال رکھنا چاہیے کہ ناصر خسرو کے ہاں الفاظ "روح" اور "نفس" مترادفات ہیں، لہذا کہیں وہ لفظ روح استعمال کرتا ہے اور کہیں نفس [3] زاد المسافرین صفحہ ۲۹۱، ۲۹۲، [4] ایضاً صفحہ ۲۹۳، ۲۹۴،

اور اپنی غذا سے لذت حاصل کرتی ہے، روحِ نباتی مین یہ باتین نہین ہوتین[1]

اوپر کے بیان سے یہ خیال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کہ روحِ نباتی اور روح حیوانی مین ایک فرق اور بھی ہے جس کو ہم نے فراموش کر دیا ہے، یعنی یہ کہ حیوان تناسل و توالد کے لئے مخالف جنس کے فرد کا محتاج ہوتا ہے، اور نباتات مین یہ بات نہین ہوتی، لیکن یہ خیال غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ نباتات کی یہ خصوصیت حیوانات کے مقابلے مین استوار تر اور درست تر ہوتی ہے، چنانچہ دانون مین سے بعض نر ہوتے ہین، اور بعض مادہ، درخت صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب نر و مادہ ملتے ہین، پھر اگر ایک خاص نر اور ایک خاص مادہ کو ملایا جائے، اور اس کے بعد پھر ان کو الگ الگ کر کے دوسری مادہ یا دوسرے نر کے ساتھ ملا دیا جائے، تو کوئی درخت پیدا نہین ہوتا، یعنی یہ کہ نباتات کی حالت یہ ہو کہ کوئی دانہ اپنے جفت کو نہین بدلتا، اگر یہ بدل دیا جاتا ہے، تو کوئی درخت پیدا ہی نہین ہوتا، برخلاف اس کے حیوانات کا حال یہ ہے، کہ ان کا نر ایک مادہ کو چھوڑ کر دوسری سے ملاپ پیدا کرتا ہے، اور پھر بھی توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اسی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحِ نباتی کی قوت سے جو خاصیت جفت پکڑنے کی دانون مین ہوتی ہے، وہ اس خاصیت کے مقابلے مین مستقل تر ہوتی ہے، جو روحِ حسی کی وجہ سے حیوانات مین ہوا کرتی ہے[2]

لیکن روحِ حیوانی اور روحِ ناطقہ مین فرق یہ ہے کہ روحِ ناطقہ خود اپنے جسم کی مشارکت کے بغیر حرکت کر سکتی ہے، اور روحِ حیوانی مین مشارکتِ جسم کے بغیر کوئی حرکت نہین ہو سکتی، چنانچہ حیوانات تناسل کی غرض سے طلب جفت مین پھرتے ہین، اپنے دشمنون سے بھاگتے ہین، مختلف مقامات مین اپنی غذا تلاش کرتے ہین وغیرہ، اس کے مقابلے مین نفسِ ناطقہ مین ان تمام حرکات کے علاوہ وہ حرکات بھی ہوتی ہین، جن مین جسم کی مشارکت کی ضرورت نہین پڑتی، یہ نفس اپنے طبیعی قوا کی مخالفت کرتا ہے، مثلاً یہ اپنی قوتِ شہوانی کو دباتا ہے، اپنے غصے کو روکتا ہے، اپنی بھوک کو مارتا ہے، اور دیگر اخلاقِ ناپسندیدہ سے باز رہتا ہے، اس طرح اوس کے قوائے طبیعی حدِ اعتدال سے آگے نہین بڑھتے، پھر بعض اوقات یہ جسم سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ قیاسی مقدمات قائم کرتا ہے، اون سے نتائج

---

[1] زاد المسافرین ص۲۹۳، ۲۹۴، [2] ایضاً ص۲۹۴، ص۲۹۵،

امد کرتا ہے اور ان نتائج کو نئے قیاسات کے مقدمات بناتا ہے، اسکا مطلب ہو جاتا ہے کہ نفس ناطقہ فاعل بھی ہے اور منفعل بھی، اور سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

جواباً کہا جا سکتا ہے کہ نفس ناطقہ فاعل تو اس لحاظ سے ہے کہ یہ بدیہیات عقل[1] سے مقدمات وضع کرتا ہے، چنانچہ یہ کہتا ہے کہ جسم مکان گیر ہوتا ہے، اور ہر مکان گیر حرکت پذیر ہوتا ہے، ان دونوں مقدمات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے، کہ کوئی جسم حرکت دینے والا نہیں ہو سکتا یعنی یہ کہ جسم کو حرکت دینے والی چیز مکان گیر نہیں ہو سکتی، اور چونکہ یہ مکان گیر نہیں لہذا یہ جسم نہیں، اس طرح اس عمل میں یہ خود اپنا مفعول بن جاتا ہے، اتنی ہی مختصر گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر چند نفس نباتی و نفس حیوانی حرکت دینے پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کا حرکت دینا ویسا نہیں، جیسا کہ جسم کا حرکت دینا ہے، اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ نفس ناطقہ میں ایک قوت ایسی ہے کہ جس سے یہ جسم کو بھی حرکت دیتا ہے، اور خود اپنے آپ کو بھی، یہ نفس حیوانی کو خشم شہوت، حسد وغیرہ سے روکتا ہے اور یہی وہ قوتیں ہیں، جو نفس حیوانی کو حرکت دیتی ہیں،[2]

اب مقدمات قیاسی سے نتائج حاصل کرنے میں جو حرکت نفس ناطقہ خود اپنے آپ کو دیتا ہے وہ قوت عقل کے ذریعہ دیتی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ نفس ناطقہ کی قوت جنبانندہ بے نہایت ہوتی ہے، یہ اس لحاظ سے نہیں کہ یہ آرام نہیں کرتا، اور اکتساب مقدمات اور استخراج نتائج میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ اُن اعراض و حرکات کو قبول کرنے میں نہیں تھکتا، جو اس کے لائق ہیں، اسی قبول کرنے کو علم کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں اجسام اُن اعراض کو قبول کرنے میں تھک جاتے ہیں، جو اُن کے لائق ہیں، چنانچہ اگر کوئی چیز سیاہ ہوتی ہے، تو پھر بعد میں وہ اور سیاہی کو قبول نہیں کرتی، نفس ناطقہ کا حال یہ ہے کہ جس قدر زیادہ علم یہ حاصل کر لیتا ہے' اسی قدر زیادہ قابل یہ اس نئے علم کو حاصل کرنے کے ہو جاتا ہے، جو اب تک اس کو حاصل نہیں ہوا، اجسام کا حال یہ نہیں چنانچہ جب کوئی جسم سیاہی قبول کر لیتا ہے، تو مزید سیاہی کو کم قبول کرتا ہے، اور جتنی زیادہ سیاہی قبول کرتا جاتا ہے، اس کی قابلیت سیاہی پذیری اسی قدر کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ یہ قابلیت بالکل ختم ہو جاتی ہے، مختصر یہ کہ نفس ناطقہ کی قوت بے نہایت ہوتی ہے، یہ اپنی ذات کیلئے فاعل ہے،

---

[1] زاد المسافرین ص۲۹۵، [2] ایضاً ص۲۹۶ زمانہ حال کی نفسیات اسی کو اس طرح بیان کریگی کہ نفس (ناطقہ) احساسی تہیجات کو وصول بھی کرتا ہے، اور استدلال بھی کرتا ہے، پہلی حالت میں یہ منفعل ہے، اور دوسری میں فاعل،

اور اوس کی ذات اوس کے لئے منفعل[51]، اس کا حال روحِ نباتی، یا روحِ نمائی، اور روحِ حیوانی یا روحِ حسی سے مختلف ہی، حالانکہ یہی دونوں ارواح باعتبار وجود اس پر مقدم ہیں، اسی سے منتج ہوتا ہے، کہ ہیکل مردم میں اس کی پیدائش بھی ان دونوں کی پیدائش سے مختلف ہی[52]

خلاصہ اس تمام طویل بحث کا یہ ہے کہ نفس نباتی، نفسِ حیوانی اور نفسِ ناطقہ، تینوں میں یہ بات مشترک ہے، کہ ان کی پیدائش اور ابتدا امزاج جسدی کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی، لیکن مقدم الذکر دو نفوس اسطقسی (عنصری) مزاج میں اجرام فلکی کی تاثیر سے پیدا ہوتے ہیں، اور نفسِ ناطقہ کی پیدائش اس سے مختلف ہوا کرتی ہے، چنانچہ "دینِ حق" (اسلام) کے حکما، اور متقدمین فلاسفہ میں سے وہ جن کو متالہین کہا جاتا ہی، دونوں اس پر متفق ہیں، کہ نفسِ ناطقہ الٰہی اور ابداعی جوہر ہے[53]، اور صفاتِ الٰہی کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اسی کو بقائے ابدی ہے یعنی جسم کو فنا کے بعد بھی یہ بذاتِ خود قائم رہتا ہے[54]، اس کے برخلاف

---

[51] ناصر خسرو کی اصل عبارت یہ ہے:- ...... "وفاعل است مرذاتِ خویش را، وذاتِ او مر او را منفعل است" (ص۲۹۵) یہ جملہ ابہام انگیز ہی، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ناصر خسرو کے نزدیک نفسِ ناطقہ بحیثیت فاعل اور نفسِ ناطقہ بحیثیت منفعل، یا خود اس کے الفاظ میں اور اوس کی ذات دو علٰحدہ علٰحدہ اور قائم بالذات چیزیں ہیں، اصلیت یہ نہیں، ناصر خسرو کے نزدیک نفسِ ناطقہ ایک ہی ہی، یہی فاعل بھی ہی، اور منفعل بھی یعنی فعل و انفعال اس کے دو شئون ہیں، اس کو ہم چند سطریں قبل ہی واضح کر چکے ہیں، زمانۂ حال کے فلاسفہ و ماہرین نفسیات بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ کانٹ ذاتِ فاعل کو "خالص ایغو" (Pure ego) اور ذاتِ منفعل کو "تجربی ذات" (Empirical self) کہتا ہے، ولیم جمیس ان کو علی الترتیب ذات بحیثیتِ عالم (Knower) اور بحیثیت معلوم (Known) یا مختصراً علی الترتیب محض "میں" ("The I") اور "مجھ" ("The me") کے نام سے موسوم کرتا ہے، فی زمانہ یہ عقیدہ بہت سے نئے مسائل کی تخلیق کا باعث ہوا ہے، [52] زاد المسافرین ص ۲۹۶، ۲۹۷، [53] دیکھو حاشیہ ص ۴۲

[54] حکیم ناصر خسرو شاید بھول گئے، کہ وہ ص۵۸ اور ص۱ ہر نفسِ مطلق، نہ کہ نفسِ ناطقہ کے متعلق کہ آئے ہیں، کہ "آن جوہر بذاتِ خویش زندہ است، (ص۵۸) اور پس ظاہر کردیم کہ اندر ما گوہر لیست کہ بذاتِ خویش زندہ است، ...... و پس از فنائے جسد باقی ست"، (ص۱) اصل یہ ہے کہ ماہیتِ نفس کی تمام بحث میں اونھوں نے نفس (یا روح) کے ان تین مدارج کو پیش نہیں رکھا ہی، ماہیتِ نفس کے متعلق اونھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس میں نفس سے اُن کی مراد غالباً "نفسِ ناطقہ" ہے، لیکن بحث کے دوران میں انھوں نے

مقدم الذکر دونون روحون کا ثبات و وجود کالبد کے ثبات و وجود پر موقوف ہے اور کالبد کا ثبات و وجود اجزاء فلکی کی تاثیر سے ہے[1]

(۶)

نفس ناطقہ مین دو بڑی بڑی قوتین ہوتی ہین، ایک قوتِ علم اور دوسری قوتِ عمل، قوتِ علم کا پہلا کام اس اعتقاد کے ساتھ چیزون کا تصور کرنا ہے، کہ یہ چیزین ایسی ہی ہین، افضل ترین عمل جو نفس کو اس قوت سے حاصل ہوتا ہے، یہ ہے کہ توحید پر اس کا اعتقاد مبنی بر صدق و یقین ہو، قوتِ عمل کا پہلا کام یہ ہے، کہ اس چیز کے طلب کی آرزو مند ہو، جو اس کے جوہر مین مرکوز ہے، اور یہ طلب بقائے ابدی کی خاطر ہو، جس نفس مین دو نون قوتین اور یہ دونون فعل نہین ہوتے وہ نفس بہیمی ہوتا ہے، اور جو نفس کہ دونون کامون سے نہین تھکتا، وہ نفس فرشتگی ہوتا ہے، اس لحاظ سے نفس و جسم کا اتحاد اسی وجہ سے ہے، کہ یہ دونون قوتین فعلیت مین آجائین، چنانچہ کہا جا سکتا ہے، کہ جسم نفس کیلئے ایک عمدہ سواری ہے جس کے ذریعہ وہ (نفس) منزل قوت سے دیارِ فعل کی طرف آتا ہے[2]

(۷)

اوپر نفس کی دو بڑی بڑی قوتون کا ذکر ہوا ہے، ایک قوتِ علمی اور دوسری قوتِ عملی، ان مین سے قوتِ علمی مین حواس کی وساطت سے نصیب ہوتی ہے، یہ حواس پھر دو قسمون کے ہوتے ہین، اول حواسِ ظاہری، اور دوم حواسِ باطنی، بالفاظ دیگر یہی دو قسمون کے حواس ہمارے ہر قسم کے علم کے ذرایع ہین، اوراق آیندہ مین انھی حواس پر علحدہ علحدہ بحث ہوگی، پہلے ہم حواس ظاہری کو لیتے ہین،

حواس ظاہری پانچ ہوتے ہین، لامسہ، ذائقہ، سامعہ، شامہ، اور باصرہ[3]، یہ نفس کے گویا پانچ جسمانی آلات ہین جن سے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶) نفس نباتی اور نفس حیوانی کو بھی شامل کر لیا ہے، اسی سے بعض جگہ غلط مبحث پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ ص ۵ پر نفس کے متعلق کہا ہے، کہ "آن جوہر بذات خویش زندہ است" اور ص ۷ پر "اندر ما" کے الفاظ اضافہ کرکے نفس کو نفس ناطقہ کے ہم معنی کر دیا، یہ ادھر جو کچھ بھی کہا ہے، وہ صراحۃً نفس ناطقہ سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ نفس مطلق سے، [1] زاد المسافرین ص ۲۹۷ - ۲۹۸، [2] ایضاً ص ۳۰۹ - ۳۱۱،

[3] حکیم ناصر خسرو کی ادبی خصوصیات مین سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے، کہ وہ اپنی تحریرون مین تا بحد امکان عربی الفاظ سے اجتناب

کہ وہ چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے، ان حواس میں سے بعض دوسرون کے مقابلے مین شریف تر ہوتے ہین، اوران کا یہ شرف اس منفعت اور مضرت کے مطابق ہوتا ہے جس کو یہ حواس پیدا کرتے ہین، اس لحاظ سے جس جس مین منفعت زیادہ ہو وہ شریف تر ہے لیکن بے سخن حیوانات مین یہ شرف ذرا مختلف اصول پر ہوتا ہے،

ان حواس مین سے حاسۂ لمس عام ترین ہے اس وجہ سے بھی کہ یہ تمام حیوانات مین ہوتا ہے، اور اس لحاظ سے بھی کہ لمس کی قابلیت اس کے تمام جسم مین ہوتی ہے، حیوان کیلئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ جو درد و رنج اس کیلئے مہلک ہوتا ہے اسکو اس حاسہ سے معلوم کرکے اس سے پرہیز کرتا ہے، پھر مجامعت کی لذت کے سبب اپنے جوڑے کو اسی حاسہ کی مدد سے تلاش کرتا ہے تاکہ اپنی نوع کو فنا ہونے سے محفوظ کرے، اسی طرح حاسۂ ذوق مین حیوان کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اسی کی وجہ سے اپنی غذا کی طرف رغبت کرتا ہے، بے سخن حیوانات مین حاسۂ لمس حاسۂ ذوق کے مقابلے مین افضل ہوتا ہے، اسی وجہ سے کہ ان مین حاسۂ ذوق ضعیف ہوتا ہے، اور اس سے اوسکو لذت بھی کم حاصل ہوتی ہے، اس کے علاوہ غذا کی طرف حیوان کو رغبت ہوتی ہے، وہ بھوک کی وجہ سے ہوتی ہے، نہ اس وجہ سے کہ وہ خوش ذائقہ اور بد ذائقہ غذا مین تمیز کرتے ہین، چنانچہ پرندے عام طور پر دانون کو بغیر توڑے کھاتے ہین، لہذا وہ ان کے ذائقے کو محسوس ہی نہین کرسکتے، اس کے مقابلے مین لمس سے وہ درد و رنج سے اجتناب کرتے ہین، اپنے جوڑے کو حاصل کرتے ہین، اور اپنی نوع کی نگہداشت کرتے ہین،

حاسۂ سمع مین حیوانات کے لئے بہت کم منفعت ہوتی ہے، دلیل اسکی یہ ہے، کہ اکثر حیوانات مین یہ حاسہ ہوتا ہی نہین، چنانچہ سانپ، مچھلی، چیونٹی، چوہا، مکھی، اور بعض پرندے اس سے محروم ہوتے ہین[1] اس محرومی کے باوجود ان کی پیدائش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۴) کرتے ہین، چنانچہ زاد المسافرین مین اونھون نے کثرت و تعدد کیلئے بسیاری، موجد یا خالق کیلئے باشانندہ، صاعد کیلئے برشوندہ، ماہیت کیلئے چہ چیزی، علت کیلئے چرائی، عرض، طول، عمق اور ارتفاع کیلئے علی الترتیب پہنا، درازا، ژرفا اور بالا، قوت ارادہ کیلئے خواست وغیرہ استعمال کئے ہین، اپنے اسی میلان کے زیر اثر اونھون نے ان حواس ظاہری کے عربی نامون کی بجائے فارسی نام وضع کئے ہین، چنانچہ لامسہ کو بساوندہ، ذائقہ کو چشندہ، سامعہ کو شنوندہ، شامہ کو بویندہ اور باصرہ کو نگرندہ کہتے ہین، ڈاکٹر حسن نے کتاب کے آخر مین ان الفاظ کا ایک مختصر فرہنگ شامل کیا ہے، [1] یہ بیان ذرا مشکوک ہے، چنانچہ مشہور بات ہے کہ سانپ کے کان بہت تیز ہوتے ہین، اسی طرح چوہے مین بھی سماعت کا نہ ہونا بہت مشکوک ہے،

اور زندگی مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، حالانکہ یہی کمال حیوان ہے، حاسۂ شامہ کا فائدہ یہ ہے، کہ بے سخن حیوان اسی کے ذریعے مفید و مضر غذا مین تمیز کرتا ہے، چنانچہ جو سبزہ کہ ان کے لئے زہر ہے، اور جو پانی کہ ان کے لئے شور روار ہے، اس سے وہ اسی قوت کی مدد سے پرہیز کرتے ہین، ان حیوانات مین یہ حاسہ اکثر دیگر حواس پر فضیلت رکھتا ہے، چنانچہ شکاری کتا جھاڑیون اور کھیتون مین اسی کی مدد سے زندہ پرندہ کا پتہ لگاتا ہے، اور چیونٹی بو ہی سے دانے کے مقام کو معلوم کرکے اوس کو اپنے سوراخ مین لے آتی ہے، حاسۂ باصرہ حیوانات کے لئے بہت زیادہ سودمند اور نفع بخش ہے، یہ اسی کی مدد سے اپنے دشمن اور دوست مین مدد کرتے ہین، اس کے علاوہ اسی سے وہ مرغوب غذا کو طلب کرتے، اور ضرر رسان اور مہلک مقامات سے دور بھاگتے ہین،

لیکن نفس ناطقہ کے لئے حاسۂ سامعہ باقی تمام حواس پر افضل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ کو دیگر نفوس پر جو فضیلت حاصل ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ یہ علم پذیر ہے، جس نفس کو حاسۂ سامعہ نہین ہوتا، اس کو نہ تو بولنا آتا ہے، نہ وہ علوم ریاضی یا دیگر علوم حاصل کرسکتا ہے، یہان تک کہا جاسکتا ہے، کہ جو شخص گنگ ہو، وہ درجۂ مردمی سے ساقط ہے، نفس ناطقہ کے لئے حاسۂ شامہ سب حواس سے کمتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص مین یہ حاسہ نہین، اس کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچتا ہے، کہ وہ خوشبوؤن کو حاصل نہین کرسکتا، لیکن اس کی تلافی اس طرح ہو جاتی ہے، کہ وہ بدبوؤن سے بھی محفوظ رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفس ناطقہ کے لئے جو حاسہ شریف ترین ہے، یعنی حاسۂ سامعہ وہ بے سخن حیوانات مین خسیس ترین ہے، اور جو اس کیلئے خسیس ترین ہے یعنی حاسۂ شامہ، وہ حیوانات کیلئے شریف ترین ہے، انسان مین قوت ذائقہ بہت لطیف اور قوی ہوتی ہے، اسی سے وہ چیزون کی طرف رغبت کرتا ہے، اور بھوک کی لذت، یا تکلیف، کے علاوہ وہ وہ لذتین حاصل کرتا ہے، کہ بے سخن حیوانات کو میسر نہین آتین، حواس لامسہ اور باصرہ کے اعتبار سے انسان اور حیوانات مین کوئی فرق نہین، دونون ان حواس کی وجہ سے اپنے آپ کو گرمی اور سردی کی تکلیف سے محفوظ رکھتے ہین، جنسی کھانے کی لذت حاصل کرتے ہین، تاکہ ان کی نوع تلف نہ ہوجائے، اپنے دشمن سے دور بھاگتے ہین، اور مہلک مقامات سے کنارہ کرتے ہین، بہرحال جو مخصوص منافع کہ نفس ناطقہ کو حواس سے حاصل ہین، اور جن تک حیوانات کی رسائی نہین اُن مین سے ایک علم ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ حیوانات پر فضیلت رکھتا ہے،

بے علم انسان تو گائے بیل کی مانند ہوتا ہے، اور باعلم فرشتوں کا ہم رتبہ ہوتا ہے، بے علم انسان کے نفس تک یہ علم دو راستوں سے پہنچتا ہے، ایک قول اور دوسرا کتابت، قول سے استفادہ ممکن ہوتا ہے سامعہ کی وجہ سے، اور کتابت سے باصرہ کی مدد سے یعنی اگر سماعت نہ ہو، تو قول کو سُن نہیں سکتے، اور اگر بصارت نہ ہو تو تحریر کو پڑھنا ممکن ہی، ان دو حواس کے ذریعے علم حاصل کرنے کے بعد انسان گائے بیل کے درجے سے ترقی کرنے کے بعد فرشتہ بن جا سکتا ہے، اسی واسطے کہا جا سکتا ہے، کہ انسان کے لئے یہ دونوں حواس باقی ماندہ حواس کی بہ نسبت افضل ہیں پھر ان دونوں میں سے سامعہ باصرہ کے مقابلے میں بھی شریف تر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مادرزاد اندھا ہو، لیکن اس کی قوت سماعت درست ہو تو وہ سن کر ہی بہت علم حاصل کر سکتا ہے، اگرچہ وہ شکلوں اور رنگوں کا تصور نہیں کر سکتا، اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص مادرزاد بہرا ہے، تو اسے بولنا ہی نہیں آتا، نہ وہ کوئی علم حاصل کر سکتا ہے، حالانکہ اس کی قوت بصارت میں کوئی فتور نہیں، اس کو ایسا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس میں وہ اشاروں سے کام چلا سکے، مختصر یہ کہ جس طرح نفسِ نامیہ (نباتی) کا کمال یہ ہے کہ وہ نمو پذیر ہو، اسی طرح نفسِ ناطقہ کا کمال یہ ہے کہ وہ علم پذیر ہو، اور نفسِ ناطقہ کا یہ کمال بغیر ان دو حواس کے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر ان دونوں حواس کو دیگر حواس کے مقابلے میں شریف تر مانا گیا ہے، جو فائدے کہ انسان کو ان دو حواس سے حاصل ہوتے ہیں، ان سے بے سخن حیوان محروم رہتا ہے، یہ نفس ناطقہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں، پھر یہ شخص درجہ علوم پر پہنچتا ہے، تو ان فوائد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ ناطقہ کے یہ دونوں حواس زیادہ وحدت پذیر ہوتے ہیں۔[۵۱]

(۸)

جن حواس ظاہری کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان سے انسان صرف محسوسات کا علم حاصل کر سکتا ہے معقولات کو حاصل کرنے کیلئے اس کو حواس باطنی کی ضرورت ہوتی ہے، کسی قول کی محض آواز یا کسی تحریر کی شکل وصورت تو محسوسات میں سے ہے، اور اس آواز اور اس تحریر کے معنی معقولات میں سے ہے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے،

---

۵۱ زاد المسافرین ص۱۴، ۵۲ الفضائل ص۱۱-۲۲

کہ جو کچھ بھی حواس باطنی سے حاصل ہوتا ہے، وہ بالضرورت حواس ظاہری کے راستے سے گذر چکا ہوتا ہے[1] چنانچہ مادرزاد اندھا شخص رنگوں اور شکلوں، اور مادرزاد بہرا شخص آوازوں اور لحنوں کا تخیل کرسکتا ہو نہ ان پر فکر کرسکتا ہے، حواس ظاہری کی طرح حواس باطنی بھی پانچ ہیں، تخیل، وہم، حفظ، فکر، اور ذکر، یعنی "یاد کرنا" بسطور آئندہ میں انہی پر بحث ہوگی،

حواس باطنی میں سے وہم گویا حرکتِ فکر ہے، یا عقل کی سب سے پہلی حرکت ہے، اس کے پس پشت حس ہوتی ہے، یعنی جس چیز میں حس نہیں ہوتی، اس میں وہم بھی نہیں ہوتا، لیکن حس کے مقابلے میں وہم زیادہ خطا پذیر ہوتا ہے، چنانچہ انسان اکثر زیانکار چیزوں کو سودمند سمجھتا ہے، اور بالعکس سودمند چیزوں کو زیانکار، وہم اور حس میں فرق یہ ہے، کہ حس کی فعلیت بیداری میں ہوتی ہے، اور وہم کی بیداری اور خواب دونوں میں، اس کے علاوہ حس سے حاضر اشیاء کا علم ہوسکتا ہے لیکن وہم سے حاضر اور غائب دونوں اشیاء معلوم کی جاسکتی ہیں، حیوان میں وہم کا وہی درجہ ہوتا ہے، جو انسان میں عقل کا ہوا کرتا ہے، لیکن وہم کا اثر عقل کے اثر کی نسبت کمزور ہوا کرتا ہے، انسان کی قصدی حرکات فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں اور وہم نفس بہیمی کی حرکت ہے[2]، اس کی تعریف یہ ہے کہ یہ قوت ہے جس سے ہوا کی وساطت سے اشیاء دریافت کی جاتی ہیں، یا یہ کہ یہ وہ قوت ہے، جو محسوسات کے اثر کو قبول کرتی ہے، اس کے مقابلے میں قوتِ تخیلہ یا تخیل وہ قوت ہے، جو محسوسات کی صورت کو اُن کے ہیولیٰ سے مجرد کرکے ان کی نگہداشت

---

[1] کتاب زاد المسافرین کا جو قلمی نسخہ کیمبرج میں ہے، اس پر حاشیہ اور شرح بھی ہے، اس موقع پر حاشیہ نویس اور شارح کا یہ فقرہ بہت بصیرت افروز ہے:- "..... تخیل در چیزے تواند کرد کہ اول از حواس ظاہر یافتہ باشد، وہمچنین تفکر و توہم والا در چیزے کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، از راہ حواس باطن نمی تواند دانست، واگر کسی گوید کہ چیزے را تخیل و توہم کند، کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، مثل آدم دو سر و دریائے زیبق را مثال این گوئیم کہ چون آدم، و سر را، ہر دو را دیدہ وہمچنین دریا و زیبق را تفصیل و ترکیب کند کار متفرقہ است، و این کار را بکند" (ص ۴۸۹ و ص ۴۹۰) زمانہ حال کے ماہرین نفسیات بھی اپنی اپنی کتابوں میں تخیل کی بحث میں گویا اسی فارسی عبارت کا ترجمہ کردیتے ہیں، چنانچہ دیکھو نفسیات مصنفہ پروفیسر انجل ص ۲۰۳، [2] لیکن چند سطرین قبل ہی کہا گیا ہے، کہ "وہم نخستین حرکت عقل است" (ص ۲۳) اور عقل نفس ناطقہ کے لئے مخصوص ہے، لیکن اب یہاں وہم کو نفس بہیمی کی حرکت کہا جارہا ہے، جو عقل سے معرا ہوتا ہے، اس تضاد کا کیا حل ہے؟

بے علم انسان تو گائے بیل کی مانند ہوتا ہے، اور باعلم فرشتوں کا ہم مرتبہ ہوتا ہے، بے علم انسان کے نفس تک علم دو راستوں سے پہنچتا ہے، ایک قول اور دوسرا کتابت، قول سے استفادہ ممکن ہوتا ہے سامعہ کی وجہ سے، اور کتابت سے باصرہ کی مدد سے، یعنی اگر سماعت نہ ہو، تو قول کو سُن نہیں سکتے، اور اگر بصارت نہ ہو تو تحریر کو پڑھنا ناممکن ہے، ان دو حواس کے ذریعے علم حاصل کرنے کے بعد انسان گائے بیل کے درجے سے ترقی کرنے کے بعد فرشتہ بن جا سکتا ہے، اسی واسطے کہا جا سکتا ہے، کہ انسان کے لئے یہ دونوں حواس باقی ماندہ حواس کی بہ نسبت افضل ہیں پھر ان دونوں میں سے سامعہ باصرہ کے مقابلے میں بھی شریف تر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مادرزاد اندھا ہو، لیکن اس کی قوت سماعت درست ہو تو وہ سن کر ہی بہت علم حاصل کر سکتا ہے، اگرچہ وہ شکلوں اور رنگوں کا تصوّر نہیں کر سکتا، اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص مادرزاد بہرا ہے، تو اوسے کو بولنا ہی نہیں آتا، نہ وہ کوئی علم حاصل کر سکتا ہے، حالانکہ اس کی قوت بصارت میں کوئی فتور نہیں، اس کو ایسا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس میں وہ اشاروں سے کام چلا سکے، مختصر یہ کہ جس طرح نفس نامیہ (نباتی) کا کمال یہ ہے کہ وہ نمو پذیر ہو، اسی طرح نفس ناطقہ کا کمال یہ ہے کہ وہ علم پذیر ہو، اور نفس ناطقہ کا یہ کمال بغیر ان دو حواس کے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر ان دونوں حواس کو دیگر حواس کے مقابلے میں شریف تر مانا گیا ہے، جو فائدے کہ انسان کو ان دو حواس سے حاصل ہوتے ہیں، ان سے بے سمجھ حیوان محروم رہتا ہے، یہ نفس ناطقہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں، پھر یہ شخص درجہ علوم پر پہنچتا ہے، تو ان فوائد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس ناطقہ کے یہ دونوں حواس زیادت پذیر ہوتے ہیں،[۵۲]

(۸)

جن حواس ظاہری کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان سے انسان صرف محسوسات کا علم حاصل کر سکتا ہے معقولات کو حاصل کرنے کیلئے اس کو حواس باطنی کی ضرورت ہوتی ہے، کسی قول کی محض آواز یا کسی تحریر کی شکل و صورت تو محسوسات میں سے ہے، اور اس آواز اور اس تحریر کے معنی معقولات میں سے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے،

---

۵۲ زاد المسافرین ص ۱۹، ۵۲ ایضاً ص ۱۶-۲۲

کہ جو کچھ بھی حواس باطنی سے حاصل ہوتا ہے، وہ بالضرورت حواس ظاہری کے راستے سے گذر چکا ہوتا ہے[1]، چنانچہ مادرزاد اندھا شخص رنگوں اور شکلوں، اور مادرزاد بہرا شخص آوازوں اور لحنوں کا تخیل کر سکتا ہے، نہ ان پر فکر کر سکتا ہے، حواس ظاہری کی طرح حواس باطنی بھی پانچ ہیں، تخیل، وہم، حفظ، فکر اور ذکر، معنی "یاد کرنا" بسطور آئندہ میں انہی پر بحث ہو گی،

حواس باطنی میں سے وہم گویا حرکت فکر ہے، یا عقل کی سب سے پہلی حرکت ہے، اس کے پس پشت حس ہوتی ہے، یعنی جس چیز میں حس نہیں ہوتی، اس میں وہم بھی نہیں ہوتا، لیکن حس کے مقابلے میں وہم زیادہ خطا پذیر ہوتا ہے، چنانچہ انسان اکثر زیانکار چیزوں کو سودمند سمجھتا ہے، اور بالعکس سودمند چیزوں کو زیانکار، وہم اور حس میں فرق یہ ہے، کہ حس کی فعلیت بیداری میں ہوتی ہے، اور وہم کی بیداری اور خواب دونوں میں، اس کے علاوہ حس سے حاضر اشیاء کا علم ہو سکتا ہے لیکن وہم سے حاضر اور غائب دونوں اشیا معلوم کی جا سکتی ہیں، حیوان میں وہم کا وہی درجہ ہوتا ہے، جو انسان میں عقل کا ہوا کرتا ہے، لیکن وہم کا اثر عقل کے اثر کی نسبت کمزور ہوا کرتا ہے، انسان کی قصدی حرکات فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں اور وہم نفس بہیمی کی حرکت ہے[2]، اس کی تعریف یہ ہے کہ یہ قوت ہے جس سے ہوا کی وساطت سے اشیاء دریافت کی جاتی ہیں، یا یہ کہ یہ وہ قوت ہے، جو محسوسات کے اثر کو قبول کرتی ہے، اس کے مقابلے میں قوت تخیلہ یا تخیل وہ قوت ہے، جو محسوسات کی صورت کو اُن کے ہیولیٰ سے مجرد کر کے ان کی نگہداشت

---

[1] کتاب زاد المسافرین کا جو قلمی نسخہ کیمبرج میں ہے، اس پر حاشیہ اور شرح بھی ہے، اس موقع پر حاشیہ نویس اور شارح کا یہ فقرہ بہت بصیرت افروز ہے، "...... تخیل در چیزے می تواند کرد کہ اول از حواس ظاہر یافتہ باشد، و ہمچنین تفکر و توہم والا در چیزے کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، از راہ حواس باطن نمی تواند دانست، و اگر کسی گوید کہ چیزے را تخیل و توہم کند، کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، مثل آدم دو سر و دریائے زیبق وامثال این گوئیم کہ چون آدم، و سر را، ہر دو را دیدہ و ہمچنین دریا و زیبق را تفصیل و ترکیب کند کار متفرقہ است، و این کار را بکند" (ص ۹ ۴ و ۴۹) زمانہ حال کے ماہرین نفسیات بھی اپنی اپنی کتابوں میں تخیل کی بحث میں گویا اسی فارسی عبارت کا ترجمہ کر دیتے ہیں، چنانچہ دیکھو نفسیات مصنفہ پروفیسر اینجل ص ۲۰۳، [2] لیکن چند سطریں قبل ہی کہا گیا ہے، کہ "وہم نخستین حرکت عقل است" (ص ۲۳) اور عقل نفس ناطقہ کے لئے مخصوص ہے، لیکن اب یہاں وہم کو نفس بہیمی کی حرکت کہا جا رہا ہے، جو عقل سے معرا ہوتا ہے، اس تضاد کا کیا حل ہے؟

کرتی ہے، یہ قوت دماغ کے سامنے کے حصہ میں ہوتی ہے[۵۱] قوت متخیلہ ان صورتوں کو مجرد کرکے ان کو قوت حافظہ[۵۲] کے سپرد کرتی ہے، یہ بھی ایک حسّ باطنی ہے، اور یہ موخر دماغ میں ہوتی ہے، ایک اور حسّ باطنی ذاکرہ ہے، جو ان محفوظ صورتوں کو حفظ میں سے واپس نکالتی ہے، قوت حافظہ اور قوت ذاکرہ میں سے مقدم قوت حافظہ ہوتی ہے، کیونکہ جب تک کہ کوئی چیز خفظ نہ کی جائے، اس وقت تک اس کا احیار، یا تذکرہ ممکن نہیں ہو سکتا، جب قوت متخیلہ "صور تہائے شخصی، یا صور تہائے قولی، یا صور تہائے کتابتی" میں سے ایک صورت کو اس کے ہیولی سے مجرد کرتی ہے، اور قوت حافظہ کے سپرد کرتی ہے، تو قوت حافظہ اس صورت کی نگہداشت کرتی ہے، پھر جو صورت کہ قوت متخیلہ اس کے بعد اسکے سپرد کرتی ہے، قوت حافظہ اس کا مقابلہ پہلے کی صورت کے ساتھ کرتی ہے، جب یہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مشابہ پاتی ہے، تو اوس کو وہی صورت سمجھتی ہے اور جب یہ صورتیں ایک دوسری سے نہیں ملتیں، تو جان لیتی ہو کہ یہ دو نہیں،

ان تمام حواس باطنی کے وظائف کو حکیم ناصر خسرو نے ایک لطیف تشبیہ کی صورت میں بیان کیا ہے، کہتے ہیں کہ قوت متخیلہ، جو صورتوں کو اُن کے ہیولی سے مجرد کرتی ہے، گویا ایک لکھنے والا شخص ہے، جو "صورت قول" کو اس کے ہیولی یعنی ہوا اور آواز، اور "صورت نوشتہ" کو اس کے ہیولی یعنی سیاہی و کاغذ و حروف وغیرہ سے مجرد کرکے اس صورت بے ہیولی کو قوت حافظہ کے اندر لکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں جو کچھ انسان کے حافظے میں ہوتا ہے، وہ نفسانی کتابت ہے، جس کو نفس قوت متخیلہ کے قلم سے حافظے کے کاغذ پر لکھتا ہے، چنانچہ ہم جانتے ہیں، جب ہم کسی تحریر یا قول کو حفظ کرتے ہیں، تو حروف و الفاظ

---

[۵۱] شارح کا خیال ہے کہ:- "مراد از قوت متخیلہ حس مشترک است کہ مرجمیع محسوسات را کہ ہمہ حواس ظاہر دریابند دریابد و آن صور تہا را بخزانۂ خیال سپارد، نہ قوت متخیلہ کہ جمہور آن را غیر حس مشترک دانند و کار او ترکیب و تحلیل صور است و مکان آن را کہ در مقدم دماغ گفتہ نیز موید ہمین است" (ص۴۹) [۵۲] شارح کے نزدیک:- "مراد از قوت حافظ درین جا قوت خیال است کہ حافظ و نگاہدارندۂ صورت است، نہ قوت حافظ کہ مصطلح قوم است کہ آن حافظ و نگاہدارندۂ معانی جزئی است، کہ واہمہ ادراک نمود، پس قوت حافظ بمعنی لغوی است نہ اصطلاحی، اما تعیین مکان این قوت کہ حافظ صورت است موخر دماغ کردن درست است، مگر گوئیم کہ موخر بطن اول دماغ باشد" (ص۴۹)

تو غائب ہو جاتے ہین، اور وہ صورت مجرد باقی رہ جاتی ہے، جس کو قوتِ متخیلہ نے منتزع کرکے قوتِ حافظہ کے سپرد کیا ہے، قوتِ ذاکرہ گویا ایک شخص ہے، جو اس کتابتِ نفسانی کو پڑھتا ہے، چنانچہ ہمین معلوم ہے کہ قوتِ ذاکرہ جب چاہتی ہے ان نوشتون کو پڑھ لیتی ہے، جو حفظ ہین، اور خود وہ نوشتے اپنے اپنے حال پر باقی رہتے ہین، اس کتابت کا حال عام جسمانی کتابت کا سا ہے کہ ان کو خواہ کتنا ہی پڑھا یا سنا جائے، ان کی حالت مین کوئی تغیر واقع نہین ہوتا، اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے، کہ نفس قوتِ ذاکرہ کی مدد سے اس "نوشتہ نفسانی" کو پڑھ سکتا ہے جس کو قوتِ متخیلہ نے حافظہ کے کاغذ پر لکھا ہے، اور اس پڑھنے آواز اور حروف شنودنی کو ادا کرنے کی ضرورت نہین ہوتی، چنانچہ اگر ہم کوئی شعر حفظ کرلین، تو پھر بعد مین باآواز بلند پڑھے بغیر اس کا اعادہ کرسکتے ہین،

مندرجۂ بالا تشبیہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ جس طرح نفس کی ظاہری کتابت و کتابت ہوتی ہے، اسی طرح باطنی کتابت و کتابت بھی ہوتی ہے، اور جس طرح اس کی ظاہری گفتاری، و گفتہ ہوتا ہے، اسی طرح باطنی گفتاری و گفتہ ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ ظاہری جو کچھ ہے، وہ "ہیولیائے مصورہ" ہے، اور باطنی جو کچھ ہے، وہ "صورتِ بے ہیولی" لہذا ضروری ہے کہ ان مجرد صورتون کو حاصل کرنے والی قوتین لطیف ہون، یہ قوتین حواس باطن ہین، باوجود اس کے کہ محسوسات و مدرکات بکثرت ہین، لیکن پھر بھی یہ حواس باطن ان سب کیلئے تنگ نہین، ان تمام صور تہائے ہیولانی کا نمایندہ مشاعر جسم مین ہے، یہ حواس ظاہری ہین، ان حواس کی خصوصیت یہ ہے، کہ یہ دو چیزون کو بیک وقت اور بیک جا حاصل نہین کرسکتے، بلکہ ایک ایک کرکے پاتے ہین، محسوسات ان کے اندر پہنچ کر ایک دوسرے کی مزاحمت کرتے ہین، اور ان کے لئے ان حواس کے اندر جگہ تنگ ہوجاتی ہے، چنانچہ ایک ہی مقام پر دو حرف نہین لکھے جاسکتے، اس کے مقابلے مین کتابتِ نفسانی مین بہت سے مختلف علوم جگہ پاتے ہین، اور ان کے آپس مین نہ مزاحمت ہوتی ہے، نہ اُن کے لئے جگہ کی تنگی ہوتی ہے[1]

---

[1] زاد المسافرین صفحہ ۲۳-۲۶ حکیم ناصر خسرو نے اپنی مثنوی روشنائی نامہ (مطبوعہ کاویانی ص ۱۹) مین حواس ظاہری و باطنی اور ان کے دقائق کو بہت خوبی اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، کہتے ہین:-

ترا زین خان شش سوره گزر شد، درین خان خانه تو پنج در شد،

مختصر یہ کہ قدرت نے اشیائے عالم کو دریافت کرنے کیلئے دو آلات بنائے ہیں، ان میں سے ایک تو حواس ظاہری ہیں جن سے محسوسات و مشاہدات دریافت کئے جاتے ہیں، اور دوسرے حواس باطنی ہیں جن سے نامحدود و نامتناہی چیزیں در کی جاتی ہیں، اب چونکہ انسان اپنے حواس ظاہری سے تمام متناہیات و جسمانیات کو دریافت اور ان کے تمام منافع و فوائد کو حاصل کرلیتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ وہ حواس باطنی سے نامتناہیات کو دریافت اور قبول، اور اون کے تمام فوائد کی کو حا کرے کہ اسی کا نام عقل ہے، ہمارے اس دعوی کی، کہ انسان نے اپنے حواس ظاہر سے تمام اون فوائد و لذات و منافع کو حاصل کرلیا ہے، جو اس دنیا میں موجود ہیں، اور اب کوئی چیز ایسی نہیں رہی جس کو اوس نے چھوڑ دیا ہو، یا جو اس سے پوش رہی ہو، دلیل یہ ہے کہ زمانہ دراز گذر گیا، اور اب تک کوئی نئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ انسان پہلے ہی سے اوس سے واقف نہ ہو[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۳) کشادہ ہر درے در بوستانے — زہر در اندر آید کاروانے،

اگرچہ اندریں خانہ غریبی، — ازیں بر پنج دریا با نصیبی،

یکے جنبت کو بیند عجائب، — شود زیں دید نی رائے تو صائب،

دگر گوشت کہ شہرا و کلامست، — دلت را زان معانی بس تمامست،

دگر بینی کہ بوئے گل پذیرد، — دماغ و دل ز بویش ذوق گیرد

ز ذوق و لمس نعمت ہست بہرہ، — چو نرمی یا درشتی دست بہرہ

حواس ظاہراند این پنج باطن، — بود پنج دگر اے یار محسن

خیال و وہم فہم و حفظ دیگر، — کہ حس مشترک خوانیش بر سر،

خطا بیند باز این پنج گانہ — توانی راست بین شان کرد یانہ

ریاضت کش مر اوراست بین کن، — پس آنگاہے گمانت را یقین کن،

چو اینہا راست بین گشتند از آن پس — ترا سرمایہ این اندر جہان بس،

کشادہ گردد آنگہ چشم بینش، — بہ بینی آن ورائے آفرینش

[1] یہ دلیل بہت ہی عجیب وغریب ہے، اس کو تسلیم کرلینے سے کیا انسان (نعوذ باللہ) عالم الغیب والشہادہ نہیں بن جا

اب رہا یہ دعویٰ کہ انسان حواسِ باطنی سے ناتناہیات پر اطلاع پاتا ہے، سو اس کی دلیل یہ ہے، کہ حواس
نی کی قوت بھی ناتناہی ہے، چونکہ تناہی قوت والے حواس یعنی حواس ظاہری سے موجوداتِ تناہی سے واقفیت
تی ہے، لہذا ظاہر ہے کہ ناتناہی قوت والے حواس یعنی حواس باطنی، موجودات ناتناہی کا علم مہیا کرین گے، خصوصاً
ائے بھی کہ ناتناہیات کی اصل یعنی عقل بھی انسان کو عنایت ہوئی ہے، اس پر معترض کہہ سکتا ہے، کہ جب انسان ناتناہی
طلع ہوجاتا ہو، تو یہ ناتناہی اس کے لئے تناہی بن جاتا ہے، چنانچہ اگر یہ صحیح ہے کہ آسمان اپنی اس وسعت کے باوجود
ے کے تل مین سما سکتا ہے، اور اس قدر مختلف و متلون صورتین قوتِ متخیلہ مین جو کاسۂ سر کے اندر ہے، جگہ پا سکتی ہین، تو یہ
حیح ہے کہ ناتناہیات اپنی بے نہایتی کے باوصف، ناتناہی قوتون کو تناہی کردین، لیکن ہمارے اس قول کی تائید کہ
سان اپنے حواس باطنی سے روحانیات کے کلیاتِ ناتناہی سے مطلع ہوجاتا ہے، حواس ظاہری کے ضائع نہ ہونے سے
تی ہے، اس کے علاوہ جب انسان حواس ظاہری سے تمام فوائد جسمانیات کو حاصل کرلیتا ہے، تو ضروری ہے کہ وہ
س باطنی سے "تمام فوائد عقلانی" کو حاصل کرے، اور پھر بھی یہ ناتناہی قوتین ضائع نہ ہون، بعینہٖ اس طرح جیسے کہ تناہی قوتین
ئع نہین ہوتین۔ (باقی)

سیر الصحابہ حصہ ششم

جسمین بہ ترتیب چار اہم ہستیون حضرت امام حسن، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی
عنہم کے حالات و سوانح، اخلاق و فضائل، اور ان کے مذہبی، علمی، اخلاقی، اور سیاسی مجاہدات اور کارنامون کی
یل ہے، ضخامت ۴۰۲ صفحے، قیمت ہے ۔

بقیہ حاشیہ (صفحہ ۳۴۴) لیکن شارح کا خیال ہے کہ "اگر کسے گوید کہ بسیار چیزہا درین زمانہا نزدیک ظاہر شدہ است کہ پیش ازین ظاہر
بودست، این حکم چگونہ راست باشد؟ گوئیم کہ بعض چیزہا کہ بر بعض مردم بعض اقالیم ظاہر شدہ آن نیست کہ بعض مردم اقالیم دیگر ندانستہ
بلکہ بر آنہا ظاہر ...... (یہان ایک لفظ کرم خوردہ ہے، صحیح کو معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہے) نہایتش بر مردم اقالیم دیگر
از مدتے رسیدہ، پس چیزے نبودہ کہ بر مردم ظاہر نشدہ است" (صفحہ ۵، صفحہ ۶) زاد المسافرین ص ۲۶۹ - ۲۷۰۔

فردوسی کا بزمیہ کلام

از

جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی

عجم کا نامور شاعر فردوسی اپنی غیر فانی رزمیہ نظم شاہنامہ کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کرچکا ہے، اس لئے اس شاہکار کے بعد کسی دوسرے کلام کو اس سے منسوب کرنے کی حاجت باقی نہین رہتی، لیکن مؤرخین اور تذکرہ نویسون نے شاہنامہ اور مثنوی یوسف و زلیخا کے علاوہ بھی فردوسی کے بزمیہ کلام از قسم قصائد و غزلیات، قطعات، رُباعیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے متفرق اشعار بھی نقل کئے ہین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران کا یہ مایۂ ناز رزمیہ نویس بزمیہ شاعری پر بھی قدرت رکھتا تھا، اگرچہ یہ نہین معلوم ہوتا کہ فردوسی نے کوئی دیوان مرتب کیا ہو، دولت شاہ کے اس بیان سے کہ

"شاعری پیشہ ساختہ، قطعہ و قصائد می گفت، از خاص و عام وجہ معاش بدو می رسید"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ لکھنے سے پیشتر فردوسی بھی اور پیشہ ور شاعرون کی طرح قصائد و غزلیات لکھکر معاش حاصل کرتا ہوگا، لیکن نظامی عروضی کا بیان ہے، کہ فردوسی کا پیشہ زمینداری تھا، جس کی آمدنی سے وہ کسب معاش کرتا تھا[2] اسلئے ظاہر ہے، کہ معیشت کے لئے وہ کسی کا محتاج نہ تھا اسی طرح جو اشعار قصائد وغیرہ کے ملتے ہین، اُن سے بھی یہ ثابت نہین ہوتا، کہ اوس نے مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنالیا ہو، بہرحال اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے قصائد و غزلیات وغیرہ لکھے تھے، جن کا بہت سا حصہ برباد ہوگیا، اور بالفعل نایاب ہے،

---

[1] تذکرہ دولت شاہ ص۱۱ طبع بمبئی، [2] چہار مقالہ ص۴۵ ، طبع ایران شہر برلن،

خود فردوسی اپنی مثنوی یوسف و زلیخا میں[1] جو اس کی آخر عمر کی تصنیف ہے، اپنے عاشقانہ اشعار و غزلیات کی طرف

شارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

بسے نامۂ دوستان گفتہ ام، الخ

ہمیدون بسی راندہ ام گفتگوے ٭ زخوبان شکر لب ماہروی،

لیکن صاحب مرأة الخیال کے نزدیک شاہنامہ کے سوا فردوسی کا اور کلام نہیں ہے[2] اس پر تنقید کرتے ہوئے

ولینا آزاد فرماتے ہیں:۔

"تذکرۂ مرأة الخیال میں جو لکھا ہے کہ سوائے شاہنامہ کے کوئی اور نظم اوس کی نہیں یہ غلط ہے کیونکہ قصۂ حضرت یوسف

راقم نے بچشم خود دیکھا ہے، ××× دو قطعہ جو تاریخ ہفت اقلیم میں دیکھے گئے، اہل اخلاق کیلئے تحفۂ دلکش ہیں"[3]

اس کے بعد آزاد نے ہفت اقلیم کے حوالے سے تین قطعے اور ایک رباعی نقل کئے ہیں،

حمد اللہ مستوفی نے لکھا ہے، کہ شاہنامہ کے علاوہ فردوسی کے عمدہ اشعار ہیں، اور ایک غزل کے چار شعر

نقل کئے ہیں[4]

لطف علی آذر نے بھی فردوسی کے اشعار نقل کئے ہیں، اور لکھا ہے کہ

"چند بیتے از قصائد و قطعات و رباعیات کہ در بعضے کتب متفرقہ بنظر رسیدہ منتخب و نوشتہ شد"[5]

رضا قلی ہدایت نے بھی لکھا ہے، کہ مثنویات کے علاوہ فردوسی کے قصائد اور غزلیات بھی تھیں، جو باقی نہیں رہیں[6]

در متفرق اشعار نقل کئے ہیں،

فردوسی کے بزمیہ کلام (قصائد و غزلیات وغیرہ) پر یورپین مستشرقین ڈاکٹر ایتھے (ETHE) نے ایک

۱؎ چند سال ہوئے پروفیسر شیرانی نے رسالہ اردو میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں مثنوی یوسف زلیخا کو فردوسی سے منسوب
رنے کی وجوہ پر مفصل بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ یہ مثنوی فردوسی کی تصنیف سے نہیں ہے، ۲؎ مرأة الخیال ص۲۲ بمبئی
۳؎ نگارستان فارس ص۱۶، ص۱۷ ۴؎ تاریخ گزیدہ ص۸۲۴، طبع عکسی لندن، ۵؎ آتش کدہ ۶؎ مجمع الفصحا، جلد اول ص۳۸۳، ص۳۸۴،

مضمون بعنوان FIRDUSI ALS LYRIKER لکھا تھا، جو میونخ (جرمنی) کے رسالہ SITZUNGSBERICHTE (جلد ۲ ۱۸۷۳ء ص ۲۷۵ - ص ۳۰۴ اور جلد ۳ ۱۸۷۳ء ص ۶۳۳، ص ۶۹۳) مین شائع ہوا تھا، پروفیسر براؤن نے اس مضمون کا حوالہ اپنی کتاب مین دیا ہے[1] اصل مضمون جرمن زبان مین اور بالفعل نایاب ہے صرف اس قدر معلوم ہو سکا، کہ ایتھے نے اپنے مضمون مین جن کتابون کا حوالہ دیا ہے وہ حسب ذیل ہین:-

۱- مجموعۂ اشعار شعرائے متقدمین یعنی ایک سو ستر شعراء کے اشعار جو زیادہ تر فردوسی کے پیش رو اور اس کے معاصر شعراء کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ مین موجود ہے،

۲- مخزن الغرائب، تذکرۂ شعراء فارسی قلمی،

۳- مخزن العرائب، اسی نام کا ایک اور رسالہ،

۴- لباب الالباب عوفی،

۵- آتشکدۂ آذر،

۶- ہفت اقلیم امین رازی،

۷- ریاض الشعراء والۂ داغستانی،

۸- لب لباب،

۹- خلاصۃ الافکار،

۱۰- بتخانہ،

۱۱- منتخب التواریخ بدایونی،

مندرجۂ بالا کتابون مین فردوسی کے جو اشعار منقول ہین، ان کو ایتھے نے یکجا جمع کر دیا ہے، جن مین ایک قصیدہ ۵۴ شعر کا، تین غزلین، چھ رباعیان، تین قطعے اور دو قصیدے اور ہین، لیکن ایتھے کے منقولہ بعض قطعے اصلی نہین ہیں

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۲ ص ۱۳۱ کا نوٹ، نمبر ۱،

جیسا کہ اون کی سُست بندش اور بے ربطی سے پایا جاتا ہی، اسی بنا پر ایک ایرانی محقق نے یہ اعتراض کیا ہی، کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی مدح مین جو اشعار ہین، وہ تمامتر متوسطین اور متاخرین کی تصنیف سے ہین[۱]

ایتھے کی کتب مرجوعہ مین اکثر قلمی کتابین ہین، جو غیر الحصول ہین، اس لئے اس کی بیان کردہ تین مطبوعہ کتابون لباب الالباب، آتشکدہ، اور منتخب التواریخ کے علاوہ بعض دیگر کتب تذکرہ کی مدد سے ہم ذیل مین فردوسی کے اشعار نقل کرتے ہین،

۱۔ لباب الالباب عوفی، (جلد دوم ص۳۳ طبع لندن)

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم زگفتار تازی و از پہلوانی،
بچندین ہنر شصت و دو سال بودم کہ گوشہ برم زآشکار و نہانی،
بجز حسرت و جز وبال گناہان، ندارم کنون از جوانی نشانی،
بیاد جوانی کنون مویہ آرم، بدین بیت بو طاہر خسروانی،
جوانی من از کودکے یاد دارم، دریغا جوانی دریغا جوانی،

۲۔ تاریخ گزیدہ (ص۸۲۳) طبع عکسی لندن)

شبے در برت گر برآسودمی، سر فخر بر آسمان سودمی،
قلم در کف تیر بشکستمی، کلاہ از سر مہر بربودمی،
بقدر از نہم چرخ بگذشتمی، بپی فرق کیوان بفرسودمی،
بہ بیچارگان رحمت آوردمی، بدر ماندگان بربخشودمی،

۳۔ ہفت اقلیم (نگارستان فارس ص۱۶، ص۱۷)

فلک گر بزیر نقاب اندراست وگر زیر پر عقاب اندراست

---

[۱] مجلہ کاوہ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ ص۳ طبع برلین،

مپندار کو از پئے کار بد قوی | بہ بند خطا و ثواب اندر است
اگر بد کنی کینہ خود بری | ز چشم زمانہ بخواب اندر است
برا یوانہا نام بیژن ہنوز | بزندان افراسیاب اندر است

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم الخ (مطابق تاریخ گزیدہ)

بیا گوے کہ پرویز از زمانہ چہ برد | برو پرس کہ کسری زرو زگار چہ خورد
گر او گرفت ممالک بدیگران بگذاشت | ور این ہمہ خزائن بدیگران بسپرد
تا چند نہی بر دل خود غصہ و درد | تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد
زان پیش کہ گرد و نفس گرم تو سرد | با دوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد

۴- منتخب التواریخ (جلد اول ص۱۰ طبع کلکتہ)

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست | چگونہ دریا کا نرا کنارہ پیدا نیست
شدم بدریا غوطہ زدم ندیدم دُر | گناہ بخت من است این گناہ دریا نیست

۵- آتشکدہ (ص۹۲، ص۹۷ طبع بمبئی)

مستت ہمی چشم تو و تیر بدست | بس کس کہ ز تیر چشم تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست | کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

بیا گوی کہ پرویز از زمانہ چہ خورد الخ (مطابق ہفت اقلیم)

بسی رنج دیدم الخ (مطابق مذکورۂ بالا) صرف ۲ شعر

تا چند نہی بر دل خود غصہ و درد الخ (مطابق ہفت اقلیم)

دوش از سر لطف بندہ پرور دن خویش | بنمودی طریق مردی گردن خویش
جرمم ہمہ عفو کرد و دستم بگرفت | خندان خندان فگند در گردن خویش

۶- مجمع الفصحاء (جلد اول ص۳۹۲، ص۳۹۳ طبع ایران)

شہی کہ چون بدو انگشت در خیبر کند — برآمدا ز پے اسلام صد ہزار انگشت

علی عالی اعلیٰ کہ دست قدرت او — ہزار رہ زدہ در چشم روزگار انگشت

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست — بہیچ وجہ مرا ورا زمانہ جویا نیست

بروجا در دریا نشین مگر روزی — بدست افتد دری کجاش ہمتا نیست

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست الخ، (مطابق منتخب التواریخ)

بیا بگوی کہ پرویز از زمانہ چہ خورد الخ، (مطابق مذکورہ بالا)

دو چیز بر تو بے خطر ببینم، — کانرا خطر است نزد ہر مہتر

دینار چو بر نہی بسر بر تاج، — در معرکہ جان چو بر نہی مغفر

اگر بدانش اندر زمانہ لقمان وار — سرای پردۂ عصمت بر آسمان زدۂ

وگر ز کتب فلاطون وارسطاطالیس — ہر آنچہ ہست پسندیدہ پاک بستدۂ

اگر سپہبد سیصد ہزار شہر شوی — وگر برہمن ششصد ہزار بتکدۂ

بہ پیش ضربت مرگ این ہمہ ندارد سود — ہمی ببا ید رفتن چنانکہ آمدۂ

"در اظہار تاسف از جوانی و تضمین بیت ابو طاہر المتخلص بخسروانی"[۵] (مطابق عوفی وغیرہ)

"از غزلیات اوست"

شبی در برت (مطابق گزیدہ وغیرہ)

اسمین ایک شعر زائد ہے، اور "درماندگان" کی بجائے "دلدادگان" ہے،

جمال تو گرزان کہ من دارمی ؎ — بجائے تو گرزان کہ من بودمی،

"در حضور سلطان محمود بر حسب امر بہیت دمیدن خط ایاز او یماق گفتہ"

---

۵ ابو طاہر الطیب بن محمد الخسروانی طبیب، شعرائے آل سامان مین سے تھا، (لباب الالباب ج ۲ ص ۲)

مستست ہمی چشم تو و تیر بدست بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست

گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

غم در دل من در آمد و شاد برفت باز آمد و رخت خویش بنہاد برفت

گفتم بہ تکلف کہ زمانی بنشین، بنشست و کنون زفتنش از یاد برفت

تا چند نہی بردل خود غصہ و درد، الخ (مطابق ہفت اقلیم وغیرہ)

دوش از سر لطف بندہ پروردن خویش، الخ (مطابق آتشکدہ)

(۷) دیباچہ شاہنامہ (طبع بمبئی صفحہ ۵۰)

فردوسی کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ ایک مجلس میں جب کہ تمام درباری شعراء حاضر تھے، سلطان محمود نے ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں رباعی کہنے کی فرمایش کی، شعرانے فردوسی کی طرف اشارہ کیا، اوس نے فی البدیہہ کہا:-

مست است بتا چشم تو و تیر بدست، الخ (مطابق مجمع الفصحاء)

سلطان کو یہ رُباعی بہت پسند آئی اور اوس نے فردوسی کی بہت تعریف کی،

سلطان محمود کے وزیر احمد بن حسن میمندی، اور فردوسی میں مخالفت تھی، اس وجہ سے فردوسی کے احباب اسکو اس بات کی ترغیب دیا کرتے تھے، کہ وہ اس کی مخالفت ترک کرکے اس کے ساتھ موافقت پیدا کرے، مگر فردوسی اسکی کچھ پروا نہین کرتا تھا، اور کہتا تھا:

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام مائل بمال ہرگز وطامع بجاہ نیز

سوی در وزیر چرا ملتفت شوم، چون فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا، تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا:-

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست الخ

ان کتابون کے علاوہ بعض لغت کی کتابون مین بھی فردوسی کے اشعار ملتے ہین، جو سند مین لائے گئے ہیں

۔۔۔

۱۔ فرہنگ شعوری:۔

لغت "ترک" کی سند میں:۔

بدو بگو نہ درہم کسوتی کہ از شرفش ۔۔۔ کلاہ گوشۂ عرش است ترک شب پوشم

لغت "ذوش" کی سند میں:۔

بانگ کردست اے بت سیمین ۔۔۔ ذوش خواندم ترا کہ ہستی ذوش

لغت "گوش" کی سند میں:۔

پاس می داشتم برائے وہوش ۔۔۔ وز خطاب کسم نیامد گوش

۲۔ مجمع الفرس،

لغت "درغ" کی سند میں:۔

دل برو مرا ونزد مردم نشمروم (کذا) ۔۔۔ گفتا کہ چہ سود است کہ درغ آب برد

لغت "فلاوش" کی سند میں:۔

بر گرد گل سرخ تو خطی بکشیدی، ۔۔۔ تا خلق جہان را بخلاوش فگندی

مگر اسدی طوسی نے اس شعر کو رودکی سے منسوب[1] کیا ہے، اور اس کو اس طرح لکھا ہے:۔

گرد گل سرخ اندر خطی بکشیدی ۔۔۔ تا خلق جہان را بفگندی بخلاوش

۳۔ فرہنگ جہانگیری،

لغت "سکسک" کی سند میں:۔

اسپے چنانکہ دانی زیر از میان زیر ۔۔۔ در کاہلی کہ داشت نہ سکسک نہ راہوار

[1] لغت فرس ص۲۵۵ طبع جرمنی،

ان مآخذ کے علاوہ بھی اگر تحقیق کی جائے تو ممکن ہی کہ لغت کی کتابون اور اشعار کی بیاضون مین فردوسی کا اور کلام بھی حاصل ہو سکے،

یہ تمام اشعار جو اوپر نقل کئے گئے ہین، بہت ممکن ہو کہ اُن مین بعض اشعار فردوسی کے نہ ہون، لیکن اس مین شک نہین ہو کہ اکثر حصہ اسی کی تصنیف سے ہے، اور اسی کے نام سے تذکرون مین منقول چلا آتا ہی، اب رہا یہ سوال کہ یہ اشعار فردوسی کے شایانِ شان ہین یا نہین؟ تو اس زمانہ کے طرزِ سخن کو دیکھتے ہوئے ہم فردوسی کے اس کلام کو معیارِ سخن سے گرا ہوا نہین پاتے، اگرچہ بعض سخن فہمون کے نزدیک وہ اس قدر وقعت کا مستحق نہین ہو، جیسا کہ فردوسی کے کلام کو ہونا چاہئے، چنانچہ پروفیسر براؤن بھی اس کے متعلق یہی رائے رکھتے تھے، لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہی کہ جن شعراء نے کسی خاص صنفِ نظم مین کمال پیدا کیا ہی، ان کا دوسرا کلام وہ وقعت اور رتبہ حاصل نہین کر سکا ہی وجہ ہے کہ نظامی گنجوی جو مثنویات کے امام مانے گئے ہین، ان کی غزلیات و قصائد مین وہ رنگ پیدا نہ ہو سکا، جو مثنویات مین ان کا امتیازی وصف ہی، بہرحال ہمارے پاس اس وقت فارسی کے ایک قدیم اور نامور شاعر کے کلام کا کچھ حصہ جو اس نے شاہنامہ کے علاوہ لکھا تھا، موجود ہے، اور اصناف قصیدہ و غزل وغیرہ مین فردوسی کے طرزِ سخن اور اندازِ کلام کو ظاہر کر رہا ہے،

مقبرۂ شاہ بیگم

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مولف حیاتِ جلیل الہ آباد

خلوص و وفا کی پیکر، بے قرار اور دردمند دل والی بیگم آج اپنے شوہر جہانگیر کے قربِ ظاہری سے محروم اور اس کی آخری آرام گاہ سے منزلوں دور ہے، وہ الہ آباد میں دفن ہے اور جہانگیر لاہور میں، مگر اس کی بے چین روح کو تسکین وتسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اس کی ابدی خواب وراحت کے لیے اس کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی اسی کے ناز بردار ہاتھون سے سپرد خاک ہوئی، وہ جیسی نفیس مزاج، جمیل وخوبصورت تھی نصیبون سے ویسی ہی حسین ودلکش قبر بھی پائی، یہ مقبرہ نہایت خوش قطع غیر معمولی طرز کا ہے، ہندؤون اور اندلسی مسلمانون کے ملے جلے طریق تعمیر کا بہتر نمونہ، بیگم نے ایک ہندو راجہ کے گھر جنم لیا تھا، ایک مسلمان بادشاہ کے یہان دم توڑا، اس لئے اسکا مدفن دونون کی مخلوط ومتحد یادگارون کی نظیر ہے، اکبر کے عہد کا عروج تھا، اور جہانگیر کی ذاتی نگرانی اور توجہ، ایسی چیز تیار ہوگئی جس کی مثال دوسری جگہ کم ملے گی، تفصیل آگے آتی ہے،

سلاطین اسلام کے مختلف خاندانون اور مختلف دورون کے مختلف طرز تعمیر سے صاحبان فن واہل نظر کو اطلاع وآگاہی ہے، اس لیے صراحت وتشریح کی ضرورت نہین، اسقدر یاد دلادینا کافی[1] ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ مین عربی تعمیرات کا اثر ختم ہوکر ہندؤون اور ایرانیون کا اثر قائم ہوگیا تھا، یا یون کہیے کہ عربی طرز تعمیر کے بجاے ہندی طرز تعمیر غالب ہوکر جدید مغلیہ طرز تعمیر کی بنیاد پڑی تھی، جہانگیری طرز تعمیر مین جو مغلیہ طرز تعمیر کا وسطی یا دوسرا دور ہے، عربی اور ایرانی طرز کے ساتھ ہندؤن اور بودھون کا طرز تعمیر بھی نظر آتا ہے،

---

[1] مرقع اکبرآباد، از مولوی سید احمد مارہروی، صفحہ ۶۔

یہ مقبرہ اس اتحاد کی زندہ یادگار اور جہانگیری عمارات مین نقشِ اولین ہے،

یہ سنگین و خوشنما نازک عمارت باغ کے پچھم جانب خسرو باغ کا تیسرا[1] مقبرہ ہے مسٹر بیلی[2] کے حساب سے دوسرا اور زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے پہلا،

باغ کے صدر جنوبی دروازہ سے دو سو اسی قدم کے فاصلہ پر بالکل سامنے یہ سہ منزلہ عمارت واقع ہے، اتفاق سے آجکل اس کے قریب ہی املی کے ایک پرانے درخت کی شاخین راستہ پر بڑھ آئی اور پھیل گئی ہین جس سے نگاہ کو دفعۃً رُک جانا پڑتا ہے لیکن اسکا سایہ سایۂ رحمت اور باعثِ راحت و فرحت ثابت ہوتا ہے اور دو سراہی قدم یا دوسری ہی نظر ڈالنے پر مقبرہ کا سنگین چبوترہ، بلند کرسی، سطحِ زمین سے ملا ہوا دروازہ بلکہ عمارت کی ہر چیز گنبد مع کلس سامنے آجاتا ہے، پھاٹک سے یہان تک پہنچنے کے لئے فراخ و کشادہ سڑک موجود ہے جو تقریباً آدھے راستہ تک خوب پختہ، سواری نے جانے کے قابل بنی ہے، اس کے دونون جانب دلآویز روش[3] سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں، خوشنما جھاڑیاں اور جا بجا بڑے بڑے گھنے درخت بھی ہین، بقیہ نصف راہ صرف پیادہ طے کرنا ہوتی ہے، کیونکہ گھومنے والوں کے لیے پختہ سڑک یہان سے بائین کو گھوم جاتی ہے اور چند پتھر یہان سدِّ راہ کھڑے کر دیئے گئے ہیں، مرنے والون کی عظمت منزلت اور قبرون کی حرمت، ادب و احتیاط کا اقتضا یہی تھا، یہ تجویز پرانی ہو یا حال کی اصلاح، ضرور قابلِ تحسین و اعتراف ہے،

اس مقبرہ اور اس کے حوالی کا ایک مکمل نقشہ صاف اور اچھا، خفیف رنگین، امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ میں موجود ہے، جس کے نیچے ذیل کی عبارت لکھی ہے،

Mausoleum of the Ranee wife of the Emperor Jahangir near Allahabad Drawn and engraved by Thos Daniell

---

[1] آرکیالوجی کل سروے آف انڈیا جلد دوم یعنی، دی مانومینٹل انٹی کوٹیز اینڈ انسکرپشنس، مولفہ ڈاکٹر اے فوہرر پی ایچ ڈی مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۳۰، اور پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس صفحہ ۳۰۵۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد جلد ہشتم مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۳۲ و جدید ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۲، و تاریخ جہانگیر از پروفیسر بنی پرشاد، صفحہ ۱۴۴، [2] مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۵،

یہ نقشہ نامور چابکدست نقاش و مصور طاؔمس دانیال کی صناعی و ہنرمندی کا شاہکار ہے اور ڈیڑھ صدی پہلے کی نقشہ کشی و طباعت کا کارنامہ، پیانہ بڑا ہے، قرینہ ہے کہ نظری ہوگا، لیکن اصل سے بالکل ملتا جلتا ہے اور اصول پیمایش کے مطابق مانا جاتا ہے، مقبرہ کے پچھم پرانی دیوار اور کنواںؔ مع تماشائیون اور تفریح کرنے والون کے انبوہ کے اپنی پوری شان وسامان کے ساتھ نظر آتا ہے، شہر و حوالی شہر کی مخلوق کا ایک جمع غفیر پانی لینے کے لئے ہر قسم کے برتن، پکھالین، اور جانور ہمراہ لے کر امنڈا آتا ہے،

موجودہ حالت مین بھی مقبرہ کا منظر اور اس کا گرد و پیش نہایت دل پسند و دلکش ہے، پچھم جانب وسیع میدان ہے، لان (LAWN) ہین، پورب کو دو عمارتین ہین پہلی اسکی بڑی بیٹی سلطان النسا نثار بیگم کا خوبصورت گنبد، دوسری اس کے لخت جگر سلطان خسرؔو کا مرقد، شمال مین روشین اور کیاریان ہین، اور خیابان ہین، کچھ زیر زراعت زمین بھی ہے، سرسبز و لہلہاتے ہوئے قطعات ہین، دیوار بھی قائم ہے، کنوان بھی مگر ایک بڑی حد تک بے مصرف، حوض بھی ہین، مگر خشک، سرو کے پودے حال مین لگائے گئے ہین، تاڑ کے دو پرانے درخت بھی باقی ہین، معلوم نہیں کس کی رعایت ذوق ملحوظ رکھی گئی ہے، کچھ اور سدابہار درخت بھی ہین، ترتیب و نگہداشت کے لحاظ سے بلکہ ہر حیثیت سے کوئی چیز کسی طرح انگشت نمائی کے قابل نہین، اور یون تو ع

کیسی ہی ٹھیک بات ہو حسن کو اختلاف ہے

یہ تعمیر چار فٹ کی بلند کرسی پر کی گئی ہے، عمارت کے سب سے نیچے درجہ کا ہر پہلو اکتالیس گز ہے، اور پر چڑھنے کے لیے ایک ایک فٹ اونچی تین تین سیڑھیان ہین یعنی آسایش و فراغت کے ساتھ پہنچ جانے کے لئے صدر دروازہ کے دونون جانب ایک ایک چھوٹا سا زینہ موجود ہے، نیچے اوپر مقبرہ کی تینون منزلین جدا جدا نظر آتی ہین مگر یہ ایک ہی بنیاد یا دیوار پر قائم نہین ہین، بلکہ تینون طبقے یا مرتبے یکے بعد دیگرے بنے ہوئے ہین، مرتبہ اس عہد کی دفتری و کتابی اصطلاح مین منزل کے معنی مین مستعمل ہوتا تھا[۵]، یہ مرتبے مختلف انداز اور جدا جدا عرض و طول

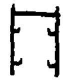
---

[۵] الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس مین بھی اس کا ذکر ہے، ص ۵۲، [۲] جہانگیرنامہ معتمد خان

کے ہین پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا چھوٹا، لمبائی چوڑائی اور بلندی مین کم ہوتا چلا گیا ہے، یہانتک کہ تیسری منزل کی وسعت بقدر مقدور اختصار کے ساتھ، نیز اسکی انتہائی بلندی، گنبد اور گنبد کے کلس پر پہنچکر ختم ہو جاتی ہے، فن ڈرائنگ کے ایک ماہر کا ارشاد ہے کہ مقبرہ کا فوٹو ایک مثلث نما چوکھٹے مین بڑی آسانی وخوبی سے آسکتا ہے،

باہر سے دیوارین تمام وکمال سرخی مائل سنگ سفید کی ہین، کہین کہین زرد دھولپور پتھر بھی استعمال ہوا ہے، نیچے والے طبقہ (منزل) مین دیوارون کے باہر اٹھارہ فٹ چار انچ چوڑا چبوترہ ہے، اس چبوترہ مین تین سمت تو پانچ پانچ سنگین جالیان چار فٹ نو انچ لمبی ایک فٹ چوڑی لگی ہین، چوتھی طرف یعنی دکن کو سامنے کے رخ صرف دو جالیان ہین اور ان کے بیچ مین (صدر کا ایک) دروازہ، سب ملا کر سترہ جالیان ہوئین، یہ جالیان اصول فن پیمایش وتعمیر کے مطابق بنائی گئی ہین، اور روشنی کا اچھا کام دیتی ہین، یہ (داخلہ کا) دروازہ چبوترہ سے گذر کر یعنی چبوترہ کو کاٹتا ہوا بارہ فٹ نو انچ کے فاصلہ پر ملتا ہے عمارت کے علو ورفعت اور اپنے اطراف وجوانب کی بلندی وشان کے لحاظ سے آجکل تنگ اور نیچا سمجھا جاتا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ تین چار سو برس پیشتر یہی صورت پسند ورائج تھی، ہندوانہ تعمیرات مین یہ بات عام پائی جاتی ہے، موجودہ چوکھٹ اور کواڑون کی حالت اُن کی دیرینہ سالی وکہنگی کم ازکم کثرت استعمال پر دلالت کرتی ہے، تختے کمزور، نسبۃً پتلے، قدرے ناہموار اور ناپیوست سے ہو رہے ہین، بالائے دروازہ محراب کی بلندی اس کی چوڑائی کی مناسبت سے نہین، بلکہ کچھ زیادہ پائی جاتی ہے، اس محراب کے دونون طرف یعنی آمنے سامنے دوسری منزل کو جانے کے لیے غیر مسقف (کھلے ہوئے) زینون کی دہری قطار

دیوارین پورا بوجھ اٹھانیے کے قابل خوب مضبوط، موٹی موٹی، اینٹ اور چونے کی بنائی گئی ہین، تعمیر مین یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ منزل زیرین کے پہلے حصہ کی کھلی چھت دوسری منزل کے لیے چبوترہ کا کام دیتی ہے، اور دوسری منزل کی چھت تیسری یعنی سب سے اوپر والی منزل کے ساتھ کارآمد ہے، اندر کی تیسری دیوار پر دو منزلون کا بار تھا اس لیے وہ زیادہ مستحکم اور عریض ہے، پہلی دیوار صرف تین فٹ سات انچ ہے، دوسری چار فٹ سات چار انچ، اور تیسری پانچ فٹ نو انچ، دیوارون کا موٹاپا بقدر ضرورت بتدریج بڑھتا گیا ہے، اسی لیے بمقابلہ

حصے کی دیوار کے دوسرے اور تیسرے حصے کی دیوارین زیادہ چوڑی رکھی گئی ہین، چھت یہان دس فٹ سات انچ بلند رہ جاتی ہے، اس (دوسری) منزل کی دیوارون مین ہر چہار طرف، ہر ضلع کے وسط مین ایک ایک کھلا ہوا دروازہ ہے، ان دروازون مین چوکھٹ بازو نہین ہے، اسکی بغلی دیوارون مین نیچے اوپر دو دو آنکڑے لوہے کے لگے ہین، جنکی شکل یہ ہے،  قیاس ہوتا ہے، کہ ان قلابون پر کبھی کواڑ رہے ہون گے، یا ان پائیزون پر کواڑ لگانے کا ارادہ رہا ہوگا. مگر تکمیل کی نوبت نہین پہنچی، ہر دروازے کے دونون طرف محرابون کے دو دو نشان بھی ہین، یعنی ہر دیوار مین چار چار، دروازون کی بلندی طے کرنے کے بعد دیوارون پر، ہر آٹھ محرابون کے اوپر آرائش وزیبایش کے لیے پتھر مین کھدے ہوئے معمولی نقش ونگار ہین، ایسے ہر پھول کے گرد، ہر نقش کے ساتھ محرابون سے اوپر خوشنما سنگی حاشیہ نظر افروز ہے، نقشی کارنس کے نیچے پتھر مین جالی بنے ہین، یہ کل جگہ خالی اور غیر مکمل سی نظر آتی ہے، حتی کہ دروازون کے خشتی پہلو چونے کے پلاسٹر سے بھی محروم ہین اور پلاسٹر پر قلعی تو کسی جگہ نہین پائی جاتی، صورتِ حال شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس طرف توجہ نہین ہوئی، یا یہ کہ اس منزل کے نیچے شاہزادی دفن تھی اور اس کے اوپر نقلی تربت ہے، اس لیے اس درمیانی طبقہ کو سادہ چھوڑ دیا اور ان بالا وپست درجون کا احترام مدنظر رکھا گیا، حتی الوسع ہر نوع کی آرایش وتکلفات تعمیر سے درگذر کیا گیا ہی، معمولی محرابین اور جدولین کافی سمجھی گئی ہین، دروازے بھی مستقل دروازون کی حیثیت کے نہین، بلکہ دیوارون مین مستطیل شگاف نکاس کے لیے ہین، یہ منزل منزل اسفل (نیچی والی) کی چھت یا اندرونی گنبد کے گرد کے ابھرے حصے پر اٹھائی گئی ہے،

تیسری منزل یا مرتبۂ سوم نے پوری عمارت اور اس کے حسن کو انتہا پر پہنچا دیا ہے، یہ بارہ دری آج بھی مجلۂ عروسی یا نیرنگ کمال وجمال ہے، یہ جگہ مربع ہے، ہر طرف تین تین در ہین، بیچ کا در زیادہ فراخ اور کشادہ ہے، باقی دونون دائین بائین کے اس سے کم چوڑے ہین، اوپر ایک خوشنما سبک قبہ ہے، بیگم کی نقلی یا مصنوعی قبر اسی مرمرین مجمر (کٹہرہ) کے اندر بنی ہے، اس سے ایک گز نیچے سنگ سرخ کی غلام گردش بنی

اور اس پر ہموار مسطح چھت، غلام گردش کے اوپر پتھر کے صاف ستھرے تختے باہر نکال کر دھوپ اور بوچھار سے بچانے کے لیے چھجا بنا دیا ہے، مقبرہ کا یہ حصہ حسین سے حسین ہے، انگریز ہندسوں (انجینیرون) نے قنوج کے مخدوم جہانیان کی مسجد کو (جو عہد سلاطین شرقیہ کی یادگار ہے) پتھر پر نقاشی و دستکاری کے لحاظ سے نہایت خوب اور قابل تحسین بتایا اور لاجواب لکھا ہے، لیکن مین عرض کرونگا کہ مقبرہ شاہ بیگم کے اس حصہ مین جیسا خوب اور باریک و نازک کام نقاشی اور بیل بوٹے کا کیا گیا ہے، مسجد کا کام اس کے مقابلہ مین کچھ زیادہ وقعت نہین رکھتا، شاید اسکی یہ وجہ معقول ہو کہ مسجد کی تعمیر اس مقبرہ سے دو ڈیڑھ سو برس پیشتر ہوئی تھی، اتنے زمانہ مین زمانہ بہت ترقی کر گیا تھا، اور مغلون کی سرپرستی اور دستگیری نے سنگ تراشی و نقاشی کے ہنر کو منتہاے کمال پر پہنچا دیا تھا، اس ایوان مین پہنچکر نظر واپس آنا نہین چاہتی، ع

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

قبر کا تابوت، لوح سرہانے، سنگ پائین، ہر چیز مرمر کی اپنی اپنی جگہ بے مثل ہے، تعویذ کے دونون پہلوؤن پر یہ رباعی جلی حروف مین پاکیزہ نستعلیق مین کندہ ہے، (بائین جانب، تابوت کے دلے مین)

بیگم کہ زعصمت رخ رحمت آراست　　اقلیم عدم زنور عزت آراست

(داہنی طرف کے دلے مین)

سبحان اللہ زہے کمال عفت　　کز حسن عمل چہرۂ جنت آراست

تعویذ پر حسب معمول قلمدان بنا ہے،

لوح مزار شاہزادی کے شایان شان، خوب بلند ہے، اس پر یہ کتبہ ہے،

اللہ اکبر

چون چرخ فلک ز گردش خود آشفت　　در زیر زمین آئینۂ مہ بنہفت

۱؎ گزیٹر جدید ضلع فرخ آباد،

تاریخ وفات شاہ بیگم جستم — از غیب ملک بخلد شد بیگم گفت (سنہ ۱۰۱۲ھ)

لکاتبہ عبداللہ[1] مشکین قلم، جہانگیر شاہی،

مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ[2] مین "آئینۂ مہ" کی جگہ "آئینۂ خود" اور مسٹر بیوریج نے اپنے مقالہ[3] مین

آئینۂ مہر" لکھا ہے، مسٹر ڈیو ہرسٹ نے اپنی تحریر[4] مین تصحیح فرما دی ہے، بیل صاحب نے پہلی رباعی مین "عزت"

ی جگہ "غیرت" لکھا تھا، شاید چھاپے کی غلطی ہو،

بازآمد، ان پتھرون پر نہایت خوبصورت نستعلیق حروف کندہ ہین، ہر مصرع کے گرد نفیس بیلین اور گلکاریان

ین، یہ حروف اس قدر باقاعدہ، سڈول، دبیز اور باہر کو ابھرے ہوئے ہین، کہ آجکل کے موٹے موٹے انگریزی

روف جو بیل وغیرہ کی چادرون پر ڈھالے جاتے ہین، ان کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہین، مرمرین ظرف

ور نستعلیق حرف، ع

عروس جمیل و لباس حریر،

پتھر کے پھولون پر کوئی روغن سرخی مائل پھرا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ ماند ہوتا جاتا ہے، سنگ بالین ایک بلند بالا

تختہ مرمر کا، لمبا چوڑا اور خوب موٹا ہے، خوبصورت دلفریب تراشا گیا ہے، اس پر نہایت عمدہ کام ہے، پائین قبر

---

[1] میر عبداللہ مشکین قلم دولت جہانگیری کے نامور کاتب و خوشنویس تھے، قلعہ الہ آباد مین اشوک کے مشہور سنگین ستون پر ہندی عبارت

کے نیچے سنہ ۱۰۱۴ھ مین جہانگیر نے اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام فارسی مین کندہ کرایا ہے، وہ انھیں کے ہاتھ کا کمال ہے، (مفتاح التواریخ

صفحہ ۱۹۷) تبریز کے رہنے والے، شاہ نعمت اللہ مشہور ولی کی اولاد سے تھے، دینی و دنیوی، صوری و معنوی، علوم مین پایہ بلند

رکھتے تھے، "مشکین قلم" دربار جہانگیری سے خطاب ملا تھا، مختلف مقامات پر اکثر بادشاہی کتبے آپکے ہنر و جادو نگاری کی یادگار ہین، سنہ ۱۰۳۵ھ

(سنہ ۱۶۲۵ء) مین رحلت فرمائی، فرزند صالح نے عالیشان مقبرہ آگرہ مین بنوایا تھا، ان کے خاندان مین خوشنویسی پشتہا پشت تک قائم

رہی (حیات جمیل حصہ دوم صفحات ۲۰۲، ۲۰۳ - نوٹ) [2] صفحہ ۴۳ [3] جرنل ایل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۶۰۲، [5] جرنل

ذکر رباتیہ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء، صفحہ ۷۶۲ ا

کا تختہ بھی ایک ڈال سنگ مرمر کا، سرہانے والے پتھر کے بالکل مشابہ اور ہمشکل ہے، اس پر بھی ویسی ہی نفیس بیلین اور باریک کام ہے، البتہ کچھ لکھا نہیں ہے، یہ سنگ بالین کا ہر لحاظ سے پورا جواب ہے، اور خود لاجواب، یہان مرمرین دالھون اور تختون پر مختلف اقسام خصوصاً کنار کی بیلین، خوبصورت دوہری تہری ابھری ہوئی نگاہ افروز ہیں، کہین کہین کچھ پتھر یا اس کا کوئی ریزہ اکھڑ بھی گیا ہے، مگر ان کے نشانات و داغ زیادہ نمایان نہین، کم ہین اور خفیف، قبہ، گنبد مختصر و ہندوانہ ہے، چینی وضع سے بہت ملتا جلتا ہوا، جہان ایوان کی دیوارون کی بلندی ختم ہو جاتی ہے یعنی عمارت کے چوکور حصہ سے پتھر کے تختے بڑھتے گھٹتے ہوئے لگا کر، بتدریج اٹھا اٹھا کر، چارون پہلو کو اوپر لیجا کر ملا دیا ہے، حقیقۃً یہ کوئی برج نما (مدور) یا گنبد نہین ہے بلکہ ایک خاص وضع کی چیز ہے، اس پر کلس بھی اسی شان کا زرنگار و زر اندود مناسب حال چڑھایا گیا تھا، اب بے رونق ہو گیا ہے، اس طبقہ کا قبہ، اس کا فرش، اس کے مرمرین تختے اور چٹانین، اس کے حسین ستون، ان سب پر نازک نقاشیان، غرضکہ اس کا ہر جزو و کل قابل ناز اور سلاطین تیمور کی عظمت ماضیہ اور صنعت کاملہ کا آئینہ دار ہے،

حکومتون کے انقلاب اور یار و اغیار کی دست درازی و دست برد نے اس کے ساتھ جو کچھ ظلم کیا ہوگا کس کی زبان بتا سکتی ہے، لیکن امن و امان اور تہذیب و روشنی کے زمانہ مین یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ہم نے جو قدردانی کی اور سیاحون اور زائرین نے جس قدر ضرر پہنچایا، وہ بھی ناقابل تلافی ہے، فرش کے چمکتے ہوے پتھرون پر بہت سے حضرات نے انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی مین اپنے نام نامی اور دستخط گرامی نقش فرما دیے ہین، کسی مسٹر جیمس نے اپنے نام کے ساتھ سنہ ۱۸۶۶ بھی چاقو سے کھود دیا ہے، شاید یہی سب سے پہلا ظلم اور فتنہ برپا ہوا تھا، جس کی اور لوگون نے تقلید کی ہے،

اوپر کی دونون منزلون کی آپ سیر کر چکے اور اس سیر سے تمام باغ بلکہ حد نظر تک کا لطف اٹھا لیا، آئیے اب باقی ماندہ، پست ترین طبقہ کو بھی اندر سے دیکھ لیجئے، در اصل یہی منزل، منزل اول ہے، زمین پر واقع ہے، مگر بہت وسیع، فراخ اور کافی روشن ہے، اس کے داخلہ کا دروازہ وہی ایک ہے جس کا ذکر ابتدا

ین آچکا ہے، دروازہ مین قدم رکھتے ہی یہ تہ زمین یا بالائے زمین حصہ عمارت کا شروع ہوجاتا ہے، ایک لمبا چوڑا، چوکور کمرہ شاہ بیگم کا مدفن ہے، جس پر کسی قدر اٹھی ہوئی محدب چھت ہے، اس کمرہ کے اردگرد دوہری دوہری غلام گردشین، طواف کرنے کے لئے خوب لمبی چوڑی بنی ہین یعنی صدر دروازہ سے اندر آکر پوری وسعت و طوالت کا ایک لمبا سا کمرہ ملتا ہے، اس کے بعد دوسرا دروازہ ہے، اس دروازے کے بعد پھر ویسا ہی چوڑا چکلا گردگھما (مطاف) ہے، مگر یہ پہلے سے طول مین کم ہے، ان دونون دروازون سے گذر کر حجرۂ قبر مین پہنچتے ہین باقی تین طرف کوئی دروازہ نہین، لیکن روشنی کی شعاعین سنگ سرخ کی سادہ مگر قابل غور جالیون اور خانون سے ہوکر اندر آتی ہین، یون سمجھ لیجئے کہ پہلی دیوار سے جو تین فٹ سات انچ عریض ہے اور اس کے دروازہ سے اندر داخل ہونے کے بعد اس کنارہ سے اُس کنارہ تک آپ کو پانچ حصے یا کمرے ملین گے، پہلا دروازہ سے لیکر دوسری دیوار و دروازہ تک، یہ بارہ فٹ چوڑا ہے، اس کے بعد دوسری دیوار چار فٹ ساڑھے چار انچ موٹی ہے، پر دوسرا کمرہ سات فٹ ساڑھے چار انچ چوڑا، بعد ازان تیسری دیوار پونے چھ فٹ موٹی، بعد ازان حجرۂ قبر ہے، انیس فٹ مربع، گویا وسطی یا مرکزی کمرہ کے گرد ہر چار سمت دوہرے درجے ہین، دو داہنے دو بائین، دو سرھانے اور دو پائین، مرکزی حجرہ پر دوسری اور تیسری منزلین واقع ہین،

قبرون کا تہ خانہ مین بنانا تو ایک مدت درازسے چلا آتا تھا، لیکن سلطنتِ مغلیہ کے عروج، یعنی اکبر اور جہانگیر کے عہد مین اسکو اور بھی ترقی ہوگئی تھی، بالخصوص بیگمات کی تدفین مین، پھر کچھ زمانہ بعد تو دولتمند اور صاحبِ مقدرت طبقون مین اسکا رواج عام اور دستور سا ہوگیا، چنانچہ شاہ بیگم کی ساس (اکبر کی پہلی ہندو بی بی، جہانگیر کی مان) ملکہ مریم زمانی[1] آگرہ کے ایک ایسے ہی مقبرہ مین سو رہی ہے، اس سے بھی روشن اور شہرت یافتہ مثال ممتاز محل (روضۂ تاج) کی ہے، نیز شاہجہان کی ملکہ قندھاری بیگم کے مدفن کی اس گئی گذری

---

[1] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد مارہروی، صفحہ ۱۶۴ [2] " ایضاً، صفحات ۵۰-۱۲۳،

حالت مین بھی دہلی و آگرہ مین ایسی زیر زمین قبرین بہ تعداد کثیر موجود ہین[1]،

شاہ بیگم کا جسد خاکی کسی سفید و تابندہ مرمر کے تابوت کے اندر دفن نہیں ہو بلکہ اسکی قبر اینٹ چونے کی سادہ و بے تکلف تعمیر ہو، قبر کے چبوترہ کا طول دس فٹ عرض سات فٹ دو انچ ہی، قبر کا تابوت یعنی اونچا حصہ پانچ فٹ پانچ انچ لمبا، دو فٹ پانچ انچ چوڑا ہے، قبر کے چبوترہ کی بلندی ایک فٹ ایک انچ ہے، اور تعویذ کی ایک فٹ چار انچ، دونون کی ملا کر دو فٹ پانچ انچ ہوئی، اسکی چھت کسی قدر پست گر محدب ہے، چارون دیوارون کے پہلوؤن کو کچھ کچھ اٹھا کر اوپر ملا کر پاٹ دیا آپ چاہین تو اس کو نیم گنبد کہہ سکتے ہین، شاید ایک تہ خانہ یعنی زمین دوز حصہ عمارت کے لیے یہی مناسب و کافی تھا، اس پورے طبقۂ زیرین مین معمولی پتھر کے چوکون کا ہموار صاف ستھرا فرش ہے، کثرت استعمال و پامالی سے چکنا بھی ہو گیا ہو، ایک وسیع مسقف رقبہ مین ایسا فرش نہایت اچھا پیرون کے لیے آرام دہ اور آنکھون کیلیے راحت بخش ثابت ہوتا ہے، شاید یہ درجہ کبھی چارون طرف سے بند رہا ہوگا، جیسا کہ مسٹر بیل نے لکھا ہے اور منافذ اور جھنجریون سے روشنی کا بقدر قلیل انتظام ہوگا، مفتاح التواریخ کے الفاظ یہ ہین: "اصل تربت او اندرون روضہ ہست و آن مسدود است از ہر چہار طرف" بظاہر اسکی تعبیر دشوار ہے، اور اگر آمد و رفت کے اعتبار سے بند ہونا مراد ہو تو چارون طرف سے مسدود ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ایک دکن رخ تو در وازہ ضرور کھلا ہوا موجود ہے، بہرکیف اب کوئی بگڑی ہوئی کیفیت باقی نہین، غالباً اصلی حالت مین تبدیل کر دی گئی ہے، ممکن ہے کہ یہان کبھی نقش و نگار یا رنگینیان رہی ہون، مگر اس وقت سفیدی اور چونے کی تہون کے سوا کچھ نظر نہین آتا، چھت کی استرکاری مین البتہ کچھ جدولین، اور دائرہ بناتے ہوئے جال در جال پیدا کر دیے گئے ہین، اور وہ خوشنما ہین،

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پری رہی، اسی طرح آج بھی ہے، اُسکی آغوش یا دامان عاطفت مین کئی بچے کھیل رہے اور قبر کے پہلوؤن اور بغلی حصون کو آباد کئے ہوئے ہین، اس کی قبر کے پاس داہنے کو

[1] تاریخ آگرہ صفحات ۵۰ و ۹۰ و ۹۲ و ۹۴ و ۱۰۴ و ۱۶۴ و ۱۶۸ و ۱۷۳، [2] ص ۳۳۵

دو چھوٹی چھوٹی قبرین ہین، جس کے بعد اینٹ کی جالی سے ادھر کا دروازہ بند کر دیا ہے، بائین طرف بھی دو

ہین، دوسرے درجے مین، اسی طرح پر بائین طرف دو قبرین چھوٹی چھوٹی برابر کو ہین، اور تین قبرین سی قدر ہوگا

ہٹ کر، تیسرے درجہ مین ایک معمولی چبوترہ اینٹون کا نظر آتا ہے، جو تقریبًا ایک گز مربع اور ایک بالشت اونچا

"تجلد شد بیگم"[1] سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہین جو سنگ بالین پر مرقوم ہے، مسٹر بِل اپنی اورینٹل بائگرفیکل ڈکشنری

مین ۱۰۱۲ھ = ۱۶۰۳ع لکھتے ہین، تزک[2] مین سال وفات ۱۰۱۳ھ چھپا ہے، ممکن ہے کہ ٹائپ کی غلطی ہو، مسٹر بویرتیج

کی رائے[3] ہے، کہ تزک کی مندرجہ تاریخ یعنی ۲۶ رماہ گذشتہ ۱۰۱۳ھ ۶ رمئی ۱۶۰۵ء کے مطابق ہوتی ہے، غالبًا

خود جہانگیر یا اس کے نقل کنندہ کاتب سے ایک سال بڑھ گیا ہے، صحیح تاریخ ۲۶ ر ذیحجہ ۱۰۱۲ھ یا ۱۶ رمئی ۱۶۰۴ء

ہے، اکبر نامہ سے بھی یہی سال پایا جاتا ہے،

ڈاکٹر فوہرر شاہ بیگم کا سالِ وفات ۱۰۱۴ھ لکھتے ہین[4]، وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سب سے بڑے افسر تھے، انکی

کتاب یادگار ہائے قدیم پر سرکاری استناد، سرکاری حکم اور سرکاری خرچ سے سرکاری مطبع مین چھپی، یہ مقبرہ

اور اس کا کتبہ ان کی نگرانی اور سایۂ عاطفت مین تھا، ان سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا تعجب سے خالی نہین،

کرنیل نیول ڈسٹرکٹ گزیٹر جدید[5] مین ارقام فرماتے ہین، کہ "کتبہ سے سالِ وفات ۱۶۲۱ معلوم

ہوتا ہے" گزیٹیرون کے فاضل مولف بھی انسان ہین، باوجود وسعت نظر و تحقیق اور قابل معاونین کی ایک

جماعت کے ان کا قلم بھی کبھی کبھی فاش غلط نگاریان کر جاتا ہے، ان کا یہ لکھنا کہ خسرو کی مان کا سالِ وفات

۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے، ایک فاحش غلطی ہے، "معلوم ہوتا ہے" کے معمولی فلسفیانہ وادیبانہ عذر کے لکھ دینے

سے ان کی ذمہ داری و جوابدہی ان کو سبکدوش نہین کرتی، اس شاہزادی نے ۲۶ ر ذیحجہ ۱۰۱۲ھ کو وفات

---

[1] صفحہ ۱۵۲، [2] صفحہ ۲۶، [3] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۳-۶،

[4] آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا سلسلۂ جدید، جلد دوم، صنادید قدیمہ اور کتبے، صفحہ ۱۳۰،

[5] صفحہ ۱۶۹، گزیٹیر سابق، صفحہ ۲۰۳،

پائی تھی جو تمام تقادیم موجودہ ورائجہ کے حساب سے ۶ رمئی ۱۹۰۲ء کے مطابق ہے، قطعۂ تاریخ اور اسکی نقل آپکے سامنے موجود تھی، ۱۰۱۲ھ یکم جون ۱۶۰۳ء سے شروع ہوکر ۱۹ رمئی ۱۶۰۴ء کو ختم ہوا، ۱۶۲۱ء کا پہلا دن ۱۵ رصفر ۱۰۳۰ھ کے مطابق تھا، پندرہ برس کا تفاوت! قیاس چاہتا ہے کہ غلطی سے ماں کے سالِ وفات کے بجائے بیٹے کا لکھ گیا ہو، اس لئے کہ سلطان خسرو آخر جنوری یا شروع فروری ۱۶۲۲ء مین فوت ہوا تھا، اور ۱۰۳۱ھ کا آغاز ۱۷ نومبر ۱۶۲۱ء کو اور اختتام ۲۵ راکتوبر ۱۶۲۲ء کو ہوتا ہے، بعض اوقات ایک تقویم سے دوسری مین تحویل کرتے وقت مہینون یا دنون کا فرق ناگزیر یا ناقابل لحاظ سمجھا جاتا تھا،

صفحات تاریخ بتاتے ہین کہ مغلون کے محلات مین آنے والی ہندوستانی شاہزادیون مین مان بائی (شاہ بیگم) سب سے پہلی رانی تھی جس نے حرم سرائے سلطانی مین جان دی اور اپنے شوہر پر نثار و تصدق ہوگئی، تیمور کے پوتے نے بھی نیازمندی و وفا کا حق ادا کیا اور اس کے جسدِ خاکی کی ابدی آسایش کے لئے دامنِ فردوس مین ایک قابلِ رشک نشیمن مہیا کردیا، اسکا مقبرہ جس اہتمام و لطافت اور تعمیری و نسوانی رعایتون کے ساتھ اس سرسبز و سدا بہار چمن کی آغوش مین تیار کرایا گیا، اس کے نمایان شان تھا، مغلون کے بہت سے شاندار مقبرے اور عمارتین مین نے آگرہ اور دہلی مین ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر دیکھے ہین، لیکن شاہ بیگم کے مقبرے کو بے تکلف و تامل اور بلا خوف تردید ان کے سلیقۂ تعمیر کا حسین ترین نمونہ اور خوشنمائی و نزاکت کا مجسمہ کہہ سکتا ہون، اس کی سادگی و نظر فریبی مسلّم ہے، ساتھ ہی جدت وضع، اندازِ تعمیر اور مجموعی اختصار نے جو خوبی و رعنائی پیدا کردی ہے، اسکی دادِ تحسین مجھ ناشناس کی آنکھین کیا دے سکتی ہین، مین نے ایک بالغ نظر کو اس وجہ خاص سے اسکو تاج پر بھی فوقیت و ترجیح دیتے دیکھا ہے،

ایک عورت کے روضہ کی تعمیر مین خصوصیت یا صفت اسکی نسوانیت کو ہونا چاہئے، اگر اکبری دور کے تعمیرات کا سا مردانہ پن، استواری و استحکام کی نمایش اور اہتمام اس مین بھی کیا جاتا تو لطافت و نزاکت، دلکشی و دلربائی خواہ مخواہ مفقود یا نظر انداز ہو جاتی، یہ نسوانیت یہان ارادۃً پیدا کی گئی ہے اور بدرجۂ اتم زیب دے رہی ہے

یون کہئے کہ روضہ کی عمارت محض روضہ نہین بلکہ شاہ بیگم اپنی بہارِ حسن وجمال کے ساتھ اس رشکِ فردوس مقام پر جلوہ افروز ہے، پھر یہ اسکی انتہائی خوبی ہے کہ صبح درخشان ہو یا نیمروز تابان، شام کا دھندلکا ہو یا رات کی گھنگھور سیاہی، یہان رانی اپنی اترتی یا ڈھلتی ہوئی جوانی مین نہین، بلکہ چڑھتے ہوئے شباب مین رونق بخش نظر آتی ہے،

مین نے جب اپنی جوانی اور نئی عمر مین اس کو پہلے پہل دیکھا تھا تو اپنے نزدیک فیصلہ کر لیا تھا کہ جہانگیر نے یہ خوبصورت اور نازک یادگار بنا کر بیگم کی مہر و وفا کا صلہ یا حقیقۃً اپنا خراج عشق ادا کیا ہے اولوالعزم شاہجہان نے بلند حوصلگی کے ساتھ ممتاز محل کا روضہ بنوا نے مین محض باپ کی تقلید یا پیروی کی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے،

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے مرقد پر بارہا گیا، اور زبان حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے،

برمزارِ ما غریبان، نے چراغے، نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

لمگر
مضامین عالمگیر

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر پر اعتراضات اور ان کے جوابات، مورخانہ تحقیق و تنقید کا ہندوستان مین پہلا نمونہ، قیمت باختلاف کاغذ و طبع - عہ و عہ ضخامت ۱۲۴ صفحے،

مقالاتِ شبلی حصۂ اول

مولٰنا شبلی مرحوم کے ۷ مذہبی مضامین کا مجموعہ جنمین اہم مذہبی مسائل پر بحث کی گئی ہے مرتبہ دار المصنفین، و مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت عہ، حصۂ دوم، ضخامت ۱۳۰ صفحے قیمت ۱۲ ر، مینجر،

گجراتی زبان اور اوسکی تاریخ،

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی)

(۳)

گجراتی لٹریچر دو خاص عہدون مین تقسیم ہی،(۱) عہدِ قدیم، (۲) عہدِ جدید، عہدِ قدیم کا زمانہ پندرہوین صدی سے انیسوین صدی تک ہی، اور عہدِ جدید کی ابتدا، انیسوین صدی سے ہوتی ہے، عہدِ جدید کی خصوصیت یہ ہو کہ جو شاعر اس زمانہ مین گذرا، وہ ایک خاص مذہبی خیال کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا، جو طالب علم ان کی تصانیف کا مطالعہ کرے، اوس کو چاہئے کہ سب سے پہلے وہ مختلف جماعتون کا مطالعہ کرے، اور اون کے مختلف عقائد کو سمجھے، ان شاعرون کا پوری طور سے مطالعہ اسوقت ممکن ہوسکتا ہی، جب ہم اون مختلف جماعتون سے پوری طور پر واقف ہو جائین، جن سے وہ متعلق تھے، اگر ہمارے پاس اس کے متعلق کامل معلومات نہ ہون تو ہم ان شاعرون مین سے کسی شاعر کے ساتھ انصاف نہین کرسکتے ہین، ہم اپنے قدیم شاعرون کا مناسب طریقہ سے مطالعہ اُسی وقت کرسکتے ہین، جب کہ ہم شاعر کو سمجھین، اور اوس کی جماعت کے عقائد پر اچھّا غور کرین، اگر ہم کسی تعصب کے ماتحت ایسا کام کرین، تو ہم ضرور اون کے ساتھ بے انصافی کرین گے، "نرسنہ" کو سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہے، کہ وشنو جماعت کے متعلق واقفیت حاصل کرین، اور میران کی پیروی کرنے کے لئے ہمین میران جیسا بننا چاہئے،

عہدِ قدیم کا سب سے آخر شاعر اور گجرات کا ایک بہترین شاعر ہمارا رنگیلا دیارام شاعر تھا، دیارام کی زندگی کے متعلق مختلف روایات ہین بعض کہتے ہین، کہ وہ اخلاقاً کمزور تھا، اور اس کی شہادت اوس کی تصانیف سے ملتی ہے جنمین وہ عشق کے جذبات کو علانیہ بغیر اخلاق کے معمولی قواعد کی پابندی کے بیان کرتا ہے، اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جوانی مین وہ بہت شریر تھا، وہ چاندود کا رہنے والا تھا چاندود ہندوؤن کی جاترا کی جگہ ہی، اور نرمادا (؟) کے کنارے واقع ہے، دیارام کو اس سے خاص مسرت ہوتی تھی

کہ وہ ان عورتوں پر جو نرمدا کے کنارے پانی لینے آتی تھیں، پتھر پھینکے اور شرارت کرے، ایک روز اوس نے ایک سنار کی عورت کو چھیڑا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اوسے تیر کر پاس کے گاؤں "کرنالی" میں بھاگ جانا پڑا، وہان ایک سادھو کسوانند سے ملاقات ہوئی اور وہ ایسے شریر اور بدمعاش کو اپنا چیلا نہین بنانا چاہتا تھا، مگر آخرکار کسوانند نے اُسے اپنا چیلا بنالیا، دیارام اس سے بہت خوش ہوا، اور اوس نے، یہ "پاڈا" گایا، گرو بڑا ہو، گرو بڑا ہے"، دیارام فطری شاعر تھا، وہ بچپن ہی سے چھوٹی چھوٹی نظمین لکھ لیا کرتا تھا، کہا جاتا ہو کہ اوس نے اپنی جوانی کے زمانہ مین چند "پاڈے" نظم کئے تھے، جو اخلاق سے گرے ہوئے تھے، اوس نے کبھی شادی نہ کی، اور بوڑھا ہو کر مجرد ہی حالت مین مرگیا، ہندوستان کے مقدس مقامات کی پیدل جاکر زیارت کی جس سے اوسے مختلف تجربات حاصل ہوئے، بنارس مین اوس نے کاشی وشویشور کی تعریف مین ایک کتاب لکھی، وہ ہندوستان کے تمام صوبون کی زبانون سے واقف تھا، وہ بہت حسین اور دلفریب تھا، اوس کی آواز مین شیرینی تھی، وہ وشنو جماعت سے تعلق رکھتا تھا، اُس کے گربے "بہترین اور مقبول گربے" کا مضمون نسوانی جذبات کے ذریعہ شری کرشن کی پرارتھنا ہو، دیارام کے گربے مین عشق کے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ گربے کا مضمون عبادت ہے، اس لئے اسے لڑکی اپنی ماں کے سامنے بغیر روک ٹوک کے گا سکتی ہے، دیارام کے گربے مشہور و معروف ہین، یہ دیکھنا مناسب نہیں ہو کہ اس کا چال چلن بے داغ تھا، یا نہین، لیکن خدا کے ساتھ اس کا عقیدہ بہت زیادہ تھا، اس کا گرو اچھا کا رام بھٹ اُنو نرسنگھ کا دوسرا اوتار کہتا تھا، اس کی تصانیف کئی ہین، اوس کی زبان شیرین اور دلفریب ہے، اس کا طرز تحریر بہت صاف ہے، وہ خودمختار اور صداقت شعار تھا، اس کی فطرت کی جھلک اس کی نظمون مین پائی جاتی ہو، وہ گجرات کا بائرن کہلاتا تھا اور عہد قدیم کا بہترین شاعر تھا،

عہد جدید کا آغاز دیارام کے بعد سے ہوتا ہے، اس عہد کے بعد برطانوی حکومت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوچکی تھی شورید وسر مرہٹے گجرات سے چلے گئے تھے، مغربی تعلیم کی ابتدا ہو رہی تھی بمبئی یونیورسٹی قائم کی گئی تھی، گجرات کے پایہ تخت احمد آباد مین بھی تعلیم پھیل چلی تھی، بعض لٹریری ریسرچ (تحقیقات) بھی کی گئی تھی انگریز مشنریون کی مدد سے گجراتی زبان کے قواعد لکھے گئے تھے احمد آباد مین گجرات ورنیکلر سوسائٹی قائم کیگئی تھی شاعر دلپت رام ڈایا بھائی اس سوسائٹی کا خاص منظم کرنے والا تھا وہ

عہدِ جدید کا پہلا اور خاص شاعر ہے، مذہب جو شاعری کا مرکز تھا، بدل دیا گیا تھا، اب شاعری کے مضمون مین انسانی زندگی کے تمام مختلف پہلو دکھائے جاتے تھے، نرمداشنکر جو دلپت رام کا معصر تھا سورت شہر مین ۱۸۳۳ء ۱۸۸۶ء مین گذرا تھا، یہ دونون شاعر لٹریچر کے میدان مین ایک دوسرے کے حریف تھے، اس کا لازمی نتیجہ ادبی مباحثے تھے، جو سائل اور روپیہ جیسے تو نہ تھے لیکن کچھ کچھ ویسے ہی تھے، ان بحث و مباحث سے سوسائٹی کو بہت فائدہ ہوا، دلپت رام پرانے سخت مذہبی نظام سے تعلق رکھتا تھا، اور نرمداشنکر ایک نوجوان بت شکن اور سوسائٹی کی اصلاح کرنے والا تھا، اوس نے کچھ انگریزی تعلیم حاصل کر لی تھی، نرمداشنکر کو ہر ایک پرانی چیز سے نفرت تھی، یہ دو برابر کے لیکن ایک دوسرے کی رقیب قوتین ایک دوسرے سے جنگ کرتی تھین، ان شاعرون کے مزاج اور فطرت کا عکس ان کی تصانیف مین نمایان ہے، دلپت رام ارتقار پر عقیدہ رکھتا تھا، اور نرمداشنکر سوسائٹی کی اصلاح و بہبودی کے کام مین انقلابی خیال رکھتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ذات پات کے نظام کا ایک ہی وار مین کام تمام کر دے، دلپت رام اس بات کا سبق دیتا تھا، کہ سوسائٹی کی ترقی کے کام کو آہستہ آہستہ اور تبدریج کرنا چاہئے، اس ویر پا جنگ سے لٹریچر پر بہت فائدہ مند اثر ہوا،

نرمداشنکر اور دلپت رام گجراتی لٹریچر کے قابلِ احترام شاعر کہلائے جانے لگے، دلپت رام نے ہمارے لٹریچر مین بہت کچھ اضافہ کیا ہے، اوس کی زبان سنجیدہ، متین معمولی، ظریف، اور پُر معنی ہے، اس کے "دُہرسے" اور "چانڈ" اس بات کے ثبوت ہین، اوس نے ہمین چند "گربے" بھی دئے ہین، اوس پر خدا کی طرف سے ایک عجیب بخشش تھی، کہ وہ "پاڈون" کوئی البدیہہ کہہ لیا کرتا تھا، بحیثیت ایک آدمی کے وہ سادہ مزاج اور وفادار تھا، اور حکومت اور عوام دونون اوس سے محبت کرتے تھے، نرمداشنکر خود سر، مضطرب اور تخیل رکھنے والا اور مصلح تھا، اور بحیثیت ایک شاعر کے نوجوان طبقہ اوسے بہت پسند کرتا تھا، اوس کی شاعری مین زور ہے، اور اوس کے "ویر راس" مین شجاعت کے جذبات ہمین بہادر بناتے ہین، اُس کا خیال تھا، کہ کام کو شروع کرنے کے بعد بہرحال اُسے ختم کرنا چاہئے، نرمداشنکر ہی پہلا شخص ہے، جس نے گجراتی لٹریچر مین نثر کی ابتدا کی، مادر وطن سے اوسے بہت محبت تھی، اوس کی نظم بعنوان "اے باوقار گجرات تیری فتح ہو" بطور ایک قومی ترانہ کے پیش کیجا سکتی ہے، نرمداشنکر پہلا شخص تھا، جس نے گجراتی ڈکشنری، (لغت) لکھی تھی، بھولا ناتھ سارابائی

نے گجراتی لٹریچر میں ایشور بھگتی (خدا کی عبادت) کی نظمیں لکھنے کی پہلے پہل بنا ڈالی تھی،

کیا کوئی ایسا گجراتی ہے، جس نے "لاٹھی" واقع (کاٹھیاواڑ) کے ٹھاکر صاحب شری سورسنگھ گوہی کا نام نہیں سنا، صرف وہی ایک ایسی مثال ہے، جو بادشاہ بھی تھا اور شاعر بھی، اس کا تخلص "کلاپی" تھا، اس کی موسیقی کی آواز ایسی ہی شیرین تھی جیسے برسات کے موسم میں کسی مست اور بے رفیق طاؤس کی، اس کے زمانہ میں بہت سے نئے اور مختلف عناصر گجراتی لٹریچر میں داخل کئے جا رہے تھے، گجرات میں انگریزی تعلیم کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ انگریزی زبان کی خصوصیات بھی ہمارے لٹریچر میں داخل ہوتے جاتے تھے، اب تک شاعری کا نفس مضمون عشق الٰہی تھا، "کلاپی" نے اپنی نظموں میں دنیاوی عشق داخل کر دیا، کلاپی نوجوانوں اور طالب علموں کا مقبول شاعر ہے، اس کی نظمیں عشقیہ جذبات (پریم رس) سے پُر ہوتی ہیں، ان خطوط میں جو اس نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، ادبی چاشنی ہے، اور وہ بہت اچھے ہیں، وہ شاعر کے بہ نسبت عاشق مزاج زیادہ ہے، اوس کی نظمیں ذاتی تجربہ کے حسن سے رنگی ہوئی ہیں، اس کی خوش قسمتی تھی، کہ اس کے حلقۂ احباب میں بہترین لٹریری اشخاص تھے، منی لال نانھو بھائی، دروید ی سا ملداس کالج بھاؤنگر میں سنسکرت کا پروفیسر تھا، اوس نے بہت سے مضامین لکھے ہیں، اور اُن میں سے ایک مضمون جو اوس نے کیرکٹر پر لکھا ہے، قابلِ توجہ ہے، پریمانند کے تماشوں کو چھوڑ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اب تک گجراتی میں ڈراموں کا لٹریچر نہ تھا، اس کا ڈرامہ "کانتا" گجراتی ڈراموں میں سے ہے، اوس نے بہت سے سنسکرت ڈراموں مثلاً اترا رام چرتر، "شکونتلا" وغیرہ کا ترجمہ کیا ہے، اوس نے بہت سے فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ وہ گو سنسکرت کا پروفیسر تھا، لیکن اوس نے غزل لکھنے کا تتبع، فارسی الفاظ کو گجراتی الفاظ میں استعمال کر کے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے، مثلاً "امید لاکھوں نا کامیوں کے اندر پوشیدہ ہے، زخم معشوق کے خنجر کے اندر چھپا ہوا ہے، میں نے جدائی کے ایام آہ وزاری اور اشک بہا بہا کر گذار دئے ہیں، اگر میرے حلق پر خنجر بھی چل جائے، پھر بھی وصال کی تمنا مجھ سے جدا نہ ہوگی"،

گوردھن مادھورام ترپیدی گجراتی لٹریری کانفرنس کا پہلا پریسیڈنٹ گجراتی مصنفوں میں نہایت ممتاز جگہ رکھتا ہے، وہ ایل ایل بی، اور ناڈیاڈ (نڈیاد) کا ناگر برہمن تھا، وہ گجراتی، سنسکرت اور انگریزی کا بہت ہی پُرشوق

طالبعلم تھا، اس وقت گجراتی زبان عجیب حالت مین سے گذر رہی تھی، تین اور عالم اشخاص کی تو یہ کوشش تھی، کہ گجراتی کو سنسکرت کے ساتھ ملادیا جائے، اور نئے تعلیم یافتہ نوجوان اس بات کیلئے انتہائی کوشان تھے، کہ گجراتی کو انگریزی کے زیر اثر لے آئین، گوردھن نے اس رسہ کشی کو بہت کامیابی کے ساتھ طے کردیا، اس نے خوبصورتی کے ساتھ تینون زبانون سنسکرت، انگلش، اور انگریزی کی خصوصیات کو اختیار کرکے اُن کو باہم ملا دیا، اُس کا آخری ناول "سرسوتی چندر" گجراتی لٹریچر مین بہترین تصنیف ہی، وہ چار حصّون مین شائع کی گئی ہی، گوردھن نے اپنے علم کے خزانہ کو اُسی تصنیف مین ختم کردیا ہے، اس کے کیرکٹر نہایت اعلیٰ ہین، وہ ایک بڑے متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ خاندان کا معاشرتی ناول ہے، ہم اس کے کمود، اور (ہیروین) "کسم" (اسکی بہن) اس کے سرسوتی چندر (ہیرو) وشنو داد، بدھی وان وغیرہ، کو اپنی باطنی نظر کے سامنے دیکھتے ہین، اس ناول کا گجراتی سوسائٹی پر بہت ہی اچھا اثر ہوا ہے، المختصر گجراتی سوسائٹی امثل سرسوتی چندر بن گئی ہی، اس نے گجراتی کے بڑے بڑے شاعرون کی زندگی پر انگریزی مین بعض مضامین لکھے ہین، علاوہ ازین اوس نے اپنی نظمون کا مجموعہ شائع کیا ہے جس کا نام محبت کی انگشتری (سنھ مدرا) رکھا ہے، اس کے نثر کا تتبع بہت کیا جاتا ہے، سنہ ۱۹۰۶ء مین وہ مرگیا،

اب ہم اپنے زمانہ مین پہنچ گئے ہین، اس زمانہ کے موجودہ گجراتی شاعرون اور مصنفون کی نسبت اگر کچھ لکھا تو شاید ہمارا مضمون قابلِ اعتراض بن جائے، اس لئے ہم ان کو آیندہ مورخ کے حوالہ کرتے ہین، تاہم ختم کرنے سے پہلے گجراتی لٹریچر کی موجودہ حالت کے متعلق مختصر طور پر ضرور کچھ کہین گے، گجراتی زبان گو بہت ترقی کرگئی ہی، کئی ماہوار رسالے شائع ہوتے ہین، کالجون مین بھی گجراتی پڑھائی جاتی ہے، گجراتی لٹریچر کے تمام شعبون پر کئی عالم لکھنے والے ناول بھی لکھے جاتے ہین، کنھیا لال منشی اور نرائن ٹھکر مہذب ناول لکھتے ہین، نثر کا لٹریچر بھی بہت صاف، سادہ شایستہ ہے، آج زبان کی سادگی نے لٹریچر مین مستقل جگہ حاصل کرلی ہے، تصنع کے بجائے سادگی ہے، عدم تعاون تحریک نے بہت قابل لکھنے والے پیدا کردیے ہین، یا دوسرے الفاظ مین یہ کہ اس تحریک نے ہمارے لٹریچر پر ڈالی ہی، اس نئی طرز کے خاص لکھنے والے تحریک کے روح رواں، ہمارے بزرگ اور محترم مہاتما گاندھی جی ہین،

کے نثر لکھنے والوں میں یہ سب سے اول ہیں جس طرح ان کی زندگی پاک سادہ اور عبادت گذار ہے، اسی طرح ان کی زبان بھی پاک، صاف سادہ اور شگفتہ ہے، اونھوں نے گجراتی نثر مین ایک نئی شاخ لگائی ہے،

شاعری بھی اعلیٰ بلندی پر پہنچ گئی ہے، دلپت رام شاعر کا قابل فرزند نھا لال آج کل لٹریری آسمان کا چاند ہے جس سے بہت سے مبتدی مستفید ہوتے ہیں، وہ بہترین شاعرون مین سے ہی، اس کی نظمین چاندنی رات کے مانند حسین اور دلفریب ہین، اوس نے بھی شاعری مین نئی شاخ لگائی ہے، اسکی نظمون کی خصوصیات "پلیٹک ورس" ہے، اسکے ڈرامے بھی اوسی طرز مین لکھے جاتے ہین، اس کے گربے گجرات مین بہت مشہور ہین،

اور شبر فرامجی خبروار ایک اور شاعر[1] ہے، جو گو پارسی ہے، مگر اس کی نظمین پاکیزہ اور ادبی ہوتی ہین، حب وطن پر اُس کی نظمون نے گجراتیون کے قلوب مین جگہ کرلی ہے، پروفیسر بلونت رلے کلیان رائے، ٹھاکور کی عالمانہ اور فلسفیانہ نظمین اعلیٰ سوسائٹی مین پڑھی جاتی ہین، نرسمہراو، بھولاناتی، ڈی وے، ٹیاکو، جدید انگریزی کو گجراتی شاعری کے ساتھ مدغم کرنے مین کامیابی ہوئی ہے، اسکی وہ نظمین جو فطرت کی تعریف مین لکھی گئی ہین، بہت خوشی کے ساتھ پڑھی جاتی ہین، ان نامون کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شاعرون کی ایک کثیر تعداد گجرات کے گلستان مین چہل قدمی کررہی ہے، تراجم سے بھی گجرات کے لٹریچر مین دوسری زبانون کی خصوصیات کا اضافہ ہو رہا ہے، دیوان بہادر کیشولال، ہرشدلال دھروکے، "مُدرا راکشس" "شکونتلا" وغیرہ سنسکرت کے بعض عالمانہ تراجم ہین، پروفیسر دھروا ایک بہت بڑا نقاد اور فائیولاجسٹ ہے، (بنارس ہندو یونیورسٹی کے) پروفیسر انند شنکر دھروبھی سنسکرت کے ایک بڑے عالم ہین، وہ ادبی رسالہ "وسنت" کے مدیر اور مشہور نقاد ہین،

مختلف صوبون کی زبانون مثل بنگالی، مرہٹی وغیرہ کے مطالعہ کا رواج گجرات مین ہو چلا ہے ان زبانون کی خصوصیات بھی گجراتی مین داخل کیجارہی ہین، علاوہ سائنس اور تاریخ کے علوم مین بھی کافی تحقیقات اور جدوجہد کی گئی ہے، ابھی حال مین ایک انسائیکلوپیڈیا بھی لکھی جارہی ہے جس سے زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچے گا،

[1] عرف عام مین اس کا نام اردشیر اور تخلص کبردار کہلاتا ہے،

مندرجہ ذیل شعرا گجراتی زبان کے پیدا ہوئے، جنکو گجرات مین کافی مقبولیت ہوئی،

(۱) نرسینھ مہتا، جوناگڈھی، متولد ۱۴۱۲ء،

(۲) میران بائی، (میواڑ) ۱۴۲۰ء، ۱۴۷۰ء،

(۳) بھالن ۱۴۳۹ء، ۱۵۲۹ء،

(۴) اکھا ۱۶۱۵ء، ۱۶۷۵ء،

(۵) پریمانند، بڑودہ کا باشندہ تھا، ۱۶۳۶ء مین پیدا ہوا، اور ۱۷۳۴ء مین فوت ہوا،

(۶) سامل احمدآباد کا رہنیوالا تھا، ۱۶۷۵ء مین پیدا ہوا اور ۱۷۶۳ء مین انتقال کرگیا،

(۷) دیارام، ڈبھوئی مین قیام رکھتا تھا، ۱۷۶۶ء مین پیدا ہوا، بڑا فاضل تھا، چودہ زبان کا عالم تھا، ۱۸۵۲ء مین فوت ہوا،

(۸) دلپت رام اصل وطن آبا و اجداد کا بھلیمان تھا، پھر کاٹھیاواڑ مین آکر بسے اس کے بعد احمدآباد چلے آئے، ۱۸۲۰ء مین پیدا ہوئے، اور ۱۸۹۸ء مین اس فانی دنیا کو خیرباد کہا، ان کا لڑکا بھی گجرات کا اسوقت بہترین شاعر ہے،

(۹) نرمدا شنکر ۱۸۳۳ء مین پیدا ہوا، سورت ان کا مسکن تھا، ۱۸۶۶ء مین چل بسے،

(۱۰) نند شنکر ۱۸۳۵ء مین اس جہان مین آئے اور ۱۹۰۵ء مین یہان سے کوچ کرگئے، یہ سورت کے باشندے تھے،

(۱۱) نول رام، انکی ولادت سورت مین ہوئی ۱۸۳۶ء،

(۱۲) [illegible] بھائی ۱۸۵۵ء مین تولد ہوا اور ۱۹۲۳ء مین انتقال کیا،

(۱۳) بھگوان لال اندرجی ڈاکٹر ۱۸۳۹ء مین انکی ولادت ہوئی، ۱۸۸۸ء مین وفات پائی،

(۱۴) من سکھ رام ۱۸۴۰ء مین اس باکمال نے دنیا مین قدم رکھا، یہ گجرات کا فردوسی ہے، اپنے اشعار مین غیرملکی زبان سے بے حد احتراز کرتا ہے، اور خالص گجرات کی زبان استعمال کرتا ہے، فارسی، عربی وغیرہ کے الفاظ مشکل سے اُس کے اشعار مین ملیں گے، ۱۸۹۰ء مین اوس نے دنیا کو وداع کیا،

(۱۵) کے خسرو کابراجی، ۱۸۴۲ء مین پیدایش ہے، اور ۱۹۰۴ء کو راہی ملک عدم ہوئے،

(۱۶) واگ جی، ۱۸۵۰ء مین پیدا ہوئے، اور ۱۸۹۰ء مین وفات پائی،

(۱۷) نارائن ہیم چندر، ۱۸۵۵ء،

(۱۸) گوردھن رام، ۱۸۵۵ء مین پیدایش ہوئی، اپنے وقت کے اہل کمال مین ان کا شمار ہے، ۱۹۰۷ء مین اس جہان سے رخصت ہوئے،

(۱۹) ہری لال، متولد ۱۸۵۶ء، متوفی ۱۸۹۶ء،

(۲۰) منی لال نبھو بھائی ۱۸۵۸ء متوفی ۱۸۹۸ء،

(۲۱) بالا شنکر، ۱۸۵۹ء، ۱۸۹۸ء،

(۲۲) انبالال شاکرلال، ۱۸۴۴ء،

(۲۳) نتھو رام، ۱۸۶۲ء، ۱۹۲۲ء،

(۲۴) تری بھون داس، ۱۸۶۳ء،

(۲۵) امرت لال، پڈھی یار، ۱۸۷۰ء،

(۲۶) بھوگندر راؤ، ۱۸۷۵ء، ۱۹۱۵ء،

(۲۷) رنجیت راؤ، ـــــ،

(۲۸) ڈاہیا بھائی، ناٹک لکھنے مین وقت صرف کیا، ۱۹۰۲ء،

(۲۹) نہالال کوئی ابن دلپت رام کوی، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی ہوگی، "گربا" لکھنے مین آپ کو کمال بہم پہنچا ہے، اور فارسی سے بھی آشنا ہین، انکے علاوہ اس عہد مین نرسی راؤ، بلونت راؤ، کلاپی، منی شنکر متوفی ۱۹۲۴ء اور بوٹا ڈکر وغیرہ قابل ذکر ہین، سب سے آخر مین مجھے افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مسلمان گجراتی شعرا کے نام اور حالات دستیاب نہین ہوئے، حالانکہ اکثر احباب سے مین نے طلب کئے، مگر نہ مل سکے، اگر کوئی صاحب اطلاع دین گے، تو بے حد شکر گذار ہون گا،

پدماوت کا مُصنّف کون تھا؟

از

مولانا سعید انصاری صاحب رفیق دارالمصنفین

منشی برج بھوکن لال صاحب محب نے دریاباد (ضلع بارہ بنکی) کی ایک تاریخ لکھی ہے، جو ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ کے نامی پریس سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، اس میں قاسم شاہ صاحب کی ایک منظوم بھاشا تصنیف "ہنس جواہر" کا تذکرہ کرتے ہوئے پدماوت سے اوس کا مقابلہ کر کے ترجیحی پہلو پیدا کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں پدماوت کی نسبت "خلاصۃ التواریخ" کی حسب ذیل عبارت نقل کی گئی ہے،:-

نسخۂ پدماوت مشتمل بر حقیقت رائے رتن سین مرزبان چتور کہ بنا بر پدماوت زوجۂ خود با سلطان علاء الدین والی دہلی محاربہ نمودہ بود کہ مصر پدماوت ہرا سامی راجہ بخط ہندی نوشتہ آن را باہورام خلاصۂ مریدان گوسائین ولی رام بعبارت مرغوبہ بفارسی در آوردہ"

(تاریخ دریاباد ص ۱۰۹)

اور اس سے حسب ذیل تاریخی نتائج نکالے گئے ہیں،:-

(۱) پدماوت کو اول مشر پدماوت دھرنے جو رائے رتن سین کے درباری رکن تھے، بزمانۂ علاء الدین (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) والی دہلی بھاشا زبان میں تصنیف کیا،

۲- بعد اوس کے باہو رام مرید گوسائین ولی رام کے ذریعہ اسے فارسی جامہ نصیب ہوا،

۳- اور ہندی تصنیف کی مدد سے ایک مدت کے بعد شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) کے عہد میں ملک محمد جائسی

کی کتاب پدماوت تالیف ہوئی،

۴ - اورنگ زیب (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کے زمانہ تک نقاش اول کی دھوم رہی (یعنی پدمادھر پدماوت کے مصنف کی حیثیت سے مشہور رہا، کیونکہ خلاصۂ تواریخ اورنگ زیب کی عہد کی تصنیف ہے،) پھر نقش ثانی کا رواج ہوا، (یعنی ملک محمد جائسی کی پدماوت کا شہرہ ہوا، اور پدمادھر کی شہرت فنا ہوگئی،) جو اس وقت تک شہرت کے ساتھ قائم ہے،

۵ - اس واقعہ سے منشی جواہر (مصنفہ قاسم شاہ صاحب) کا درجہ ملک محمد جائسی کی کتاب پدماوت کے مقابلہ مین ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ یہ پدماوت مشہر پدمادھر اور باہورام کی کتابون کا ترجمہ ہے، اور منشی جواہر قاسم شاہ کی طبع زاد تصنیف ہی،

لیکن ان نتائج مین متعدد غلط فہمیان ہین،

۱ - معبر پدمادھر (صحیح بدہادھر) مصنف پدماوت کو راے رتن سین والی چتور کا درباری فرض کیا گیا ہے، جس کے لئے تاریخی سند کی ضرورت ہی، اور مصنف نے "خلاصہ تواریخ" کی مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ (جو قابل بحث ہی) کوئی سند مہیا کرنے کی زحمت گوارا نہین فرمائی ہی،

۲ - چونکہ بدہادھر کا زمانہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہین ہے، اسلئے پدماوت کا زمانہ تصنیف سلطان علاء الدین والی دہلی کا عہد سلطنت (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) بہ مشکل فرض کیا جا سکتا ہی،

۳ - بدہادھر کی پدماوت کے کسی نسخہ کا کسی کتب خانہ مین مصنف نے وجود نہین ثابت کیا ہی، اسلئے اوس کے فارسی ترجمہ (مصنفہ باہورام) کے وجود کا یقین بھی آسانی کے ساتھ نہین آسکتا

۴ - بدمادھر کی پدماوت اور اس کا فارسی ترجمہ چونکہ "مشکوک الوجود"، اور "مفقود الخبر" ہین، اسلئے ایسی کتابونکو قطعیت کے ساتھ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا ماخذ قرار نہین دیا جا سکتا،

۵ - یہ بھی تسلیم کرنا مشکل ہے، کہ خلاصۂ تواریخ کے زمانۂ تصنیف تک جو اورنگ زیب کے عہد مین یعنی پدماوت کا مصنف بدہادھر ہی تسلیم کیا جاتا تھا، اور ملک محمد جائسی کی پدماوت گوشۂ گمنامی مین پڑی ہوئی تھی،

۲- بدہادھر اور بنا ہورام کی کتابون کا وجود ثابت ہونے سے پہلے یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے، کہ ملک محمد جائسی کی پدماوت اون کا ترجمہ تھی، اور اس لئے ہنس جواہر (مصنفہ قاسم شاہ) اوس پر ترجیح رکھتی ہی،

حقیقت یہ ہی کہ مصنف کے پیش نظر خلاصۃ التواریخ کا جو مطبوعہ نسخہ تھا، اس مین عبارت غلط چھپی ہی، دار المصنفین مین اوس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اس کتاب کا مصنف سُجان سنگھ دہیر ساکن قصبہ پٹیالہ اپنی ماخذون کو گناتے ہوے پدماوت کے متعلق لکھتا ہی:-

"ونسخۂ پدماوت مشتمل بر حقیقت راے رتن سین، مرزبان چتور، کہ بنا بر پدماوت زوجۂ خود با سلطان علاء الدین والی دہلی محاربہ نمود"

یہ عبارت یہین پر ختم ہو گئی ہے، اور اس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہین،

۱- پدماوت مین راے رتن سین والی چتور کا قصہ لکھا ہے، جو اپنی بیوی پدماوت کی وجہ سے سلطان علاء الدین والی دہلی سے لڑا تھا،

۲- اسمین یہ تصریح نہین ہی کہ پدماوت علاء الدین کے زمانہ مین تصنیف ہوئی تھی،

۳- نہ اس کا ذکر ہے کہ پدماوت کا مصنف کون تھا؟ اور کس زمانہ مین گذرا تھا؟

۴- نہ اس کا پتہ ہے، کہ پدماوت کا بھاشا سے فارسی مین ترجمہ ہوا تھا،

---

[1] کتبخانہ برٹش میوزیم اور بانکی پور کی فہرستون مین اس نام کے مختلف تلفظ لکھے ہین، مارلے، اور اسپرنگر نے (س ن ج ان)، ئیس اور الیٹ نے (س ب ح ان) گارسن دی ٹاسی نے (س ج ان) پڑھا ہے، بوڈلین لائبریری کی فہرست مین ایتھے نے (س ج ان راے) لکھا ہے، جو ٹاسی کے مطابق ہے، چونکہ آخری تلفظ مین "ہند دین" ہے اس لئے دہی صحیح ہے، بانکی پور کی فہرست مین مصنف کو کہتری لکھا گیا ہے، اور اس کی تائید دار المصنفین کے قلمی نسخہ سے ہوتی ہے، کہ اس مین نام کا جزء سنگھ کا لفظ بھی ہے جو پنجاب کے اون کھتریون کے نام کے ساتھ شامل ہوتا ہے، جو سکھ مذہب کے پیرو ہوتے ہین،

اب آگے چلئے، پدماوت کے ذکر کے بعد سجان سنگھ نے اپنی کتاب "خلاصۃ التواریخ" کے دوسرے ماخذ کا تذکرہ کیا ہے اور وہ یہ ہے:-

"نسخہ راجاولی کہ مصر بدہا دھر اسامی راجہا بخط ہندی نوشتہ، و آنرا نباہورام[1] خلاصہ مردان گسائین ولی بعبارات مرغوبہ بفارسی در آوردہ"

اس ثابت ہوتا ہے، کہ:-

۱- راجاولی ہندی زبان میں ایک کتاب مصر بدہا دھر نے تصنیف کی تھی،

۲- نباہورام نے اسی راجہ ولی کو فارسی زبان میں لکھا تھا،

۳- راجاولی میں راجاؤں کے نام لکھے گئے تھے،

۴- بدہا دھر اور نباہورام کب اور کس زمانہ میں گذرے ہیں؟ اس کا کچھ ذکر نہیں ہے،

دار المصنفین کے قلمی نسخہ سے ہم نے جو عبارتیں نقل کی ہیں، برٹش میوزیم اور بانکی پور کے نسخوں میں بھی اسی کے مطابق

اب حسب ذیل مسائل پر غور کرو،

۱- پدماوت اور راجاولی دو کتابیں ہیں،

۲- پدماوت میں رائے رتن سین کی رانی پدماوت کا قصہ ہے اور راجاولی میں راجاؤں کے نام ہیں، اسلئے دونوں کے موضوع میں بڑا فرق ہے، جو دونوں کے ناموں سے ظاہر ہے،

۳- پدماوت کے مصنف کا نام نہیں لکھا ہے، اور راجاولی کے مصنف کا نام بدہا دھر اور فارسی مترجم کا نام نباہورام بتایا گیا ہے، پھر بدہا دھر پدماوت کا مصنف کیسے ہو سکتا ہے، اور نباہورام کے پدماوت کے فارسی

[1] قلمی نسخہ میں یہ نام صاف نہیں پڑھے گئے، کتبخانہ برٹش میوزیم اور بانکی پور کی فہرستوں میں پہلا نام (ب د دھ ا د ھ ر) (Bidhadhar) اور دوسرا (ن ب ا ہ و رام) (Nibahuram) لکھا ہے، اس لئے مصنف تاریخ دریاباد میں پدمادھر اور باہورام جو نام لکھے ہیں، غلط ہیں،

ترجمہ کو کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے؟

۴ - پدماوت، ملک محمد جائسی کی تصنیف ہے، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا انکار اب تک کسی نے نہین کیا ہے، خلاصۃ التواریخ مین جو پدماوت کے مصنف کا نام نہین لیا گیا ہے، اوس کا سبب یہ نہ تھا، کہ پداوت کسی اور شخص نے بھی لکھی تھی، بلکہ یہ سبب تھا، کہ پدماوت کا ملک محمد جائسی کی تصنیف ہونا ایک مشہور بات تھی،

۵ - خلاصۃ التواریخ کے ماخذون کی فہرست مین متعدد نام ایسے بھی ملتے ہین، جن کے مصنفین کا ذکر نہین کیا گیا ہے، مثلاً گل افشان جو سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ تھا، اور جس مین بکرماجیت کے حالات تھے، تاریخ شہاب الدین غوری، تاریخ سلطان علاء الدین خلجی، تاریخ بہادر شاہی جس مین گجرات (احمد آباد) کے بادشاہون کے حالات تھے، تاریخ سلاطین جس مین ملتان، مالوہ، دولت آباد (دکن) جونپور، بنگالہ، اُوڑیسہ کے سلاطین کا تذکرہ تھا، تو کیا ان سب کتابون کو بھی فرضی مصنفین کی طرف منسوب کر دیا جائے گا؟

ؔ فہرست کتبخانہ برٹش میوزیم بانکی پور،

تلخیص و تبصرہ

طریق معاش کا انتخاب

طریق معاش کا انتخاب اپنی اہمیت کے لحاظ سے جسقدر غور و تامل کا مستحق ہے اسی قدر اُس مین غفلت و بے پروائی برتی جاتی ہے، ہر پیشہ کے لئے اختیار کرنے والے کی صلاحیت اور استعداد کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اور اسی اعتبار سے اوسکی تعلیم و تربیت ہونی چاہئے، لیکن عام طور پر طلبہ کی صلاحیت و استعداد پر کوئی توجہ نہین کی جاتی اور بغیر اس خیال کے کہ جس پیشہ کیلئے اونھین تیار کیا جارہا ہے، اُس مین وہ کہان تک کامیاب ہوسکتے ہین، والدین اُنھین اپنی پسند یا مصلحت کے لحاظ سے تعلیم دیتے رہتے ہین، بہت کم والدین کا انتخاب طلبہ کی استعداد کے موافق ہوتا ہے، عموماً اون کے اندازہ اور قیاس مین غلطی ہوجاتی ہے، جس کی پاداش طلبہ کو تمام عمر اپنی ناکام زندگی مین برداشت کرنی پڑتی ہے، اس غلطی سے بچنے کی غرض سے چند سالون سے یورپ کے بعض ملکون مین ایسے ادارے قائم کئے گئے ہین جنمین ابتدا ہی سے طلبہ کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ ہوتی رہتی ہے، اور زمانہ تعلیم ہی مین اون کو بتادیا جاتا ہے کہ وہ کن پیشون کیلئے زیادہ موزون ہین تاکہ اوسی لحاظ سے وہ اپنے آیندہ طریق معاش کا انتخاب کرکے اس کے لئے تیاری کرین اور زندگی مین کامیاب ہوسکین، انگلستان مین بھی اس قسم کا ایک ادارہ (Institute of Industrial Psychology) دس سال سے کام کررہا ہے، اس کے صدر ڈاکٹر مایرس (Dr. C. S. Myers) نے اس موضوع پر حال مین ایک مقالہ مانچسٹر گارجین مین تحریر کیا تھا جسے اسٹیٹسمین نے نقل کیا ہے، اس کی تلخیص ہم سطور ذیل مین پیش کرتے ہین:-

اگر کسی شخص نے کوئی ایسا پیشہ اختیار کرلیا ہے، جس کے لئے وہ موزون نہین ہے، تو انفرادی حیثیت سے اس کی زندگی

ناکام اور دردناک ہے، اور اجتماعی حیثیت سے وہ ایک ایسے مسئلہ کو پیش کر رہا ہے، جو موجودہ زمانہ کے اہم مسائل میں ہے، غلط پیشہ اختیار کرنے کا نتیجہ غیر آسودگی، بے اطمینانی، ناشادگی، ناکامی، خود اعتمادی کا نقصان، اور انسانی قوتوں کا حیرت انگیز اختلاف ہے، لیکن دانشمندی کے ساتھ صحیح پیشہ کا انتخاب کرنا بھی آسان نہیں ہے، اس کے لئے لڑکے یا لڑکی کی دماغی، جسمانی اور مزاجی قابلیت اور استعداد کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ضروری ہے، اس کیلئے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے، کہ مختلف پیشوں کے لئے کس کس قسم کی اہلیت اور قابلیت درکار ہے، پیشوں کے انتخاب میں اکثر و بیشتر اتفاق ہی کو دخل ہوتا ہے، محض اس لئے کہ بچوں اور اُن کے والدین و اساتذہ کو وہ معلومات حاصل نہیں ہوتے جو ایک صحیح تر انتخاب کیلئے ضروری ہیں، فلسفۂ نفسیات میں جو ترقی حال میں رونما ہوئی ہے، اوس نے خوش قسمتی سے اس مسئلہ کا حل بھی پیدا کر دیا ہے، ماہرین نفسیات سالوں سے ایسے طریقے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن سے طلبہ کی ذہنی اہلیت اور مزاجی اور کرداری کیفیت کا صحیح اندازہ ہو سکے، اور وہ ایک بڑی حد تک اس کوشش میں کامیاب ہوگئے ہیں، وہ اپنے طریقہ پر زید کی جانچ کرکے صرف یہی نہیں بتا دیتے کہ وہ ایک ذہین لڑکا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں، کہ یونیورسٹی کے جن طلبہ نے نمایاں کامیابی کے ساتھ اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں، زید اپنی ذہنی استعداد کے لحاظ سے ان سے کسی قدر بڑھا ہوا ہے، نیز اونھیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اوس میں صنعت و حرفت کے پیشوں میں کامیاب ہونیکی صلاحیت بہت کم ہے، اور انجینیری، تعمیرات، دندان سازی، اور اسی قسم کے دوسرے پیشے اوس کے لئے موزوں نہیں ہیں، نفسیاتی جانچ کے ذریعہ سے وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ زید میں خود اعتمادی، حاضر جوابی، احتیاط اور منطقی استدلال کی صفتیں موجود ہیں، اور اس سے زبانی گفتگو کرکے وہ اس خیال کی تصدیق کر لیتے ہیں، کہ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہو سکتا ہے، دریافت کرنے پر زید بھی اس پیشہ کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے، پھر اس کے اساتذہ بیان کرتے ہیں کہ لاطینی اور انگریزی زبانوں میں اسکی استعداد بہت اچھی ہے، اور انجمن مباحثہ کا وہ ایک سرگرم رکن ہے، آخر میں اوس کے باپ سے گفتگو کرکے یہ معلوم کر لیا جاتا ہے، کہ وہ زید کو بیرسٹری کی تعلیم دلانے کی استطاعت رکھتا ہے، اور تعلیم سے فراغت کے بعد ہی جب تک زید کی آمدنی قابلِ اطمینان نہ ہو جائے، اوس کی مالی امداد کرنے کیلئے آمادہ ہے، ان معلومات کے بعد زید کے لئے یہ پیشہ منتخب کیا جاتا ہے،

انگلستان مین اس قسم کی جانچ اور مشورہ کا کام ایک خاص ادارۂ نفسیات (National Institute of Industrial Psychology) کے ہاتھ مین ہے، دس سال سے زائد سے اس ادارہ کے ارکان مختلف پیشون کے لئے طلبہ کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ کے طریقے وضع کررہے ہین، اور اونھون نے تفصیل کے ساتھ اُن ضروریات کا مطالعہ کیا ہے، جس کا لحاظ ہر پیشہ کے انتخاب کیلئے لازمی ہے، اونھون نے تین عنوانون کے ماتحت تمام پیشون کی تقسیم کی ہے (۱) وہ پیشے جن کا تعلق خاص طور پر اشخاص سے ہے، مثلاً درس وتدریس، عملہ کی نگرانی وغیرہ، (۲) وہ پیشے جو خاص کر اشیا سے متعلق ہین، مثلاً فن تعمیر، چمن بندی وغیرہ (۳) وہ پیشے جو خصوصیت کے ساتھ مجرد خیالات اور علامات سے تعلق رکھتے ہین مثلاً روپیہ وغیرہ کا حساب کتاب یہ تقسیم گو ناقص ہے، تاہم کارآمد ہے،

یہ ادارہ جن طلبہ کو کسی پیشہ کے انتخاب کی بابت مشورے دیتا ہے، اُن سے دریافت بھی کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے انتخاب مین کہان تک کامیاب ہوئے، اس دریافت کے جو جوابات موصول ہوئے ہین، وہ بہت امید افزا ہین، اور ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو مشورے ادارہ نے دیے تھے، وہ عمومیت کے ساتھ صحیح اور کامیاب ثابت ہوئے، چنانچہ جن لوگون نے ادارہ کے مشورون پر عمل نہین کیا، ان مین کامیابی اور ناکامی کا تناسب تقریباً برابر ہی رہا، لیکن جن لوگون نے اس کے مشورون پر عمل کیا، ان کی کامیابی ناکامی سے نوگنا زیادہ تھی،

یہ ادارہ جس کی شاخین انگلستان کے متعدد مدارس مین قائم ہوگئی ہین، اونچے درجون کے طلبہ مین سے ہر سال تقریباً آٹھ سو طلبہ کو اُن کے آیندہ طریق معاش کے انتخاب کے متعلق مفید اور مناسب مشورے دیتا رہتا ہے، لیکن یہ قلیل تعداد اوس کثیر تعداد کے مقابلہ مین کچھ بھی نہین ہے، جو اس قسم کے مشورون سے محروم رہنے کے باعث زندگی مین عموماً ناکام رہتی ہے، لہذا خیال یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام مدارس مین ایسے اساتذہ مقرر کردئے جائین جن کا کام خاص طور پر وقتاً فوقتاً طلبہ اور طالبات کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ کرنا، اور اونھین مفید مشورے دینا ہوگا، یہ اساتذہ ادارۂ نفسیات کے تعلیم یافتہ ہون گے، اور اوسی ادارہ کے طریقون پر عمل کرین گے،

"ع ز"

یورپ مین اوسطِ پیدایش کے انحطاط کا اقتصادی اثر

پروفیسر ہرش (Hersch) جنیوا یونیورسٹی نے ان اثرات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو یورپ مین اوسط پیدایش کے انحطاط سے اقتصادی حالات پر پڑ رہے ہین، جیسا کہ اسٹیٹسمین راوی ہے، یہ نتیجہ نکالا ہو کہ یہ انحطاط مستقل کساد بازاری کے پیدا کرنے کا ایک قوی باعث ہوگا، اور اس سے بے روزگاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکے گا، پروفیسر موصوف بتاتے ہین کہ سیکڑون برس تک یورپ کے ملکون کا سالانہ اوسط پیدایش تقریبًا (۴۰) فی ہزار تھا، انحطاط فرانس مین شروع ہوا، اور گذشتہ صدی کے دوران مین اس کی رفتار برابر جاری رہی، اس صدی کے آخری رُبع مین یہ انحطاط ان ملکون مین بھی شروع ہوگیا، جہان جرمن نسل کے لوگ آباد ہین، اور وہان موجودہ صدی کی ابتدا مین اس انحطاط مین تیزی کے ساتھ ترقی ہوتی گئی، جنگ عظیم کے قریب اٹلی اور مغربی سلافی قومون (Western Slaven) مین کچھ انحطاط رونما ہونے لگا، فرانس مین اگرچہ اوسط پیدایش برابر گرتا جارہا تھا، تاہم سنہ ۱۹۳ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس سال دوسرے ممالک کا اوسط فرانس سے بھی کم تھا، فرانس کا اوسط پیدایش فی ہزار (۱۷٫۴) تھا، جرمنی کا (۱۶) سوئزر لینڈ اور ناروے کا، (۱۶٫۷) انگلستان کا (۱۵٫۸) اور سوئیڈن کا (۱۴٫۸) جنگ کے بعد ہی اسپین، پرتگال، پولینڈ، سوویٹ روس، اور ریاستہائے بلقان مین بھی اوسط پیدایش گرنے لگا، اونچے طبقون کی بہ نسبت صنعت وحرفت کے طبقون مین اوسط پیدایش زیادہ ہے، لیکن شہرون مین اس کا انحطاط دولتمندون سے زیادہ غربا مین نمایان ہو،

اوسط پیدایش کے انحطاط کا اثر ملک کی آبادی پر یہ پڑا کہ تمام یورپ اور خصوصًا اس کے شمالی اور مغربی ممالک مین بچون کی تعداد کا تناسب بہت گھٹ گیا، اور بڑون کا تناسب اس وقت بڑھا ہوا ہو، جسکی ایک وجہ یہ ہو کہ اوسط اموات مین کمی ہوگئی ہو، لیکن نوجوانون کی تعداد کے تناسب مین کمی شروع ہوگئی ہے، اور بوڑھون کا تناسب زیادہ ہوگیا ہو، یعنی جیسا کہ پروفیسر موصوف لکھتے ہین، "اگر اس وقت بچون کی تعداد کم ہے، اور بڑون اور بوڑھون کی زیادہ تو تھوڑے ہی دنون مین بچون اور کام کرنے کے قابل اشخاص کی تعداد اور بھی کم ہوجائے گی اور

بڑھون کی تعداد مین اضافہ ہو جائے گا، شمالی اور وسطی مغربی یورپ مین اوسط پیدائش اوسط اموات کے تقریباً برابر ہی ہے، اور ممکن ہے کہ مستقبل قریب مین یہ اوسط اموات سے نیچے گر جائے یعنی مغربی یورپ کی آبادیون مین جمود کے آثار پائے جاتے ہین۔

اس صورتِ حال کے اقتصادی اثرات کیا ہون گے؟ پروفیسر ہرش اس سوال کا جواب یہ دیتے ہین کہ "پیدا کرنیوالون کی بہ نسبت صرف کرنے والون کی تعداد کم ہو جائے گی، کیونکہ معاشی نقطۂ نظر سے پیدا کرنے والون کی تعداد تقریباً تمام تر جوانون اور پختہ عمر والون پر مشتمل ہے، بچّون کا کام پیدا کرنا نہین، بلکہ صرف کرنا ہے، اور ان کی تعداد کا انحطاط بوڑھون کی تعداد کی افزایش سے زیادہ ہو، پیدا کرنے والون کی تعداد کی مناسبت سے صرف کرنے والون کی تعداد کا یہ مستقل انحطاط لازمی طور پر بے روزگاری کو ترقی دیتا رہے گا، اور یہ بے روزگاری کوئی وقتی اور موسمی بے روزگاری نہ ہو گی، بلکہ ایسی بے روزگاری ہو گی، جسے بجا طور پر ترکیبی کہہ سکتے ہین، کیونکہ یہ نتیجہ ہو گی آبادی کی ترکیب عمری کا"

اس بے روزگاری کو دور کرنے کیلئے پروفیسر موصوف یہ تجویز پیش کرتے ہین کہ کام کے گھنٹون مین تدریج تخفیف کر دی جائے، جن کامون کیلئے اجرت مقرر ہے، ان کے لئے عمر بتدریج محدود کر دی جائے، طبقہ عوام کی قوت خریداری مین اضافہ ہو جائے، اور تنخواہون مین تخفیف کر کے ملازمتون کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن اوسط پیدائش کے گر جانے سے جو ترقی پذیر کسادبازاری وجود مین آگئی ہے، اوس کو رفع کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشی زندگی کے مختلف شعبون مین آبادی اور سرمایہ کی تقسیم مین ایک تبدیلی پیدا کر دی جائے تمام ضرورتین اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکسان نہین ہوتین، ایک شخص کو اپنی بھوک اور پیاس بجھانے کیلئے غذا اور پانی کی ایک متعین مقدار چاہئے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی صاحبِ علم کی تشفی کیلئے کتنی کتابون کی ضرورت ہو گی، یا تصویرون کی کونسی تعداد اس شخص کے ذوق کو پورا کر دے گی، جو ان کے جمع کرنے کا شائق ہے، غرض جو ضروریات خالص مادّی اور زندگی کیلئے لازمی ہین، وہ سامان کی ایک محدود مقدار سے پوری ہو سکتی ہین، لیکن جو ضروریات اجتماعی، دماغی، فنی، اخلاقی، یا اسی قسم کی ہین وہ حقیقتہً غیر محدود ہین، اور ان کو پورا کرنے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک مزید ضرورت پیدا ہو جاتی ہے، پہلی قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کوئی آبادی سامان کی جو مقدار استعمال کر سکتی ہے، اس کی تعیین خاص طور پر اس آبادی کی

مجموعی تعداد سے کی جاتی ہے، اور دوسری قسم کی ضروریات کیلئے سامان کی جو مقدار درکار ہوتی ہے اس کا انحصار خصوصیت کے ساتھ اوس آبادی کے معیار حیات و تمدن اور اوس کی قوت خریداری پر ہوتا ہے" پروفیسر ہرش کا خیال ہے کہ پہلی قسم کے سامانوں کا اوسط پیداوار کم کر دینا چاہئے، دوسری قسم کے سامانوں کی طلب تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ بڑھتی ہی جائے گی، خواہ آبادی اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے،

"ع ز"

سرطان کے علاج مین ترقی

تین ہزار برس سے زیادہ ہوئے، جب کہ مصر کے قدیم پوجاریوں نے سرطان کے بعض مریضوں کو دیکھ کر اس مرض کے متعلق کچھ لکھا تھا اور اس کے علاج کے لئے ایک مرہم تجویز کیا تھا، جو دراصل بہت کم مفید ثابت ہوا، پھر اس کے بعد اب سے تقریباً ایک سو برس پہلے تک اس مرض کی نسبت بہت کم معلوم ہو سکا، ایک سو سال ہوئے، ماہرین حیوانات و نباتات اور اطبا نے خوردبین کے ذریعہ سے اس کا معائنہ شروع کیا اور تیس سال کے عرصہ میں یہ معلوم کر لیا کہ سرطان کی متعدد قسمیں ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں، جو سرطان جلد سے پیدا ہوتے ہیں، وہ جلد کے چھوٹے چھوٹے خانون سے بنتے ہیں، اور جو اندرونی اعضا سے نکلتے ہیں، وہ اُن خانون سے بنتے ہین جن سے ان اعضا کی تعمیر ہوتی ہے ہڈی کا سرطان جسم کے کسی اور حصہ کے سرطان سے مختلف ہوتا ہے، بتدریج ان سرطانون کی علٰحدہ علٰحدہ تقسیم قائم کی گئی ان کے جدا جدا نام رکھے گئے اور یہ قلم بند کر لیا گیا کہ بعض سرطان دوسرون دوسرون کی بہ نسبت بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہین، تقریباً اسی زمانہ مین فن جراحی مین بھی ترقی رونما ہونے لگی اور بعض بعض خانون پر عمل جراحی کیا بھی گیا، لیکن انیسوین صدی کے وسط تک جبتک کہ بے حس کرنے والی دواؤن کا استعمال عام نہیں ہو گیا، سرطان کے بڑے آپریشن نہیں کئے گئے اور چونکہ تمام زخم پک جاتے تھے، اس لئے بہت کم غدود کاٹ کر نکالے جاتے تھے، پھر لسٹر (Lister) کی عظیم الشان تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صفائی اور دافع تعدیہ اشیاء کے استعمال سے زخم کو پکنے اور خراب ہونے سے روکا جا سکتا ہے، اور اس اکتشاف کے بعد سرطان کے نازک آپریشن بھی کئے جانے لگے، لیکن تندرست ہو جانے والون کی تعداد پھر بھی کم ہی رہی،

۱۸۹۶ء میں رونٹجن (Roentgen) نے عکس ریز (اکس ریز) کو دریافت کیا اور ۱۸۹۸ء میں میڈم کیوری (Madam Curie) نے ریڈیم کو معلوم کیا، ان دریافتون کے بعد سے سرطان کے علاج کا جدید طریقہ شروع ہوا، یعنی آپریشن کے ذریعہ سے نکال دینا یا ریڈیم کے ذریعہ سے فنا کر دینا، لیکن بہت سے سرطان ایسے ہین، جو آپریشن یا ریڈیم کسی طریقے سے اچھے نہین ہو سکتے،

۱۹۰۰ء کے قریب یہ معلوم کیا گیا، کہ سفید چوہون کو بھی انسان ہی جیسا سرطان ہوتا ہے، اور یہ ایک جانور کے جسم سے نکال کر دوسرے جانور کے جسم مین منتقل کیا جا سکتا ہے،

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سرطان کسی جرثومہ (germ) کے سبب سے نہین ہوتا، لہذا یہ قدیم خیال بالکل غلط تھا، کہ سرطان کے مریض کا تعدیہ اس کے تیمار دارون پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے، اسی طرح جانورون پر تجربہ کر کے یہ بھی دکھایا جا چکا ہے، کہ یہ مرض موروثی نہین ہوتا،

جانورون مین سرطان بعض معمولی کیمیاوی مواد (Chemicals) سے پیدا کیا جا سکتا ہے، بعض کیڑے بھی سرطان پیدا کرنے کا سبب ہو سکتے ہین، مصر مین ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے، جس کے کاٹنے سے سوزش پیدا ہوتی ہے، اور اسی قسم کا سرطان پیدا ہو جاتا ہے، جیسا فراعنۂ مصر کے زمانہ مین وہان کے باشندون مین پایا جاتا تھا، کیڑون کے کاٹنے سے جو سرطان پیدا ہوتا ہے، وہ بہ نسبت سرد ملکون کے مشرق بعید مین بہت زیادہ پایا جاتا ہے،

اس مین شبہہ نہین کہ لوگ اگر حفظانِ صحت کے معمولی اصولون پر عمل کرنے لگین، تو بہت سے سرطانون سے پناہ مل سکتی ہے، مثلاً منہ کے سرطان اکثر ایسے مصنوعی دانتون کے استعمال سے جو ٹھیک لگتے نہین یا تیز دانتون کے زبان پر رگڑنے سے یا اسی قسم کے دوسرے اسباب سے جنھین دفع کیا جا سکتا ہے، پیدا ہو جاتے ہین، اسی طرح جو سرطان تارکول یا ایسے روغنون سے پیدا ہوتے ہین، جو مشینون مین استعمال کیے جاتے ہین اُن سے بچنے کا بہت آسان طریقہ یہ ہے کہ کثرت سے غسل کیا جائے، تاکہ اس قسم کے روغن جسم سے صاف ہوتے رہین،

"ع ز"

یونان کے بعض آثار قدیمہ

گذشتہ موسم گرما مین یونان کے دار السلطنت ایتھنز مین ماہرین آثار قدیمہ نے بہت سی نادر چیزین کھود کر نکالی ہین، ایتھنز کے قدیم بازار (The agora) مین بے شمار کنوئے تھے، ان مین سے صرف ایک کنوئے سے (۲۱۷) چیزین برآمد کی گئی ہین یہ چیزین چھٹی صدی قبل مسیح سے لیکر ۳۰۰ء قبل مسیح تک کی ہین ان مین سب سے زیادہ قدیم چیز ایک خوبصورت برتن ہے جسمین دو دستے لگے ہوئے ہین، یہ ساتوین صدی قبل مسیح کے آخری دور کا ہے، اس کے علاوہ ایک اور نہایت قدیم گلدان ہے جس کی شکل ایک جھکے ہوئے لڑکے کے مانند ہے جس مقام پر یہ قدیم بازار واقع تھا، وہان اب جدید عمارتین بن گئی ہین، اور ان آثار قدیمہ کے نکالنے کیلئے بہت سے جدید مکانات کو گرا دینا پڑا ہے، گذشتہ موسم گرما کی کھدوائی مین کنوؤن کے علاوہ بالکل غیر متوقع طور پر ایک مقبرہ بھی برآمد ہوا ہے، اس مین تین انسانی ڈھانچے، ایک نیلے شیشے کا ہار اور چند ٹوٹے ہوئے گلدان ملے ہین، اسی کے قریب فتح کے پردار دیوتا کے دو مجسمے بھی برآمد ہوئے ہین، جو پانچوین صدی قبل مسیح کے بنے ہوئے ہین، ایک سنگ مرمر کا مجسمہ شہنشاہ ہیڈرین (دوسری صدی عیسوی) کا بھی نکلا ہے، اس کا سر ابتک نہین ملسکا ہے، لیکن اور علامات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ یہ مجسمہ اسی شہنشاہ کا ہے، ایک اور سنگ مرمر کا مجسمہ چوتھی صدی قبل مسیح کا شاہکار ہے، یہ ایک نوجوان حسینہ کا مجسمہ ہے، جس کا لباس اس قدر باریک دکھایا گیا ہے کہ جسم کی خوبصورتی لباس کے اوپر سے بھی نمایان ہے، قریب تین سو قندیلین (لیمپ) برآمد ہوئی ہین، جو مختلف قسمون اور ساتوین صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی عیسوی تک کے مختلف زمانون کی بنی ہوئی ہین تین سال کی کھدوائی مین ایک ہزار سے زیادہ کتبے اور چوبیس ہزار سے زیادہ قدیم سکے ملے ہین، اس سلسلہ مین ایک دلچسپ چیز یہ ہاتھ آئی ہے، کہ یونان کے قدیم معمار پختہ عمارتون مین جو مسالہ دیتے تھے اس کا نسخہ مل گیا، ڈاکٹر لیسلی شیر (Dr. Leslie Shear) جنکی سرکردگی مین امریکہ کے ماہرین آثار قدیمہ نے اُن مین

اکثر چیزیں برآمد کی ہیں، اپنے ساتھ پرانی گچ کے کچھ ٹکڑے امریکہ لیتے آئے تھے، جن کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن میں (۲) فی صدی بالو اور (۳۶) فی صدی چونا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ تناسب اوس نسخہ سے مختلف ہے جو شہنشاہ اغسطس (پہلی صدی قبل مسیح) کے زمانہ کا معمار وٹرووس (Vitruvius) چھوڑ گیا ہے،

قدیم اہل ایتھنز کی مذہبی زندگی سے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہوئے ہیں، یونان میں فرقہ ادریہ (Gnostic) دوسری صدی عیسوی کا ایک طاقتور فرقہ تھا، جس کے مذہب میں سحر کاری کے علاوہ یونانی، مصری، اور سامی مذاہب کے اجزا بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کے پاس بعض ایسے جواہرات ہوتے تھے جن پر عجیب و غریب قسم کی تصویریں بنی ہوتی تھیں اور عجیب و غریب دیوتاؤں کے نام اور طلسمی عبارتیں کندہ ہوتی تھیں، چنانچہ جو پتھر برآمد ہوا ہے، وہ اس قسم کا ہے، جسے "ابراساکس" (Abraxas) کہتے ہیں، اس نام کے اعداد (۳۶۵) ہیں جو سال کے دنوں کی تعداد ہے، اس پتھر پر ابراساکس نامی ایک عجیب جانور کی تصویر بنی ہوئی ہے، جس کا سر مرغ کا ہے، اور جس کی ٹانگوں کے بجائے دو سانپ ہیں،

ایتھنز کی قدیم عدالتی کارروائی سے متعلق بھی ایک دلچسپ چیز برآمد ہوئی ہے، جو شہری جیوری کے فرائض کے لائق سمجھے جاتے تھے، اونھیں ایک کانسے کا ٹکٹ دیا جاتا تھا، جس پر اون کا نام، اُس شعبہ کا نام جس سے وہ متعلق ہوتے تھے، اور شہر کی مہر کندہ ہوتی تھی، مقدمہ کی سماعت کے وقت جیوری کے ہر رکن کو کانسے کے دو قرص دئے جاتے تھے، ایک کا مرکزی حصہ کھوکھلا اور دوسرے کا ٹھوس ہوتا تھا، جس قرص کا مرکزی حصہ کھوکھلا ہوتا تھا، اوسے ملزم کی بریت کے لئے ووٹ دینے میں استعمال کرتے تھے اور جس کا ٹھوس ہوتا تھا اسے سزا کیلئے ووٹ دینے میں، جیوری کا ہر رکن ووٹ دیتے وقت پوشیدہ طور پر ایک قرص کانسے کے ایک ٹب میں ڈال دیتا، اور پھر ان سب قرصوں کو جمع کرکے جیوری کی رائے معلوم کرلی جاتی، اور اسی کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا، جو قرص برآمد ہوئے ہیں، وہ چوتھی صدی قبل مسیح کے ہیں، اور یہ اُسی زمانہ کے ہیں جس زمانہ کی عدالتی کارروائی کا بیان ارسطو نے اپنے "دستور ایتھنز" میں کیا ہے،

قدیم ایتھنز کے سیاسی قانون کے متعلق بھی ایک اہم چیز کا انکشاف ہوا ہے، پانچوین صدی قبل مسیح مین ایتھنز کے قانون مین جلاوطنی (Ostracism) کا رواج جگہ پاچکا تھا، اس قانون کے مطابق وہان کے شہری کسی قائد کو جو حد سے زیادہ قوت واقتدار حاصل کرلے، دس سال کیلئے جلاوطن کرسکتے تھے، اس کا طریقہ یہ تھا، کہ اوس قائد کا نام مٹی کے ایک ٹکڑے پر جسے اوسٹراکون (Ostrakon) کہتے تھے کندہ کردیا جاتا تھا، اور وہی اس کے خلاف ووٹ کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، پہلا مدبر جس کے خلاف یہ قانون جاری کیا گیا، ہپارکوس (Hipparchos) تھا، جو جنوری ۴۸۷ء قبل مسیح مین جلاوطن کیا گیا، چنانچہ ایک اوسٹراکون جسپر اوس کے خلاف ووٹ دیا گیا تھا، گیارہ دوسرے اوسٹراکونون کے ساتھ برآمد ہوا ہے۔

"ع ز"

خلفائے راشدین

سیرالمہاجرین کا حصہ اول، یہ چارون خلفا کے ذاتی حالات فضائل اور مذہبی وسیاسی کارنامون اور فتوحات کا آئینہ ہے، حجم ۳۰۰ صفحے قیمت :- ؎ ہے

مہاجرین

حصہ اول

اس کتاب مین خلفائے راشدین کے علاوہ بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ اکابر بنی ہاشم وقریش اور ان اصحاب کے حالات سوانح، اخلاق وفضائل کی تفصیل کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، شروع مین ایک مفصل مقدمہ مین قریش کی تاریخ اور قبائل مہاجرین کی تفصیل کی گئی ہے، اور مہاجرین کے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہین، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، قیمت للعہ، حجم ۴۲۹ صفحے

منیجر دارالمصنفین۔

اخبار علمیہ

سائنس کی مختصر ترین تاریخ،

ڈاکٹر ہنری کرو، (امریکہ) نے سائنس کی ایک نہایت مختصر اور دلچسپ تاریخ لکھی ہے، جو حسب ذیل ہے:

فیثاغورث نے "کل" کا نام "کائنات" (Cosmos) رکھا، اقلیدس نے جیومیٹری کی تشکیل کی، ارشمیدس (Archimedes) نے طبعیات کی۔

زینوفانیس (Xenophanes) نے افلاک کو ایک دیکھا، کوپرنکس (Copernicus) نے اس کا مرکز آفتاب کو ٹھہرایا،

اجسام طبعی کی حرکت میں گیلیلیو (Galileo) نے ایک قانون کا مشاہدہ کیا، اور اوسی سے نیوٹن نے جاذبیت عامہ (Universal gravitation) کا اصول مرتب کیا۔

دیمقراطیس (Democritus) نے ترکیب مادہ کے ذروی نظریہ (atomic Theory) کی ابتدا کی، ڈالٹن نے اس نظریہ کو مستقل و مستحکم کردیا،

انیسویں صدی میں ڈارون (Darwin) اور لامارک (Lamarck) نے ارتقائے عضوی کے مسئلہ کو باقاعدہ شکل میں پیش کیا،

ٹیکہ کے ذریعہ سے امراض سے محفوظ رکھنے کا طریقہ جینر (Jenner) اور پاسچر (Pasteur) نے دریافت کیا،

اور سنٹڈ (Oersted) اور فیراڈے (Faraday) نے برقی مقناطیسیت کا نظریہ دریافت کیا، میکسول (Maxwell) اور ہرٹز (Hertz) نے اور ترقی دی

بکیرل (Becquerel) کریز (Curies) اور ٹامسن (Thomson) کی کوششون سے نازک ذرات اور برقیہ (Fragile atoms & electrons) کا مشاہدہ کیا گیا،

آئنسٹائن (Einstein) کے نظریہ نسبیت سے سائنس کے ایک جدید باب کا افتتاح کیا ہے

جمہوریۂ ترکی مین بچّون کی نگہداشت

رسالہ مسلم ورلڈ (اکتوبر ۱۹۳۳ء) مین استنبول کے روزنامہ جمہوریہ (۱۰ جنوری ۱۹۳۳ء) کا حسب ذیل اقتباس شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ دس سال کے عرصہ مین انجمن تحفظ اطفال ترکی نے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے زیر نگرانی کن طریقون سے ملک کے (۴۸۰) مرکزون مین ترکی بچّون کی دیکھ بھال کی ہے:-

اس انجمن نے (۱۱۸۰۳) بچّون کو اپنی نگرانی مین لیا ہی، (۵۲۴۷۵) بچّون کیلئے دودھ کا انتظام کیا ہے، (۱۷۴۱۴۹۱) بچّون کو جوتے تقسیم کئے ہین، (۷۳۰۵) بچّون کو ٹوپیان خریدی ہین، اور (۱۴۳۰۳) بچّون کیلئے مدرسہ کی ضروریات کا سامان فراہم کیا ہے (۱۴۹۱۲۷) بچّون کا علاج ہوا ہے، (۱۰۰۷۱) بچّون کو مالی مدد دی گئی ہے، (۳۴۵۰۳) بچّون کو طبّی غسل دیا گیا ہے، (۷۶۳) بچّون کا ختنہ کیا گیا ہے، (۱۵۱۲) بچّون کی ولادت کے وقت دائیان موجود رکھی گئی ہین، (۵۴۵۷) بچّون کو مدرسون اور دوسرے ادارون مین داخل کیا گیا ہے، (۵۲۶۲۲) بچّون کو دوسرے مختلف طریقون سے مدد دی گئی ہے، بچّون کی مجموعی تعداد جنھون نے اس انجمن کے ذریعہ سے کسی طریقہ پر مدد پائی ہے (۶۰۰۵۸۰) ہے۔

قسطنطنیہ مین ابتدائی تعلیم کی ترقی

مسلم ورلڈ قسطنطنیہ مین ابتدائی تعلیم کے متعلق بھی جمہوریہ ۲ جنوری ۱۹۳۳ء کا حسب ذیل اقتباس نقل کرتا ہے

"قسطنطنیہ مین ابتدائی تعلیم کا نصاب پوری کامیابی کے ساتھ جاری ہے، جہان تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے، قسطنطنیہ اس معیار تک پہنچ چکا ہے، جو تمام دوسرے شہرون کے لئے بھی ہونا چاہئے، پہلے ابتدائی مدارس مین بچّون کی تعداد صرف تیس ہزار تھی، لیکن اب سخت کوششون کے باعث صرف ترکی

مدارس مین یہ تعداد اٹھاؤن ہزار ہو گئی ہے اگر اس تعداد مین اُن بچّون کا شمار بھی کر لیا جائے جو غیر ملکی مدارس مین تعلیم پا رہے ہین، تو اندازہ یہ ہے کہ ابتدائی مدارس کے طلبہ کی تعداد شہر قسطنطنیہ کی آبادی کی دس فیصدی ہو جائیگی، دستوری حکومت کے زمانہ مین ابتدائی مدارس کیلئے صرف پانچ عمارتین بنائی گئی تھین، لیکن جمہوری حکومت کے دور مین ایسی ۹۵ عمارتین تعمیر ہو گئی ہین، اور اب یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ بہت سے غریب بچے صبح سے دوپہر تک یا دوپہر سے شام تک مدرسون مین پڑھتے ہین، اور باقی اوقات مین اپنی معاش حاصل کرنے کیلئے اخبارات فروخت کرتے ہین جن بچّون کے لئے کوئی ٹھکانا نہین ہے، اُن کے لئے غلطہ مین میونسپلٹی کی طرف سے ایک جائے قیام کا انتظام کیا جائے گا، اور چند سال کے اندر قسطنطنیہ کے اُن تمام بچّون کو جنکی عمرین ابتدائی مدارس مین تعلیم پانیکی ہین، اور جو صبح سے شام تک دوکانون مین اپنا وقت صرف کرتے ہین، پولیس کے ذریعہ سے مدرسون مین جانے کیلئے مجبور کیا جائے گا،

قدیم مطبوعات کی قدردانی

اسٹیٹسمن مورخہ ۲۹ اکتوبر سنہ ۳۳ء مین "سونے سے تولی جانے والی کتابین" کے عنوان سے یورپ و امریکہ مین قدیم مطبوعہ کتابون کی قدردانی کے دلچسپ حالات شائع ہوئے ہین، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ان مادہ پرست ممالک مین بھی سب سے قیمتی کتابین آسمانی کتابین ہی سمجھی جاتی ہین، اور اون کے بعد انگریزی ادب کے ممتاز شاعر شکسپیر کی تصنیفات آتی ہین، چنانچہ اس وقت تک مطبوعہ کتابون مین سب سے قیمتی کتاب انجیل ہی کا ایک نسخہ ہے، جسے گوٹن برگ نے شائع کیا تھا، یہ نسخہ آخری مرتبہ (۲۱۲۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا ہے، اس کے بعد قیمت کے لحاظ سے دوسرا نمبر شکسپیر کی ایک نظم "وینس اینڈ ڈونیس" (VENUS AND ADONIS) کا ہے، جو (۱۵۱۰۰) پونڈ مین فروخت ہوئی تھی، اور ابھی حال مین اسی شکسپیر ہی کے ڈرامون کا ایک نہایت قدیم نسخہ اپنی قیمت کے لحاظ سے دنیا کی مطبوعہ کتابون مین تیسرے نمبر پر آیا ہے، یہ نسخہ سنہ ۱۶۲۳ء کا چھپا ہوا ہے، اشاعت کے وقت اس کی قیمت محض ایک پونڈ تھی، مگر آج (۱۴۵۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا ہے، یہ نسخہ لارڈ روز بری کے کتب خانہ مین

محفوظ تھا، اور یہان سے اب امریکہ لے جایا گیا، اور اول الذکر دونون کتابون کے خریدار بھی امریکی ہی ہین

گوٹن برگ کی شائع کردہ ایک دوسری انجیل بھی ہو، جو تین جلدون مین ہے، اور ان کی مجموعی قیمت (۱۱۴۴۷) پونڈ مل چکی ہو، ان جلدون کے متعلق دعوی کیا جاتا ہو کہ یہ سب سے پہلی کتاب ہے، جو ٹائپ مین شائع ہوئی ہے، اس کا زمانہ طباعت آج سے (۴۷۰) سال پہلے ہو، اسکے ۴۲ مکمل نسخے اسوقت تک دنیا مین معلوم ہو سکے ہین، اسی طرح انجیل کا ایک دوسرا نسخہ جو پہلے کارڈینل منیر لرن کے پاس تھا (۸۷۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا، پھر اسکی (۱۲۰۰۰) پونڈ قیمت ملی

اہل یورپ مطبوعہ کتابون کے مصنفون کی دستی تحریرون کی بھی اوسی طرح قدردانی کرتے ہین انگریزی ادبیات کی شہرۂ آفاق نظم "الائیس اِن ونڈرلینڈ" (ALICE IN WONDERLAND) کا وہ قلمی مسودہ جو شاعر کے ہاتھ کا ہو، (۱۵۴۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا، اور یہان تک کہ ڈاکٹر جانسن کے زبان انگریزی کے اوس لغت کے پروفون کی قیمت بھی ۲۲۵۰ پونڈ ملی، جو ۱۷۵۵ء مین شائع ہوا تھا، ان پروفون مین ڈاکٹر جانسن کے ہاتھ کی بہت سی ایسی اصلاحین درج ہین، جو شائع شدہ نسخہ مین درج نہ ہو سکین، نیز ان مین مصنف کے ہاتھ کے بہت سے اضافے بھی ہین، یہ پروف مکمل تین جلدون مین سمائے ہین لیکن ان مین کتاب کا مکمل نسخہ موجود نہین ہے،

موسم کا اثر نشو ونما پر

ڈاکٹر ٹرنر (TURNER) نگران محکمہ حفظان صحت مساچیسٹس (MASSACHUSETTS) (امریکہ) نے اپنے طویل تجربون کے بعد بچون کی نشو ونما کے متعلق ذیل کا بیان شائع کیا ہو:-

تندرست بچون کے جسم کے وزن بڑھنے کی رفتار اپریل، مئی اور جون کے مہینون مین سست پڑجاتی ہے، پھر ابتدا موسم سرما سے وزن کے بڑھنے مین تیزی شروع ہوتی ہو، یہانتک کہ موسم سرما اور خزان کے مہینون مین یہ پوری تیزی سے بڑھتا ہوا او برخلاف اس کے بچون کا قد زیادہ تیزی سے اونھین مہینون مین بڑھتا ہو جنمین وزن کی زیادتی سست رفتاری پر ہوتی ہو لیکن یہ تعجب کے ساتھ سنا جائے گا کہ یہ دنیا کے شمالی نصف کرہ کے بچون کی نشو ونما کے حالات ہین جنوبی نصف کرہ کے بچون کے وزن اور قد کے تیزی او رسستی کے ساتھ بڑھنے کا موسم شمالی نصف کرہ کے اس موسم کے بالکل برعکس ہوتا ہو،

"ع ز"

ادبیات

خونِ جگر

از حضرت جگر مرادآبادی،

سنتا ہون کہ ہر حال مین وہ دل کے قرین ہے
جس حال مین ہون اب مجھے افسوس نہین ہے؛

عالم ہے کچھ ایسا کہ زمان ہے نہ زمین ہے،
مین ہون، نہ در یار نہ سجدہ، نہ جبین ہے؛

جس دل مین تری یاد ہے تو صدر نشین ہے،
وہ دل بھی حسین اوس کی محبت بھی حسین ہے؛

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہین ہے،
سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جو ننگِ جبین ہے؛

جس رنگ مین دیکھو اوسے وہ پردہ نشین ہے
اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہین ہے

ہر ایک مکان مین کوئی اس طرح مکین ہے،
پوچھو تو کہین بھی نہین، دیکھو تو یہین ہے؛

نزدیک ہو یا دور، جہان تم ہو وہین ہے؛
عاشق وہی عاشق ہے جو مجبور نہین ہے؛

وہ آئے ہین اے دل ترے کہنے کا یقین ہے،
لیکن مین کرون کیا مجھے فرصت ہی نہین ہے؛

قطعاتِ امجد

از حکیم الشعرا، حضرت امجد، حیدرآبادی،

آیا ہے، زمانہ، ترقی،
گندہ بندہ، خدا ہوا ہے،

ایمان سے دل کو صاف کرکے
امجد، صوفی بنا ہوا ہے،

جہان کو ناز ہے ہستی پر اپنی، مین اپنی نیستی پر مر رہا ہون،

ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری، تنزل مین ترقی کر رہا ہون،

ہے اور یقینی ہے، یہی سب کی صدا ہے، لیکن نہین معلوم کہ وہ کون ہے کیا ہے،

کیا کوئی کہے اوس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے،

ہر گھڑی عمر کی کیا جلد گذر جاتی ہے، جس طرح کوئی اُڑا جاتا ہو طیارے مین

جان اور جسم کی آغوش مین کیا حیرت ہے زندگی جھولتی ہے موت کے گہوارے مین

رنگِ حسرت،

از جناب جلیل قدوائی ایم اے علی گڈھ،

میرے نالون پہ اوس نے آہ نہ کی، آہ کیا مجھ پہ اک نگاہ نہ کی،

مین نے کس شوق سے اوسے دیکھا اوس نے میری طرف نگاہ نہ کی،

غلط انداز بھی نگہ مجھ پر، تو نے اے شوخ کم نگاہ نہ کی،

میری آہون نے مجھ کو خاک کیا، اوس ستمگر کے دل مین راہ نہ کی،

ہم نے ہنس ہنس کے عشق مین کاٹی جان پر بھی بنی تو آہ نہ کی،

سچ ہے یہ آپ نے مجھے چاہا مین نے ہی آپ سے نباہ نہ کی،

تجھ کو دل دے کے وہ سبق سیکھا، بھول کر پھر کسی سے چاہ نہ کی،

ہم اسیرون نے جب قفس چھوڑا مڑ کے پھر اس طرف نگاہ نہ کی،

زندگی بھر ہم اس روش سے چلے کہ تمیزِ گدا و شاہ نہ کی،

دولتِ عشق پا کے مین نے جلیل

ہوسِ مال و حبِ جاہ نہ کی،

مطبوعات جدیدہ

جدید اردو شاعری از پروفیسر عبد القادر سروری ایم اے، کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن حجم ۴۲۷ صفحے مجلد

تقطیع چھوٹی، قیمت ۳ روپے، ناشر انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن،

ادھر چند سال میں اردو ادب اور شعر و شاعری کی تاریخ و تبصرہ پر بعض اچھی اچھی کتابیں نکلی ہیں، اون میں ایک اور اضافہ اس زیر تبصرہ کتاب "جدید اردو شاعری" سے ہوا ہے، جو غور و فکر اور اصابت رائے کے ساتھ لکھی گئی ہے، کتاب کا مبحث اس کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اس میں دور جدید کی شاعری پر بامعان نظر بحث کی ہے، کتاب چند حصوں اور ہر حصہ چند بابوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں شعر کی ماہیت، تعریف، شاعری کی قسمیں، اور پھر اردو شاعری کی صنفیں بیان کی گئی ہیں، دوسرا حصہ گویا اصل موضوع پر مقدمۂ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں مصنف نے جدید اردو شاعری کا آغاز انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد سے دکھایا ہے، اور اوسے "دور انقلاب" سے تعبیر کرکے بتایا ہے کہ اس سے پہلے اردو شاعری دور انحطاط میں تھی، پھر اس کے تنزل کے اسباب بتائے ہیں، اسکے بعد انقلاب کے اثرات دکھا کر آزاد اور حالی کو جدید اردو شاعری کا معمار بتایا ہے، اور جدید اردو شاعری کی پیدایش کا زمانہ ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۰ء تک میں متعین کیا ہے، اس کے بعد کتاب کا تیسرا حصہ آتا ہے، اور یہین سے اصل موضوع بحث چھڑتا ہے، مصنف نے اس کو "عصر اصلاح" سے تعبیر کیا ہے، اس میں آزاد، حالی، نذیر احمد، شرر، شبلی، اور کیفی حیدرآبادی کو جگہ دی ہے، ان میں سے ہر ایک کے حالات زندگی اس اسلوب میں لکھے ہیں، جس سے ان کی شاعری کی تدریجی ترقی نمایان ہو، اور پھر ہر ایک کی شاعری کے کمالات و خدمات پر محققانہ تبصرہ کرکے باہم ایک دوسرے میں موازنہ کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان معاصرین پر یکجا قلم اوٹھانے کے باوجود ذاتی رجحانات و عصبیت سے دامن بچا کر جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کی کوشش رکھنا مصنف کا لائق ستایش کارنامہ ہے، اس کے بعد درمیانی زمانہ

جسمین اسماعیل، اکبر، شوق قدوائی، اور نظم طباطبائی وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، پھر عصر حاضر آتا ہے، جسمین اس عہد کے ممتاز شعراء اقبال، سیماب، تسرور جہان آبادی، حسرت، فانی، چکبست، عظمت، جوش، اصغر، امجد، جگر، ریاض، صفی، جلیل، عزیز، اور رسوا وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، اور ادبی اسلوب و انداز میں ان کی شاعری پر ناقدانہ تبصرہ ہے، آخری باب شعرائے مستقبل کے عنوان سے ہے، جسمین ہمارے نوجوان شعراسے اردو کو روشناس کیا گیا ہے،

مصنف کی رایون اور تنقیدون سے پون تمام و کمال اتفاق کرنا تو ممکن نہین، لیکن کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہو کہ یہ رائین کامل غور و فکر اور کلام کے صحیح مطالعہ کے بعد قائم کی گئی ہین، البتہ حیدرآباد کے شعراے اردو کے متعلق مصنف کی رائین نشانہ اصول جرح و تعدیل کی حیثیت سے بھی مستند نہ سمجھی جائین، تاہم ان کے تذکرون مین بھی ایک حد تک اظہار حق کی کوشش کی گئی ہے، لیکن معلوم نہین، مصنف نے ہمارے شہر کے زندہ شاعر اقبال سہیل کو، سہیل مرحوم کے لقب سے کیون یاد کیا ہو، شاید یہ "تابش سہیل" کی آیندہ درخشانی کا تفاوگلاپش خیمہ ہو، جو کچھ دنون مین پریس سے نکلنے والی ہے، اور اس کی مستحق تھی کہ اس کتاب کے باب عصر حاضر مین پہلے سے موجود ہوتی،

انقلاب دہلی، مرتبہ جناب نظامی بدایونی، نظامی پریس بدایون، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۴۰ صفحے، سرورق خوشنما، قیمت ۱۲ر،

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد ہندوستان کو جن سیاسی حالات سے دوچار ہونا پڑا، ادھین دیکھتے ہوئے اس عہد کے اردو شعراء کے کلام مین دلی اور اسلامی ہند کی بربادی پر جو کچھ بھی مل جاتا ہو، وہ بساغنیمت ہو، کیونکہ مختلف سیاسی ماحول کی بنا پر اوس عہد کے شعرائے اردو نے اگر اپنے مجروح جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے کی جراٴت بھی کی تو اوسی گل و بلبل اور روداد چمن کی داستان کا پردہ قائم رکھ کر، تاہم یہ بھی صحیح نہین کہ اردو شاعری دلی اور اسلامی ہند کی بربادی کے مرثیون سے کلیتہً خالی ہو، ہمین جناب نظامی بدایونی کا جنھون نے دلی کی بربادی کے ستائے ہوؤن کی پرنم آنکھین بھی دیکھی ہون گی، شکر گذار ہونا چاہئے کہ اوھون نے اس جانب توجہ کی، اور دلی کی بربادی کے اردو مرثیے ایک رسالہ کی شکل مین جمع کر دیے، جو "فریاد دہلی" معروف بہ "انقلاب دہلی" کے نام سے موسوم ہے، اس مین تقریباً ۵۰، ۶۰ اردو شعراء کے مرثیے ہین، رسالہ کی ترتیب شعراء کے نامون کے حروف تہجی پر ہے، ایک ایک دو دو سطرون مین شاعرون کا مختصر تعارف بھی درج ہو، ابتدا مین

خواجہ حسن نظامی صاحب "موٗلف غدر دہلی کے افسانے" نے ایک دیباچہ لکھا ہے،

تہذیبِ عمل، از جناب ملک محمد باقر نسیم رضوانی متعلم، ایم اے ناشر مہتمم دفتر تذکرہ گجرات پرنٹنگ پریس گجرات پنجاب، حجم ۹۰ صفحے، قیمت ۸ر

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی پنجاب کے ایک لائق اور ہونہار نوجوان ہیں اور طالب علمی سے مسائل حیات و دنیا پر غور و فکر کی نظر رکھنے کی عادت ڈالی ہے زیر تبصرہ رسالہ تہذیب عمل ان کی تعلیمی و علمی زندگی کا پہلا ثمرہ ہے، اسمین اونھون نے اپنے ہمعمر نوجوانون کو اپنی عملی زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح اصول زندگی اور اچھے عادات اختیار کرنے کیلئے راہ ہدایت دکھائی ہے، رسالہ مین کوشش کی گئی ہے کہ ایک ایک مسئلہ یا اصول زندگی کو ایک ایک صفحہ مین پیش کیا جائے، اور جہان ضرورت ہوئی ہے، اوسی سابق موضوع کو نئے صفحہ پر نئے عنوان سے جگہ دی گئی ہے، تقریباً ۸۰ عنوانات ہین، رسالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے دلچسپ اور ہمارے نوجوان طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے،

فرانسیسی افسانے، از جناب عزیز احمد صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۸ صفحے قیمت ۱۲ر

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد کی جانب سے جناب عبد القادر صاحب سروری کی ادارت مین دنیا کے شاہکار افسانے" کی اشاعت کا جو سلسلہ جاری ہے، اوس کا چوتھا حصہ فرانسیسی افسانے کے نام سے شائع ہوا ہے، اس مین ۹، ۱۰ مختصر فرانسیسی افسانون کا ترجمہ ہے، دیباچہ مین فرانسیسی ادب پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور ہر افسانے کے ساتھ اوس کے فرانسیسی افسانہ نگار کی تصویر اور اوس کا مختصر تعارف درج ہے،

تاجِ آفرینش، از جناب عبد الحمید صاحب نعمانی حجم ۷۰ صفحے قیمت ۱۲ر پتہ اجمل بکڈپو پرنس بلڈنگ بمبئی نمبر ۹،

"تاجِ آفرینش" مصر کی ایک مصلح خاتون ملک خانم عرف باحثۃ البادیہ کے چند مضامین کا اردو ترجمہ ہے، مضامین مین پردہ، تعدد ازدواج، معاشرت زن و شو، اور عورتون کی سسرال کی زندگی وغیرہ کے مباحث ہین، مضامین خصوصاً عورتون کے پڑھنے کے لائق ہین، ترجمہ صاف، سلیس اور روان ہے،

پردہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے، از مولوی سید محمد ادریس صاحب بھسایدار مہتمم تاج گنج آگرہ، قیمت ۱ر

اس رسالہ میں مکالمہ کے طور پر اسلامی پردہ، اور عورتوں کی اسلامی معاشرت کو بیان کیا گیا ہے،

گلدستۂ صد احادیث نبوی مرتبہ مولٰنا احمد علی انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور، خوبصورت مجلد چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحے،

لاہور کی انجمن خدام الدین مفید دینی خدمت انجام دے رہی ہے، اس کی جانب سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام اور اصلاح مسلمین کیلئے رسالے شائع ہوتے رہتے ہیں، جو مفت یا برائے نام قیمت پر ملتے ہیں، زیر نظر رسالہ گلدستہ صد احادیث نبوی میں صحاح سے سو مفید حدیثیں معہ ترجمہ کے ایک خوبصورت رسالہ کی شکل میں چھاپی گئی ہیں، یہ رسالہ بلا جلد کے منت اور مجلد ۲ کے ٹکٹ بھیجکر انجمن سے مل سکتا ہے،

مشکوٰۃ الصلوٰت مؤلفہ مولوی محمد الیاس صاحب برنی، استاذ معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

حجم ۱۴۲ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ۸، مؤلف سے بیت السلام حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے،

"مشکوٰۃ الصلوٰۃ" کا تذکرہ چند سال پہلے ان صفحات میں آچکا ہے، اس میں درود و سلام کی، جو میں ورد و وظیفہ کیلئے مرتب کی گئی ہیں، رسالہ مقبول ہوا، اب اس کا طبع ثانی دوبارہ شائع ہوا ہے،

اسلامی عقائد از مولٰنا اسلم جیراجپوری شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی قیمت ۱ر

بچوں کیلئے دینیات کی تیسری کتاب کے عنوان سے یہ رسالہ لکھا گیا ہے، رسالہ کا نام "عقائد اسلامی" ہے لیکن مباحث میں انبیائے کرام کے تاریخی حالات کا حصہ زیادہ ہے،

کتبخانہ بانکی پور کی نئی فہرستیں مشرقی کتبخانہ بانکی پور کی ترتیب فہرست کا جو کام کئی سال سے جاری تھا افسوس ہے کہ وہ حکومت بہار کی مالی دشواریوں کے سبب سے بند ہو گیا تھا، تاہم فہرست مذکور کی جو جلدیں مطبع میں زیر طبع تھیں، ان کی چھپائی جاری ہے، چنانچہ اوس کی حسب ذیل جلدیں نئی چھپ کر شائع ہوئی ہیں،

۱- جلد انیس ۱۹ حصہ اول عربی مخطوطات متعلقہ اصول فقہ و فقہ، مرتبہ مولوی عبد الحمید صاحب مطبوعہ بہار گورنمنٹ پریس پٹنہ ۱۹۳۱ء

۲- جلد اٹھارہ حصہ دوم عربی مخطوطات متعلقہ علوم القرآن، مرتبہ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۲ء

۳- ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسی جلد اول مرتبہ خان بہادر مولوی عبد المقتدر صاحب مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۲ء

۴- ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسی، جلد دوم، مرتبہ خان بہادر موصوف مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۳ء

جلد ۳۲	ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء	عدد ۶

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۴۰۲-۴۰۴
سفر افغانستان	"	۴۰۵-۴۲۴
رہبانیت اور اسلام	مولٰنا عبد السلام ندوی ،	۴۲۵-۴۴۰
اغلبیوں کا عدالتی نظام ،	سید ریاست علی ، ندوی ،	۴۴۱-۴۵۳
نفسیات حکیم ناصر خسرو ،	پروفیسر معتقد ولی الرحمٰن صاحب ایم اے استاذ نفسیات جامعہ عثمانیہ	۴۵۴-۴۶۱
چینی اسلامی لٹریچر	"ع ز"	۴۶۲-۴۶۷
طوفانوں کے اسباب اور موسم کے تغیرات	"	۴۶۸-۴۶۹
اخبار علمیہ ،	"	۴۷۰-۴۷۳
خطاب بہ ملت افغان ،	جناب محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ	۴۷۴-۴۷۶
مطبوعات جدیدہ ،	"ز"	۴۷۷-۴۸۰

شذرات

اس ماہ کے سلسلۂ مقالات میں "سفرِ افغانستان" کے عنوان سے پہلا مقالہ درج ہے، جسمیں اس سفر کے سرسری اور جزئی حالات کا بیان ہے، کہیں کہیں غیر اہم باتیں بھی آگئی ہیں، جسکا سبب یہ ہے کہ غیر ملک کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی، سیاح کو نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں، سفر کے سرسری واقعات کے ختم ہونے کے بعد اس ملک کے حالات پر ایک مفصل تبصرہ بھی حوالۂ قلم ہوگا، اسوقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس ملک کی اصلی خدمت یہ ہے کہ اسکو اُس امن وامان اور سکون کے حصول کا موقع دیا جائے جو اسکو میسر نہیں آتا، پھر اُسکو اسکی قبائلی زندگی سے نکال کر وسیع قومی و وطنی دائرہ میں آنے کی تلقین کیجائے، اور ملک میں صحیح تعلیم کی اشاعت عام کیجائے، اور وہاں کی مذہبی تعلیم میں نصاب وطریقۂ درس کی وہ اصلاح کیجائے، جس کی ضرورت آج تمام علمائے اسلام نے بالاتفاق تسلیم کرلی ہے،

افغانستان کے علمی وادبی حلقہ میں، روز افزوں ترقی کے آثار نمایاں ہیں، اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کی ضروری کتابوں کے ترجمے بھی ہورہے ہیں، اس سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کی الفاروق کا فارسی ترجمہ وہاں شائع ہوچکا ہے، اور اب خاکسار کی سیرت عائشہؓ کا ترجمہ کیا گیا ہے، ترجمہ مکمل ہوچکا ہے، اور اسوقت سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ کے مطالعہ میں ہے، موصوف صاحب سیف وقلم ہیں، میری نئی تصنیف خیام جو اس سفر میں میرے ساتھ تھی، جس ذوق وشوق سے انھوں نے لی، اس سے اُن کے ادبی وعلمی شغف کا پتہ چلتا تھا، امید ہے کہ یہ ترجمہ چند ماہ کے بعد وہاں کے حالات کے سکون کے بعد شاہ ظاہر خاں کے عہد میں طبع ہوکر شائع ہو، عجب نہیں کہ وہ افغان خواتین کی نئی راہِ زندگی میں نمونہ اور اسوہ کا کام دے،

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی مسرت افزا ہوگی کہ مکہ معظمہ کے چند ادبا نے ملکر یہ تہیہ کیا ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ عربی زبان میں کریں، شیخ رشدی الصالح ملحس اڈیٹر ام القرٰی اس تجویز کے محرک ہیں، اگر یہ ترجمے واقعًا

چھپ کر شائع ہو گئے تو امید ہے کہ دنیائے اسلام کے مرد و زن کے سامنے اسلام کے دونوں صنفوں کے بہترین نمونے آجائیں گے،

صوبہ کے بعض نوجوانوں نے صوبہ کے علمی و روحانی مرکز پھلواری میں جواب سلسلۂ آبادی میں صوبہ کے دار الحکومت پٹنہ سے ملحق ہو رہا ہے ایک مسلم اکاڈمی کا خواب دیکھا ہے، یہ مجلس گو شروع شروع کی ایک شخصی کوشش سے ہوئی، مگر اب چند سال سے یہ ایک جماعتی مجلس کے قالب میں ڈھل رہی ہے، مجلس کے مقاصد حسب ذیل ہیں، زبان اردو کی توسیع و ترویج، ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو حقیقی اسلامی روایات اور سچے کارناموں سے روشناس کرنا اسلام اور شاہان اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہوں، ان کو دور کرنا ٹکسٹ بک کمیٹی اور بورڈ آف اسٹڈیز کی منظور کردہ کتابوں کو مذہبی، تاریخی اور ادبی نقطہ نظر سے جانچنا، اردو اور انگریزی زبان کی تصانیف کا ایک کتبخانہ قائم کرنا خوشی کی بات ہے کہ سابق وزیر تعلیمات مرحوم سر فخر الدین کی طرح حال وزیر تعلیم مولوی سید محمد حسین صاحب بھی اس مجلس کی سرپرستی فرما رہے ہیں،

لاہور کے سیغہ مشرقیات کے اساتذہ تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ وہ ہمارے علمی و ادبی ذخیرہ میں ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے حکیم میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ شعرائے اردو (مجموعۂ نغز) بڑی محنت سے شائع کیا ہے، پروفیسر محمد اقبال نے اخبار الدولۃ السلجوقیۃ نام بنی سلجوق کی ایک عربی تاریخ تصحیح کرکے شائع کی ہے، اور عنقریب تاریخ الحکماء بیہقی (تتمۂ صوان الحکمۃ) پروفیسر محمد شفیع صاحب کی محنت و کوشش سے شائع ہونے والی ہے،

ابتک مسلمانان چین کے حالات میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت اسلام کے حصۂ چین کے سوا ہماری زبان میں کوئی کتاب موجود نہ تھی، حالانکہ چین کی اسلامی برادری کا علم ایک مدت سے ہم کو ہے، اب مسرت کی جگہ ہے کہ خود ایک چینی نوجوان اہل قلم نے جنکا اسلامی نام بدر الدین ہے، اور جو چھ سات سال سے ہندوستان میں تحصیل علم میں مصروف ہیں، اس کمی کو پورا کیا ہے، اور مسلمانان چین کے گذشتہ اور موجودہ حالات پر دو ڈھائی سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ کر ہمکو اشاعت کی غرض سے دی ہے، نوجوان موصوف کلکتہ سے پہلے دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں آئے، پھر انگریزی تعلیم کی غرض سے جامعہ ملیہ دہلی گئے، اور وہاں سے فراغت کرکے عربی ادب میں تکمیل و ترقی کی غرض سے پھر دار العلوم ندوہ میں مقیم ہیں، انھوں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ عربی میں مضمون لکھ لیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس کتاب کا عربی میں بھی خود ہی ترجمہ کریں،

لکھنؤ سے جو ماہوار اصلاحی و اخلاقی و مذہبی رسالہ **اصلاح** نام نکالا گیا تھا، بحمد اللہ کہ وہ چھ مہینوں سے ابتک نکل رہا ہے، اور اپنی بعض خصوصیات کے لیے پسند کیا جا رہا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ مسلمان اسکی طرف توجہ کریں، اور اپنی خریداری اور امداد سے اسکے نوجوان اڈیٹر کی حوصلہ افزائی فرمائیں، رسالہ کی قیمت صرف تین روپئے سالانہ ہے، اور پتہ ادارہ رسالہ اصلاح، باد شاہ باغ لکھنؤ ہے،

یورپ میں لندن اور لائیدن سے انگریزی، فرنچ اور جرمن میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے جو مسلسل اجزا سنہ ۱۹۱۳ء سے شائع ہو رہے ہیں، اور جو اب واؤ تک پہنچ چکے ہیں، اور جنمیں اسلام، اسلام کے عقائد، عبادات، فقہ، تاریخ اور مسلمان ملوک و سلاطین و حکما، و مصنفین، غرض اسلامی علوم و فنون و تاریخ کے جملہ مباحث ہوتے ہیں مصر کے چند ارباب علم کی کوشش سے اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء سے انکا عربی ترجمہ شروع ہوا ہے، محمد ثابت الفندی سند یافتہ فلسفہ، واحمد الشنشناوی سند یافتہ فلسفہ و تاریخ ابراہیم زکی خورشید سند یافتہ تاریخ، اور عبد الحمید یونس کے نام ترجمہ کی لوحِ اوّل پر ثبت ہیں، ابھی صرف اسکا پہلا جز شائع ہوا ہے، اور ہندوستان میں ابناء شرف الدین تاجرین کتب بھنڈی بازار بمبئی اسکے ایجنٹ ہیں، ہر دو ماہ میں اس کے چار چار جز (۴۸ صفحے) شائع ہوا کریں گے، اور ہر اشاعتِ دو ماہہ کی قیمت ۱۲؍ ہوگی، شائقینِ علم اس کے لئے ابناء شرف الدین کے پتہ سے درخواستیں بھیجکر اسکے خریدار بن سکتے ہیں، مصر میں اسکے دفتر کا پتہ شارع قصر النیل نمبر ۲۳ ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اکثر اجزا نظر سے گذرے ہیں، اور دار المصنفین انکا مسلسل خریدار ہے، یہ بات بے محابا کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے علوم و فنون و تاریخ پر یورپ کی تحقیقات جہانتک پہنچی ہے ان مباحث کا نچوڑ اور عطر ان اجزا میں کھینچکر رکھدیا گیا ہے لیکن جہانتک مذہبی علوم و مباحث کا تعلق ہے افسوس ہے کہ ان میں بےحد غلطیاں ہیں، خصوصًا اے جی وینسنک صاحب کی تحقیقات میں عصبیت اور دانستہ شرارتوں کا اظہار ہے، اور وہ اس انسائیکلوپیڈیا کے مؤلفین میں سے ایک ہیں، لیکن خوشی کی بات ہے کہ مصر کے اہل علم بھی انکی اس حیثیت سے اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ مصر کی شاہی لغوی مجلس میں انکے شریک کئے جانے پر اختلافات برپا ہیں، انسائیکلوپیڈیا کے عربی مترجمین بھی اس کتاب کی اس کمزوری سے آگاہ ہیں، اور اسی بنا پر وہ علماے ازہر اور دیگر مسلمان اہل علم سے قابلِ اعتراض مواقع پر حواشی لکھوا کر کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔

مقالات

سفر افغانستان

ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مدت سے آرزو تھی کہ کم از کم قریب ترین ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان ہی کو دیکھ لوں، ۱۹۲۷ء میں جمعیتہ العلماء پشاور کی شرکت کے زمانہ میں دو دفعہ درۂ خیبر کی سیاحت کی ایکدفعہ اس مختصر سفر کے رفیق مولوی ظفر علیخاں صاحب اور مولنا سید حسین احمد صاحب تھے، اور دوسری دفعہ مولنا محمد علی اور جناب شعیب صاحب قریشی، دونوں دفعہ لنڈی کوتل کے قلعہ سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا، پہلی دفعہ واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ شہر پشاور کا پھاٹک بند ہوگیا، اور رات جمرود کی سرائے میں قرونِ وسطیٰ کے مسافروں کیطرح بسر ہوئی، اور دوسری دفعہ لنڈی کوتل کے مشہور شنواری رئیس کے یہاں دن بھر قیام رہا،

اس اچٹتے ہوئے جلوۂ دیدار نے آتشِ شوق کو تیز تر کر دیا تھا، پچھلے ہی موسم گرما میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے "قابلِ شکست عہد" ہوا تھا کہ آیندہ سال افغانستان کی سیر کیجائے، ابھی اس گرمی پر پوری سردی آنے بھی نہ پائی تھی کہ خود "کوہِ طور" سے طلبِ دیدار کی صدا بلند ہوئی،

ڈاکٹر سر اقبال کا نوازش نامہ آیا کہ حکومتِ افغانستان نے مجھے، اور سر راس مسعود، اور آپ کو اپنے ہاں کے بعض علمی و تعلیمی مسائل میں مشورہ کی غرض سے بلانا چاہا ہے، کیا آپ چلنے کو تیار ہیں، میں نے جواب دیا کہ اس ملک کی جو خدمت مجھ سے بن آئے، میں اس کے لیے تیار ہوں، اس کے بعد، ر اکتوبر کو ہز اکسلنسی صلاح الدین سلجوقی جنرل قونسل افغانستان کا خط آیا، جسمیں اسی مطلب کا اظہار تھا، میں نے ان کو بھی اپنی آمادگی کی اطلاع دی، جنرل قونسل صاحب کی اصل تحریک تو یہ تھی کہ ہم لوگ ۱۲ راکتوبر کے جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر

جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا، اس لیے تاریخ کی تعیین کا مسئلہ پاسپورٹ کے ملنے کے بعد رفقار کے مشورہ پر موقوف رہا، توقع تھی کہ ۱۹۔ اکتوبر کو پاسپورٹ مجھے مل جائیگا، اور ادھر سر راس مسعود صاحب کو یونیورسٹی کی مشغولیتون کے سبب سے جلد واپسی کی عجلت تھی، ۱۷ تک ان صاحبوں کو پاسپورٹ مل گئے، اور ۲۰ کو لاہور سے اور ۲۱ کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بنگیا، اور وہ اسی کے مطابق روانہ ہوگئے، میری نسبت دفتری تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور بالآخرہ اکو نینی تال میں اس پر دستخط ہوئے، اور ۲۱ کو وہ اعظم گڈہ پہنچا، میں لکھنؤ چلا آیا تھا، دوسرے دن ایک آدمی کی معرفت پاسپورٹ لکھنؤ بھیجا گیا، جہاں وہ ۲۳ کی صبح کو پہنچا، اور میں اسی روز کے میل سے ۲ بجے پشاور روانہ ہوگیا، پشاور میں برادران عزیز حکیم عبد العزیز ندوی، اور حکیم عبد الجلیل ندوی، اور افغان مامور ویزہ (افغان پاسپورٹ آفیسر) عبد الغفور خانصاحب کو تار پہلے ہی دیدیا تھا، ۲۴ کی رات کو ۸ بجے کے قریب گاڑی پشاور سے ایک اسٹیشن پہلے نوشہرہ پہنچی، یہاں غیر متوقع طور پر حکیم عبد العزیز صاحب ندوی، حکیم عبد الجلیل صاحب ندوی، عبد الرحمان ندوی تاجر پشاور، پہلے سے آکر موجود تھے، ان کی ملاقات سے بیحد خوشی ہوئی، ایک گھنٹہ کے بعد گاڑی پشاور پہنچی، گوکہ میری آمد کی اطلاع عام طور سے شائع نہیں ہوئی تھی، تاہم اسٹیشن پر نمایندگان حکومت افغان، متعدد احباب جمعیۃ العلماے سرحد اور بھارت سبھا کے چند ارکان موجود تھے،

شب بھر حکیم عبد العزیز صاحب کے نوتعمیر کاشانہ "امان منزل" میں بسر کی صبح کو شہر کے بعض علما، اور بعض قومی کارکنوں نے ملاقات کی عزت بخشی، پنجاب کی طرح صوبۂ سرحد میں بھی، شریعت کے مقابلہ میں رسم و رواج کو قانون کی حیثیت حاصل ہے، جب سے صوبہ سرحد مین کونسل کا قیام ہوا ہے بعض پرجوش مسلمان کارکن اس کے لیے کوشان ہیں، کہ رسم و رواج کو توڑ کر شرعی احکام کی پابندی کا قانون منظور کیا جائے، ان صاحبون نے مجھ سے خواہش کی کہ افغانستان سے پشاور کو جب واپسی ہو تو اس اثنا میں یہاں مجلس شریعت کا اجلاس ہو اور میں اسمیں شرکت کردوں، چونکہ یہ خیال نہ تھا کہ واپسی کا راستہ بدلیگا، اس لئے میں نے قبول کرلیا،

یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ پاسپورٹ ملنے کے بعد بھی، ابھی سفر کی سرکاری دقتیں ختم نہیں ہوئی ہیں، ابھی افغان

گورنمنٹ کے پاسپورٹ افسر کا ویزہ، اور صوبہ سرحد کے چیف سکریٹری کے دستخط باقی ہیں، جن سے سرحد کے عبور کرنے کی اجازت حاصل ہوگی، یہ کام بھی ختم ہوا، ۲۵ کی دوپہر کو برادرم حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، جس میں شہر کے بعض علماء اور معززین شریک تھے، کھانے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی، یہیں افغانستان لے جانے والا موٹر آگیا، یہاں سے حکیم عبدالعزیز صاحب کے افغانی دواخانہ گیا، اور وہاں سے دوستوں سے رخصت ہو کر پشاور سے نکلا، غالباً ۳ بجے سہ پہر کا وقت تھا جب موٹر پشاور کے حدود سے باہر روانہ ہوا، میں نے سمجھا کہ اب عراق سفر کا خاتمہ ہوا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد درۂ خیبر کے دہانہ پر جمرود کی منزل آگئی، موٹر ایک دفتر کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا، یہاں برطانی محکمۂ آمد و رفت نے ہر شخص سے ایک ایک روپیہ اور موٹر سے چار روپیے وصول کئے، اور رسید دیدی گئی، موٹر میں میں تنہا تھا، ساتھ ایک میرا ملازم اور دوسرا شوفر تھا،

اب ہم درۂ خیبر کے اندر داخل ہوگئے، دونوں طرف پہاڑیوں کا طویل سلسلہ اور بیچ میں درہ کا پُرپیچ راستہ تھا، حکومت انگریزی نے اپنے حدود تک سڑک نہایت عمدہ بنوائی ہے، درہ کا سب سے تنگ مقام مجھے وہ نظر آیا جہاں علی مسجد نام چھوٹی سی لیکن نہایت تاریخی مسجد بنی ہے، مسجد کے پاس چائے اور سبزی اور پھلوں کی چند دکانیں ہیں، اس مسجد تک ۱۹۲۲ء میں دو دفعہ پہلے بھی آچکا تھا، اور یہاں ایک نماز ادا کرنے کا شرف بھی حاصل ہوچکا تھا، اس وقت پھر اس مسجد پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی، پہلے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان یہی مسجد حدِ فاصل تھی، لیکن اب انگریزوں نے اس سے بھی آگے بڑھکر اپنی سرحد قائم کی ہے،

اس درہ کے اوپر اسی کے ساتھ ساتھ خیبر ریلوے کی لائن بچھی ہے جس کی تعمیر انگریزی انجینرنگ کی حیرت انگیز کرامت ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر انگریزی سیاست کی سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ ریلوے تقریباً ۱۵ میل تک اس طرح پھیلی ہے کہ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر، اور کبھی وادی کے دامن میں، اور کبھی کسی پہاڑی کے سینہ کو بیچ سے چیرتی ہوئی نظر آتی ہے

بہرحال ان ہیبتناک مناظر سے گذرتے ہوئے ۴ بجے کے قریب لنڈی کوتل کی وسیع وادی میں قلعہ کے سامنے جا کر موٹر پھر رکا، میدان میں سپاہی ورزشی کھیلوں میں مصروف تھے، یہاں شوفر اور میرا ملازم قلعہ کے اندر گئے

اور جمرود کی رسید اور پاسپورٹ جاکر دکھائے، جس کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت ملی، اور موٹر نے پھر آگے کا رخ کیا، کچھ دیر کے بعد انگریزی سڑک کی صنعتکاری ختم ہوئی، اور درہ کا فطری راستہ نمودار ہوا، اور یہیں انگریزی سرحد کا آخری دفتر قائم تھا، ایک پہاڑی کے اوپر بنگلہ میں درۂ خیبر ایجنسی کا دفتر تھا، شوفر اور ملازم نے جاکر یہاں پھر پاسپورٹ دکھائے، اور برطانی پاسپورٹ افیسر نے EXAMINED کی مہر ثبت کی،

یہاں سے نکل کر چند قدم آگے بڑھے تھے کہ افغانستان و ہندوستان کی موجودہ سرحد کا بورڈ نظر آیا، جس پر انگریزی میں یہ لکھا تھا، کہ یہاں سے ہندوستان کی سرحد ہے، اور کسی کو بغیر صحیح پاسپورٹ کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں، یہاں ریلوے لائنوں کے بیچ سے جانے والے راستہ پر جس طرح ریل آتے وقت پھاٹک یا کسی اور چیز سے راستہ بند کردیا جاتا ہے، اسی طرح ایک لمبے ستون کو آڑا کرکے راستہ روک دیا گیا تھا، یہاں دونوں طرف کے سنتری کھڑے رہتے ہیں، اور ادھر کے جانے والے، اور ادھر کے اور ادھر سے آنے والے ادھر کے سرحدوار کے سپاہیوں کی اجازت سے اس روک کو اٹھا دیتے ہیں، اور مسافر پار ہو جاتے ہیں، چنانچہ حسب دستور سنتری نے برطانی سرحدداری کے سپاہی سے جو پچھلے بنگلہ کے پاس کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارہ سے دریافت کرکے روک کو دور کیا اور موٹر دفعۃً غلام ملک سے نکل کر آزاد ملک میں داخل ہوگیا،

یہی مقام تورخم کہلاتا ہے، اور یہ اب افغانی و ہندی سرحد ہے، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ درہ کا جتنا حصہ زیادہ پر پیچ اور مشکل ہے، جنگی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر برطانی حکومت نے اپنے قبضہ کو وہاں تک بڑھا دیا ہے، اب اسکے بعد درہ نسبۃً پھیلنا شروع ہوتا ہے، راستہ بالکل فطری حالت میں ہے، البتہ کہیں کہیں پتھروں کو بیچ سے ہٹا دیا گیا ہے، اور نشیب و فراز کو برابر کردیا گیا ہے، اس سرحد سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کے اوپر افغان حکومت کی پہلی چوکی تورخم نامی واقع ہے، اس کے نیچے پانی کا چشمہ سا بہتا ہے، اور ایک مختصر سے باغ یا چند درختوں کے جھنڈ کے سایہ میں خالی زمین مسجد کا کام دیتی ہے، یہاں وضو کرکے عصر کی نماز ادا کی، اور افغان افسر نے پاسپورٹ دیکھکر راہداری کا محصول چار روپیہ وصول کیا،

اب ہم افغان علاقہ میں چل رہے تھے، درہ کا راستہ کشادہ ہوتا جا رہا تھا، پاس کی پہاڑیاں دور ہٹتی جا رہی تھیں ۵ بجے کے قریب افغانی مشرقی سرحد داری کے پاس پہنچ گئے، جسکا نام ڈکہ ہے، یہاں وادی وسیع ہے، اور سامنے دریائے کابل کی نہایت کم چوڑی آب رواں کی چادر پھیلی ہوئی نظر آئی، ایک طرف افغانی سرحد دار کا مغربی طرز کا بنگلہ تھا، دوسری طرف کچی دیواروں کی عمارت کا ایک پھاٹک تھا جو افغانی سرحد داری کا دفتر تھا یہاں شوفر اور ملازم نے لیجا کر پاسپورٹ دکھائے، اور وہاں اس پر" بسر حد داری در مشرقی ملاحظہ شد" برائے رفتن کابل کی اجازتی مہر لگائی گئی، اور خبر دی گئی کہ یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے افغانی سرحد دار صاحب سے میری معرفی کرائی جائے گی، مگر وہ بیمار تھے، اندر سے باہر آنے کے انتظار میں تاخیر کا اندیشہ تھا، اس لئے معافی مانگ کر آگے بڑھنے کی اجازت چاہی، افغان سپاہی نے روک کی زنجیر ہٹائی اور موٹر آگے روانہ ہوا،

اب قریب شام کا وقت آگیا تھا، پٹھان مسافر مرد و عورت، بچے اور بوڑھے آ جا رہے تھے، اونٹ، گدھے، گائے، بیل، بھیڑیں، چراگاہوں سے واپس آ رہی تھیں، درۂ خیبر کے شروع سے لیکر یہاں تک دیہاتی پٹھان خواتین سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں مستور کھلے منہ بڑی آزادی سے آ جا رہی تھیں، بدن پر گھٹنوں تک سیاہ کرتے، پاؤں میں بڑے گھیرے کی عموماً سیاہ شلواریں، سر سے پاؤں تک سیاہ چادریں، ہر قسم کے زیور اور ظاہری آرائش سے تمام تر پاک، ان کو دیکھکر خیال ہوتا تھا کہ شاید اصل سادہ اسلامی پردہ یہی ہوگا،

ڈکہ سے آگے نکلے تو پہلی افغانی چھاؤنی نظر آئی، خیمے کھڑے تھے، سپاہی اپنی خاکی وردیوں میں چل پھر رہے تھے، ان خیموں سے ذرا ہٹکر ان کے باورچی خانہ کا خیمہ نظر آیا، ان سپاہیوں کی وردی یہ تھی، خاکی پتلون خاکی کوٹ، سر پر خاکی ٹوپی جس کے آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوا، مصری سپاہیوں کی بھی اسی قسم کی وردی ہے، مگر اُن کے سر پر ترکی ٹوپی رہتی ہے جس کے اوپر ایک خاکی غلاف چڑھا ہوتا ہے، اور اسی کپڑے کا آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوتا ہے، جس سے مقصد آنکھوں کے سامنے دھوپ کی تمازت کو روکنا ہوتا ہے،

اب شام ہو چکی تھی، اور موٹر سناٹے کے عالم میں پوری تیزی سے دوڑ رہا تھا، کبھی کبھی پٹھان کاشتکار دل

کابل یا خانہ بدوش مسافروں کا کوئی مختصر قافلہ مل جاتا تھا، جس کے ساتھ مویشیوں کا گلہ، بار برداری کے جانور یہاں تک کہ کسی بیل یا گدھے کی پیٹھ پر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں، وادیوں میں کہیں کہیں کھیت بھی تھے، یکے بعد دیگرے افغانی چوکیاں بھی گذریں، جنکے مکانات خام دیواروں کے تھے،

درۂ خیبر سے لیکر ادھر خام مکانات کا رواج عام طور سے ہے، اور غالباً اس سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہے کہ اس قسم کے مکانات بارش میں محفوظ رہتے ہیں، ادھر بارش تو کم ہوتی ہے، یہاں کی سیرابی اور سرسبزی زیادہ تر برف کے پگھلنے سے جو چشمے جاری ہوتے ہیں، انہی سے ہے، واپسی میں ملتان میں بھی اسی قسم کے مکانات دیکھے، کابل و غزنین وغیرہ میں بھی ایسے مکانات نظر آئے، بلکہ تعجب ہوتا تھا کہ قلعے اور محل اور شاہی عمارتیں بھی اسی خام مٹی کی ہوتی ہیں، یہ مٹی نہایت چکنی اور لسدار ہے، کہگل کے بعد یہ دیواریں بڑی مستحکم ہو جاتی ہیں، قلعوں میں کئی کئی گز کی چوڑی دیواریں ہوتی ہیں، اور ان میں ہر کونے پر مٹی ہی کی برجیاں بنی ہوتی ہیں، دیواروں میں بندوقوں کے لئے بیشمار سوراخ ہوتے ہیں،

درۂ خیبر میں اور دوسرے آزاد سرحد میں ہر خاندان یا قبیلہ کا اسی قسم کا الگ الگ قلعہ ہوتا ہے، جو ہر ایک کو دوسرے کے حملوں سے بچاتا ہے، اس چھوٹے سے قلعہ کا سردار **ملک** کہلاتا ہے، جمرود سے لیکر لنڈی کوتل تک اور اس کے بعد بھی اس قسم کے ملکوں کے قلعے بعض مسمار بعض کھڑے، بکثرت نظر آتے ہیں، اسی قسم کی افغانی چوکیاں راستوں میں ملیں جنمیں سے بعض اچھی خاصی بلند تھیں، اور سپاہی سیڑھیوں سے چڑھ اور اتر رہے تھے، چونکہ رات ہو گئی تھی، اس لیے خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کسی چوکی پر ہم کو روک دیا جائے، مگر ڈکہ کے سرحد دار سے کہکر ٹیلیفون سے نہ روکنے کی ہدایت کرادی گئی تھی،

اب رات کے ۸ بج چکے تھے، چاندنی چھٹکی تھی، ہر طرف پہاڑوں کی دیواریں نظر آتی تھیں کہیں کہیں تھوڑے چشمے بہ رہے تھے، انسانوں اور انسانی آبادیوں کا نشان میلوں تک نظر نہیں آتا تھا، گرم رفتار موٹر کی آواز کے سوا ہر طرف سناٹا تھا، اسی اثنا میں ایک پل آیا، جو گو نیا بنا تھا، مگر ابھی استعمال میں نہیں آیا تھا، نیچے چشمہ بہہ رہا تھا، ڈرا

نے موٹر کو نیچے اتار کر چشمہ کے اندر سے گذر کر اوپر چڑھنا چاہا، انجن چشمہ کے سرد پانی سے بجھکر خاموش ہوگیا، اب بار بار انجن کو ہینڈل کر کے متحرک کرنے میں کچھ دیر لگی، باوجود اس خاموشی تنہائی اور لق و دق میدان کے فضا میں امن و امان کا اطمینان چھایا تھا، اور جس سے یہ نتیجہ نکالا کہ بحمداللہ ملک میں مسافروں کو ہر گونہ امن و امان اور اطمینان حاصل ہے، اور یہ ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے،

چند جھٹکوں کے بعد انجن گرم ہوکر پھر متحرک ہوا، اور اوپر چڑھکر اس منزل کو طے کیا، اب جلال آباد قریب تھا، سڑک سیدھی اور صاف تھی، دو رویہ درختوں کی صفیں تھیں جنکو ختم کرنے کے بعد ہم کو جلال آباد کے چراغ نظر آنے لگے، اور بالآخر آبادی آئی، اور ہم باغ شہید نام سرکاری مہمانخانہ میں جاکر اترے، سیڑھی پر حاکم صاحب استقبال کے لئے کھڑے تھے، باغ کے اندر یہ ایک بڑی عمارت تھی جسمیں متعدد کمرے آراستہ اور مہمانوں کے لئے تیار تھے، انھیں میں سے ایک کمرہ میں اتارا گیا، مسہری اور اس پر صاف بستر اور کمل قرینہ سے لگے تھے، کمرہ میں میز کرسی، آرام کرسی ہر چیز تھی،

اس اکتوبر میں جلال آباد کا موسم پشاور کے برابر سرد تھا،

یہاں پہنچکر پہلے ہاتھ منھ دھو کر وضو کر کے مغرب اور عشاء کی یکجا مسافرانہ نمازیں ادا کیں، تھوڑی دیر میں کھانا آیا، کھانے کے بعد کابل کا مشہور سردہ اور انگور آئے سردہ اتنا میٹھا اور ساتھ ہی اتنا سرد تھا کہ وہ اس ٹھنڈک میں کھایا نہ گیا، رات بھر آرام کیا، صبح اٹھکر نماز کے بعد باغ کی سیر کی، کس قدر پرلطف سماں تھا، باغ کی پشت پر پہاڑیاں تھیں، پہاڑیوں کے دامن میں دریائے کابل یا کوئی اور چشمہ آہستگی سے بہ رہا تھا، ایک چشمہ کسی طرف سے آکر باغ کی روش کے کنارے کنارے رواں تھا، روشوں پر ہر دو طرف چنار کے لمبے لمبے درخت کھڑے تھے، یہ مہینے افغانستان میں موسم خزاں کے ہوتے ہیں، وہاں خزاں میں پتے خشک ہونے کے بجائے زرد ہو جاتے ہیں، ہر طرف زرد زرد پتوں کی ایک دوسری بہار نمودار تھی،

جلال آباد کے اس باغ کا نام میں نے باغ شہید سنا، شاید اس لیے کہ امیر حبیب اللہ خاں شہید نے

اس کو بنوایا ہے، باغ کی عمارت کا طرز ہندوستان سے جدا تھا، بلند کرسی تھی جس کے بعد برآمدہ، برآمدہ کے بیچ کے راستہ سے ایک بڑے وسیع ہال میں داخل ہو جاتے تھے، اس پورے ہال کے اوپر چھت کے بجائے گنبد، دونوں طرف کمرے، اس ہال کے پیچھے بلند سائبان جس کے نیچے ایک مختصر وادی جس میں پانی کی روانی اور سامنے مذکورہ بالا پہاڑیاں، اس باغ کی تعمیر کی نسبت گو امیر حبیب اللہ خاں کی طرف سنی، مگر بڑے ہال کے بلند دروازہ کے اوپر ایک پتھر نصب تھا جس پر کتبہ لگا تھا، میں نے اس کتبہ کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر افضل خاں کے نام کے سوا کچھ اور نہ پڑھ سکا،

میں نے سنا تھا کہ بچہ سقہ کے ہنگامہ میں جلال آباد اور اس کی سرکاری عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا تھا، اس کی ایک شہادت میں نے یہ پائی کہ باغ مذکور کے برآمدہ میں جو دروازے اور کھڑکیاں لگی تھیں، ان کے شیشے نہ صرف ٹوٹے تھے، بلکہ اُن کی لکڑیوں کو آگ سے جلائے جانے کی کوشش کی علامتیں موجود تھیں،

افغانستان کی آبادیوں کے مکانات کی چھتیں خام اور منڈیر کے بغیر، اور سپیدی یا گچ کے بجائے مٹی سے باہر سے لپے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی عمارتوں کے دیکھنے کی عادی نگاہوں کو وہ پر رونق نہیں معلوم ہوتی ہیں، مسجدیں بھی عموماً خام دیواروں کی اور گنبد و منار سے خالی ہوتی ہیں، اس لیے وہ دور سے ممتاز نظر نہیں آتیں، اور اسی لئے باہر کے سیاحوں کو یہ آبادیاں آباد اور دلکش نہیں معلوم ہوتیں، حالانکہ وہ مکانات اندر سے بہت عمدہ، آراستہ اور خوبصورت ہوتے ہیں، موجودہ شہر جلال آباد کی بھی یہی کیفیت تھی، مسافروں کے لیے ہوٹل یا کھانے کی دکانیں ہیں، چائے کے روسی سماور ہر جگہ گرم نظر آتے ہیں، یہیں سے چند میل کے فاصلہ پر ہڈا ایک گاؤں ہے، جہاں کے مشہور مجاہد عالم ملا ہڈا کے نام سے ہندوستان کے انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں آج سے بیس برس پہلے بہت نامور تھے، اور جو انگریزی فوجوں سے بارہا نبرد آزما ہو چکے تھے، ان کا سرکاری خطاب نجم المشائخ تھا، جس کی نسبت سے اُن کے مدرسہ کا نام جو اسی ہڈا میں واقع ہے، نجم المدارس ہے، اور میں نے کابل کے ایک صاحب علم سے سنا کہ وہاں ملا صاحب کا متروکہ بہت اچھا خاصہ کتبخانہ ہے، یہ مدرسہ پرانے طرز کا عربی مدرسہ ہے،

مامور صاحب جلال آباد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جلال آباد کے آس پاس بودھ لوگوں کی بکثرت سنگی یادگاریں ہیں

جلال آباد پشاور سے اسّی میل ہے، اور کابل پشاور سے دو سو میل پر واقع ہے، آج ایک سو بیس میل [۱۲۰] [۲۰۰] طے کرنے تھے، صبح کو آٹھ بجے جلال آباد سے آگے بڑھے، سڑک اچھی، اور کچھ دور تک نئی بنی تھی، پل بھی مرمت ہو رہا تھا، کہیں کہیں سڑکوں کی درستی بھی ہو رہی تھی، پٹھان مزدور کام پر لگے ہوئے تھے، اونٹوں اور گدھوں پر لدے ہوئے خانہ بدوش قبیلے، اور کہیں کہیں ہل چلانے والے کاشتکار اپنے بیلوں کے ساتھ نظر آتے تھے، جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ زیادہ سنگلاخ ہوتا جا رہا تھا،

جلال آباد سے تھوڑی دور چل کر سب سے پہلی بڑی آبادی نملا نامی آئی، یہاں ایک وسیع شاہی باغ ہے جسمیں سرکاری مہمانخانہ بھی ہے، باغ میں ہر طرف درختوں کی رونق تھی، روشوں پر چنار اور آملہ کے درخت لگے تھے، گو راستہ دوسری طرف سے تھا، لیکن ہم نے باغ کے دیکھنے کی خاطر باغ کے اندر سے ہو کر راستہ اختیار کیا، اسکو ایک نظر دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے، قصبہ میں کاشتکاروں کی آبادیاں تھیں، اور دوسرے باغ ادھر ادھر لگے تھے،

افغانستان میں پہلے جب موٹروں اور لاریوں کی سواریاں رائج نہ تھیں، اور عموماً لوگ گھوڑوں یا اونٹوں پر سفر کرتے تھے، تو عموماً ہر بارہ تیرہ میل پر پڑاؤ ہوتا تھا، اور ہر پڑاؤ پر سرکاری عہدہ داروں اور مہمانوں کے قیام کیلئے مکانات بنے تھے، جنمیں تمام سر و سامان مہیا رہتے تھے، اب موٹروں کی گرم رفتاری نے منزلوں کو دور تر کر دیا ہے، اب اسّی میل، سو میل، سوا سو میل پر یہ مکانات بالکل جدید فرنیچر اور ساز و سامان کے ساتھ موجود ہیں، تاہم مسافر ابھی تک انھیں پرانی منزلوں کا حساب لگاتے ہیں، اور ان کی فارسی میں ہمارا ہندوستانی لفظ "پڑاؤ" پوری آزادی سے مستعمل ہے، اور فاصلہ بتاتے وقت مسافت کی تعیین "یک پڑاؤ"، "دو پڑاؤ" سے کیجاتی ہے، میل کے بجائے اُن کے ہاں "کروہ" کا پرانا ہندوستانی فارسی لفظ جاری ہے جس کو ہم ہندی "کوس" کا مرادف کہہ سکتے ہیں، اور جو تقریباً پونے تین انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے، اب جدید سڑکوں کی تعمیر میں فرنچ اصطلاحات میٹر، سینٹی میٹر اور کیلومیٹر کا رواج ہو رہا ہے،

یہاں سڑکوں پر میلوں کے نشانات نہیں لگے ہوئے ہیں، اس سے مسافروں کو مسافتوں کے جاننے میں

دقتیں پیش آتی ہیں، اگر ملک کی وزارتِ امورِ نافعہ اس کی طرف توجہ کرے، تو یہ ذرا سی اصلاح مسافروں کی بڑی الجھن کو دور کر دے،

نملا سے آگے بڑھکر شاید ایک آدھ گھنٹہ میں، ہم فتح آباد پہنچ گئے، یہ جلال آباد سے اٹھارہ میل پر ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ پشاور اور کابل کے ٹھیک بیچ میں واقع ہے، یہ بھی ایک قصبہ سا ہے، مختصر سا بازار ہے، جس میں مسافروں کے کھانے پینے کی چیزیں اور سبزیاں ملتی ہیں، چائے خانے مع گرم سماوروں کے کئی موجود ہیں،

اب جبکہ کابل اور پشاور کے درمیان مسافروں کی اور اسباب کی لاریاں اور ٹیکسی گاڑیاں بکثرت آتی جاتی ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر ان کے لئے تیل اور ان کی درستی کے مختصر سامان موجود رہیں، چنانچہ صوبہ سرحد کے ایک مسلمان تاجر نے افغانی سرکار سے اس کا ٹھیکہ لیا ہے، ان کی پہلی دکان تو ڈکہ میں ملی تھی، جہاں پانی پت کے ایک مسلمان نوجوان نوکر تھے، دوسری دکان فتح آباد میں ملی، دکان کی عمارت نئی بنی تھی، عمارت کے نیچے زمین دوز کمرہ تیلوں کا گودام تھا،

نملا کے آس پاس کھیت ہیں، جنہیں افغانی کاشتکار اس وقت ہل چلا رہے تھے، یہ ہل ہندوستانی ہلوں کے مشابہ تھے، اس ملک میں کھیتوں کی سیرابی چشموں اور نہروں کے پانی سے ہوتی ہے، یہ چشمے اور نہریں فطرۃً نشیب میں، جدھر جدھر گھومتی ہیں زمین کو شاداب اور سرسبز بناتی جاتی ہیں، اور وہاں آبادیاں قائم ہو جاتی ہیں، کچھ دنوں کے بعد جب ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا ہے تو یہ آبادیاں بھی ادھر منتقل ہو جاتی ہیں، اس انتقال مکانی کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں جا بجا ملتی جاتی ہیں،

سیرابی کا طریقہ یہ دیکھا کہ کاشتکار کفگیر کی طرح کی لکڑی کا کوئی آلہ (ڈوا) ہاتھ میں لیکر نہروں سے پانی اُچھال اُچھال کر کھیتوں میں چھڑک کر پھینکتے ہیں، افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا طریقہ بھی یہی دیکھا، سڑکوں کے دونوں طرف چشمے بہ رہے ہیں، میونسپلٹی کے ملازم جو سڑکوں کی صفائی کے لئے مامور ہیں، وہ اسی طرح سے چشموں سے پانی اُچھال اُچھال کر سڑکوں کو تر کرتے ہیں، تاکہ گرد و غبار بیٹھ جائے،

جلال آباد سے فتح آباد تک سڑک کی سنگلاخی ایسی ہو کہ موٹروں کو سخت سے سخت ہچکولے پڑتے ہیں، ہمارا موٹر گو زیادہ مستعمل نہ تھا، مگر اس کے ایک پہئے کے نیچے کی ایک کمانی ٹوٹ گئی، فتح آباد کی تیل والی دکان میں پہنچکر موٹر میں جب تیل ڈالا جانے لگا تو اس ٹوٹی کمانی پر نظر پڑی، بڑی مشکلوں سے وہاں لوہے کی ایک لمبی سلاخ کا ٹکڑا ملا، جس کو ٹیڑھا کرکے، لوہے کے تار سے باندھکر اس کمانی کی مرمت کیگئی، جسمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، اس دکان کے ملازم بھی ہندوستانی تھے، انھوں نے چائے سے تواضع فرمائی، انھیں نے مجھے بتایا کہ یہاں سے چھ میل پر ایک مزار ہے، جسکی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت لوطؑ کی قبر ہے، اور لوگ اسکی زیارت کو جاتے ہیں،

یہاں کچھ بچے قرآن پاک اور پرانی گلستان و بوستاں اور کسی فارسی نظم کے سبق پڑھتے نظر آئے، نکلے گا کر پڑھنے کی خاص لَے تھی، جو مجھے تو بہت خوش آیند معلوم ہوئی،

۱۱ بجے کے قریب موٹر کی مرمت ختم ہوئی، اور ہم آگے بڑھے، راستہ اوسی طرح دشوار گذار، سنگلاخ، اور پُرپیچ تھا، ہم کو کابل پہنچکر وزراے حکومت سے معلوم ہوا کہ موجودہ حکومت نے کابل اور پشاور کے درمیان ایک اور سڑک کا کام شروع کیا ہے، جو نسبتہً اس سے کم دشوار گذار ہی اور ساتھ ہی اس رستہ سے کابل اور پشاور کے درمیان پچاس میل کی مسافت کم ہوجائیگی، اور امید ہے کہ اس سڑک کی تیاری کے بعد ہندوستان و افغانستان کی آمد و رفت، اور تجارتی کاروبار میں بہت بڑی ترقی ہو جائے گی، میرے خیال میں پشاور سے جلال آباد کو وہی نسبت ہے جو چمن اور کوئٹہ سے قندھار کو ہے، مگر قندھار کے بازاروں میں جو رونق اور آبادی اور دکانوں کی کثرت نظر آتی ہے، وہ جلال آباد کو نصیب نہیں، حالانکہ جلال آباد پشاور سے صرف اسی میل ہے، اور اسی بنا پر جلال آباد میں تجارتی ترقی کی بہت بڑی صلاحیت موجود ہے، کہ افغانستان و یاغستان اور دیگر مشرقی کوہستانوں کے درمیان یہی ایک شہر تجارت کا مرکز بن سکتا ہے،

فتح آباد سے چل کر ڈیڑھ بجے دن کو ہم گولالا نامی قصبہ میں پہنچے، آبادی گو مختصر مگر مشغول معلوم ہوئی، چھوٹا سا بازار بھی ہے جسمیں دن رات کی ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں، کھانے کی کئی دو دکانیں تھیں، یہاں سے کابل تک

پھر کوئی ایسا مقام نہ تھا، اس لیے یہاں کھانے کا انتظام کیا گیا، اس دوکان کو ہوٹل تو نہیں کہہ سکتے، گو یہاں اس کا یہی نام ہے، ہاں باورچی کی ایک ستھری دوکان کہہ سکتے ہیں، ایک طرف میرے لیے اس نے میز اور کرسی لگا دی، اور اوپر کھانا رکھ دیا، پشاور سے جو افغانی روٹی شروع ہوتی ہے، وہی پورے افغانستان میں ملتی ہے، چپاتیوں کا رواج نہیں، دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح یہاں بھی گھروں میں روٹیاں بازاروں سے پک کر آتی ہیں، یہ بڑی قسم کی تنوری روٹی ہوتی ہے، روٹی، مرغ، انڈے اور فیرینی کے تین کھانے، اور کافی کی تین پیالیاں میرے اور شوفر اور ملازم کے لیے تھیں، مگر اس ارزانی کو سنکر آپ حیرت زدہ ہونگے، کہ ان کی مجموعی قیمت انگریزی سکہ کے حساب سے صرف ایک روپیہ ایک آنہ تھی،

ملک افغانستان کے اندر اب تک شاید سوا سو میل کے قریب ہم طے کر چکے تھے، مگر اب تک کسی مسجد کے منارے نگاہیں نہیں ٹکرائی تھیں، یہاں آکر یک بیک خیال ہوا کہ کیا یہ پورا اسلامی ملک مسجدوں سے خالی ہے؟ میں نے دکاندار سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے، اس نے سامنے کے بلند چبوترہ کی طرف اشارہ کیا، ظہر کا وقت تھا وہاں گیا تو دیکھا کہ قصبہ کی سب سے اونچی جگہ پر مٹی کا ایک چبوترہ ہے، اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا دالان ہے، دالان میں صرف ایک دروازہ تھا، اس کو کھولکر دیکھا تو دیوار میں امام کی جگہ کے لیے محراب بنائی گئی تھی، اور خطیب کے لئے بغل میں ایک دو زینہ کا چبوترہ تھا، اب سمجھ میں آیا کہ چونکہ یہاں کی ان مسجدوں میں گنبد اور منارے نہیں ہوتے، اسی لیے وہ اجنبیوں کو مسجدیں نہیں معلوم ہوتیں،

بہرحال مسجد میں ظہر اور عصر کی یکجا نماز ادا کر کے ۳ بجے کے قریب آگے چلے، اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے، راستہ کا پیچ و خم اور نشیب و فراز بڑھتا جاتا تھا، راستہ کیا، پہاڑوں کے بیچ سے اور کبھی ان کے ادھر سے اور کبھی ادھر سے، پہاڑوں کو بچا بچا کر وہ نکالا گیا ہے اور جو اس قدر کم چوڑا ہے کہ دو موٹریں بمشکل چل سکیں، ان کے نیچے ہر قدم پر عمیق غار، کھڈ، یا چشمہ، اگر ڈرائیور ایک سکنڈ کے لیے بھی غفلت کرے تو موٹر اور سواریوں کی ہڈیوں تک کا بھی کہیں پتہ نہ چلے، پہاڑی راستوں کا پیچ و خم اس قدر ہے کہ ہر موڑ پر یہ ڈر لگتا تھا کہ کوئی لاری یا

موٹر ادھر سے آئے تو ٹکرا نہ جائے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر واقف کار اور مشاق ڈرائیور نہ ہوں تو بسلامت پہنچنا مشکل ہے، اس پست و بلند اور ناہموار راستہ کو دیکھکر سعدی کی درویشانہ کیفیت کا شعر یاد آتا تھا،

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم،

گہے برپشتِ پائے خود نہ بینم،

الغرض ان خطرناک نشیب و فراز اور زیر و بالا، اور چڑھاؤ اُتار راستوں کو طے کرکے مغرب کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں دریائے کابل میں بند باندھا گیا ہے اور پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے، اس کے پاس ہی قریہ کی ایک آبادی آئی، جسکا نام شاید خاک جبار ہے، اور اس کے بعد دور تک راستہ اس طرح ہو کہ اوپر پہاڑی دیوار، نیچے سڑک اور اس کے نیچے پتھروں سے الجھتا اور نشیب و فراز سے ہاتھا پائی کرتا ہوا چشمہ نما دریا کا پانی بہ رہا ہے، اس وقت بھی کابل سے سرِ شام چلنے والی لاریاں سامان و اسباب اور مسافروں سے بھری ہوئی، راستہ میں ملتی جاتی تھیں، اخیر مغرب کو شاید کابل سے ۵ امیل پہلے، بتِ خاک پہنچے، یہ گویا کابل کا پھاٹک ہے، پرانی وضع کا اچھا خاصہ بازار ہے، آمد و رفت کی کثرت بھی تھی، یہاں سرِ راہ ایک مکان کے سامنے موٹر رکا، معلوم ہوا کہ یہاں کابل جانے کا محصول چنگی وصول ہوتا ہے، یہاں سے کابل کا سیدھا راستہ ہے، سڑک چوڑی، ہموار اور صاف، سڑک کے دونوں طرف چشمے بہ رہے تھے، اور ان کے نیچے غالباً چنار کے درخت دو رویہ لگے تھے، جیسے جیسے شہر قریب آتا جاتا تھا روشنی کی رونق بڑھتی جاتی تھی، اب شہر کابل کا چنگی خانہ آیا، یہاں موٹر کا نمبر، ڈرائیور کا نام، مسافر کا نام وغیرہ درج کیا گیا یہیں ٹیلیفون آیا کہ حکومت کی طرف سے چند نمایندے استقبال کے لئے آرہے ہیں، چند منٹ انتظار کیا جائے، انتظار کو کچھ ہی منٹ گذرے تھے کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار شاہی موٹر آکر رکا، اور اس سے چند اصحاب اترے، جنمیں سے ایک وزارتِ خارجیہ کے اور دوسرے صاحب وزارتِ تعلیم کے نمایندے اور ایک دو اور بزرگوار تھے، انھوں نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی وزارتوں کی طرف سے خوش آمدید اور مہمان نوازی کے الفاظ ادا فرمائے، اور مجھے اپنی کار میں لے کر شہر میں داخل ہوئے،

رات کا وقت تھا، شہر کے اکثر حصے بجلی کی روشنی سے منور تھے، بعض حصوں کی عمارتیں اچھی خاصی بلند اور شاندار، اور سڑک صاف وہموار تھی، پولیس کے سپاہی اچھی خوشنما وردیوں میں آمد ورفت کے نظم ونسق کیلئے کھڑے تھے، پرانے کابل سے گذر کر ہم کابل کے نئے شہر میں پہنچے، اور دار الامان میں لائے گئے، جس کو امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں جدید طریق پر آباد کرنا چاہا تھا، یہاں یورپین انجینیروں کی نگرانی میں جدید طرز وانداز کی پانچ چھ سرکاری عمارتیں بنی ہوئی ہیں، اور ہر عمارت کئی کئی منزل کی ہے، انھیں عمارتوں سے ایک شاندار عمارت شاہی مہمانخانہ ہے، اسی مہمانخانہ کے سامنے آکر موٹر رکا، اور ہم سب اتر کر باغ کے اندر داخل ہوئے، اس باغ کے پھاٹک پر وہ صاحب ملے جو ہم نوواردمہمانوں کی خاطر مدارات اور دیکھ بھال کے لیے مقرر تھے، ان کا نام سرور خاں اور گویا تخلص ہے، یہ امیر عبد الرحمٰن خان مرحوم کے زمانہ کے مشہور سردار عبد القدوس خاں کے پوتے ہیں، پچیس تیس کے درمیان عمر ہوگی، یہ فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، شعر وشاعری کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں، فارسی میں کم کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، شعر العجم اور میرزا مظہر کے خریطۂ جواہر کے تمام منتخب اشعار ان کی نوک زبان ہیں، اندازہ ہے کہ پچیس تیس ہزار شعر اُن کو یاد ہونگے، اخلاق پسندیدہ، اطوار شایستہ، ذہن رسا، مذاق عالی، تذکروں کے حافظ، اور قلمی کتابوں کے جویا، فارسی تحریر کا بہت سلیقہ رکھتے ہیں، کابل کی شاہی انجمن ادبی (جسکو "رائل اکاڈمی" کہنا چاہئے، اور جسکو موجودہ حکومت نے قائم کیا ہے) کے رکن رکین ہیں، رسالہ کابل میں ان کے مضامین چھپا کرتے ہیں،

سرور خاں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا، میں نے عرض کی "در کابل دیدہ بودم واکنوں در کابل[۱] می بینم" انھوں نے اس فقرہ سے مزا لیا، اور مجھے ساتھ لیکر مہمان خانہ کی دوسری منزل پر لے گئے، جہاں ہمارے پیشرو رفیقوں کا قیام تھا، اور اس کا ایک کمرہ میرے لیے مخصوص تھا، یہاں سب سے پہلے مدیر صاحب مہمانخانہ سے تعارف کرایا، پھر ڈاکٹر اقبال اور نواب سر راس مسعود سے جا کر ملا، سر راس مسعود کیساتھ پروفیسر ہادی اور ڈاکٹر سر اقبال کیساتھ غلام رسول خاں بیرسٹر لاہور سکریٹری ہو کر آئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، پروفیسر ہادی میرے پرانے دوست ہیں، ان سے بارہ برس کی ملاقات ہے، نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے ہیں، پہلے سائنس کے لیے انگلستان گئے تھے، پھر واپس آکر جامعہ ملیہ

[۱] پہلے کابل سے رسالہ کابل اور دوسرے سے شہر کابل مراد ہے۔

میں رہے، وہاں سائنس کلاس کو ترقی دی، پھر مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے، فارسی ایک حیثیت سے ان کی مادری زبان ہے اور ایرانی فارسی، ایرانی لب ولہجہ میں اچھی بولتے ہیں، اور ماشاء اللہ مردانہ حسنِ صورت اور اعتدالِ قامت سے بھی سرفراز ہیں، فارسی میں اب جاکر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لندن سے حاصل کی ہے، اور ایرانی جہازرانی پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے

غلام رسول خاں آج سے چوبیس برس پہلے امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں کابل میں بصیغۂ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے، اس لئے ان کی رفاقت سے سب کو بہت آرام پہنچا،

بہرحال اسوقت جب ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کی کہ مجھے چھوڑ کر آپ سب کے اس عجلت سفر پر مجھے اردو کا ایک پرانا شعر راستہ بھر یاد آیا کیا،

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

سب نے کہا یہ شعر گویا آج ہی کے لیے کہا گیا تھا،

اس وقت نو بجے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے ہاں مہمانوں کی دعوت تھی، اُن کا ٹیلیفون آیا کہ "نو وارد مہمان" بھی شریکِ دعوت ہوں، اور لوگ تیار ہو چکے تھے، اس لئے تاخیر کے خیال سے میں بھی اسی حالت میں بلا تبدیل لباس، ساتھ ہو گیا، ہم لوگ دو موٹروں میں روانہ ہوئے، ایک میں ڈاکٹر اقبال، میں اور سرور خاں گویا اور دوسرے میں سر راس مسعود، پروفیسر ہادی اور غلام رسول خاں، تھوڑی دیر میں صدر اعظم صاحب کے محل تک پہنچے محل میں ہر جگہ بجلی کی روشنی تھی، جگہ جگہ فوجی سپاہیوں کے پہرے تھے، ایک دروازہ پر پہنچکر اترے، دوسرے مہمان سب پہنچ چکے تھے، سب سے آخر میں ہم لوگ پہنچے تھے، محل میں ہر چیز یورپین طریق و قاعدہ سے تھی، ایک گیلری سے ہو کر اندر وسیع دالان میں پہنچے، سب سے تعارف اور ملاقات ہوئی، مہمانوں میں جن صاحبوں کے نام اسوقت یاد آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ، شہزادہ اسد اللہ خاں کمانڈر افواج شاہی، سردار فیض محمد خاں وزیر خارجیہ، سردار احمد خاں وزیر دربار، اللہ نواز خان وزیر فوائد عامہ، میر عطا محمد خاں صدر مجلس

اعیان (پارلیمنٹ) وغیرہ،

چند منٹ کے توقف کے بعد سردار ہاشم خاں صدر اعظم تشریف لائے، بالا قد، وجیہ چہرہ، گورا رنگ، متوسط بدن، فرنچ کٹ داڑھی، سر پر افغانی ٹوپی، جسم پر کوٹ اور پتلون، افغانستان جدید میں امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ سے سر کے علاوہ باقی جسم میں یورپین لباس رواج پذیر ہے، یہاں کے تعلیم یافتہ اصحاب، ارباب مناصب، عہدہ دار، فوج، پولیس، سپاہی، حتیٰ کہ خدام اور سرکاری شوفر تک یہی لباس پہنتے ہیں،

ہاشم خاں نے آکر مہمانوں سے مصافحہ کیا، سردار فیض محمد خاں نے ہندوستانی مہمانوں کا ایک ایک کرکے تعارف کرایا، اس کے بعد سردار ہاشم خاں سب کو لیکر کھانے کے کمرہ میں گئے، کھانا میز و کرسی پر تھا اور ہر چیز یورپین طریق پر آراستہ تھی، کھانا کھلانے والے ملازمین بدستور سیاہ کپڑوں میں تھے، ہاتھوں میں سپید دستانے اور سر پر افغانی ٹوپیاں، کھانے کی گول میز مختلف قسم کے انگوروں اور پھلوں اور گلدانوں سے آراستہ تھی، کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب وسلیقہ ہر چیز آجکل کی متمدن دنیا کی سطح کے برابر تھی، اور بقول ڈاکٹر اقبال، ہم کو تعجب ہورہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں، یا تمدن جدید کی نئی دلی میں،

میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں، سرور خاں گویا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ رسالہ کابل میں افغانستان کے اکثر علما و فضلا و شعرا، اور ارباب کمال کے حالات چھپتے ہیں، مگر اس کا ذکر اب تک نہیں آیا، جس نے کابل میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی، سب نے پوچھا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خراسان کے عالم مقاتل بن حیان، جو ابو مسلم خراسانی سے بھاگ کر ادھر چلے آئے تھے، اس سلسلۂ سخن سے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع ہوگئی، اور اس موضوع پر سردار فیض محمد خاں نے جو عہد امانی میں وزیر تعلیم، اور اب وزیر خارجیہ ہیں، اس قدر پر معلومات گفتگو فرمائی، اور ہندوستان کے موریا خاندان (پاٹلی پتر) اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر اس خوبی سے کیا کہ میں ان کا بیحد معترف ہوگیا، سر راس مسعود نے اپنے جاپانی سفروں کے حالات سے اس علمی دسترخوان میں نئی لذت پیدا کی، ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ وسیاست کے نکات بیان فرمائے،

اسی میز پر رئیس اعیان میر عطا محمد خاں کے متعلق معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء والی مکہ کی مشہور موتمرِ اسلامی میں وہ بھی سفیرِ افغانستان کے ساتھ شریک تھے، اور وہ کہتے تھے کہ میں نے تمھیں وہاں دیکھا تھا، مگر مجھے ملنا یاد نہیں آیا، یہ نہایت متین و سنجیدہ اور خاموش بزرگ ہیں، چہرہ پر خوبصورت داڑھی ہے، سن پچپن اور ساٹھ کے قریب ہوگا، عربی ممالک کی سیاحت کی ہے، اور عربی زبان خوبی اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں.

وزیر حربیہ شاہ محمود خاں، نادر خاں شہید مرحوم کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں، ابھی گو جوان ہیں، مگر ماشاءاللہ جوان صالح ہیں، ان میں ہر دلعزیزی اور محبوبیت کی شان معلوم ہوتی ہے، وہ اپنی فوجی وردی میں تھے، اور شہزادہ اسد اللہ خاں بھی فوجی وردی میں تھے، یہ شاہی فوجی دستہ کے کمانڈر ہیں، امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے خلف الرشید امیر امان اللہ خاں کے سوتیلے بھائی، اور نادر خاں اور ہاشم خاں وغیرہ کے بھانجے ہیں، ابھی گو سن کم ہے، مگر سعادت کا نور پیشانی پر نمایاں ہے، غالباً پچیس برس کے قریب عمر ہوگی،

ہمارے رفقائے طعام میں اللہ نواز خاں بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، شاید لوگوں کو یاد ہو کہ جنگِ عظیم کے زمانہ میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے، اُن میں سے ایک یہ تھے، گو یہ اصلاً افغان ہیں، مگر مدت سے ان کا خاندان ملتان میں آباد ہے، اور وہ اس طرح ہندوستانی اور افغانی دونوں ہیں، بچہ سقا کے ہنگامہ کے وقت جنرل نادر خاں کو جس نے سب سے پہلی مدد دی وہ یہی تھے، اون کا مجاہد کی حیثیت سے سرحد کے بعض قبائل پر اثر تھا، وہ انھیں میں سے تین سو آدمی لیکر نادر خاں کے پاس آئے اور انھیں کا سب سے پہلا دستہ تھا جو شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل پہنچا تھا، موجودہ حکومت اون کے خدمات کی پوری قدر کرتی ہے، اور اس نے ذمہ داری کے مختلف عہدوں پر ان کو سرفراز کیا، اور اب وہ آجکل وزیر فوائد عامہ (پبلک ورکس) ہیں، دوہرا بدن، چوڑا چہرہ، گندم گون رنگ، چہرہ سے استقلال اور عزم برستا ہے،

کھانے سے فارغ ہو کر ملاقات کے پہلے کمرے میں آکر بیٹھے، چائے کافی، سگریٹ وغیرہ سے تواضع ہوتی رہی، سردار ہاشم خاں نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ہے، میں نے کہا بلا ساز کے کوئی مضائقہ نہیں۔

وہ شاید ساز کا لفظ نہ سمجھے، فرمایا، "ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی، مرد گاتے ہیں" ڈاکٹر اقبال نے تائید کی، گویوں یا قوالوں یا فوجی نغمہ نوازوں کا ایک دستہ آیا، نشستیں کرسیوں پر تھیں، وہ ادب سے آداب بجالا کر نیچے قالین پر بیٹھ گیا، اور نغمہ طرازی شروع کی، ہندوستان میں تو بیدل عظیم آبادی کی بہت کم پرسش ہے، مگر افغانستان اور سنا ہے ایشیائے وسطی کے دوسرے فارسی داں ملکوں میں بیدل کی بہت قدر ہے، قوالوں نے بھی بیدل کی غزل شروع کی، پھر حافظ کی ایک دو غزلیں پڑھیں پھر بیدل کو شروع کیا، تھوڑی دیر تک یہ مجلس سماع گرم رہی اور بعد ازیں میزبان کا شکریہ ادا کر کے سب مہمان ۱۱ بجے رات کے قریب رخصت ہوئے،

دوسرے دن جمعہ کا روز تھا، خیال تھا کہ آزاد اسلامی ملک کا بھی جمعہ دیکھیں، صبح کو مختلف اصحاب ملنے کو آئے جنمیں ہندوستانی بھی تھے، اور تعلیم یافتہ افغان، اور اہل منصب بھی، ہندوستان اور افغانستان کے وقت میں قریب قریب ایک گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے، وہاں کی گھڑی ہمارے ہاں سے ایک گھنٹہ پیچھے رہتی ہے، میں نے اپنی گھڑی نہیں بدلی تھی، اور صاحبوں نے پیچھے کر لی تھی، نماز کا وقت بارہ بجے کے بعد آگیا، شاہ نادر خاں مرحوم مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے، مگر اس دن شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں، جسکا نام "جامع مسجد پُل خشتی" ہے، نماز پڑھنے والے تھے، ہم لوگ بھی وہیں پہنچے، امیر معاویہ پر جب سے دمشق کی مسجد میں ایک خارجی نے حملہ کیا تھا، اس وقت سے سلاطین اسلام میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ مسجد کی عمارت میں ایک گھرا ہوا کمرہ بادشاہ کے لیے ہوتا ہے، امیر معاویہ نے جب یہ بدعت جاری کی تھی تو اس کا نام "مقصورہ" تھا، معلوم نہیں افغانستان میں اس کو کیا کہتے ہیں، بہر حال اس جامع مسجد میں بھی یہ مقصورہ بنا ہوا ہے، اور افغانستان کے بادشاہ اسی میں نماز پڑھتے رہے ہیں،

"پُل خشتی" ایک پل کا نام ہے، جو لکڑی کے بجائے اینٹوں سے بنا ہے، اسلئے پل خشتی کہلاتا ہے، اور اسی نسبت سے مسجد کو جامع مسجد پل خشتی کہتے ہیں، یہ مسجد پرانے شہر میں ایک تنگ بازار کے اندر واقع ہے، مسجد گو وسیع تھی، مگر ہندوستان کی جامع مسجدوں کی طرح شاندار نہیں، نمازی دروازے سے لیکر محراب تک بھرے تھے، غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی، ظاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کی عام مالی حالت بلند نہیں، یہ سب پرانے افغانی

لباسوں میں تھے، سامنے منبر پر کوئی افغانی مولوی صاحب فارسی میں وعظ فرما رہے تھے،

ہم لوگوں کو شاہی مقصورہ میں لے جایا گیا، وہاں دوسرے مخصوص اصحاب بھی پہلے سے موجود تھے، تھوڑی دیر کے بعد اعلیحضرت شاہ نادر خاں مرحوم تشریف لائے، چھریرا بدن، بالا قامت جسم پر سیاہی مائل مخطط سوٹ، پاؤں میں بوٹ، سر پر کلاہ اور دستار، ہاتھوں میں سپید دستانے، مسجد میں وہ نہایت سادگی کے ساتھ داخل ہوئے، اہل مسجد سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، یعنی جن صفوں سے وہ گذرے، وہاں لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوئے اور نہ واعظ صاحب نے اپنا وعظ بند کیا، موحد مسلمانوں کی یہ ادا کس قدر مؤثر ہے کہ خانۂ خدا میں غیر خدا کی تعظیم نہیں، جب وہ مقصورہ کے دروازہ کے پاس آئے، تو آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا، جو اسلام کی مساوات کی عملی مثال کے طور پر دل میں محفوظ رہے گا،

وہ مقصورہ کے دروازہ کے سامنے پہنچے تو ایک بلند بالا غریب پیر کہن سال اپنی جگہ سے اٹھکر ان تک پہنچا، سر پر پرانی مندیل بندھی تھی، پاس پہنچکر اس نے شاہ مرحوم کے رخسار کو بوسہ دیا، (افغانستان میں محبت کے اظہار کے طور پر ایک دوسرے کے رخسار کو بوسہ دیتے ہیں) شاہ مرحوم نے بھی اسی محبت سے اوسکے رخسار کو بوسہ دیا، اور اوسکو اپنے ساتھ مقصورہ میں لے آئے، اور باڈی گارڈ کے آدمیوں سے فرمایا کہ انکو بھی یہیں اگلی صف میں جگہ دو، اندر آکر سب سے ملے، مجھ سے چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی، اسلئے سردار فیض محمد خاں نے مجھے ملایا، مصافحہ کیا، اور تواضع اور خاکساری کے انداز میں خیریت دریافت فرمائی، اور اپنے پہلو میں جگہ دی، تھوڑی دیر کے بعد وعظ ختم ہوا، موذن نے اذان دی، اذان کے بعد سب سنتیں پڑھنے کو کھڑے ہوگئے، پھر دوسری اذان ہوئی اور خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا، دوسرے خطبہ کے آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خاں کا نام لیا، تو میں نے دیکھا کہ مرحوم نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر تواضعاً اپنے سر کو جھکا دیا، ان کی یہ ادا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی،

خطبہ کے بعد دوگانۂ جمعہ، اور اس کے بعد حسب معمول سنتیں ادا ہوئیں، لوگ اپنی جگہ جگہ پر بیٹھے رہے

اس کے بعد امام نے دعا مانگی، اور سب مصلیوں نے بھی آمین کے لئے ہاتھ اٹھائے، نماز سے فارغ ہو کر، شاہ مرحوم نے ایک اور مؤثر نظارہ پیش کیا، ان مرد ضعیف کو اپنے پاس بلا کر ہم لوگوں سے فرمایا کہ یہ سید ہیں، اور نیک ہیں اور میرے پرانے ملنے والے ہیں، پھر ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے کہ "اسلام کا بھلا ہو، اور مسلمانوں کی خدمت جس سے بن آئے، اسکو نیک توفیق عطا ہو" پہلے تو وہ سمجھے نہیں کہ شاہ مرحوم نے کیا فرمایا، شاہ نے دوبارہ وہی الفاظ فرمائے تو انھوں نے دعا، کے لیے ہاتھ اٹھائے، شاہ مرحوم نے اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا کر آمین کہی،

اس کے بعد سب اٹھے، شاہ مرحوم نے ہم مہمانوں سے فرمایا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے، اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو ساتھ ہی کھانا تناول کریں، مگر دوسرے ضروری کاموں کے سبب سے ہم سب نے اس وقت معذرت چاہی، اس کے بعد سب پیدل کر وہ اپنے موٹر پر واپس گئے، ان کے پیچھے اُن کے باڈی گارڈ کی کار روانہ ہوئی

ہم غلام ملک کے رہنے والوں کے لیے شاہ و گدا کی یکساں نماز کا نظارہ نہایت مؤثر تھا، ڈاکٹر اقبال فرمانے لگے کہ آج میں سمجھا کہ دار الحرب میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں؟ میں نے عرض کی، ڈاکٹر صاحب آپ نے اسلام کے نظریہ کے طور پر جو فرمایا تھا،

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

آج آپ نے عملاً اسکی تصویر دیکھی، اگر غزنین کا بڑا مرقع نہیں دیکھا تو کابل کا چھوٹا مرقع تو دیکھ لیا، فرمایا ہاں دیکھ لیا،

(باقی)

خیام

ازسید سلیمان ندوی

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ، اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر سب سے مفصل، اکمل اور حق المقدور محققانہ، یہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے، ضخامت ۰۲۰ ۵ صفحات، کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ، قیمت غیر مجلد ہے مجلد للعہ

"منیجر"

رہبانیت اور اسلام

وَرُهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ

از

مولانا عبد السلام ندوی،

اسلام سے پہلے دو متضاد نظامِ اخلاق دنیا مین قائم تھے، اور ان دونون کو اون لوگون نے قائم کیا تھا، جو اپنے دینی اور دنیوی اقتدار سے دنیا کو ان کا پابند بنا سکتے تھے، ایک نظامِ اخلاق تو روم اور ایران کے شہنشاہو رئیسون، امیرون اور دولت مندون کا تھا، جو ہر قسم کی دنیوی شان و شوکت، دنیوی جاہ و جلال، اور دنیوی آرایش و نمایش کے اظہار کا ذریعہ تھا، اور آج یہی نظامِ اخلاق یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ طبقہ مین پہنچکر اور بھی زیادہ شاندار لطیف اور رنگین ہوگیا ہے، اور تمام دنیا اوسکی پابند ہو رہی ہے،

دوسرا نظامِ اخلاق یہودیون، عیسائیون اور ہندؤن کے مذہبی پیشواؤن کا تھا، جسمین انتہا درجہ کی بوسیدگی، انتہا درجہ کی شکستگی، انتہا درجہ کی خشکی، اور انتہا درجہ کی ترشروئی پائی جاتی تھی، اور اس مین تکلف کے بجائے سراسر تکلیف ہی تکلیف تھی، لیکن اس تکلیف کے باوجود ان لوگون کا دینی اقتدار اس کو دنیا مین اس قدر مقبول بنا رہا تھا، کہ جو لوگ اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے اس طریقِ زندگی کے مخالف تھے، وہ بھی ان لوگون کا احترام کرتے تھے اور آج بھی پوپون سنیاسیون اور درویشون کے سامنے بڑے سے بڑے گردن فراز لوگون کے سر نیاز جھک جاتے ہین،

اسلام آیا تو یہ دونون نظامِ اخلاق انتہائی عروج کی حالت مین قائم تھے، اور اون مین ہر قسم کی

دینی اور دنیوی کشش پائی جاتی تھی لیکن اسلام نے شدت کے ساتھ ان دونون کی مخالفت کی اور اس
مقابل مین ایک نہایت معتدل نظامِ اخلاق قائم کیا جس مین فطری میلان کے سوا کسی قسم کی رنگینی تو
اور تراش وخراش نہ تھی، باپ مان کے فرمانبردار رہو، بچون سے محبت رکھو، عورتون کے ساتھ عمدہ سلو
کرو، زمین پر اکڑ کر مت چلو، نرم لہجے مین بولو، اگر کوئی سلام کرے، تو اس کے سلام کا جواب اوس سے بہتر ط
دو، یہ اور اسی قسم کی سیکڑون اخلاقی باتین اسلامی نظامِ اخلاق کا جزو ہین، اور یہ ایسی باتین ہین جو بچون کو ر
مین پڑھائی جاتی ہین، اس لئے اس قسم کی سادہ اخلاقی باتون کو سنکر بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر د
سب سے بڑے اور سب سے آخری پیغمبر کا یہ کونسا عظیم الشان اخلاقی کارنامہ ہے اور اس مین کونسی جدت اور ندرت پائی

۱- سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی حقیقی چیزین جن سے دنیا اور اہلِ دنیا کا وجود قائم ہے
ہین جو سادہ اور معتدل اور فطری ہین، لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غیر فطری چیزون کی مصنوعی لیکن مز
لذتین، دنیا کو ان فطری چیزون سے غافل کر دیتی ہین، اور ایسی حالت مین ایک پیغمبر کا اصلی کارنامہ صر
یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے چہرے سے ان غیر فطری اور مصنوعی چیزون کا نقاب اوتار کر پھینک دے، تا
کا اصلی چہرہ روشن ہوجائے، دودھ اور پانی نہایت سادہ فطری چیزین ہین، مگر انھی دونون سے ا
زندگی کو نشو ونما حاصل ہوتی ہے لیکن ایک شرابی، شراب کو ان دونون پر ترجیح دیتا ہے، اور شراب کی مص
لطافتون کے سامنے ان دونون قدرتی چیزون کی کوئی قدر وقیمت نہین ٹھہرتا، ایسی حالت مین اگر کو
اوس کو دودھ اور پانی کے فوائد اور شراب کے نقصانات سمجھاتا ہے، تو اس کے یہ معنی نہین ہین کہ وہ سائنس
کسی جدید اور دقیق مسئلہ کی ایجاد کرتا ہے، بلکہ اوس کا اصلی کارنامہ صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ اس شخص کی آ
کے سامنے سے نشہ کا مصنوعی پردہ ہٹا دینا چاہتا ہے، رسول اللہ صلعم کے زمانے مین اخلاقی حیثیت سے د
حالت بھی شرابیون کی سی ہو رہی تھی، ایک طرف تو فرمانروایانِ روم وایران اپنے شاہانہ ساز وسامان
نشے مین چور اور دوسری طرف یہودیون عیسائیون اور ہندوؤن کے مذہبی پیشوا اپنی گدڑی مین گ

کہ اسی حالت مین رسول اللہ صلعم نے اپنی سادہ اور معتدل اخلاقی تعلیم سے ان دونون فریق کی آنکھون کے سامنے سے غفلت کے یہ پردے دور کر دئے اور فطرت کا جو خوبصورت چہرہ حریر کی چمکدار قباؤن اور کمل کی گدڑیون کے اندر چھپ گیا تھا، اوس کو اپنے اصلی حسن و جمال مین دنیا کے سامنے پیش کر دیا،

۲- دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو معتدل فطری نظامِ اخلاق قائم کیا وہ اگرچہ بظاہر نہایت بے رنگ اور سادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس زمانے کی حالت کو پیشِ نظر رکھا جائے جس مین رسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے تھے، تو صاف معلوم ہوگا کہ آپ کی اخلاقی تعلیمات اوس زمانے کے حالات کے بالکل مخالف تھین، اور مخالف حالات پر قابو پانا اور زمانے کی روش کے مخالف چلنا بڑے بڑے اولوالعزم ہی لوگون کا کام ہو سکتا ہے، اوس زمانے مین اہلِ عرب بالخصوص صحابۂ کرام نہایت غربت و افلاس کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، ایک صحابی کا بیان ہے کہ مین ساتوان مسلمان ہون، اوس وقت یہ حالت تھی کہ ہم لوگ درخت کے پتے کھا کھا کر گذر اوقات کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے جبڑے پھٹ پھٹ گئے تھے،

تمام اہلِ مدینہ کی عام غذا کھجور اور جو تھی، جو کا آٹا بھی چھنا ہوا نہین ہوتا تھا، کیونکہ صحابہ کے گھرون مین چھلنی نہین ہوتی تھی، آٹا پیس کر مونہ سے پھونک دیتے تھے، بھوسی اُڑ جاتی تھی، اور جو کچھ بچ جاتا تھا اس کو کھا لیتے تھے،

کپڑے کی یہ حالت تھی کہ بہت سے صحابہ کے پاس صرف ایک چادر ہوتی تھی، جس کو گلے مین باندھکر ٹخنون تک لٹکا لیتے تھے، کہ تہبند اور کرتہ دونون کا کام دے، ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا کہ ایک کپڑے مین نماز جائز ہے یا نہین؟ تو ارشاد ہوا،

اولکلکم ثوبان. کیا تم مین ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہین،

شادی بیاہ مین دلھنون کو معمولی جوڑا بھی میسر نہین ہوتا تھا، حضرت عائشہ رضہ کا بیان ہے کہ میرے پاس گاڑھے کی ایک کرتی تھی، شادی بیاہ مین جب کوئی دولھن سنواری جاتی تھی تو وہ مجھ

سے اوس کو مستعار منگوا لیتی تھی، رومال نہایت معمولی درجہ کی چیز ہے، لیکن صحابۂ کرام کو وہ بھی میسر نہ تھا، کھانا کھاتے تھے، تو پانؤں کے تلودن مین ہاتھ پونچھ لیتے تھے،

صحابۂ کرام کے گھر نہایت مختصر، پست اور کم حیثیت ہوتے تھے، اون مین پائخانے تک نہین ہوتے تھے، اور راتون کو گھرون مین چراغ تک نہین جلائے جاتے تھے، یہ حالت بالکل راہبانہ اور جوگیانہ زندگی کے مطابق تھی، اور ایسی حالت مین اگر آپ راہبانہ اور جوگیانہ زندگی کی تعلیم و یتے تو اس ماحول کے بالکل مطابق ہوتی اور صحابۂ کرام نہایت آسانی کے ساتھ اوس کو قبول کر لیتے،

زمانۂ جاہلیت مین بھی مذہبی حیثیت سے اہل عرب کا میلان رہبانیت ہی کی طرف تھا، مثلاً مذہبی اعمال مین اہلِ عرب کا سب سے محبوب ترین عمل حج تھا، اور اوس کو وہ طرح طرح کی ریاضتون کے ساتھ ادا کرتے تھے، مثلاً اہل یمن جب سفرِ حج کیلئے روانہ ہوتے تھے تو کسی قسم کا زادِ راہ ساتھ نہین لیتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم لوگ متوکل باللہ ہین، خدا کے گھر کا حج کرتے ہین تو کیا وہ ہم کو کھانا نہ کھلائے گا؟ لیکن مدینہ تک پہنچکر بھیک مانگنے لگتے تھے، ایک رسم یہ تھی کہ جب یہ حج کرتے تھے تو گھرون کے اندر دروازے کے راستے سے نہین داخل ہوتے تھے، بلکہ گھر کی پشت سے پھاند کر آتے تھے، کیونکہ وہ چاہتے تھے، کہ زمانۂ حج مین اون کے اور آسمان کے درمیان کوئی درمیانی چیز حائل نہ ہونے پائے، اس لئے اگر وہ دروازون سے گھر مین آتے تو اون کے اور آسمان کے درمیان چھت حائل ہوجاتی، ایک طریقہ یہ تھا کہ ایّامِ حج مین قریش کے سوا عرب کے اور تمام مرد اور عورت ننگے ہوکر طواف کرتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ قریش کے لوگ چونکہ خانۂ کعبہ کے مجاور تھے، اس لئے اونھون نے تمام اہلِ عرب پر اپنا تفوق قائم کرنے کیلئے یہ طریقہ ایجاد کرلیا تھا، دوسری بات یہ تھی کہ اہلِ عرب کپڑے پہن کر مذہبی مراسم کا ادا کرنا مذہبی زہد و تقشف کے مخالف سمجھتے تھے، زمانۂ جاہلیت کی ان سختیون کا اثر عہدِ اسلام مین بھی قائم رہا، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا

کہ اپنے دونوں بیٹوں کا سہارا دیکر چل رہا ہو، وجہ دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ اوس نے خانہ کعبہ تک پا پیادہ چلنے کی منت مانی ہو، ایک صحابیہ نے بھی اسی قسم کا ارادہ کیا اور رسول اللہؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا، توآپ نے فرمایا پیدل بھی چلو اور سوار بھی ہو لیا کرو، ایک طریقہ یہ تھا کہ اونٹوں کی طرح ناک میں نکیل ڈال لیتے تھے، دوسرا شخص اسکو پکڑ کر کھینچتا تھا، خود رسول اللہ صلعم نے اسی طرح ایک شخص کو طواف کرتے دیکھا،

حج کا زمانہ عرب میں خصوصیت کے ساتھ تجارتی گرم بازاری کا زمانہ ہوتا ہے لیکن اسلام لانے کے بعد صحابہ کرامؓ زمانۂ حج میں تجارت کو ایک گناہ کا کام سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ تو صرف ذکر و عبادت کا زمانہ ہے، ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور کسی دنیوی کام میں مشغول نہیں ہونا چاہیے،

بعض لوگ روزے کے متعلق بھی طرح طرح کی سختیوں کا التزام کرتے تھے مثلاً روزہ رکھتے تھے تو دھوپ میں کھڑے رہتے تھے، اور کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، اور ان تمام حالات نے رہبانیت کی تعلیم کیلئے فضا کو بالکل صاف کر دیا تھا، اسلام آیا تو اوس نے صحابۂ کرام میں اور بھی شدت کے ساتھ ذوق عمل پیدا کیا، اور اس حالت میں قدرتی طور پر بہت سے صحابہ رہبانیت کی طرف مائل ہوئے، چنانچہ چند صحابہ نے رسول اللہ صلعم کی بیبیوں کی خدمت میں آکر آپ کی عبادت کا حال دریافت کیا، لیکن جب آپ کی معتدل عبادت گذاری کا حال معلوم ہوا، تو اونھوں نے اپنے معیار کے مطابق اوس کو کم سمجھا، اور اوس کی یہ تاویل کی کہ ہم میں اور رسول اللہ صلعم میں بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ آپکے اگلے پچھلے گناہ سب معاف ہو چکے ہیں، اسلئے آپ کو بہت زیادہ عبادت کی ضرورت نہیں، اسلئے ان میں ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھتا رہونگا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھونگا، ایک صحابی بولے کہ میں کبھی نکاح ہی نہ کرونگا، حضرت عثمان بن مظعونؓ ایک رہبانیت پسند صحابی تھے، اونھوں نے اپنے اوپر عورت، خوشبو، اور ہر لذیذ چیز کو حرام کرنا چاہا، یہانتک کہ رسول اللہ صلعم سے بدھی ہونے کی اجازت حاصل کرنی چاہی، اور صحابہ کہتے ہیں، کہ اگر آپ اون کی یہ درخواست منظور فرما لیتے تو ہم سب کے سب بدھی ہوجاتے،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ تھے، جو سخت سے سخت ریاضت اور سخت سے سخت عبادت میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے دیکھا کہ مسجد کے دونوں ستونوں کے درمیان ایک رسّی بندھی ہوئی ہی، دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ ایک صحابیہ نے جن کا نام زینب ہے، یہ رسی باندھ رکھی ہے، جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو اوس سے لٹک جاتی ہیں، تاکہ نیند نہ آنے پائے، ایک صحابی تھے جو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے تھے، اور رات کو نماز پڑھتے تھے،

اسلام میں جہاد بھی ایک عبادت ہی، اس لئے اس کا شوق بھی صحابہ کے دلوں میں رہبانیت کا میلان پیدا کرتا تھا، چنانچہ حضرت سعد بن ہشامؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بی بی کو طلاق دیدی، اور مدینہ آیا کہ وہان کی جائداد کو بیچ کر ہتھیار خریدوں اور جہاد کروں، اون کو چند صحابہ اور ملے، جنھوں نے کہا کہ ہم میں سے اور چھ شخصوں نے بھی یہی ارادہ کیا تھا،

ان سب سے بڑھکر یہ کہ خود صحابہ میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ ایسا موجود تھا، جو بالکل راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو بالکل خدمت اسلام کیلئے وقف کر دیا تھا، اور ہر قسم کے دنیوی کاروبار یعنی زراعت، تجارت اور ملازمت وغیرہ کو چھوڑ کر اپنی زندگی صرف عبادت گذاری کیلئے نذر کر دی تھی، یہ لوگ راتوں کو عموماً عبادت کرتے تھے، اور قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چُن لاتی تھی، اور اس کو بیچ کر اپنے بھائیوں کیلئے کھانا مہیا کرتی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے، اور جب شادی کر لیتے تھے، تو اوس حلقہ سے نکل جاتے تھے، ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے، کہ رانوں تک لٹک آتی تھی، اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے، اور مسجد کی چھت میں لگا دیتے تھے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتی تھیں، یہ لوگ اون کو اوٹھا کر کھا لیتے تھے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، رسول اللہ صلعم کے پاس جب کہیں سے کوئی صدقہ کا کھانا آتا تھا، تو کل اون کے پاس بھیج دیتے تھے

اور جب دعوت کا کھانا آتا تھا، تو اون کو بلا لیتے تھے، اور ان کے ساتھ بیٹھکر کھاتے تھے، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ راتون کو رسول اللہ صلعم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے تھے یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو آدمی کو اپنے ساتھ لیجاتا تھا، اور ان کو کھانا کھلاتا تھا، چنانچہ بعض فیاض اور دولت مند صحابہ کبھی کبھی اسّی اسّی آدمیون کو ساتھ لیجا کر کھانا کھلاتے تھے، ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی،

ان تمام واقعات کے پیش نظر رکھنے کے بعد علانیہ ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ بالکل رہبانی تعلیم کی دعوت دے رہی تھی، لیکن بایں ہمہ رسول اللہ صلعم نے رہبانیت کی مخالفت کی، اور عام اعلان فرمایا،

انّ اللہ ابدلنا بالرّھبانیۃ الحنفیۃ	خدا نے رہبانیت کے بدلے ہم کو آسان اور سیدھا مذہب عطا فرمایا،

اور جو لوگ نکاح کو مذہبی زہد و تقشف کے خلاف سمجھتے تھے، اون کو ہدایت فرمائی،

تزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ولا تکونوا کرھبانیۃ النصاری.	یعنی نکاح کرو کیونکہ مین اور امتون کے مقابل مین تمھاری بڑھی ہوئی نسلی تعداد پر فخر کرونگا، اور عیسائیون کی طرح جوگی پنا نہ اختیار کرو،

صرف اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ رہبانیت کے خلاف متعدد دلائل قائم کئے:-

۱- چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رض کے متعلق جبکہ عورت، خوشبو، اور تمام لذیذ چیزون کو اپنے اوپر حرام کرلینا چاہتے تھے، یہ آیت نازل ہوئی:-

یاایھا الذین آمنوا لا تحرموا الطیبٰت ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا انّ اللہ لا یحب المعتدین.	(ترمذی تفسیر سورۂ مائدہ)	مسلمانو! خدا نے جو پاکیزہ چیزین تمھارے لئے حلال کردی ہین، اون کو (اپنے اوپر) حرام نہ کرو، اور حد سے نہ بڑھو، کیونکہ خدا حد سے بڑھنے والون

اس ایت سے بتصریح ثابت ہوا کہ اسلام نے رہبانیت کی مخالفت اس بنا پر کی کہ وہ توسط اور اعتدال کے مخالف تھی، کیونکہ انسانی زندگی کا مقصد صرف عیش و عشرت نہیں ہے، لیکن اس معاملہ مین اس قدر حد سے بھی نہ بڑھ جانا چاہئے، کہ ہر خوشگوار اور لذیذ چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے، یہان تک کہ شراب کی طرح برف کا شربت بھی ناجائز ہو، اور اجنبی عورتون کی طرح اپنی عورت بھی اپنے اوپر حرام کر لیجائے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ رہبانیت کی بنیاد درحقیقت نفس کشی پر قائم تھی، یعنی بہت سے لوگون کا خیال تھا کہ انسان خدا کیلئے جسقدر دکھ اٹھاتا ہو، اوسی قدر خدا اوس سے خوش ہوتا ہے، لیکن رسول اللہ صلعم نے اس خیال کو غلط قرار دیا، چنانچہ ایک صحابی ایک سال آپ کی خدمت مین حاضر ہو کر واپس چلے گئے، دوسرے سال پھر حاضر خدمت ہوئے، تو صورت اس قدر بدل گئی تھی، کہ آپ نے اُن کو نہین پہچانا، اور اونھون نے خود اپنا تعارف کرایا، تو آپ نے فرمایا تمھارا رنگ روپ کیون بدل گیا، تمھاری صورت تو اچھی خاصی تھی، بولے جب سے آپ سے جدا ہوا رات کے سوا ون کو کبھی نہین کھایا، یعنی برابر روزے رکھے، فرمایا تم نے اپنی جان کو کیون دکھ دیا، ؟ پورے رمضان کا روزہ رکھو، اور ہر مہینے مین صرف ایک دن کا۔

۳- رہبانیت کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے، کہ انسان عبادت کی معمولی مقدار پر قناعت نہین کرتا، بلکہ اس قدر عبادت کرتا ہے، جو انسانی طاقت سے باہر ہوتی ہے، چنانچہ جن صحابیہ نے مسجد کے دونون ستونون کے درمیان ایک رسی باندھ رکھی تھی، جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تھین تو اس سے لٹک جاتی تھین، تا کہ نیند نہ آنے پائے، لیکن رسول اللہ صلعم نے اس رسی کو کھلوا دیا، اور فرمایا کہ

لیصل احدکم نشاطہ فاذا فتر فلیقعد،	یعنی جب تک آدمی چست و چالاک رہے اوس وقت تک نماز پڑھے اور جب تھک جائے تو بیٹھ جائے،

اس غیر معمولی عبادت کے بے نتیجہ ہونیکی ایک وجہ اور بتائی،

علیکم ما تطیقون من الاعمال	یعنی تم لوگ صرف اوتنی ہی عبادت کرو جتنی کہ تمکو

فانّ اللّٰہ لا یمل حتیٰ تملوا۔ | بخاری ومسلم | طاقت ہے، کیونکہ خدا ثواب دینے سے اوس وقت تک نہین تھکتا جب تک تم لوگ خود۔

ایک حدیث مین ہے، کہ جب کسی کو نماز پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے، تو اُس کو سو رہنا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے کہ استغفار کی حالت مین توبہ و استغفار کے بجائے وہ اپنے آپ کو گالیان دینے لگے،

اصل یہ ہے کہ دل پر اثر کسی کام کی کثرت کا نہین ہوتا، بلکہ مداومت کا ہوتا ہے یعنی جو کام ہمیشہ کیا جاتا ہے گو اوسکی مقدار کم ہو، وہی نتیجہ خیز ہوتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ

اِنّ اَحبّ الاعمال ادومھا الی اللّٰہ وان قلّ۔ | یعنی خدا کو وہی عبادت سب سے زیادہ پسند ہے جو ہمیشہ کی جائے، گو وہ کم ہو،

رسول اللہ صلعم سے زیادہ عبادت گذار کون ہوگا؟ لیکن جب حضرت عائشہ رضؓ سے سوال کیا گیا، کہ رسول اللہ صلعم کو کون سی عبادت سب سے زیادہ پسند تھی، تو بولین کہ وہ جو ہمیشہ کیجائے؛ اسی اصول کی بنا پر اسلام نے کثرتِ عبادت اور کثرتِ ریاضت کو ناجائز قرار دیا، اور اسی چیز پر رہبانیت کی بنیاد قائم رہتی تھی

۴- رہبانیت کی بنیاد ایک اور چیز پر بھی قائم ہے یعنی گوشہ نشینی اور مخلوقِ الٰہی سے علٰحدگی پر، اس لئے اصلی سوال یہ ہے کہ سوسائٹی سے الگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بہتر ہے، یا سوسائٹی مین شامل ہو کر رہنا افضل ہے؟ اسلام نے دوسری صورت کو ترجیح دیا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے:-

انّ المسلم اذا کان یخالط النّاس و یصبر علی اذاھم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس و لا یصبر علی اذاھم۔ | جو مسلمان لوگون مین مل جل کر رہتا ہے، اور اون کی دی ہوئی تکلیفون پر صبر کرتا ہے، اوس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگون مین نہ تو مل جل کر رہتا ہے نہ اُن کی دی ہوئی تکلیفون پر صبر کرتا ہے۔

حکمائے اسلام نے فلسفۂ اخلاق پر جو کتابین لکھی ہین، اون مین بھی یہی ثابت کیا ہے کہ انسان

کے فضائل اخلاق کا ظہور صرف سوسائٹی میں رہنے سے ہوتا ہے، سوسائٹی سے الگ رہکر کوئی شخص محاسن اخلاق کا اظہار نہیں کرسکتا، چنانچہ ابن مسکویہ کتاب الطہارۃ میں لکھتا ہے کہ

"حکما کا قول ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی وہ ایک ایسے شہر کا محتاج ہے، جسمین بہت سے لوگ رہتے ہون، تاکہ اوسکی انسانی سعادت مکمل ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ انسان لوگون کی دوستی، معاشرت اور اون کی سچی محبت کرنے پر مجبور ہے، کیونکہ یہ لوگ اوسکی ذات اور اس کی انسانیت کو مکمل کرتے ہین، اور وہ بھی اون کے لئے ایسا ہی کرتا ہے، پس جب یہ فطری ضرورت ٹھہری تو ایک عقلمند آدمی کیونکر تنہائی اور گوشہ نشینی کو اختیار کرسکتا ہے، اور ایسی حالت مین جو لوگ سوسائٹی سے الگ ہوکر پہاڑون کے غارون مین رہتے ہین، یا میدانون مین عبادت خانے بنا لیتے ہین، یا شہرون مین پھرا کرتے ہین، اون کو کوئی اخلاقی فضیلت بلکہ سرے سے انسانیت ہی نہین حاصل ہوتی، کیونکہ جو شخص سوسائٹی سے الگ رہتا ہے، اوس سے بہادری، سخاوت اور عدالت کوئی چیز ظاہر نہین ہوسکتی بلکہ اوس کے فطری قوا اور ملکات بالکل بیکار ہوجاتے ہین، اور اون کا رخ خیر و شر کسی کی طرف نہین ہوتا، ایسی حالت مین یہ لوگ بمنزلہ جمادات اور مردون کے ہین، کہ وہ لوگ اپنی نسبت خود خیال کرتے ہین اور دوسرے لوگون کا بھی اُن کی نسبت یہی خیال ہوتا کہ وہ پاکباز اور عادل ہوتے ہین لیکن درحقیقت وہ پاکباز اور عادل نہین ہوتے، یہی حال تمام اخلاقی فضائل کا ہے یعنی جب اس قسم کے لوگون سے برائیان نہین سرزد ہوتین، تو لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ یہ لوگ صاحب اخلاق ہین، حالانکہ اخلاقی فضائل بیکار چیز نہین، بلکہ وہ افعال واعمال ہین، جن کا ظہور تمام معاملات اور تمام اجتماعی کامون مین مشہور آدمیون کے سامنا اون کے گھرون مین ہوتا ہے"

اسی فلسفیانہ اصول کی بنا پر اسلام نے اجتماعی زندگی کو فضائل اخلاق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا اور راہبانہ زندگی کی تمام خصوصیات کے مخالف اخلاقی تعلیم دی، مثلاً راہبانہ زندگی کا نتیجہ یہ تھا کہ اعزہ واقارب بلکہ ماں

باپ تک کی محبت دلون سے جاتی رہتی تھی، زندہ دلی اور خوش طبعی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا، لیکن اس کے مخالف اسلام نے اعزہ و اقارب بالخصوص ماں باپ کے تعلقات کو نہایت اہم اور ضروری قرار دیا، چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا، کہ میری بہترین خدمت کا مستحق سب سے زیادہ کون ہے؟ فرمایا "تمھاری ماں" اوس نے کہا کہ پھر کون، فرمایا "تمھارا باپ"، عیسائی راہب عورتون سے سخت نفرت رکھتے تھے، لیکن اسلام نے عورتون کو زندگی کا نہایت ضروری جزو ٹھہرایا، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا:-

الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المرأة الصالحة.	یعنی دنیا ایک پونجی ہے، اور دنیا کی سب سے بہتر پونجی نیک عورت ہے۔

اور خانگی ضروریات اور معاشرتی تعلقات کے علاوہ، عورت کو شگفتگی خاطر، اور خوش طبعی کا ایک ذریعہ قرار دیا، چنانچہ ایک صحابی نے ایک شادی شدہ عورت سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ

فهلا تزوجت بكرا تضاحلك وتضاحكها وتلاعبك وتلاعبها.	یعنی تم نے کنواری عورت سے شادی کیون نہین کی جو تم سے ہنسی مذاق کرتی اور تم اوس سے ہنسی مذاق کرتے، وہ تمھارے ساتھ کھیلتی، اور تم اوس (بخاری)

اولاد کی پرورش اور محبت کو بہت بڑی اخلاقی فضیلت قرار دیا، اور جو عورتین اولاد سے زیادہ محبت رکھتی تھین، خاص طور پر اون کی تحسین و ستایش کی، چنانچہ فرمایا:-

خیر نساء رکبن الابل نساء قریش احناهن على ولد فی صغره.	عرب کی عورتون مین سب سے بہتر قریش کی عورتین ہین جو بچپن مین بچون سے بہت زیادہ محبت رکھتی ہین

ایک صحابی آپ کی خدمت مین اپنے بچے کو لیکر حاضر ہوئے، اور اوس کو چمٹانے لگے، آپ نے فرمایا "تم کو اوس سے محبت ہے؟" بولے "ہان" فرمایا اس سے زیادہ تم سے ارحم الراحمین کو محبت ہے، بعض صحابہ ایسے تھے، جو اپنے تمام مال و دولت کو خدا کی راہ مین دے دینا چاہتے تھے، لیکن چونکہ اس سے اولاد کے حق

کو صدمہ پہنچتا تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے اون کو اس نیت سے باز رکھا، چنانچہ ایک صحابی نے اپنے مرض الموت مین آپ سے درخواست کی، کہ مین صاحب مال ہون اور میری وارث صرف ایک لڑکی ہے، کیا مین اپنے مال کا دو ثلث خیرات کر سکتا ہون؟ فرمایا نہین، اونھون نے کہا تو آدھا، فرمایا نہین صرف ایک تہائی" اور یہ بھی بہت ہی، اگر تم اپنے ورثہ کو دولت مند چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج اور بھیک منگا بنا کر چھوڑ جاؤ، تم خالصتہ لوجہ اللہ جو کچھ بھی صرف کروگے یہان تک کہ اپنی بی بی کے منہ مین اگر لقمہ بھی ڈالوگے تو تم کو اس کا ثواب ملے گا"،

زندہ دلی اور خوش طبعی کی یہ کیفیت تھی کہ خود رسول اللہ صلعم کا معمول تھا، کہ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک مصلے پر بیٹھے رہتے تھے، اور اس حالت مین صحابۂ کرام زمانۂ جاہلیت کے واقعات بیان کرتے تھے اشعار پڑھتے تھے، اور ہنستے تھے، اور آپ ان تذکرون کو سنکر مسکراتے تھے،

عید کے دن چھوٹے چھوٹے لڑکے اور چھوٹی چھوٹی لڑکیان آپ کے پاس جمع ہو کر باجے بجاتی تھین اور مسرت کے ترانے گاتی تھین، حدیث کی کتابون مین ہے کہ صحابۂ کرام مردہ دل اور خشک مزاج نہ تھے، بلکہ اپنی صحبتون مین اشعار پڑھتے تھے، اور جاہلیت کے واقعات کا تذکرہ کرتے تھے،

۲- راہبانہ زندگی کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انسان کھانے پہننے اور رہنے سہنے کے تمام پر لطف اور راحت رسان طریقون کو چھوڑ کر نہایت ادنی درجہ کی وحشیانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہو چنانچہ ایک راہب نے پورے ۳۰ سال جو کی روٹی اور گدلے پانی پر بسر کئے، ایک اور راہب سال بھر مین صرف ایک بار ایسٹر کے دن حجامت بنواتا تھا، نہ کبھی کپڑا بدلتا تھا، نہ اوس کو دھوتا تھا، یہانتک کہ وہ خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جسم سے اوتر جاتا تھا، ایک اور راہب عمر بھر ایک تنگ و تار غار مین رہا، ایک اور بزرگ جنگل کی خاردار جھاڑیون مین رہتے تھے، اور سونے کیلئے کبھی نہین لیٹتے تھے، ایک راہب نے پچاس سال تک اپنے چہرہ یا پاؤن پر پانی کی چھینٹ تک پڑنے نہین دی، لیکن اسلام چونکہ اصولاً اس زندگی کا

مخالف تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے ہر موقع پر اس کی مخالفت کی، چنانچہ ایک بار بعض صحابہ نے اسی قسم کی راہبانہ زندگی بسر کرنے کا تہیہ کیا، اور ان مین ایک صاحب نے کہا کہ "مین بچھونے پر نہ سوؤنگا" رسول اللہ صلعم کو خبر ہوئی تو ایک عام تقریر کی جسمین فرمایا کہ لوگ ایسا کیون کہتے ہین،؟ مین تو نماز بھی پڑھتا ہون اور سوتا بھی ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون، اور نکاح بھی کرتا ہون، تو جو شخص میرے طریقہ سے انحراف کرے گا، وہ مجھ سے الگ ہے"، ایک صحابی کہتے ہین، کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہتے تھے، اور پانی برستا تھا، تو ہمارے جسم سے بھیڑ اور بکری کی بو آتی تھی، یعنی چونکہ صحابہ غربت و افلاس کی وجہ سے بھیڑ بکری کے اون کا کپڑا پہنتے تھے، اس لئے جب اون پر بارش کے چھینٹے پڑتے تھے، تو ان سے بھیڑ بکری کی بو آتی تھی، یہ ایک قدرتی رہبانیت تھی، جس کو آسانی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا تھا لیکن اسلام چونکہ اصولاً راہبانہ زندگی کا مخالف تھا، اس لئے اوس نے اس ناگوار حالت مین تغیر پیدا کیا، اور رسول اللہ صلعم نے ہر جمعہ کو غسل کرنا، اور خوشبو لگانا واجب یا کم از کم سنت قرار دیا، لیکن یہ غسل کیون ضروری قرار دیا گیا، اس کی وجہ خود صحابہ کی زبان سے سننا چاہئے،

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان فرماتے ہین، کہ صحابۂ کرام سخت تنگدست تھے، کمل کے کپڑے پہنتے تھے، اپنی پیٹھ پر بوجھ لادتے تھے، اور اون کی مسجد نہایت تنگ اور اوس کی چھت نہایت پست تھی، یعنی اوپر چھت کی جگہ صرف ایک چھپر تھا، ایک روز رسول اللہ صلعم نماز جمعہ کیلئے مسجد مین آئے، دن نہایت گرم تھا، لوگون کو کمل کے کپڑے مین پسینہ آیا تو اُن کے بدن سے اس قدر بو پھیلی کہ سب کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلعم کو بو کا احساس ہوا تو فرمایا کہ لوگو جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور جہان تک ممکن ہو، عمدہ تیل اور عمدہ خوشبو لگاؤ، صرف جمعہ ہی کی تخصیص نہین بلکہ آپ صفائی اور ستھرائی کو عموماً بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور لوگون کو مہذب صورت مین رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، چنانچہ آپنے ایک شخص کو دیکھا کہ اوس کے بال بکھرے ہوئے ہین، نہ تو اوس نے تیل لگایا ہے، نہ کنگھی کی ہے، فرمایا کیا اس کو بالون کے

سلجھانے اور ہموار کرنے کا سامان میسر نہین، ایک اور شخص کو دیکھا کہ نہایت گندہ اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوے ہو، فرمایا کیا اوس کو پانی نہین ملتا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھوے، ایک اور صحابی کہتے ہین، کہ مین رسول اللہ صلعم کی خدمت مین نہایت معمولی درجہ کے کپڑے پہنکر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کیا تمھارے پاس مال ہے؟ اونھون نے کہا ہان، فرمایا کس قسم کا مال ہے، بولے خدا نے مجھکو اونٹ، بکریان، گھوڑے، غلام سب کچھ دیا ہے، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے احسان کے نشانات تمھارے جسم سے ظاہر ہونے چاہئین، یعنی تم کو اپنی حیثیت کے موافق کپڑے پہننے چاہئین،

جسمانی طہارت و پاکیزگی، بلکہ جسمانی زیب و زینت کی چند معمولی چیزین ایسی ہین، جو تمدن اور وحشیانہ زندگی کے درمیان حد فاصل ہوسکتی ہین، اور اون کی پابندی مین بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ بھی صرف نہین ہوتا، لیکن راہب اور سنیاسی لوگ چونکہ ہر ممکن طریقہ سے زیب و زینت کی چیزون سے احتراز کرتے ہین، اس لئے ان کی پابندی کو مذہبی زہد و تقشف کے خلاف سمجھتے ہین، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی شکل و صورت نہایت وحشیانہ ہو جاتی ہے، اور صفائی و پاکیزگی ان کو چھو بھی نہین جاتی لیکن اسلام چونکہ دنیا کو وحشیانہ حالت سے نکالنے اور تہذیب و شایستگی کے پھیلانے کیلئے آیا تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے ان چیزون کو خصال الفطرۃ کا لقب دیا اور فرمایا، کہ "دس باتین فطرت مین محسوب ہین" یعنی مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک مین پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیون کی بیچ کی جگہ کو دھونا، بغل اور زیر ناف کے بال منڈوانا، منہ مین پانی ڈال کر کلی کرنا، اور استنجا کرنا، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ دین فطرت کے بانی اول یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ان باتون پر عمل کر کے خدا سے دریافت کیا، کہ یہ کیا ہے،؟ جواب ملا کہ "وقار" فرمایا تو خداوندا میرے وقار کو اور بڑھا، ان تعلیمات کو پیش نظر رکھکر اگر وحشیون، سنیاسیون، سادھوؤن اور راہبون کی جسمانی حالت پر نظر ڈالی جائے، تو صاف معلوم ہوگا کہ ان لوگون نے دنیا مین رہبانیت اور سنیاس کے نام سے کسقدر

غلاظت نجاست، گندگی، بلکہ وحشت پھیلا رکھی تھی، لیکن اسلام نے رہبانیت کا خاتمہ کرکے انسانیت کے چہرے کوکس قدر نازک لطیف اور روشن کردیا، لیکن ان تعلیمات کے ساتھ اسلام نے انتہا درجہ کی نمایش اور آرایش کی بھی ممانعت کی ہے، چنانچہ حضرت فضالہ بن عبیدؓ مصر کے گورنر تھے، لیکن ان کی یہ حالت تھی، کہ ایک دوسرے صحابی اون سے ملنے کیلئے گئے، تو دیکھا کہ اون کے بال بکھرے ہوئے ہین، وجہ پوچھی تو بولے کہ رسول اللہ صلعم ہم لوگون کو بہت زیادہ عیش پرستی سے منع فرماتے تھے، سرسے اوتر کر پاؤن پر نظر پڑی تو دیکھا کہ پاؤن مین جوتا نہین ہے، بولے آخر ایسا کیون ہے، ؟ فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤن رہا کرین، اس لئے رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیمات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو راہبانہ اور جوگیانہ زندگی سے ملتا جلتا ہے،

چنانچہ ایک بار آپ کے سامنے صحابۂ کرام نے دنیوی عیش وعشرت کا ذکر کیا تو فرمایا کہ کیا تم لوگ نہین سنتے ؟ کیا تم لوگ نہین سنتے ، ؟ پھٹے حال مین رہنا ایمان کا ایک جزو ہے، ایمان کا ایک جزو ہے، ایک حدیث مین ہے کہ خدا نے تم کو جو کچھ دیا ہے، اوس پر خوش رہو، تو سب سے زیادہ دولتمند سمجھے جاؤگے اور بہت زیادہ نہ ہنسو، کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے، ایک صحابی سے آپ نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت مین سے صرف ایک خادم اور ایک سواری جس پر سوار ہوکر تم جہاد کرسکو، کافی ہے، ایک حدیث مین ہے کہ کھیتی باڑی نہ کرو، اس سے تمھارے دلون مین دنیاداری کا میلان پیدا ہوگا،

ایک حدیث مین ہے کہ اگر تم لوگ خدا پر اچھی طرح توکّل کرو تو تم کو روزی اوسی طرح ملے گی، جس طرح چڑیون کو ملتی ہے، کہ صبح کو خالی پیٹ جاتی ہین اور شام کو پیٹ بھرکے آتی ہین،

ایک حدیث مین ہے، کہ مجھکو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے، جو گمنام ہو، اور تھوڑی سی روزی رکھتا ہو اور اسی پر قناعت کرے، ایک صحابی نے آپ سے کہا کہ مین آپ کو محبوب رکھتا ہون، فرمایا ذرا سوچ سمجھ کے کہو، اوںھون نے کہا، خدا کی قسم مین آپ کو محبوب رکھتا ہون، فرمایا اگر تم مجھے محبوب رکھتے ہو، تو فقر وفاقے

کیلئے تیار ہو جاؤ، کیونکہ جو شخص مجھکو محبوب رکھتا ہی، اسکی طرف احتیاج سیلاب کی طرح بڑھتی ہی،

ایک حدیث مین ہے کہ جنت مین میرے حوض پر پہلے فقرائے مہاجرین اترین گے، جن کے سرون کے بال پریشان اور کپڑے میلے ہین، جو نازپرورده عورتون سے نکاح کرنے کی صلاحیت نہین رکھتے، اور جب کسی کے دروازے پر جاتے ہین، تو اون کو اندر آنے کی اجازت نہین ملتی" ایک حدیث مین ہے کہ جو شخص باوجود استطاعت کے محض خاکساری سے عمدہ لباس کا پہننا ترک کردے گا، خدا اوس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اوس کو اختیار دے گا، کہ اہل ایمان کے حلون مین سے جو حلہ چاہے پہن لے،، اسی قسم کی اور بھی بہت سی حدیثین ہین، اور ان حدیثون سے پہلے زیب و زینت اور صفائی و پاکیزگی کے متعلق جو حدیثین نقل کیگئی ہین، بظاہر اون کے مخالف ہین لیکن درحقیقت ان حدیثون مین کسی قسم کا اختلاف و تناقض نہین ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب ان دونون قسم کی حدیثون کو نقل کر کے لکھتے ہین، کہ

"ان دونون قسم کی حدیثون مین کوئی اختلاف نہین ہی، کیونکہ اس جگہ درحقیقت دو مختلف چیزین ہین، جو بظاہر مشتبہ معلوم ہوتی ہین، لیکن ان مین ایک چیز تو مقصود ہے اور دوسری مذموم، جو چیز مقصود ہے وہ بخل کا چھوڑنا ہے، لیکن انسانی مدارج کے اختلاف سے بخل مین بھی اختلاف ہو جاتا ہی مثلاً بادشاہون کیلئے جو چیز بخل مین داخل ہے، وہ ایک فقیر کے حق مین بعض اوقات فضول خرچی مین داخل ہو جاتی ہے، دوسری جو چیز مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ بدوؤن اور وحشیون کی عادتین نہ اختیار کیجائین، بلکہ صفائی، پاکیزگی اور عمدہ عادتون کی خو ڈالی جائے، لیکن جو چیز مذموم اور بری ہے وہ یہ ہو کہ تکلف، نمایش، اور کپڑون پر فخر کرنے مین بہت زیادہ مبالغہ نہ کیا جائے، اور محتاجون کی دلشکنی نہ ہونے پائے، اس قسم کی اور بھی بہت سی باتین ہین، اور حدیث کے الفاظ مین ان باتون کی طرف اشارات پائے جاتے ہین،

(باقی)

اغلبیون کا عدالتی نظام

از

سید ریاست علی ندوی،

اغلبیون کی حکومت، افریقہ مین ۱۸۴ھ سے ۲۹۶ھ تک رہی، اس حکومت کے قیام سے پیشتر افریقہ، مرکزی حکومت بغداد کے ایک ماتحت صوبہ کی حیثیت سے تھا، جس پر مصر کی حفاظت کے خیال سے قبضہ رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا، اور اسی لئے خزانہ مصر سے ایک لاکھ سالانہ کی رقم یہان فوجی نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے خرچ کی جاتی تھی،

جب ۱۸۴ھ مین ابراہیم بن اغلب اس صوبہ کا والی بنایا جانے لگا، تو اوس نے افریقہ کو ایک آزاد صوبہ کی حیثیت مین لانے کیلئے اس رسم کو ترک کرنا چاہا، اور خلیفہ ہارون رشید سے استدعا، کی کہ مصر کے خزانے پر ولایت افریقہ کا بار نہ ڈالا جائے، مزید بران خود حکومت افریقہ سے سالانہ چالیس ہزار دینار قبول کئے جائین ہارون رشید نے یہ تجویز خوشی سے منظور کر لی، اوس وقت سے افریقہ مین گویا ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی، جس کا بانی یہی ابراہیم بن اغلب تھا، اوس کے بعد افریقہ کی یہ حکومت اسی کے خاندان مین متوارث رہی، یہان تک کہ اسماعیلیون نے ۲۹۶ھ مین اس کا خاتمہ کیا،

دولت اغلبیہ کا نظام حکومت اون مختلف شعبون مین تقسیم تھا، جو اوس عہد مین متمدن حکومتون کیلئے ضروری سمجھے جاتے تھے، چنانچہ عدالت و قضا کا صیغہ بھی اون کے نظام حکومت مین جداگانہ قائم تھا، اگرچہ ہماری سنہ وار تاریخون مین اس کا کوئی مستقل تذکرہ نظر نہین آتا تاہم کچھ ان کتابون مین اور زیادہ تر افریقہ کے علماء و ارباب فضل

کے سوانح حیات و تراجم میں اس صیغہ کی تفصیلات کے نشانات ملتے ہیں جن سے اس کے متعلق ایک سرسری اندازہ ہوجاتا ہے،

قضاۃ کا تقرر | افریقیہ میں دولت اغلبیہ کے قیام سے پیشتر تک قضاۃ افریقیہ کا تقرر براہ راست خلفاء عباسیہ کرتے تھے، چنانچہ جب پہلا اغلبی والی ابراہیم اپنے عہدہ پر آیا، تو اس وقت عہدۂ قضاء پر عبد اللہ بن غانم سرفراز تھے، اور انھیں خود ہارون رشید نے اس عہدہ پر مامور کیا تھا، (معالم الایمان ج ۲ ص ۲۱)

پھر جب اغلبی حکومت قائم ہوئی، تو قضاۃ کے تقرر کا حق خلفائے عباسیہ سے منتقل ہو کر اغلبی فرمانرواؤں کو حاصل ہوگیا، چنانچہ عبد اللہ بن غانم کی وفات سے جب یہ جگہ خالی ہوئی، تو خود فرمانروائے افریقیہ ابراہیم بن اغلب نے اپنے اختیار سے قاضی ابو محرز کو یہ عہدہ سپرد کیا، (معالم ج ۲ ص ۱۹) اغلبی فرمانروا کا نامزد قاضی ساری حکومت کیلئے قاضی القضاۃ ہوتا، جس کا لقب بالعموم "قاضی افریقیہ" ہوتا، اور کبھی "قاضی قیروان" (دار السلطنت) بھی کہا جاتا، اور یہی "قاضی افریقیہ یا قاضی قیروان"، اغلبی حکومت کے محکمۂ "دیوان القضاء" کا افسر اعلیٰ ہوتا،

دیوان القضاء

دیوان القضاء میں حسب ذیل تقسیم کا پتہ چلا ہے، دفتر دار القضاء، مجلس قضاء، قضاۃ صوبہ جات و ولایت، دیوان المظالم اور دار الافتاء، دیوان القضاء کی اصطلاح کا اطلاق ان سب کے مجموعہ پر ہوتا تھا،

دفتر دار القضاء و مجلس قضاء | دیوان القضاء کا صدر دفتر جامع قیروان میں تھا، اور یہیں مجلس قضاء بھی ہوتی تھی،

عمال دفتر اپنے اپنے مشاغل کے لحاظ سے "کاتب" "صاحب" "وثائق" "حجاب" وغیرہ کہلاتے، موخر الذکر، موجودہ اصطلاحات کے رو سے، گویا موجودہ کچہریوں کے کلرک، منشی، "پیشکار" اور چپراسی ہیں

یہ "کاتب" اور "صاحب وثائق" اپنے زمانہ کے ممتاز اہل علم مین ہوتے تھے، علوم دینیہ، فقہ (قانون اسلامی) اور ادب پر انھین عبور حاصل ہوتا، مثلاً ابن عذاری حوادث ۲۹۵ھ مین لکھتا ہے،

اسی سال ابو عقال بن خیر فقیہ نے بھی انتقال کیا، وہ اہل عراق (احناف) کے مذہب کے پیرو تھے، اور ابن عبدون کے زمانہ مین اون کے کاتب، (کلرک) تھے، (ابن عذاری ترجمہ اردو ص ۲۰۰)

اسی طرح ایک "صاحب وثائق" کی وفات کے موقع پر لکھتا ہے،

اسی سال (۳۱۹ھ) احمد بن احمد بن زیاد الفارسی **صاحب وثائق** نے قیروان مین وفات پائی، یہ صاحب علم و فضل تھے، عیسیٰ بن مسکین (قاضی القضاۃ افریقیہ) کے زمانہ مین احکام و مراسلات کی کتابت ان کے ذمہ تھی، وثائق، شروط، اور مواقیت صلوٰۃ کے متعلق ان کی تصنیفات بھی ہین، (ر صفحہ ۲۸۶)

مجلس قضا کا اجلاس ابتدائے عہد سے قاضی ابو محرز (۱۹۱ھ ۔ ۲۱۴ھ) کے ابتدائی زمانہ تک اسی جامع قیروان مین ہوتا رہا، کچھ دنون کے بعد وہ جامع مسجد کے بجائے اپنے گھر ہی پر مقدمات کی سماعت کرنے لگے، (معالم الایمان ج ۲ ص ۲۰، ۲۳) پھر انھی کے عہد مین اسی عہدہ پر مساوی اختیارات کے ساتھ قاضی اسد بن فرات بھی بعض وجوہ سے مامور کئے گئے، ادھون نے حسب سابق اپنے اجلاس کیلئے جامع قیروان ہی کو منتخب کیا (ر ص ۲) اور پھر جب امام سحنون کا زمانہ (۲۳۴ھ ۔ ۲۴۰ھ) آیا، تو اونھون نے بھی اسی قدیم مقام کو دار القضا قرار دیا، اور اس کے بعد یہی مقام عہد آخر تک دار القضا رہا،

امام سحنون نے اپنے عہد مین مسجد ہی کے احاطہ مین عدالت کیلئے ایک مستقل عمارت تعمیر کرائی، اور اسی مین اجلاس کرنے لگے، عمارت کے صدر دروازہ پر دربان ہوتے، جو اشخاص متعلق مقدمہ کے بجز کسی کو اندر نہ جانے دیتے، عدالت کی یہ عمارت بعض تاریخی روایات کی بھی دلچسپ حامل بن گئی چونکہ

اس کے تعمیر کرانے والے امام سحنون مالکی المذہب تھے، اور اونھون نے دمشق و بغداد کی روایات کے برخلاف اپنی ذاتی رائے سے عدالت کیلئے ایک مستقل عمارت اگرچہ وہ صحن مسجد ہی مین کیون نہ ہو، بنوائی تھی، اس لئے یہ احناف اور مالکیہ کا ایک اختلافی مسئلہ بن گیا، احناف کے پیش نظر غالبا قضاۃ بغداد کا طرز عمل تھا، وہان بھی قاضی القضاۃ ہمیشہ پایہ تخت کی مسجد جامع مین اجلاس کرتا رہا، اس لئے اون کے نقطۂ نظر سے اس جداگانہ عدالتگاہ کی ضرورت نہین تھی، چنانچہ افریقہ کی اس عمارت کے ساتھ یہ پیش آیا، کہ امام سحنون کے بعد جو قضاۃ افریقیہ مالکی المذہب مقرر ہوئے وہ اسی مین اپنا اجلاس کرتے رہے، لیکن جب کوئی حنفی المذہب قاضی مقرر ہوتا تو اس عمارت کو منہدم کرا دیتا، اور پھر جب کوئی مالکی قاضی آجاتا تو اس کو از سر نو تعمیر کراتا، معالم مین ہے،

وکان یجلس فی بیت فی الجامع بناہ لنفسہ اذ رای کثرۃ الناس وکثرۃ کلامھم فکان لا یحضر عندہ غیر الخصمین ومن یشھد بینھما وکانت قضاۃ المالکیۃ یحکمون فیھا بعدہ واذا ولی عراقی ھدمھا واذا ولی مدنی بناھا۔

(ج ۲ ص ۵۶)

اور وہ (امام سحنون) جامع مسجد کی ایک عمارت مین اپنا اجلاس کرتے تھے، جسکو خود اونھین نے تعمیر کرایا تھا، کیونکہ اونھین سماعت مقدمہ کے وقت لوگون کی کثرت اوران کی زیادہ گفتگو سے تکلیف محسوس ہوئی، چنانچہ اس کے بعد اون کے سامنے مدعی مدعا علیہ اور اون کے گواہون کے سوا اور کوئی حاضر نہ ہوسکتا تھا، اور مالکی قضاۃ اون کے بعد اسی عمارت مین اجلاس کرتے رہے اور جب کوئی حنفی قاضی آجاتا تو اس کو منہدم کرا دیتا، پھر جب کوئی مدنی قاضی مقرر ہوتا،

عدالت مین قاضی القضاۃ کی معیت مین چار دیگر فقہا بھی سماعتِ مقدمہ کے وقت مشورہ کیلئے بیٹھا کرتے تھے، جسے دورِ حاضر کی اصطلاح مین "ججون کی بنچ" یا "اسیسرون کی جماعت" کے الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہین، اگرچہ ان فقہا کی حیثیت کسی قدر ان سے مختلف تھی، ان فقہا کو قضاۃ خود اپنے ساتھ بٹھاتے تھے اور وہ مقدمہ کی مالہ و ماعلیہ کی سماعت کرتے، مقدمہ کی سماعت کے بعد قاضی ان سے نقد و نظر کے ساتھ بحث و گفتگو کرتا، جب سب کی رائین اور دلیلین معلوم ہو جاتین، تو مقدمہ کا کوئی فیصلہ کیا جاتا، اس لئے فقہا کی یہ جماعت نہ تو "ججون کی بنچ" سے کلیۃً مطابق ہے، کہ انھین حق قضاءت حاصل نہ تھا، اور نہ انھین "اسیسرون کی جماعت" کہا جاسکتا ہے، کہ دورِ حاضر مین کم از کم ہندوستان کی عدالتون مین اسیسرون کا انتخاب علم و فضل کے اعتبار کے بجائے مالیہ کی کثرتِ ادائی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف یہ چارون فقہا، اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز ہوتے تھے اور قاضی کے ساتھ کسی خاص قسم کے مقدمون مین شرکت کرنے کے بجائے جیسا کہ اسیسرون مین ہوتا ہے، ان تمام مقدمون مین شریکِ سماعت رہتے جو قاضی کی عدالت مین دائر ہوتے تھے، معالم مین قاضی حماس بن مروان کے متعلق ہے،

واجلس معه من الفقهاء اربعة	اور اپنے ساتھ چار فقہا موسیٰ ابن القطان، ابو
موسی ابن القطان واباعبد الله	عبداللہ الضراب اور عبدالرحمٰن الورقہ . . . . کو
الضراب وعبد الرحمن الورقة ...	بٹھایا، اور اون سے درخواست کی، کہ اون
و..... وسالهم ان ينظر وماید ور	کے اجلاس مین جو مقدمات زیرِ سماعت ہون
في مجلسه ولا يحكم بين خصمين	حاضر رہ کر اون پر غور کرین، اور اون سے
حتى يناظرهم في قضيتهما (ص ۲۲۴)	جب تک فریقین کے قضیہ پر تبادلہ خیال ع

عورتون کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک خاص دن

بعض قضاۃ افریقیہ نے عورتون کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک خاص دن مقرر کر دیا تھا، جسمین صرف عورتون کے مقدمات سُنے جاتے تھے، اجلاس مین صرف قاضی

بیٹھتا، حاجب اور دربان اور پیشکار تک مجلس سے رخصت کر دیئے جاتے، قاضی ابو محرز کے سوانح حیات مین مذکور ہے،

وکان ابو محرز یجلس الخصوم فی دارہ ویجعل للنساء یوما عند باب دارہ،	ابو محرز مقدمات اپنے گھر پر کرتے تھے، اور انھون نے عورتون (کے مقدمات) کیلئے ایک خاص دن مقرر کر دیا تھا، اوس دن وہ اپنے مکان کے دروازے کے پاس اجلاس کرتے تھے،
(معالم ج ۲ ص ۲۳)	

اسی طرح قاضی عبد اللہ بن غانم کے تذکرہ مین ہے،

کان یجلس للنساء یوما ونقله المالکی عن ابی محمد عبد اللہ بن ابی زید عن عبد اللہ بن سعید ابن الحداد عن ابیه وزاد وکان یزیل الکتاب والحجاب من بین یدیه فی ذالک الیوم الذی یجلس فیه للنساء،	(عبد اللہ بن غانم) ایک خاص دن عورتون کے مقدمات سننے کیلئے بیٹھتے تھے، اس کا تذکرہ مالکی نے ابو محمد عبد اللہ بن ابی زید سے اور انھون نے سعید سے اور سعید نے اپنے باپ حداد سے نقل کیا ہے، اور یہ بھی اس پر مستزاد بتایا ہے کہ جس دن عورتون کے مقدمے سننے بیٹھتے اوس دن اپنے پاس سے پیشکارون اور دربانون کو علٰحدہ کر دیتے تھے،
(ر ج ۱ ص ۲۲)	

مہر عدالت

عدالت کی مہر قاضی کی انگوٹھی مین ہوتی، عدالت کی تمام تصدیقون کا مدار اسی انگوٹھی پر ہوتا اس لئے اس انگوٹھی کو قضاۃ کسی وقت جدا نہین کرتے تھے، اور اس کی حفاظت قاضی کے فرائض منصبی مین بھی جاتی تھی، فرمانروایان اغالبہ بھی اس کی نگرانی رکھتے تھے، کہ اس مہر کی پوری حفاظت ہوتی رہے، اس سلسلہ مین قاضی ابو محرز کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ معالم مین نقل ہے،

قاضی ابومحرز کی طبیعت کسی قدر تنگی واقع ہوئی تھی، وہ جب تک وضو کرنے مین پانی خوب نہ بہالیتے اون کی تشفی نہ ہوتی، اس لئے وضو کرتے وقت انگوٹھی کو پہنے رہنا اون کیلئے دشوار تھا، وضو کے وقت اُن کی انگلی خالی دیکھکر لوگون کو در پردہ شکوک پیدا ہوے، اور کسی نے افواہًا فرمانروائے افریقیہ ابراہیم بن اغلب تک یہ شکایت پہنچا دی کہ وہ وضو کے وقت انگوٹھی اوتار کر گھر مین رکھدیتے ہین، گھر کی عورتین موقع پاکر جس پر چاہتی ہین، مہر لگا لیتی ہین، ابراہیم کو یہ سنکر جستجو ہوئی، چنانچہ ایک دن قاضی ابو محرز وضو کرنے مین مصروف تھے، کہ ابراہیم کے دو خدام خاص اچانک آپہنچے، اور اون سے برجستہ سوال کیا، کہ "امیر دریافت فرماتے ہین کہ اس وقت آپ کی انگوٹھی کہان ہے،" قاضی ابو محرز اپنا وضو جاری رکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ گردن کے پاس لیگئے، اور سینے پر سے ایک ڈور اوٹھا کر دکھائی اور کہا "یہ دیکھو میں ڈورین بندھی ہوئی میری گردن مین لٹکی ہے"، (معالم ج ۲ ص ۲۴)

قضاۃ صوبہ جات ولایت، قاضی القضاۃ افریقیہ، افریقیہ کی دوسری ولایتون اور صوبون کیلئے قاضی مقرر کرتے تھے، چنانچہ افریقیہ کی مختلف ولایتون صقلیہ، طرابلس، اور زاب وغیرہ کے قضاۃ انھی کے مقرر کردہ ہوتے ان قضاۃ کا کبھی کبھی تبادلہ بھی ہوتا، اور انھین معزول بھی کرنے کا اختیار تھا، ولایتون کی قضاۃ سے مراد ساری ولایت کی قضات تھی، مثلاً ابوالعباس اسحق بن ابراہیم ازدی کے سوانح مین ہے،

ولی قضاء الزاب لعیسیٰ بن مسکین	عیسیٰ بن مسکین (قاضی القضاۃ) کے عہد مین
ثم ولاہ حماس قضاء طرابلس	زاب کے قاضی مقرر ہوئے، پھر انھین حماس نے
وکان عدلا فی احکامہ واراد	طرابلس کی قضاۃ پر مامور کیا، یہ اپنے فیصلون
بالزاب ای وسائر عمالہ لقول	مین عدل و انصاف کرتے تھے، اور "زاب"
التیجی ولی قضاء الزاب وطبنۃ باغاۃ	سے مراد اس کا پورا صوبہ ہے کیونکہ تیجی کا بیان
لعیسیٰ بن مسکین ایام ابراھیم بن احمد	تصریح سے ہے کہ زاب، طبنہ اور باغایہ کی قضات

وولاه حماس القضاء ایام زیادة الله قضاء اطرابلس۔ (معالم ج ۲ ص ۲۲۴)

عیسیٰ بن مسکین کی طرف سے ابراہیم بن احمد کے عہدِ حکومت میں ملی، اور حماس نے ان کو زیادۃ اللہ کے زمانہ میں طرابلس کا قاضی مقرر کر دیا۔

ولایت کے یہ قضاۃ اپنے صوبہ کے دیوان القضاء کے افسر اعلیٰ ہوتے، ان کے یہاں بھی عمال دفتر علیحدہ ہوتے، اور یہ خود اپنے صوبہ کے مختلف شہروں کیلئے قاضی مقرر کرتے، اور ان کے عزل و نصب کا اختیار انھی کو ہوتا،

ولایتوں کے قاضیوں کی اگر شکایتیں ہوتیں، تو وہ قاضی القضاۃ تک پہنچتیں جنکی یا تو وہ تحقیقات کرتے، یا اگر بے محل شکایتیں ہوتیں تو رد کر دیتے،

دیوان نظر المظالم نظر المظالم کا علیحدہ محکمہ اسی دیوان القضاء کے ماتحت قائم تھا، اس میں دو قسم کے مقدمات پیش ہوتے، ایک تو عمال و کارپردازان حکومت کی زیادتیوں کی وہ شکایتیں اس میں سنی جاتیں جو اون سے اپنے عہدہ کے فرائض کی انجام دہی میں سرزد ہوتیں، دوسرے بازار کے معاملات خرید و فروخت لین دین، ناپ تول، اور بیع و شرا میں جو زیادتیاں اور اختلافات ہوتے، اون کی دادرسی اور فیصلے کئے جاتے، اور شہر کی آبادی والے، اپنے کسی حق سے تجاوز کرتے تو اون کی گرفت ہوتی، یا کوئی ایسے فعل کا مرتکب ہوتا جو شہر کے باشندوں کی تکلیف کا باعث ہوتا تو بھی اوس کی گرفت ہوتی،

اس صیغہ کی پہلی قسم کے کاموں کے متعلق بالعموم مورخین اسلام نے تذکرہ کیا ہے، دوسری قسم کے کاموں کی تفصیل ذیل کے اقتباس سے ہو گی، معالم میں ابو القاسم محمد بن محمد بن خالد القیسی المعروف بہ طرزی کے سوانح حیات میں ہے،

وولاه عیسیٰ بن مسکین علی مظالم القیروان وولاه حماس بعد عشر

انھیں عیسیٰ بن مسکین نے مظالم قیروان پر مقرر کیا، پھر حماس نے انھیں قضاۃ سپرد کی دس

سنین... المراد بالمظالم احکام السوق (جلد ۳ ص ۶) سال تک اور مظالم سے مراد بازار کے احکام ہین۔

طرزی نے بازار مین بڑی خوبی سے نظم وضبط قائم کیا، چنانچہ صاحب معالم کا بیان ہی،

لم یل اسواق القیروان قبلہ اضبط منہ۔ قیروان کے بازارون مین اس سے پہلے کسی نے اسقدر ضبط ونظم قائم نہین کیا،

چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ اپنے عہدے پر سرفراز تھے، قیرواں کے بازار مین گذر رہے تھے ایک مقام پر جامع مسجد کے سامنے بڑی مقدار مین پانی بہتا نظر آیا جس سے راستہ کی آمد ورفت مین زحمت پیش آرہی تھی، یہ فوراً وہین رک گئے، تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ امام جامع مسجد کا یہ فعل ہے، ان کے کوئین مین چوہا گرگئی ہی، بلاکر دریافت کیا، اور راستہ کی آمد ورفت روکنے کے جرم مین اس عظیم المرتبت شخصیت کو بھی قیدخانہ بھیج دیا، جب ظہر کی نماز کا وقت آیا، لوگون کو امام کی تلاش ہوئی، اور لوگ ان کے پاس سفارشی بن بن کر آنے لگے، کہ جرم سے چشم پوشی کیجائے، اور اون کو رہا کر دیا جائے، آخر انھین قیدخانہ سے نکالنے کا حکم دیا، جب سامنے آئے تو کہا" اگر تم امام نہ ہوتے، اور لوگ تم سے مستغنی ہوتے، تو مین تمھین قید سے باہر نہ نکالتا،، (معالم ج ۳ ص ۸)

اسی لئے محکمۂ مظالم کا یہ عہدہ معزز عہدون مین شمار ہوتا، اور ممتاز اہل علم اس پر سرفراز کئے جاتے تھے، چنانچہ قیروان کے محکمۂ مظالم پر حبیب بن نصر تمیمی (۲۲۷ھ) ابو العباس بن خداش تمیمی الفقیہ متوفی ۲۹۶ھ ابو العباس احمد بن ابراہیم بن احمد بن اغلب (۲۸۷ھ) وغیرہ جیسے ممتاز فقہا کے نام ملتے ہین، (ابن عذاری ترجمہ اردو ص ۱۴۹، ص ۱۹۶، ص ۲۰۰،)

محکمۂ مظالم مین جو فقہا، وقضاۃ عہدیدار تھے، اون کے مناصب مقرر تھے، اونکے محدود ومتعین اختیارات کے لحاظ سے اوسی نوعیت کے مقدمات اون کی عدالت مین دائر ہوتے تھے، یعنی استغاثہ مین مالیت کی تعداد ومقدار کے لحاظ سے ان قضاۃ کو مقدمات کی سماعت کا حق حاصل تھا، قاضی ابو الربیع سلیمان

بن سالم کندی المعروف بابن کحالہ، عیسیٰ بن مسکین کے عہد مین قیروان کے محکمہ مظالم مین تھے، ان کے متعلق تصریح ہے:

ولاہ ابن طالب قضاء باجۃ واعمالھا وولاہ عیسی بن مسکین مظالم القیروان واذن لہ ان ینظر فی مائۃ دینار (معالم ج ۲ ص ۱۳۱)

ابن طالب نے انھین باجہ اور اوس کے صوبہ کا قاضی مقرر کیا، اور پھر عیسیٰ بن مسکین نے انھین مظالم قیروان پر مامور کیا، اور اجازت دی کہ سو دینار تک (کے مقدمات کا فیصلہ کرین)

محکمہ افتاء | صیغۂ افتاء بھی دیوان القضاء کے ماتحت تھا، مفتی شہر کا تقرر بھی قاضی القضاۃ کرتا جس کے فتاوے شرعی مسائل مین، نافذ ہوتے، مفتی کا انتخاب قضاۃ چھان بین کے بعد کرتے، اور تقرر سے پہلے امتحان لے کر تشفی کر لیتے، مثلاً قاضی عبداللہ بن طالب کے عہد مین محمد بن سحنون افتاء کی خدمت انجام دیتے تھے، اون کی وفات کے بعد فقیہ ابو العباس اس خدمت کو انجام دینے بیٹھے، مگر ابن طالب نے انھیں اس سے روکا، اور پہلے اونکی آزمایش کی، اسکے بعد اجازت عطا کی، معالم مین ہے:

ولما مات محمد بن سحنون جلس ابو العباس للفتیا فانکر عبد اللہ بن طالب القاضی ثم بعث الی ابی الفضل السوسی ان یختبرہ فالقی علیہ کتاب الفرائض فاجاب عنہ کلہ فاباح لہ ابن طالب الفتیاء،

(معالم ج ۲ ص ۲۳۶)

محمد بن سحنون کی وفات کے بعد ابو العباس افتاء کی خدمت انجام دینے بیٹھے، مگر قاضی عبداللہ بن طالب نے اونھین اس خدمت سے روک دیا، اور ابو الفضل سوسی کو اونکے امتحان کیلئے روانہ کیا، چنانچہ وہ ابو العباس کے پاس آئے اور کتاب الفرائض بطور امتحان اون کے سامنے پیش کی، سب کا اونھون نے جواب دیا، اور ابن طالب نے اون کی خدمت افتاء کو منظور کیا،

قوانین حکومت اسلامی قانون، قرآن مجید، احادیث، قاضی کی ذاتی رائے یعنی اجتہاد یا قیاس سے عبارت ہے، اور اسی کا مجموعہ فقہ کہلاتا ہے، اغالبہ کے عہد حکومت تک فقہ کے مذاہبِ اربعہ مین ایسی عصبیت پیدا نہین ہوئی تھی، کہ ان کا اجتماع ممکن نہ ہوتا، اس لئے سلطنتِ اغالبہ کا قانون فقہ حنفی یا فقہ مالکی کے بجائے محض فقہ اسلامی تھا، اسی لئے عہدۂ قضاء پر کبھی مالکی المذہب مقرر ہوتے کبھی حنفی المذہب متعین کئے جاتے، علاوہ ازین یہ بھی کوئی ضرور نہ تھا کہ اگر قاضی القضاۃ مثلاً مالکی ہے، تو اپنے ماتحت صوبہ کے قضاۃ بھی مالکی المذہب ہی مقرر کرے، بلکہ یہ بھی ضرور نہ تھا، کہ قاضی مدعی و مدعا علیہ کے مسلک فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہوتا، بلکہ اونھین اختیار رہتا تھا، کہ وہ اپنے فہم و بصیرت کے لحاظ سے جو کچھ حق و دیانت سمجھین، اوسی کے مطابق فیصلے کرین، خواہ مدعی و مستغیث یا مدعا علیہ فقہ اسلامی کے مذاہب مین سے کوئی مذہب بھی رکھتا ہو،

چنانچہ امام سحنون نے اپنے عہدۂ قضات مین قاضی سلیمان بن عمران کو جو بعد مین قاضی القضاۃ بھی بنے، ولایت بجایہ کا قاضی مقرر کیا، سلیمان مسلکاً حنفی تھے، اور اہل بجایہ مین ایک بڑی تعداد مالکی المذہب بھی تھی، آخر باشندگان بجایہ کی ایک جماعت امام سحنون کے پاس شکایت لیکر آئی کہ سلیمان اپنے مذہب حنفی کے مطابق فیصلے کرتے ہین، امام سحنون نے اوس کے جواب مین کہا ،،

ما قدمته عليكم الا وانا اعلم انه يحكم بمذهبه.

(ج ۲ ص ۹۹)

مین نے جب انھین تمھارے صوبہ مین بھیجا، تو یہ جان کر بھیجا کہ وہ اپنے ہی مذہب (حنفی) کے مطابق فیصلے کرین گے،

شکایت لیکر آنے والا گروہ خاموشی سے واپس چلا گیا، (ج ۲ ص ۹۹) یہی وجہ ہے کہ اغالبہ کے عہد مین افریقہ مین مذہب مالکی کی مقبولیت کے باوجود اکثر فقہا حنفی المذہب تھے، معالم مین ہے،،

ان اكثر الفقهاء اذ ذاك على راى الكوفيين

(ج ۲ ص ۵۴)

کیونکہ اکثر فقہاء اوس زمانہ مین حنفی المذہب تھے،

لیکن اس کے باوجود حنفی و مالکی اختلافی مسائل کی بنا پر بہت کم اختلافات ملتے ہین، البتہ اختلاف اور عصبیت کی جھلک کلام و عقائد مین نظر آتی ہے، کیونکہ اغلبی عہد مین امرائے دولت مین سے غالب تعداد معتزلہ کی تھی، معالم مین ہے،

اکثرھم (ای رجال ابن اغلب) کانوا معتزلہ (ج ۲ ص) اکثر رجال ابن اغلب معتزلی تھے،

یہ اختلافی عقائد ایسے تھے جن کی نوبت تکفیر تک پہنچتی تھی اور ایک دوسرے کو صدق دل سے کافر سمجھتے تھے، اسلئے اکثر اس کے اثرات بھی ظاہر ہو جاتے تھے، اور وہ افریقیہ کے دیوان القضا مین بھی ظاہر ہوئے، لیکن ان کے تفصیلات کی چندان ضرورت نہین،

قاضی القضاۃ قاضی القضاۃ کو اگرچہ فرمانروایان اغالبہ نامزد کرتے تھے، مگر وہ تمام معاملات مین آزاد و خود مختار ہوتے، اونھین اس کا حق حاصل تھا، کہ جس وقت چاہتے، فرمانرواؤن کے پاس جا سکتے، خواہ حرم مین ہون یا دیوان عام مین، وہ ہر وقت امیر سے تخلیہ کر سکتے تھے، اور امیر وقت خواہ نیند مین ہو یا بیداری مین، یہ اطلاع کرا کر فوراً باریاب ہو جاتے، کسی حاجب و دربان کو اس کی اجازت نہ تھی، کہ یہ جب محل شاہی تک پہنچین، تو امیر سے اون کی ملاقات کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کر دے، وہ اکثر معاملات مین حکومت کے خلاف مقدمات سنتے، اور حکومت اور خود امیر کی ذاتی خواہش اور مرضی کے خلاف فیصلے کرتے، کبھی کبھی قاضی القضاۃ اور فرمانروائے افریقیہ مین سخت اختلافات پیش آ جاتے، امیر افریقیہ کسی مقدمہ مین کوئی خاص فیصلہ کرنے یا مقدمہ اٹھا لینے کی خواہش کرتا، اور قاضی القضاۃ سختی سے تعمیل حکم سے انکار کر دیتا، ورنہ بصورت مجبوری اپنا استعفا پیش کر دیتا، جسے امیر واپس کرنے پر مجبور ہوتا، کہ اولاً اوس وقت اس عہدے کیلئے اوس سے بہتر شخص کوئی موجود نہ ہوتا، دوسرے استعفا منظور کرنے مین فرمانروا کے عدل و انصاف کی بدنامی ہوتی، اوس کی بہ کثرت مثالین افریقیہ کے قاضی القضاۃ کی سوانح عمریون مین ملتی ہین،

افریقیہ کے قضاۃ کی جو فہرست بہ ترتیب زمانہ مرتب ہو سکی، وہ حسب ذیل ہے:-

شمار	نام قضاة	زمانۂ تقرر	زمانۂ علحدگی	کیفیت
۱	عبد اللہ بن غانم،	۱۷۱ھ	۱۹۰ـ۶ھ	ابراہیم بن اغلب کے زمانۂ
۲	ابو محرز،	۱۹۱ھ	۲۱۴ھ	حکومت کے آغاز سے
۳	اسد بن فرات،	۲۰۳ھ	۲۱۳ھ	پیشتر روح بن حاتم کے
۴	احمد بن ابو محرز،	۲۲۰ھ	۲۲۱ھ	زمانہ مین تقرر ہوا تھا،
۵	عبد اللہ بن ابی الجواد	۲۲۱ھ	۲۳۲ھ	
۶	امام سحنون،	۲۳۴ھ	۲۴۰ھ	ابن عذاری مین زمانۂ تقرر ۲۳۳ھ ہے
۷	سلیمان بن عمران،	۲۴۰ھ	۲۵۷ھ	" " ۲۴۲ھ ہے،
۸	ابن طالب،	۲۵۷ھ	۲۵۹ھ	
۹	سلیمان بن عمران،	۲۵۹ھ	۲۶۹ھ	" " ۲۶۶ھ ہے
۱۰	ابن طالب،	۲۶۹ھ	۲۷۵ھ	" " ۲۶۷ھ ہے،
۱۱	محمد بن عبدون بن ابی ثوب، المعروف بہ محمد بن عبد اللہ الرعینی،	۲۷۵ھ	.	
		.	.	
۱۲	صدینی،	.	.	
۱۳	عیسیٰ بن مسکین،	.	.	متوفی ۲۹۵ھ مدت ولایت قضا ۱۰ سال ۱۱ مہینے
۱۴	حماس بن مروان،	.	.	
۱۵	محمد بن احمد بن جمال،	۲۹۴ھ	۲۹۶ھ	ابن عذاری مین ان کا نام محمد بن عبد اللہ المعروف بہ ابن حیان ہے (ا ص ۱۹۱) و محمد بن ابن حیان (ص ۱۹۶) و ابو العباس بن حیان (ص ۱۹۷) سے

نفسیات حکیم ناصر خسرو

(۳)

از

پروفیسر معتضد ولی الرحمن، ایم اے، استاذ نفسیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن،

(۹)

اثبات وانکار لذت والم کو حکیم ناصر خسرو نے اپنے فلسفہ مذہب مین بہت اہمیت دی ہو، اسی وجہ سے اُن نے اس موضوع پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ اندر شناخت لذت مرنفس راپندار یست وقوت حق ودین وضعفِ شک را اندر آنست[۵۱] اس کے علاوہ "اندر اثبات لذت قوت دین وضعف الحاد است کہ بنیاد دین حق بر ایجاب بہشت است مر مطیعان ونیکو کاران را کہ آن معدن غایت لذات است وآنجا رنج نیست البتہ...... ونیز بر الزام دوزخ است مر عاصیان وبدکرداران راکہ آن مکان نہایت رنجاست وآنجا ہیچ لذت نیست البتہ"[۵۲] آخری عبارت جو ہم نے نقل کی ہے، اس مین یہ خیال بہت اہم ہے، کہ بہشت[۵۳] معدن لذت ہے کہ جسمین رنج نہین، اور دوزخ معدنِ رنج ہے کہ جسمین لذت نہین، اسی خیال کو اوس نے لذت والم کے اس

---

۵۱ زاد المسافرین ص۲۲۹، ۵۲ زاد المسافرین ص۲۲۹ ۵۳ بہشت و دوزخ کے وجود کو حکیم ناصر خسرو نے بڑے عجیب وغریب طریقے سے ثابت کیا ہو، کہتے ہین کہ اخلاق ستودہ یعنی عدل وانصاف، راست گوئی امانت مین خیانت نہ کرنا وغیرہ سب کے سب بہشت کے وعدے اور دوزخ کی وعید کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہین، یعنی یہ کہ یہ اخلاق معلولات ہین اور بہشت و دوزخ علل القبول شارح علل غائیہ ص۵۰۵ اب ان اخلاق کا وجود تو مسلم ہو، بالفاظ دگر معلولات موجود ہین، اور معلول کا وجود علت کے وجود کو مستلزم ہو، یہ محال ہو کہ معلول ہو اور علت نہ ہو، لہذا علت بھی موجود ہے یعنی بہشت و دوزخ موجود ہین (ص۲۳۰، ۲۳۱)

نفسیاتی نظریے کی بنیاد قرار دیا ہے، جس کا وہ قائل ہے، یہاں بھی اوس نے سلبی طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی محمد زکریا رازی[۱] اور اس کے بیٹے نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید کی ہے لیکن خود اپنے آپ کوئی خاص تعمیری نظریہ قائم نہین کیا،

محمد زکریا رازی کا نظریۂ لذت و الم مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:-

لذت دراصل رنج (یا الم) سے نجات پا جانے کی حالت کا دوسرا نام ہے، یعنی یہ کہ لذت ہمیشہ رنج کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس کے علاوہ اگر لذت ایک خاص مدت تک باقی رہے تو یہ رنج بن جاتی ہے، جس حال کو نہ لذت کہا جا سکتا ہے نہ رنج، وہ طبیعت ہے، اور اس کو حس سے معلوم نہین کیا جا سکتا، لذت حسی تو رہائی دلانے والی ہوتی ہے اور درد حسی رنج دلانے والا، لیکن لذت و الم پیدا کس طرح ہوتے ہین، ؟ اس کا جواب رازی نے لذت و الم اور حس کے تعلق کی توضیح سے دیا ہے، پہلے وہ سوال کرتا ہے کہ حس کسے کہتے ہین، ؟ حس ایک اثر ہے، جو محسوس کی وجہ سے صاحب حس مین پیدا ہوتا ہے[۲] یہ تاثیر ایک فعل ہے، جو اثر کنندہ اثر پذیر مین کرتا ہے، اثر پذیری اثر پذیر کے حال کے متغیر ہو جانے کا دوسرا نام ہے، اب یہ حال، جو حالتِ اثر پذیری مین متغیر ہوتا ہے یا تو طبیعت

---

[۱] ایران اور مسلمانون کا مشہور فلسفی ہے، حکیم ناصر خسرو ان سے بہت ناراض ہین، ان کے نزدیک الحاد و مخالفت رائے اور دنائت طبع ان کی خصوصیات امتیازی ہین، چنانچہ لکھتے ہین:- "محمد زکریا چندان سخن ملحدانہ گفتہ" (ص ۱۱۳) "....باین نتیجہ رسید در دوغزن و حرامزادہ آمد" (ص ۹ اور ص ۲۳۶)".... "پس چنین سخن گفتن فلسفہ نباشد، بلکہ عرضہ کردن جہل و سفاہت باشد" (ص ۲۴۴) ڈاکٹر رحمن کا خیال ہے کہ اس تشدد اور ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ "اقوال محمد زکریا مطابق اقوال حرانیین است کہ قائل پنج قدیم ستند باین معنی کہ چہار چیز دیگر را در قدم شریک باری میدانستہ اند.... و معلوم است کہ این عقیدہ مخالف مذہب خدا پرستی حکیم ناصر خسرو است" (مقدمہ مصحح ص ۲)

[۲] یہ تعریف گرانٹ الین کی تعریف کی یاد تازہ کرتی ہے، Organic substances acted upon by peculiar agencies in the inorganic world give rise to the phenomena of sensation دیکھو Colour-sense ص ۷.

سے ہوتا ہے، یا طبیعت سے باہر، ان تمام مقدمات کے مسلم ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ جب اثر کنندہ اثر پذیر کو اس کے طبیعی حال سے باہر کر دیتا ہے، تو رنج (یا الم) پیدا ہوتا ہے، اور جب اثر پذیر اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرتا ہے تو لذت پیدا ہوتی ہے، اسی سے ثابت ہو کہ لذت ہمیشہ رنج کے بعد پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اپنی اصلی طبیعت کی طرف عود کرنا طبیعت سے باہر ہوئے بغیر محال ہے، طبیعی حال یعنی وہ حال جو نہ لذت ہے نہ رنج اس لئے محسوس نہیں ہو سکتا، کہ محسوس ہونا تاثیر کا نتیجہ ہوتا ہے، اور تاثیر سے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، یا تو انسان طبیعی حال سے باہر ہو جاتا ہے، یا اس کی طرف عود کرتا ہے یعنی حال طبیعی سے مراد یہ ہے کہ انسان نہ تو طبیعت سے باہر ہے، نہ اوس کی طرف عود کرے، تاثیر مین یہ صورت محال ہے، اور بغیر تاثیر حس محال ہے، لہذا حال طبیعی مین حس محال ہے،

اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اگر ایک تاثیر کے بعد دوسری تاثیر ہو، اور یہ دونون تاثیرین ایک دوسری کی ضد ہون، تو اثر پذیر کو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلی تاثیر کی وجہ سے اثر پذیر اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، اور دوسری تاثیر چونکہ پہلی تاثیر کی ضد ہے، لہذا اس سے پہلی تاثیر زائل ہو جاتی ہے، اور اس طرح اثر پذیر اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے جس سے لذت حاصل ہوتی ہے، لیکن چونکہ دوسری تاثیر پہلی کو زائل کر کے خود باقی رہتی ہے، لہذا اثر پذیر اس دوسری تاثیر کی وجہ سے پھر اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہو یعنی اثر پذیر میں حالت رنج پیدا ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر پذیر کا حال طبیعی طبیعت سے باہر ہونے اور طبیعت کی طرف عود کرنے کی درمیانی حالت ہو، یعنی یہ وہ حالت ہو، جو نہ لذت ہے نہ رنج،

محمد زکریا رازی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نظریے کی تشریح اس طرح کی ہے:-

کہتا ہے، فرض کرو ایک شخص ایک ایسے کمرے مین ہے، کہ جس مین نہ اتنی سردی ہے کہ وہ کانپنے لگے، نہ اتنی گرمی ہے کہ پسینہ پسینہ ہو جائے، اس شخص کو اس کمرے مین نہ گرمی لگتی ہے، نہ سردی یعنی یہ اس کا حال طبیعی ہے، فرض کرو کہ ہم اچانک اس کمرے کو اتنا گرم کر دین کہ اس کو تکلیف ہونے لگے، اور اس کے بعد اس مین آہستہ

ـــــــــــــــــــــــــــــ

له زاد المسافرین ۲۳۱ - ۲۳۳،

آہستہ ٹھنڈی ہوا داخل کریں، اس کو گرمی کی تکلیف کے بعد ٹھنڈک کی لذت محسوس ہوگی، کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ گرمی سے وہ اپنے حال طبیعی سے باہر ہوگیا تھا، اور ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اپنے حال طبیعی کی طرف عود کرآیا، اب فرض کرو کہ ہم یہ ٹھنڈی ہوا برابر پہنچاتے رہیں، تو کیا ہوگا؟ وہ شخص پھر اپنے حال طبیعی سے باہر ہوجائے گا، اور سطح اس کی تکلیف پھر شروع ہوجائیگی، اس کے بعد اگر ہم اس کمرے کو گرم کریں گے، تو اس کو لذت محسوس ہوگی، کیونکہ اس گرمی کی وجہ سے وہ پھر اپنے حال طبیعی کی طرف عود کریگا، وقس علی ہذا،

اس مثال سے واضح ہوتا ہے، کہ لذت حسّی حالت رنج سے خلاصی پاجانے کی وجہ سے راحت پیدا ہونے کی حالت ہے، پھر جب آدمی اپنی طبیعت سے باہر تو آہستہ آہستہ ہے اور عود یکدم کرے تو لذت پیدا ہوتی ہے لیکن جب وہ یکدم طبیعت سے باہر اور عود آہستہ آہستہ کرے تو درد و رنج پیدا ہوتا ہے، مثال اس کی ایسی ہے، کہ ایک شخص بہت سخت بھوکا اور پیاسا ہے، اور یکبارگی کھانا کھائے اور پانی پی لے، تو اس کو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے وہ طبیعت سے باہر تو آہستہ آہستہ ہوا تھا لیکن کھانے اور پینے کی عود اس کی یکبارگی ہوا، اسی طرح اگر کسی تندرست شخص کو چوٹ لگ جائے، تو وہ اپنے حال طبیعی سے گویا یکبارگی باہر ہوجاتا ہے اسی وجہ سے اس کو درد ہوتا ہے، اور چونکہ وہ اچھا آہستہ آہستہ ہوتا ہے یعنی اپنے حال طبیعی کی طرف عود آہستہ آہستہ کرتا ہے، لہذا اس کو لذت کوئی محسوس نہیں ہوتی، مختصر یہ کہ طبیعت کی طرف یکبارگی عود کرآنے کا نام لذت ہے، اور طبیعت سے یکدم باہر ہوجانے کا نام رنج یا الم ہے[1]

اس طرح محمد زکریا رازی کا نظریہ لذت و الم مختصراً یہ ہے کہ لذت حسّی رفع رنج کے سوا اور کچھ نہیں، اور رنج طبیعت سے باہر ہوجانے کے ہم معنی ہے، اور لذت طبیعت کی طرف عود کرآنے کے، لیکن طبیعت کی طرف عود کرنا طبیعت سے باہر ہوجانے سے قبل محال ہے، لہذا لذت لازماً رنج کے بعد ہوتی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ رازی نے اپنے مقالے کے آخر میں کہا ہے، کہ انسان کو روشنی کی طرف دیکھنے سے لذت حاصل ہوتی ہے، لیکن اگر وہ روشنی کو بہت دیر تک

---

[1] زاد المسافرین ص۲۳۳-۲۳۴،

دیکھتا رہے، تو پھر اندھیرے کو دیکھنے سے بھی لذت یاب ہوتا ہے، رازی کا یہ قول خود اس کے اپنے نظریے کا نقیض ہو، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس کے نزدیک لذت ہمیشہ رنج کے بعد ہوتی ہے، اور یہ طبیعت سے باہر ہو جانے کے بعد اس کی طرف عود کرانے کا دوسرا نام ہے، اور طبیعت لذت و رنج کی درمیانی حالت ہو، جو محسوس نہیں ہوتی، اب سوال یہ ہے کہ روشنی اور اندھیرے کو دیکھنے کی دو حالتوں کے درمیان وہ کونسی حالت ہے، جسے رازی طبیعت کہے گا؟ جب انسان روشنی کے دیکھنے سے لذت یاب ہوتا ہے، تو وہ کونسی طبیعت ہو، جس کی طرف عود کرتا ہی؟ جواب صرف یہی ہو سکتا ہے، کہ چونکہ وہ روشنی کو دیکھنے سے لذت پاتا ہے، اور لذت میں اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے لہذا روشنی کو دیکھنا طبیعت ہو، اگر یہ صحیح ہے تو پھر اندھیرے کو دیکھنے سے اسکی لذت نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اس میں وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہو، جو حالت رنج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس کا مقدمہ غلط ہے یا نتیجہ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے، کہ روشنی کو دیکھنے کے وقت انسان کی وہ حالت نہیں رہتی جو روشنی دیکھنے کے قبل اس کی ہوتی ہے، یعنی روشنی دیکھنے میں اس کی اصلی حالت بالفاظ دیگر طبیعت بدل جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو روشنی کو دیکھنے سے اس کو لذت کیوں ہوتی ہے، پھر رازی نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی، کہ دیکھنے اور نہ دیکھنے کے درمیان کوئی ایسی حالت نہیں، جو دیکھنے کی حالت بھی نہ ہو، اور نہ دیکھنے کی بھی نہ ہو، اور جس کو بقول اوس کے طبیعت کہا جا سکے جسمیں نہ رنج ہوتا ہے اور نہ لذت، ایک جگہ رازی نے لکھا ہے کہ خوبصورت عورت کو دیکھکر آدمی کو لذت اس لئے حاصل ہوتی ہے، کہ بدصورت عورت کو دیکھنے سے اس کو تکلیف ہو چکی ہوتی ہے، اس کا یہ قول بھی سخت رکیک اور بے معنی ہے، ہم کو خوبصورت عورت کو دیکھنے سے لذت اس وجہ سے حاصل نہیں ہوتی، کہ ہم بدصورت عورت کو دیکھتے دیکھتے عاجز آچکے ہوتے ہیں، یہ لذت تو انسان کے لئے فطری ہے، اس کے علاوہ یہ بھی اس کے نظریے کے خلاف ہو، اگر اس کا نظریہ صحیح ہے، تو ہونا یہ چاہئے تھا، کہ جو شخص نہ تو خوبصورت عورت کو دیکھتا نہ بدصورت عورت کو وہ اپنے طبیعی حال پر ہوتا، اس لحاظ سے خوبصورت عورت کو دیکھنے سے اسے رنج ہونا چاہئے تھا، کیونکہ

اسمین وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو رہا ہے، اور بدصورت عورت کو دیکھنے سے اسکو لذت ہونی چاہئے تھی، کیونکہ اسمین وہ اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے، لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے، ان تمام شواہد سے ظاہر ہے کہ رازی کا یہ نظریہ صحیح نہین، کہ طبیعت کی طرف عود کرانے کا نام لذت ہے[۵۱]

ایک شخص کسی خوبصورت عورت کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے، اس کو دیکھنے سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، اس کو رنج ہونا چاہئے تھا، اب فرض کرو کہ یہ عورت اس کی نگاہون کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے، اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے، حالانکہ چونکہ وہ اپنے طبیعی حال کی طرف عود کر آیا ہے، لہذا اس کو لذت حاصل ہونی چاہئے تھی، یعنی یہ حالت بھی رازی کے نظریے کے خلاف ہے[۵۲] بہترین تردید اس نظریے کی اس طرح ہو سکتی ہے، کہ ایک تندرست اور سلیم الحواس شخص کو اس کے منہ مین شکر کا ڈلا دو، اس کے سامنے ایک گلدستہ اور مشک نافہ رکھو، اس کے قریب بہت عمدہ گانا گاؤ، نہایت خوبصورت ویبائے منقش کی چادر اس کی آنکھون کے روبرو پھیلاؤ، اور نہایت نرم باریک کپڑے کا لباس پہنا دو، اس طرح اس کا تمام طبیعی حال متغیر ہو جائیگا، اب اس نظریے کے مطابق جب طبیعی حال اس طرح متغیر ہو جاتا ہے تو رنج پیدا ہوتا ہے، لہذا اوس شخص کو بھی سخت تکلیف ہونی چاہئے تھی، لیکن عقلاے دہر جانتے ہین کہ اس سے اس کو تکلیف نہین، بلکہ لذت حاصل ہوتی ہے، اگر رازی کا نظریہ صحیح ہوتا، تو دنیا مین مکروہ اور تکلیف دہ چیز کا نام بھی باقی نہ رہتا،[۵۳]

واقعہ یہ ہے کہ رازی نے لذت اور "راحت از رنج" مین خلط مبحث کیا ہے، یہ دونون ایک ہی چیزین نہین، بلکہ دو مختلف چیزین ہین، لذت تو وہ حالت ہے کہ جب انسان اپنے حالِ طبیعی سے اس حالت مین آتا ہے، تو شادمان اور خوش ہوتا ہے، اور جب اس حالت تک نہین پہنچ سکتا تو رنج اور تکلیف اوٹھاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص درویشی و گرسنگی و تشنگی و تنہائی کی حالت کے بعد تونگری، طعام و شراب و مونس پا لیتا ہے، تو شادمان اور خوش ہوتا ہے، اور جب وہ ان چیزون کو نہین پا سکتا، تو اپنی پچھلی حالت پر رہتا ہے، اور رنج اوٹھاتا ہے، اوس کے مقابلے مین "راحت از رنج" وہ حالت ہے

---

۵۱ زاد المسافرین ص ۲۲۵، ص ۲۲۰، ۵۲ ص ۲۲۳، ۵۳ ص ۲۴۱،

کہ جب انسان اس سے اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرتا ہے، تو اپنے اصلی حال پر آجاتا ہی، چنانچہ جب وہ تندرستی کے بعد بیمار ہوتا ہی، تو تکلیف اوٹھاتا ہی، اور جب پھر تندرست ہو جاتا ہے، تو اپنے پچھلے حال کی طرف عود کرتا ہی اور اس سے اوس کو نہ لذت حاصل ہوتی ہی، نہ رنج، رازی کی غلطی یہ ہے کہ اُس نے طبیعی حال کی طرف عود کرنے کو لذت کہا، دراصل یہ حالت نہ لذت کی ہوتی ہے، نہ رنج کی، دوسرے الفاظ میں لذت ایک ایجابی حالت ہی، اور راحت از رنج، سلبی، رازی اسی نکتہ تک نہ پہنچ سکا،[1]

اس کائنات مین طبائع کو "ہدایت الٰہی" حاصل ہے جس کی مدد سے وہ اپنے مصالح کی نگہداشت کرتے ہین، اور جو بھی اپنے مصالح کی نگہداشت کرتا ہے، اس کو لذت حاصل ہوتی ہی، اسی ہدایت الٰہی کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو فساد، فنا اور رنج سے محفوظ رکھتے ہین، یہ طبائع کیلئے بمنزلہ روح کے ہے کہ ان مین قوت حس نہین ہوتی، اب تمام نفوس اپنے اپنے شرف کے مطابق اس ہدایت الٰہی سے متمتع ہوتے ہین، چنانچہ نفس ناطقہ بمقابلہ نفس حیوانی اور نفس حیوانی بمقابلہ نفس نباتی اس سے زیادہ مستفید ہوتا ہے، بہرحال موجودات مین سے کوئی بھی ایسا نہین، جو "ہدایت الٰہی" سے بہرہ ور نہ ہو، کیونکہ ان کے لئے بقا ہی، اور بقائے موجودات "ہدایت الٰہی" سے ہوتی ہے، اب لذت کی کیفیت اور کمیت اسی ہدایت الٰہی سے استفادہ پر موقوف ہوتی ہے، چنانچہ نباتات کیلئے غذا حاصل کرنے، اپنی طرح کے بچے پیدا کرنے اور نسل بڑھانے وغیرہ مین لذت ہی، لیکن حیوان مین چونکہ روح حسی ہوتی ہی، لہذا اوس کی لذت نباتات کی لذت سے بہتر ہوتی ہے، اس مین نباتات کی لذات کے علاوہ حسی لذتین بھی ہوتی ہین، اسی طرح نفس ناطقہ کی لذتین نفس حیوانی کی لذتون سے بھی زیادہ ہوتی ہین، چنانچہ اوس کی لذتین حسی بھی ہوتی ہین، اور عقلی بھی، بلکہ یہان تک کہا جا سکتا ہے، کہ تمام حسی لذتین صرف انسان ہی کو حاصل ہوتی ہین، صرف انہی لذتون پر غور کرو، جو ایک قوت ذائقہ ہی سے حاصل ہوتی ہین، اس قوت سے جو لذتین حیوانات کو حاصل ہوتی ہین، وہ ان کے پاسنگ بھی نہین ہوتین،[2]

---

[1] زاد المسافرین ص۲۴۴، [2] ص۲۴۵، ص۲۴۸،

انسان کی لذتوں کا اندازہ اسی سے کرو کہ وہ اپنی ہر حس سے اس قدر لذتیں حاصل کرتا ہے کہ حیوانات جنکے خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں، پھر قیمتی جواہر، املاک فاخرہ، ریاست فرمانروائی وغیرہ سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ ان حسی لذتوں کے علاوہ ہے، ان سب پر مستزاد علمی لذات ہیں، کہ جن کو وہ اپنے قوا میں سے اشرف ترین قوت سے حاصل کرتا ہے، اور یہ لذات حسی لذات کے مقابلے میں شریف تر، بیشتر، بلکہ بے نہایت ہوتی ہیں، وجہ اسکی یہ ہے کہ انسان کا نفس ان لذتوں کو اپنی ذاتی قوت سے حاصل کرتا ہے، اور اسمیں بھی شبہ نہیں کہ نفس جو جوہر بسیط ہے، بے نہایت ہے، جب کوئی چیز بے نہایت ہوتی ہے، تو اس کی قوت ذاتی بھی بے نہایت ہوا کرتی ہے، پھر نفس انسانی کی علم پذیری ایک ذاتی صفت ہے، لہذا جو علم کہ وہ حاصل کرتا ہے، اس سے وہ لذت پاتا ہے، پھر اس علم کی بدولت وہ اور برتر علم تک پہنچتا ہے، لہذا اس کی لذت بھی بیشتر ہو جاتی ہے، وقس علی ہذا، یہ بالکل ناممکن ہے، کہ نفس انسانی ایسا ہو جائے کہ علم کو قبول نہ کر سکے، اس تمام گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، کہ انسان کی لذات حسی بے شمار ہیں، اور یہ کہ یہ لذات اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں، کہ وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جانیکے بعد اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے، اس کے علاوہ لذت علمی بھی اس کی بے نہایت ہوتی ہے، اور ہر علم میں نفس انسانی اپنے طبیعی حال سے باہر ہو جاتا ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، لہذا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کہ رازی کا نظریہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ طبائع بے حس کی لذت ہدایت الٰہی سے اون حرکات کے ذریعہ اپنی صورتوں کی نگہداشت کا نتیجہ ہوتی ہے، جو ان کے لئے بمنزلہ ارواح ہیں، مختصر یہ کہ حیوانات کی لذتیں نباتات کی لذتوں سے زیادہ ہیں، اور انسان کی حیوانات کی لذتوں سے زیادہ، یعنی نفوس کی لذتیں ان کے مراتب کے مطابق ہوتی ہیں[51] اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک نفس انسانی جسقدر زیادہ علم سیکھتا جاتا ہے، اسی قدر دور وہ ان لذات سے ہوتا جاتا ہے، جو اس میں اور بہائم میں مشترک ہیں۔

۵۱؎ زاد المسافرین ص۲۴۹، ص۲۵۰، ۵۲، ص۳۹۶، ص۳۹۵

تلخیص و تبصرہ

چینی اسلامی لٹریچر

مشہور اسلامی رسالہ مسلم ورلڈ (اکتوبر ۱۹۳۳ء) مین ایک مضمون عنوان بالاسے شائع ہوا ہے، جس مین مقالہ نگار نے چینی اسلامی لٹریچر کے تین دور پیش کئے ہین۔ اور آخر مین اس خیال کا اظہار کیا ہو کہ اگر چین کے مسلمانون کو ملکی ترقی کا ساتھ دینا، اور اُس سے فائدہ اوٹھانا ہی، تو اونھین اپنے قدیم نظامِ تعلیم اور اسلامی معتقدات کو بالائی طاق رکھ دینا چاہئے، اور تعلیم جدید کی روشنی مین اپنے لئے ایک مفید راہِ عمل اختیار کرنی چاہیے، ہم اس مفید مشورہ کو شکریہ کے ساتھ نظرانداز کرکے نفس مضمون کا خلاصہ ذیل مین درج کرتے ہین،:-

چین کا آخری عظیم الشان شاہی خاندان منچو خاندان تھا اور اس کا پہلا جلیل القدر شہنشاہ کانگ ہسی (Kang Hsi) تھا، وہ ایک عالی دماغ مدبر ہونے کے علاوہ علم و فضل کا بھی بہت بڑا مربّی تھا، اوس نے چین کے تمام وسیع لٹریچر کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کرائی اور لٹریچر کی ہر صنف کے نمونے خواہ وہ کسی زبان کے ہون، شاہی کتبخانہ مین جمع کرائے لیکن اس ذخیرہ کے متعلق آج بہت کم معلومات حاصل ہین، بہرحال جہان تک چینی اسلامی لٹریچر کا تعلق ہی کانگ ہسی کا عہدِ حکومت اس لٹریچر کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاسکتا ہے، اس دور کے مسلمان مصنفین مین سب سے ممتاز شخصیت لیوچیائے کی ہے،

۱- اسلامی نشاۃ ثانیہ اور لیوچیائے لین،

کانگ ہسی نے جو کتابین جمع کی تھین ان مین عربی اور فارسی کی بھی بعض تصنیفات تھین، اور اون مین سے

چند تصنیفات کا ترجمہ بھی اوس عہد مین چینی زبان مین ہوگیا تھا، حال کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی اسلامی لٹریچر کی سب سے قدیم کتاب جس کی تاریخ تصنیف کی تعیین کی جا سکتی ہے، توضیح مذہب حق ہے، اوس کے مصنف کا نام وانگ تائے یو ہے، یہ کتاب پانچ جلدون مین ہے، اور غالباً عہد منچو سے قبل کی لکھی ہوئی ہے، کیونکہ موجودہ نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا دیباچہ ۱۶۴۲ء مین لکھا گیا تھا یعنی کانگ ہسی کی تخت نشینی سے تقریباً بیس سال قبل اس کتاب مین بھی جیسا کہ چین کے قدیم اسلامی لٹریچر کی اکثر کتابون مین پایا جاتا ہے مسلمانون کے ساتھ مذہبی رواداری برتنے کا شاہی فرمان درج ہے، وانگ تائے یو کی تصنیف کی اشاعت کے تقریباً ۲۵ سال بعد ایک قدیم تر کتاب کا ترجمہ شائع ہوا، جو ایران یا عرب کے خاندان یوان (YUAN) کے عہد مین لائی گئی تھی، اس کتاب کا نام حق کی طرف رجعت کرنے سے متعلق اہم باتین ہے،

اسی طرح ایک مختصر کتاب "مسلمانون کی پہلی آمد" کے نام سے ہے، جسکی تاریخ تصنیف متعین نہین لیکن اسکے ایک دیباچہ پر ۱۶۶۲ء درج ہے، جو کانگ ہسی کے عہد حکومت کا پہلا سال ہے، اس اہم کتاب مین چین مین مسلمانون کی پہلی آمد کے بابت نظریۂ رویا کی اشاعت کی گئی ہے، اور اس کے مطالعہ سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ چین مین اسلام کا داخلہ شہنشاہ تائے سنگ کی درخواست پر ہوا تھا، لیکن اس کتاب مین تاریخ کے حساب غلط ہین اور "روایات" متداولہ کے ثبوت کیلئے کافی نہین، تاہم اوسکی قدامت مین کوئی شبہہ نہین ہے،

مسلمانون کی پہلی آمد کے چند ہی سال بعد قبلہ نمائے اسلام کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کا مصنف صوبہ یونن (Yunnan) کا ایک مسلمان ماون پنگ (Ma wenping) نامی تھا، اس کتاب کا چنگتو (Chengtu) اڈیشن ۱۸۹۵ء مین دس جلدون مین شائع ہوا، جو (۵۰۰) صفحات سے زائد ضخامت کا تھا، اوس کے علاوہ چھوٹے اڈیشن بھی نکلے، جنمین سے ایک خلاصہ قبلہ نما کے عنوان سے چار جلدون مین شائع ہوا، اس کتاب سے ابتدائی منچو عہد کے مسلمانون کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، جو اپنی تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے جنوبی مغربی صوبہ مین نمایان تھے، اس دور کا سب سے بڑا مصنف

لیوچیائے لین تھا،

لیوچائے لین جس کو لیوچیہ ( ) بھی کہتے ہین. خاندان منچو کے ابتدائی عہد مین شہر نانکنگ مین پیدا ہوا، اوس نے اپنی تمام عمر علم وفضل کی تحصیل مین صرف کردی، اوس نے ایک ایسا علمی معیار قائم کردیا، کہ اوس کے بعد تمام چینی اسلامی فضلا نے اوسی کا تتبع کیا، اوس کی ابتدائی کتابون مین ایک بہت مشہور کتاب فلسفۂ اسلامی ہے. فلسفۂ اسلام پر یہ ایک ایسی مختصر مگر جامع تصنیف ہے، کہ بعد کے مصنفین مین سے اکثرون نے اوسی سے مواد حاصل کیا ہے، فلسفۂ اسلامی کے پہلے دیباچہ مین کانگ ہسی کے عہدِ حکومت کا تیرہوان سال سنہ ۱۷۰۴ء درج ہے، اس کتاب مین جغرافیہ اور اوس زمانہ کی تاریخ عالم سے متعلق نوین صدی عیسوی کی بہت سی شکلین اور نقشے بنے ہوئے ہین، اس کتاب کے بعد لیوچیائے لین نے اس کا ایک خلاصہ اسلامی قوانین ورسوم کے اہم منتخبات" کے عنوان سے شائع کیا، جس کا دیباچہ سنہ ۱۷۱۰ء کا لکھا ہوا ہے، اس مین اسلامی عقائد اور رسوم سے متعلق مختلف مابعد الطبیعیاتی اور علمی مباحث ہین، یون تو لیوچیائے لین نے بہت سی کتابین لکھین، لیکن اوس کی سب سے زیادہ عظیم الشان تصنیف سیرۃ النبی ہے، اس کتاب کی تاریخِ تصنیف کے متعلق مختلف رائین قائم کیگئی ہین، لیکن عموماً اس کا سالِ تصنیف سنہ ۱۷۲۱ء اور سنہ ۱۷۲۴ء کے درمیان خیال کیا جاتا ہے اور کثرت رائے یہ ہے، کہ اس کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۷۸۰ء مین شائع ہوا، لیوچیائے لین سے قبل چین مین جو اسلامی لٹریچر موجود تھا، اوسے خالص علمی نہین کہہ سکتے تھے، اور نہ وہ زیادہ ضخیم تھا، اوس کا بیشتر حصہ قدیم تصانیف کے ترجمہ اور موازنہ پر مشتمل تھا، اور اس مین قرآن پاک اور تفسیر پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا، لیوچیائے لین کے وقت تک چینی نژاد مسلمانون مین تبحر علمی مفقود تھا،

لیوچیائے لین کے بعد چین کے اسلامی کلچر کی دوسری تحریک شروع ہوئی، اور اس دوسرے دور کو دفاع اسلامی اور ما فوچو کا دور کہتے ہین،

۲۔ دفاع اسلامی اور ما فوچو کا دور،

۱۷۶۰ء کے قریب شہنشاہ چین لنگ (Chien lung) نے ترکستان کو سلطنت چین میں شامل کرلیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا اور چین کے تمدن (کلچر) میں باہمی مبادلہ ہونے لگا، اور جس طرح نشأۃ ثانیہ کا دور کانگ ہسی کے عہد سے شروع ہوا تھا، اوسی طرح وفاع اسلامی کے دور کی ابتدا چین لنگ کی فتحِ ترکستان سے ہوئی، یہ دور ما فوچو (Ma Fu chu) کے زمانہ مین اپنے شباب پر پہنچ گیا، ما فوچو انیسوین صدی کے ابتدائی دور کا مشہور فاضل اور مدافع اسلام (APOLOGIST) تھا، اس وقت مغربی چین مین چینیون اور عیسائیون کی طرف سے اسلام پر سخت حملے ہو رہے تھے، ما فوچو اوس جماعت کا سردار تھا، جو ان حملون کا جواب دے رہی تھی، ما فوچو کو چینی اور عربی زبان کی قدیم تصانیف پر کامل عبور حاصل تھا، اوس نے پہلے اپنے بعض پیشرؤون کی کتابون پر نظرثانی شروع کی، اور اس سلسلہ مین سب سے پہلے ما فوچو کی تصنیف کو لیا، پھر عربی بہار و خزان کی سرگذشت" پر نظرثانی کی، حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کے اکثر چینی اسلامی مصنفین تمامتر ما فوچو ہی پر اعتماد کرتے ہین،

ما فوچو نے اسلام کی مدافعت مین جو کچھ لکھا، اوس کی ابتدا اون تخیلات پر نقد و تبصرہ سے کی جو اوس زمانہ مین ذات باری تعالیٰ کی نسبت قائم کئے جاتے تھے، اپنی کتاب "آسمان کی توصیت بلیغ" مین اوس نے اوس تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جو کنفیوسیس کے لفظ آسمان اور اسلامی لفظ اللہ کے درمیان ہے،

۱۸۳۲ء مین ما فوچو نے اپنا روزنامچہ شائع کیا جو اوس نے ایک طویل سفرِ حج مین لکھا تھا، اس مین وہ روزانہ کے واقعات، منزلون کے فاصلے اور اون اشخاص کے حالات بیان کرتا ہے، جو اُسے سفر مین ملے تھے، یہ روزنامچہ پہلے عربی مین لکھا گیا تھا، بعد مین ما فوچو کے ایک شاگرد اور مداح ماآن لی (MAAN Li) نے اوس کا ترجمہ چینی زبان مین کیا، ما فوچو نے چین مین اسلام کی ترقی سے متعلق ایک فارسی کتاب کو دوبارہ اڈٹ کیا اور لوگون کی اخلاقی اصلاح کیلئے ایک کتاب بیداریِ عالم لکھی، اُس کو شاعری سے بھی ذوق تھا، اور وہ کنفیوسیس کے دیوان کے مثل اپنی غزلون کا بھی ایک مجموعہ مرتب کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس کام کو ختم نہ کر سکا

اور ۱۸۶۶ء میں صرف ایک دیباچہ لکھکر رہ گیا، بعد کو اوس کے شاگرد اور ادبی جانشین ماآن لی نے وہ مجموعہ تیار کیا، جو دیوان اسلامی کے نام سے مشہور ہے، ماآن لی نے مافوچو کی دو اور کتابوں چی نیکی، اور توضیح رسوم قواعد کا ترجمہ بھی کیا، اوس نے عربی فن شاعری پر خود بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام اسلوب شعر عرب ہے، ماآن لی کے بعد چینی اسلامی لٹریچر کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

۳۔ تحریک جدید اور پاپنگ اسکول،

انیسوین صدی کے نصف آخر مین چین کے مسلمان زیادہ تر اپنے حقوق ملی کے اصول کیلئے جد و جہد کرتے رہے، اور اس زمانہ مین بہت کم اعلیٰ لٹریچر پیدا کر سکے، قیام جمہوریہ کے ساتھ ہی مغربی خیالات کا ایک طوفان ملک مین داخل ہوگیا اور ان جدید خیالات مین آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے ساتھ حیات دنیوی اور مذہب کے متعلق بھی ایسے خیالات اور نظریات سامنے آئے جن سے ملک اوس وقت ناآشنا تھا، پاپنگ ( ) کے نوجوان مسلمانون کی ایک جماعت جس نے قیام جمہوریہ مین نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا تھا، اوس وسیع تحریک مین شریک ہوگئی، جس کا مقصد چین مین جدید تہذیب وتمدن کو رواج دینا تھا، اور اس مقصد کیلئے سب سے پہلے اونھون نے زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے جدید نظام تعلیم کو ذریعہ بنانا چاہا، چنانچہ اس جدید ترا اختراع کا ایک بڑا حصہ نظام تعلیم کے سپرد کیا گیا، اور دوسرا بڑا حصہ پبلک پریس نے اپنے ہاتھون مین لیا، اور اخبارات ورسائل کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی. پاپنگ کے جدید اسکول کا نصف سے زائد لٹریچر اون چھوٹی چھوٹی کتابون پر مشتمل تھا جو پروپگنڈا کیلئے لکھی جاتی تھین اور جنمین سے کوئی بھی بیس بائیس صفحات سے زیادہ کی نہ تھی، پاپنگ کے مکتبۂ اسلامیہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے، اور ایک کثیر تعداد مین اسلام پر چھوٹی چھوٹی کتابین شائع کی ہین، ان مین کے اکثر قدیم تصانیف کا خلاصہ ہین، جو عام فہم زبان مین مختصر کر دی گئی ہین، چین کے مسلمانون نے متعدد ہفتہ وار اور ماہوار رسالے نکالے، لیکن ان مین سے کوئی استقلال اور کامیابی کے ساتھ جاری نہ رہ سکا جس کی ایک وجہ غالباً مالی دقت ہے،

چین کے جدید نظامِ تعلیم کا اثر وہان کے تمام لٹریچر پر پڑا ہے جسمین اسلامی لٹریچر بھی شامل ہے، اور اس نظام نے وہان کے اسلامی کلچر پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا ہے، حکومت کی جانب سے جو نظامِ تعلیم قائم کیا گیا ہے اوس نے قدیم اسلامی مدارس کی بنیادین ہلا دی ہین، اور معدودے چند کے علاوہ جو مدرسے مسجدون مین قائم ہین اون کی حالت آج کل قابلِ اطمینان نہین ہے، اونھین مالی دقتون کا سامنا ہے، احادیثِ نبوی کی تعلیم انھی مدارس مین ہوتی ہے اور علومِ قدیمہ پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے، پائیگنگ کے جدید اسکول مین تعلیم کے مسئلہ مین بظاہر دو جماعتین قائم ہو گئی ہین، نوجوان طبقہ جدید نظامِ تعلیم کو رائج کرنا چاہتا ہے، اور علومِ جدیدہ کی تحصیل پر زیادہ زور دیتا ہے، برخلاف اوس کے شیوخ (AHUNGS) کی جماعت جس کے اکثر افراد سمرقند و بخارا سے آئے ہین، اس جدید نظام کی مخالف ہے اور وہ علومِ قدیمہ پر زیادہ زور دیتی ہے، اس مین شبہہ نہین کہ چین مین مسلمانون کی انفرادیت اسی قدیم نظامِ تعلیم کی وجہ سے قائم ہے، جس پر یہ شیوخ زور دیتے ہین، لیکن اب ان کا اثر کم ہو رہا ہے،

چین مین تحریک جدید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قرآن اور متعلقاتِ قرآن پر پھر زور دیا جا رہا ہے، اسکے ساتھ ہی عبادات کے ظاہری ارکان پر بھی اصرار کیا جاتا ہے، چنانچہ نماز اور دوسری عبادتون کے ارکان کی اہمیت سے متعلق مسلسل چھوٹی چھوٹی کتابین شائع ہوتی رہتی ہین،

اسلامی کلچر نے چینی زبان پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے، اور تمام چین اور خصوصًا وسط ایشیا مین روزمرہ کے استعمال کے آسان اسلامی الفاظ مثلاً اللہ، مسجد، امام، اور قرآن، غیر مسلم چینیون مین بھی رائج ہین، پائیگنگ اسکول نے مسلمان لڑکون اور لڑکیون کی تعلیم کیلئے طریقۂ نظم اختیار کیا ہے، یعنی نظمون کے ذریعہ سے وہ بچون کو اسلامی تاریخ وغیرہ کی تعلیم دیتے ہین، تاکہ بچے اسے آسانی کے ساتھ ذہن نشین کر سکین، اس قسم کی متعدد نظمین چھپکر شائع ہو گئی ہین، حال مین چینی مسلمانون نے سوال و جواب کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا طریقہ اختیار کیا ہے، چھوٹی چھوٹی کتابون مین دین کے بنیادی عقائد اور اہم باتین سوال و جواب کے طریقہ پر تصریح کے ساتھ بیان کر دی گئی ہین،

طوفانون کے اسباب اور موسم کے تغیرات

ہم ہوا کے ایک سمندر کی تہ مین رہتے ہین جو کم سے کم سو میل بلکہ شاید تین سو میل گہرا ہے، یہ ہوا مختلف گیسون سے ملکر بنی ہے، نیچے کی سطحون مین بہت زیادہ ثقیل اور اوپر کے حصّون مین ہلکی اور لطیف ہے، اسمین دھوان، گرد و غبار اور رطوبت معلق رہتی ہے، موسم کے متعلق پیشین گوئی کرنے والون کا خیال ہے، کہ کرۂ ہوائی مین تین طبق ہین، درمیانی طبق جسے ٹروپوپاز (Tropopause) کہتے ہین، طوفانی حصّہ کو جس کا نام ٹروپواسفیر (Troposphere) ہے، اسٹراٹواسفیر (Stratosphere) سے علٰحدہ کرتا ہے، جو سب سے بالائی طبق ہے، کرۂ ہوائی اوپر کی طرف سے آفتاب کی گرمی سے اور نیچے کی طرف سے سمندرون اور خشکی کے گرم حصّون کی گرمی سے گرم ہوجاتا ہے، البتہ مختلف مقامات کی بلندی، ارض البلد، موسم اور سطح زمین کی ساخت کے اختلاف کی وجہ سے اون مقامات کی حرارت مین اختلاف ہوتا ہے، ٹروپواسفیر سے گذر کر اوپر جانے مین حرارت بتدریج کم ہوتی معلوم ہوتی ہے، اور سب سے اوپر کے طبق مین یہ تخفیف موقوف ہوجاتی ہے، ان تغیرات سے بہت سی ہوائی موجین (CURENTS) پیدا ہوتی ہین، اُن مین سے بعض مستقل اور اکثر مقامی اور غیر مستقل ہوتی ہین، انھی مین قطبین کی موجین بھی ہین، شمال کے برف پوش حصّون سے غیر متعین وقفون کے بعد ثقیل اور سرد ہوا کی موجین چلتی ہین، یہ اون گرم اور مرطوب ہواؤن سے ملتی ہین، جو منطقۂ حارّہ سے بہتی ہوئی آتی ہین، سرد موجین گرم موجون کے نیچے سے بہتی ہین، اور اون کو اوٹھا کر بلند تر حصّہ مین پہنچادیتی ہین، جہان یہ گرم موجین بہت جلد سرد ہوجاتی ہین، رطوبت منجمد ہوکر بادلون کی شکل اختیار کرلیتی ہے، مخالف موجون مین گردش ہونے لگتی ہے، اور وہین بڑے بڑے بگولے پیدا ہوجاتے ہین،

یہ موسم کے حقیقی اسباب اون قوتون مین تلاش کرنے چاہئیں: جو سرد اور گرم ہواؤن کی ان

زبردست موجون کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے اصلی مقامات سے حرکت مین لاتی رہتی ہین، ایک نظریہ جواب سے پہلے تسلیم کیا جاتا تھا، یہ ہے کہ آفتاب سے جو تمازت پہنچتی ہے اوسی کے تغیرات سے موسم مین تبدیلی واقع ہوتی ہے، اور خود یہ تغیرات آفتاب کے دھبون سے پیدا ہوتے ہین،

اوّل اوّل جب تمازتِ آفتاب کا اندازہ کرنے کیلیے آلات وضع کئے گئے، تو اہم تغیرات کا انکشاف ہوا، لیکن ان ابتدائی آلات سے بالکل صحیح نتائج معلوم نہین ہوتے تھے، بعد کے باریک تر آلات نے تمازت کے ان تغیرات کو بہت کم دکھایا ہے، اور اب بہت سے ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ یہ تغیرات اس قدر خفیف ہوتے ہین کہ ان سے موسم مین تبدیلی پیدا نہین ہوسکتی،

یہ نظریہ بظاہر ناکام ہوچکا ہے، لیکن اس کے بجائے ابھی تک کوئی دوسرا نظریہ موسم کے اسباب سے متعلق قائم نہین ہوسکا ہے، اور تغیراتِ موسم کے حقیقی اسباب ہنوز پردۂ راز مین ہین، اس سلسلہ مین یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ قطبین کے قریب کرۂ ہوائی کی کیا کیفیت رہتی ہے۔ دوسرا بین الاقوامی قطبی سال (POLAR YEAR) جس مین پچیس[۲۵] سے زائد قومون نے شریک ہوکر ایک سال کیلیے ایسے اسٹیشن قائم کئے تھے، جہان سے قطبین کے کرۂ ہوائی کی کیفیت معلوم کی جاسکی، ابھی حال مین ختم ہوا ہے، اور اس ایک سال کی کارروائی سے جو نتائج حاصل ہوئے ہین، اون سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی اور جنوبی دائرون (Arctic and antarctic Circles) مین کم ازکم بیس بیس مستقل اسٹیشنون کی ضرورت ہے، چنانچہ اب ایسے چند مستقل اسٹیشن قائم کئے جارہے ہین، اور ضروری سرمایہ کی فراہمی کے بعد کافی تعداد مین قائم کردئے جائین گے، اوس وقت امید ہے کہ موسم کی تبدیلیون کا راز ایک بڑی حد تک کھل جائے گا،

(لٹریری ڈائجسٹ)

"ع ز"

اخبار علمیہ

امریکہ میں اسلامی آرٹ کی نمایش

مٹروپولیٹن میوزیم (Metropolitan Museum) نیویارک (امریکہ) میں آجکل اسلامی آرٹ کی نمایش ہو رہی ہے یعنی آرٹ کے ان مختلف اصناف کی جو اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں، اور جنمیں مصوری، نقاشی، کوزہ گری، جلد سازی، اور خوشنویسی شامل ہیں، اس نمایش میں جو مخطوطات پیش کئے گئے ہیں، ان کا بیشتر حصہ غیر مذہبی کتابوں پر مشتمل ہے، اور ان میں بھی زیادہ تر کتابیں ایران سے متعلق ہیں، ان کتابوں اور تصویرون سے بارہویں صدی سے لیکر پندرہویں صدی عیسوی تک کے ایرانی طرز معاشرت کے بعض دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں، ایرانی تصویرون اور کتابوں کے نقش و نگار میں اکثر نیلا اور سنہرا رنگ پایا جاتا ہے، اگرچہ کہیں کہیں سرخ، بادامی، اور سبز رنگ بھی نظر آجاتا ہے، اس میں شاہنامہ کی مختلف دلچسپ تصویریں ہیں، ان میں سے ایک تصویر زال کی ہے، جب وہ اپنی معشوقہ رودابہ کے بالاخانہ پر چڑھ رہا تھا، دوسری بہرام گور کی جو ایک اژدہے کو قتل کر رہا ہے، دو تصویریں قدیم تاریخ سے متعلق بھی ہیں، ایک میں دکھایا گیا ہے کہ فرامرز ایرانی فوج کو کابل پر چڑھائی کے لیے جا رہا ہے، دوسری میں "سکندر آتش بار آلات سے ہندوستان میں جنگ کر رہا ہے" ایک تصویر اور ہے جس میں سکندر کی موت دکھائی گئی ہے، اس نمایش کی اکثر تصویریں مختلف افراد کی ملک ہیں، لیکن خود میوزیم کی انعامی تصویروں میں ایک نایاب تصویر "یونس و ماہی" کی ہے جو حال میں حاصل کی گئی ہے، اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رشید الدین کی جامع التواریخ سے نکالی گئی ہے، جس کا نسخہ پہلے سلاطین عثمانیہ کے کتب خانہ میں تھا، تصویروں کا ایک اور نایاب مجموعہ کتبخانہ مارگن سے لایا گیا ہے، اس میں تیرہویں صدی عیسوی کے ایک قلمی

نسخہ کی جو عہدِ منگول کا قدیم ترین معلوم ایرانی مخطوطہ خیال کیا جاتا ہے، متعدد تصویریں ہیں، جنہیں رنگ برنگ کے جانوروں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں، ان تصویروں کے علاوہ ایک تصویر حضرت عیسیٰؑ کی جو ایک زاہد اور ایک گناہگار سے باتیں کر رہے ہیں، ایک بڑی تعداد اُن تصویروں کی ہے جنہیں شکار، گوے چوگاں، باغ، دربار شاہی اور معاشقہ کے مناظر دکھائے گیے ہیں، جانوروں میں کتا، اونٹ، ہاتھی، ہرن، اور گینڈے کی تصویریں ہیں بعض تصویروں میں دکھایا گیا ہے کہ جراح نشتر لگا رہا ہے اور بعض میں طبیب جادوگروں کا علاج کر رہا ہے جس میں نوجوانوں اور بادشاہوں کی تصویریں بھی ہیں، اس نمایش میں یورپ کے مختلف ممالک نے اپنے اپنے نوادر بھیجے ہیں، فرانس کے قومی کتبخانہ (Bibliothèque Nationale) نے بھی جس نے اس سے قبل کوئی چیز فرانس سے باہر نہیں بھیجی تھی، سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کی ایرانی اور ترکی تصویروں کے دو مجموعے پیش کئے ہیں، نمایش کا غالب حصہ ایرانی آرٹ کے نمونوں پر مشتمل ہے، لیکن چونکہ بعض نمونے ترکی اور ہندوستانی آرٹ کے بھی رکھے گئے ہیں اس لیے اس کا نام "اسلامی آرٹ" کی نمایش رکھا گیا ہے،

گرم چشموں اور آتشفشاں پہاڑوں کا استعمال

اٹلی کے بعض انجنیروں نے حال میں ایک جدید گرم چشمے کو قابو میں کیا ہے جس کے تیز اور ابلتے ہوئے پانی سے وہ مشینوں کے لیے برقی طاقت حاصل کریں گے، ان کے پیش نظر وہاں کے آتش فشاں پہاڑوں سے متعلق بھی اہم تجاویز ہیں اور وہ ان پہاڑوں سے جنھوں نے ابتک اپنی ہلاکت پاشیوں سے اٹلی کو شدید نقصانات پہنچائے ہیں، اسی قسم کی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ اگر وہ اپنی تجاویز میں کامیاب ہوئے تو ایک غیر محدود طاقت کا خزانہ ہاتھ آجائے گا، چنانچہ ان میں سے بعض تجاویز پر ایک حد تک عمل بھی شروع کر دیا گیا ہے، پروفیسر پونتے (Ponte) کا رصدخانہ سسلی کے مشہور کوہ آتشفشاں اٹنا پر واقع ہے، صرف پانچ سال ہوئے اس زبردست پہاڑ کے پھٹنے سے بیس لاکھ پونڈ کی مالیت کا نقصان ہو چکا ہے، جو بھاپ اس پہاڑ سے

نکلتی ہے، پروفیسر موصوف اس سے موسم سرما میں اپنے رصد خانہ کو گرم کرنے کا کام لیتے ہیں، انانا کے دہانہ کے قریب جو شگاف ہیں جن سے بھاپ نکلتی رہتی ہے، ان کے اندر دور تک نلکیاں لگا دی گئی ہیں، اور ان نلکیوں کا دوسرا سرا رصد خانہ کی عمارت میں داخل کر دیا گیا ہے، وہاں ان سے کھلنڈن ( ) اور ردک گھڑی ( ) کے ذریعہ سے حسب ضرورت حرارت لیجاتی ہے، اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس ملک نے کرۂ زمین کی اندرونی حرارت کو سب سے زیادہ قابو میں کیا ہے، وہ آئس لینڈ ہے، وجہ یہ ہے کہ باوجود ایک برفستانی ملک ہونے کے وہاں گرم پانی کے چشمے اور آتش فشاں پہاڑ دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں، اور اگرچہ اس جزیرہ میں ایک سو سے زیادہ ایسے چشمے موجود ہیں جنیں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے بہتے رہتے ہیں، تاہم تقریباً ایک سو بیس کوہ آتشفشاں اور سات سو گرم چشمے بھی ہیں، اندازہ یہ ہے کہ یہ چشمے سال میں دو ارب گیلن گرم پانی باہر پھینکتے ہیں، اگر اس پانی سے برقی طاقت حاصل کیجائے تو کوئلے اور لکڑی کی ایک کثیر مقدار بچ جائے گی اور ترکاریوں کے پیدا کرنے کے لیے ہزاروں ایکڑ زمینیں جن پر شیشہ کی عمارتیں کھڑی ہیں گرم کیجا سکیں گی، چند سالوں سے اس کا تجربہ نہایت کامیابی کے ساتھ کیا جارہا ہے، اور یہ حرارت مدرسوں، مکانوں اور پنیر و مکھن بنانے کی مشینوں کے گرم رکھنے میں استعمال کیجارہی ہے، اس کے علاوہ ہر قسم کی ترکاریاں مثلاً ٹوماٹو، کھیرا، ککڑی، کاہو، آلو وغیرہ اب آسانی سے پیدا کیجا سکتی ہیں، بعض گرم چشمے پھیپھڑے کے مریضوں کے لئے بھی صحت بخش ثابت ہوئے ہیں، اور ان میں سے ایک کے قریب ایک دار الصحت (SANATORIUM) قائم کر دیا گیا ہے،

دانت کی بیماریوں سے متعلق جدید معلومات

دانت کی بیماریوں سے متعلق ڈاکٹر بننگ ( ) مچگین یونیورسٹی (امریکہ) رسالہ لٹریری ڈائجسٹ میں کچھ دلچسپ اور مفید معلومات شائع کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ گذشتہ دس سا

تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غذا کو دانت کی بیماریوں سے بہت کچھ تعلق ہے، یہ تجربہ شروع میں جانوروں پر کیا گیا اور یہ دیکھا گیا کہ بعض قسم کی غذاؤں کے استعمال سے دانت خراب ہوجاتے ہیں اور دوسری قسم کی غذاؤں سے وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں، اس کے بعد بچوں پر تجربہ کیا گیا اور یتیم خانوں اور مختلف ملکی اداروں کے بچوں کو صحیح غذائیں دیکر معلوم کیا گیا کہ ان میں دانت کی بیماریاں کم ہوگئیں، اس کے متعلق متعدد نظریے پیش کئے گئے ہیں، ایک خیال یہ ہے کہ دانت کی بیماریوں کا اصلی سبب کیلسیم (Calcium) یا فاسفورس (Phosphorus) کی کمی ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا کرنے میں بعض وٹامن (Vitamin) کو سب سے زیادہ دخل ہے، چنانچہ جانوروں اور بچوں کو مختلف غذائیں دیکر یہ کوشش کی گئی کہ محض ان غذاؤں کے استعمال سے دانت بیماریوں سے محفوظ رہیں لیکن اب تک ایسی کوئی غذا معلوم نہیں کی جاسکی ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوسکے، مچیگن یونیورسٹی (امریکہ) کے محققین کی ایک جماعت چار سال سے اس مسئلہ کا مطالعہ کررہی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دانت کی خرابیوں کا بہت بڑا سبب ایک خاص قسم کے جرمات (Bacteria) ہیں جو منھ کے اندر پائے جاتے ہیں اور جنکو باسیلس السیڈ وفیلس (Bacillus acidophilus) کہتے ہیں، بعض لوگ ان جرمات سے قدرۃً محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کے منھ میں پیدا ہوتے ہی نہیں، ایسے لوگوں کے دانت خراب نہیں ہوتے، لیکن اکثر آدمیوں کے منھ میں یہ جرمات رہتے ہیں، اور اپنی کثرت وقلت کی مناسبت سے دانتوں کو خراب کرتے رہتے ہیں، محققین کی اسی جماعت نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ اگر بچوں کی غذاؤں کی سختی کیساتھ نگرانی کیجائے اور انھیں میٹھی چیزیں کم دیجائیں تو یہ جرمات بہت کم ہوجاتے ہیں اور دانت کی بیماریاں بڑھنے نہیں پاتیں، برخلاف اس کے زیادہ شکر کے استعمال سے جرمات تیزی کیساتھ بڑھتے جاتے ہیں، اور اکثر صورتوں میں دانت جلد خراب ہوجاتے ہیں، دانتوں کو محفوظ رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انھیں جہاں تک ممکن ہو ہر وقت صاف رکھا جائے اور ایسی غذا استعمال کیجائے جس کے اجزاء متناسب ہوں اور جس میں شکر کم سے کم ہو، "ع ز"

ادبیات

خطاب بہ ملتِ افغان

از

جناب محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ

جو کچھ تو نے کیا اچھا کیا اے ملتِ افغاں! ترے اندازِ ذوقِ خنجر اندازی کے میں قرباں
خبر بھی ہے؟ کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا تری اس سعیِ نا محمود کا اتمام کیا ہوگا
ہمیں رونا ہے اے بدبخت! اس غفلت پرستی کا بکھرنے کو ہے شیرازہ ترے اوراقِ ہستی کا
بساطِ دہر سے مٹ جائیگا نام و نشاں تیرا زمانہ صرف رہ جائیگا اک افسانہ خواں تیرا
یہ مانا تیغ کے جوہر ہیں پنہاں تیری فطرت میں یہ مانا جنگ کے شعلے ہیں مضمر تیری طینت میں
یہ مانا برقِ سوزاں ہے ودیعت تیری خلقت میں یہ مانا آتشِ پیکار ہے تیری جبلت میں
یہ مانا قتل و خونریزی ہے داخل تیری سیرت میں یہ مانا گرمیِ ہنگامہ ہے تیری طبیعت میں
یہ مانا آتشِ سیال ہے تیری رگ و پے میں یہ مانا ہے بلا کی شورش و مستی تری مے میں
یہ مانا تیغ کے سایہ میں تو نے پرورش پائی یہ مانا تو نے رعد و برق سے سوز و تپش پائی
یہ مانا سرخیِ خوں سے تری تاریخ رنگیں ہے یہ مانا تیری فطرت کا تقاضا رقصِ خونیں ہے
زبانوں پر ہے افسانہ ترے جوشِ شجاعت کا زمانہ معترف ہے تیری ترکانہ شہامت کا

جہاں ہے لرزہ بر اندام تیری عسکریت سے
ہزبران دلاور کانپتے ہیں تیری ہیبت سے

مسلّم ہے زمانہ میں ترا آئین جانبازی
تجھے ہے جنگجو اقوام میں حاصل سرافرازی

مگر اے ملت خودکام! یہ کسکے مقابل میں
مگر اے عبرت اقوام! یہ کسکے مقابل میں

یہ صہبائے کہن سے آہ تیری سرخوشی کبتک؟
یہ فرط غیظ سے ظالم! تری محسن کشی کبتک؟

گرائی تھی جسے برق بلا اعدا کے خرمن پر
وہ تیغ خونفشاں چلتی ہے اب خود اپنی گردن پر

مٹایا تونے ظالم! آہ اس غازی کی ہستی کو
بلند آکر کیا جس نے لوائے حق پرستی کو

چھڑایا تجھکو آکر پنجۂ سفاک سے جس نے
بچایا تجھکو اک طوفان خون و خاک سے جس نے

وہ غازی، ڈوبتی کشتی کی جسنے ناخدائی کی
صف باطل سے تنہا جسنے قوت آزمائی کی

بچالی دست غارتگر سے تیری آبرو جس نے
خزاں دیدہ چمن کو دی بہار رنگ و بو جس نے

نکالا جسنے تجھکو پستی قعر مذلت سے
نگاہیں آشنا کر دیں فضائے اوج و رفعت سے

دبایا جس نے سیلاب تفرنج کے تلاطم کو
دماغوں سے مٹایا غیر کے ذہنی تحکم کو

محاسن ہی فقط حاصل کیے درس تمدن کے
نہ الجھا خار سے دامن لٹے یوں پھول چن چنکے

اچھالا نام ملک و قوم کا اقوام عالم میں
نئے سر سے کیا شانہ وطن کی زلف برہم میں

نشاط کامرانی ہر دل افسردہ کو بخشی،
بہار رنگ و بو پھر گلشن پژمردہ کو بخشی

ضیا اندوز تھا ذروں سے تیرے مہر نورانی
درخشاں کس قدر تھا تیرا دور نشاۃ ثانی

دوبارہ اسکے دم سے قالب مردہ میں جان آئی
زمانہ کو دکھایا اس نے اعجاز مسیحائی

شریعت پر تھا مبنی اس کا آئین جہانبانی
دل بیدار تھا لذت شناس ذوق ایمانی

شعار دیں پہ قائم اسکی تدبیر و سیاست تھی
صدائے حق کے آگے سر بسجدہ اسکی سطوت تھی

بظاہر گرچہ وہ اجلال شاہانہ کا حامل تھا
حقیقت میں مگر روشن نفس درویش کامل تھا

زسرتاپا یقیں تھا، صاحبِ ایمانِ محکم تھا　　یقیناً عالمِ اسلام کا صند یدِ اعظم تھا

مدبر تھا مفکر تھا، بہادر تھا، مجاہد تھا　　سرِ اورنگ قیصر تھا، سرِ سجادہ زاہد تھا

امیرِ کشورِ جاں تھا، جہانگیر و جہاں باں تھا　　بہارِ باغِ ایماں تھا، چراغِ بزمِ عرفاں تھا

معارف کا مبلغ، حکمت و دانش کا داعی تھا　　وقارِ ملک و ملت کے لیے گرمِ مساعی تھا

وطن کا مایۂ صد ناز فرزندِ گرامی تھا　　وہ زورِ بازوے اسلام تھا ملت کا حامی تھا

بظاہر گو وہ کابل کے افق پر جلوہ آرا تھا　　مگر کل مطلعِ اسلام کا روشن ستارا تھا

نہ اٹھا دورِ آخر میں کوئی عالی ہمم ایسا　　ہوا اب تک نہ تجھ میں صاحبِ سیف و قلم ایسا

کیا حق مرتے دم تک حبِ قومی کا ادا اُس نے　　وطن کی راہ میں جانیں لڑا دیں بارہا اُس نے

ہزاروں ہیں مظاہر اسکی شانِ خسروانی کے　　ہیں روشن کارنامے اسکی فتح و کامرانی کے

وطن کا گوشہ گوشہ شاہد اسکی ترکتازی کا　　فسانہ ذرہ ذرہ کی زباں پر دلنوازی کا

نہ دی کچھ داد تونے آہ اسکے سعیِ پیہم کی　　نہ جانی قدر تونے آہ اُس سالارِ اعظم کی

خود اپنے ہاتھ سے "وہ ہستیِ نادر" گنوائی ہے　　نظیر اس کی نہ پائیگی نہ اب تک تونے پائی ہے

یہ ممکن ہو بھلا دے تو ستمگر اسکی خدمت کو　　نہ روئے حشر تک اے قوم تو اُس جانِ ملت کو

مگر تڑپے گی صدیوں "موجِ کابل" اسکی فرقت میں　　وطن کی خاک لیگی اُسکو آغوشِ محبت میں

عقیدت سے جگہ آنکھوں میں دیگی ایسے جنرل کو
بھلا ئیگی بھلا تاریخ کیونکر فاتحِ تھل کو

مطبوعات جدیدہ

فلسفۂ نفس، مصنفہ جناب ضامن صاحب نقوی، ناشر ہندوستانی اکیڈیمی یوپی، الٰہ آباد حجم ۱۰۸ صفحے، لکھائی چھپائی ٹائپ میں، کاغذ دبیز، قیمت درج نہیں،

علم النفس، قدیم وجدید دونوں فلسفوں میں حکما و فلاسفہ کا مستقل موضوع بحث و نظر رہا ہے، اور ان کے مختلف دوروں میں اس پر مختلف نقطہ ہاے نظر کے ساتھ غور و فکر ہوتا رہا، یہانتک کہ دورِ حاضر میں تو اس نے ایسی شکل اختیار کرلی کہ یہ علم شاخ درشاخ ہوکر مختلف مستقل علوم میں تقسیم ہوگیا، اور یہ فروع اپنی اصل سے ایسی جداگانہ حیثیت میں آگئے، کہ ان دونوں میں لاہوتی و ناسوتی، علوی و سفلی، روحانی و مادی کی متباین نسبتیں قائم ہوگئیں، مصنف "فلسفۂ نفس" نے اس تصنیف میں انھی ٹوٹے ہوے رشتوں کو جوڑ کر اسی تباین و تناقض کو دور کرنا چاہا ہے، اور قارئین کے خیالات کی مادی سے روحانی، سفلی سے علوی اور ناسوتی سے لاہوتی جانب رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کتاب نہ علم النفس سے متعلق محض حکماے قدیم کے خیالات و افکار کی ترجمان ہے، اور نہ اس میں علم النفس کے متعلق فلاسفہ کے جدید خیالات و نظریات ہی تعیین کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، بلکہ مصنف کے ذہن میں علم النفس کے قدیم وجدید دونوں قسم کے مباحث کے مطالعہ سے جو خیالات و نتائج مستحضر ہوے، انھی کو ایسے ربط و تسلسل کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ کتاب کے نتیجۂ بحث میں، انسانیت کا شرف و امتیاز محض حق و حقیقت کا ادراک قرار پاتا ہے، اور پھر حیات و کائنات کا مقصودِ وحید محض حق شناسی نکلتا ہے، اور یہ حق شناسی خود شناسی پر منتج ہوتی ہے، اور یہی خودشناسی، خداشناسی کے رتبۂ بلند کو حاصل کرتی ہے،

کتاب، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، بی اے کے "تعارف" کے بعد ایک مقدمہ اور چار ابواب پر

مشتمل ہے، پہلے باب میں نفس اور اسکی ماہیت پر بحث ہے، دوسرا باب نفس کے افعال و قویٰ کے ذکر میں، تیسرے میں نفس کے متعلقات کا بیان آیا ہے، اور چوتھا باب "بعض معارف نفسیات" کے عنوان سے ہے، اور اسی میں تمام مباحث کا خلاصہ سمٹ کر آگیا ہے، کتاب کے مسائل قدیم بھی ہیں اور جدید بھی، لیکن اظہار مطالب کے لیے اسلوب بیان جدید ہی ہے، اور جناب مصنف کی یہی بڑی کامیابی ہے کہ وہ علم النفس کے متعلق مغرب کے جدید نظریات اصطلاحوں اور تعبیروں کو اس طور پر کھینچ کر مشرق کی سمت لائے ہیں کہ مغرب کے نظریوں اور اصطلاحوں کی روشنی میں مشرقی مسائل وعقاید کی بھی تعبیر ہو سکی ہے، اگرچہ کتاب میں کہیں کہیں مباحث میں تشنگی باقی رہ گئی ہے، مثلاً جہاں مسئلۂ وحدۃ الوجود سے گریز کے بعد مسئلۂ توحید کا ذکر آیا ہے، لیکن بہرحال یہ امور لائق اعتنا نہیں، مناسب ہوا اگر جناب مصنف اسی اسلوب میں اپنے دوسرے متخیلہ "حیات مابعد" کو بھی مرتب کر ڈالیں،

جامع اللغات و السنہ متعلقہ از جناب خواجہ عبد المجید صاحب بی اے، ناشر جامع اللغات کمپنی لاہور،

حجم جلد اول ۲۹۶ صفحے، قیمت عـ۵ روپے ہر حصہ ۸۰ صفحے قیمتی ۱۲؍ تقطیع $\frac{20 \times 26}{4}$، کاغذ عمدہ سپید چکنا، لکھائی چھپائی اچھی،

"جامع اللغات" کا مفصل تذکرہ ان صفحات میں چند ماہ گذرے، آچکا ہے، کارکنان لغت نہایت مستعدی سے اس کے حصے حسب اعلان ۸۰، ۸۰ صفحوں میں نکال رہے ہیں، اب تک اس کے نو حصے ہمیں موصول ہو چکے جنمیں جلد اول ۲۹۶ صفحوں پر تمام ہو کر جلد ثانی کے ۵۶ صفحے بھی آگئے ہیں، جلد اول حرف "ب" پر ختم ہوتی ہے اور دوسری جلد کے ان ۵۶ صفحوں میں حرف "پ" کا آخری لفظ "پرائی" ہے، مؤلف نے انھی حصوں میں کا مقدمہ، عنوان، اور سرورق بھی پیش کر دیا ہے،

مقدمہ ۸ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں اجمال کے ساتھ اولاً "اردو کیونکر پیدا ہوئی" کو دکھایا گیا ہے، بعد اردو زبان کی تدریجی تاریخ بیان کی گئی ہے، اردو زبان کی پیدایش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں

سے مشرقی بہار تک کی زبان ایک ہی تھی، یہ کسی قدر محتاجِ تشریح اور باعث غلط فہمی ہے، مصنف نے اردو کی گذشتہ سر میں متداول نظریوں کو قبول کرلیا ہے، مثلاً "خالق باری" اردو کی پہلی منظوم تصنیف ہے، اردو کا سب سے پہلا بڑا صاحبِ دیوان شاعر "ولی دکھنی" ہے "فسانہ آزاد" سرشار کو اردو کا پہلا ناول سمجھنا چاہئے، "اندر سبھا امانت" اردو کا پہلا ناٹک ہے، ۱۸۳۶ء میں آغا محمد باقر نے پہلا اردو اخبار دہلی سے نکالا، اور اردو میں لغت کی سب سے پہلی کتاب "خالق باری" تصور کیجا سکتی ہے، آخر میں اردو کے متداول لغات کا تذکرہ اور ان میں موازنہ کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں جامع اللغات کے خصوصیات اور رموز و اشارات ہیں، خدا مصنف کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اردو کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی، توقع ہے کہ یہ لغت اگر پورے طور پر پایۂ استناد حاصل نہ کرسکا، تو کم از کم اردو لغت سے متعلق موجودہ ضروریات کا پورا کرنے والا ضرور ثابت ہوگا،

مثنویات میر، مرتبہ جناب سید محمد صاحب ایم اے، ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن تقطیع چھوٹی ۲۲۴ صفحے، قیمت مجلد عہ،

میر تقی میر کو تمام متاخرین شعرا نے اپنا "میر" تسلیم کیا ہے، دورِ حاضر کے اربابِ ادب نے بھی ان کی قدر کی ان کی متعدد تصنیفات اب تک شائع ہوچکی ہیں، کلام کا انتخاب بھی ایک سے زیادہ نکل چکا ہے، اب مولوی سید محمد صاحب ایم اے، مؤلف "اربابِ نثر اردو" نے "مثنویاتِ میر" کے نام سے میر کی تمام مثنویوں اور مثنوی نما نظموں کو یکجا کردیا ہے، ابتدا میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں میر کے مختصر حالاتِ زندگی، اور ان سے ان کی مثنویوں پر روشنی ڈالی ہے، مثنویوں کی مجموعی تعداد ۳۳ ہے، جنہیں حسن و عشق کی داستانوں کی مثنویاں، ساقی نامے مدحیہ مثنوی، صید نامے، اور ہجویہ نظمیں سب شامل ہیں،

دیوان طباطبائی یعنی صوت تغزل — مجموعۂ کلام نواب حیدر یار جنگ مولنا علی حیدر طباطبائی نظم، حجم ۳۲۰، تقطیع چھوٹی، ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، قیمت:- عہ

حضرت نظم طباطبائی، پچھلے دور کی اردو شاعری کی یادگار رہ گئے تھے، جو اگرچہ دیوانِ غالب کے شارح تھے، مگر خود اپنی غزلگوئی میں لکھنؤ کے طرز کے متبع رہے، ان کا مجموعۂ کلام "دیوانِ طباطبائی یعنی صوتِ تغزل" کے نام سے شائع ہوا ہے، حالانکہ اسے "صوتِ تغزل یعنی دیوان طباطبائی" کے عنوان سے ہونا تھا، اس مجموعہ میں بڑا حصہ، دو غزلوں کا ہے، آخر میں چند فارسی کلام، اردو رباعیاں اور تاریخیں ہیں، ہر غزل میں اس کا وزن بھی درج ہے، کلام کا رنگ لکھنوی طرز کا عاشقانہ ہے، وہی ہجر و وصال، معشوق سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے گھاتیں، لفظی رعایتیں اور صنعتیں، اور وہی گل و بلبل اور شانہ و گیسو کے مضامین ہیں، اگرچہ دس بیس میں ایک دو شعر دوسرے رنگ کے بھی سامنے آجاتے ہیں، لیکن حضرتِ نظم اردو و فارسی زبان کے قادر الکلام ادیب، اور اسی نقطۂ نظر سے شاعر تھے، ضرورت ہے کہ اس مجموعۂ کلام کا بھی، اسی استفادہ کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے، جیسے ہم اکثر متقدمین شعراء کے دواوین کا مطالعہ کرتے ہیں، مجموعہ کے شروع میں حضرت نظم ہی کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جسمیں صفائیں شعر کے سرقہ کی بحث کیگئی ہے، یہ مقدمہ شاید ناتمام رہ گیا ہے، اور ان کی وفات کے بعد تبرکات کے طور پر شامل دیوان کردیا گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس مجموعہ میں حضرت نظم کے وہ سوانح حیات بھی درج کردیے جاتے جو حیدرآباد کے رسالہ مکتبہ یا کسی دوسرے رسالہ میں تفصیل سے نکل چکے ہیں،

ریاض النسواں	از جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب، حجم بہ ترتیب ۱۹۲، ۱۷۶ صفحے، قیمت ہر ایک عہ
تحفۃ الخلال فی مسائل الاسلام والایمان	پتہ:- حافظ عبد العظیم صاحب، مکان عبد الرؤف صاحب، قریب بازار جام باغ، حیدرآباد دکن

"ریاض النسواں" فقہ شافعی میں ہے، جسمیں ابواب فقہی کی ترتیب پر مسائل لکھے گئے ہیں، عورتوں سے متعلق مسائل خصوصیت سے ہیں، شاید اسی لئے ریاض النسواں نام رکھا گیا، اس رسالہ میں کتاب الایمان سے کتاب النکاح تک کے ابواب ہیں، دوسرا رسالہ تحفۃ الخلال فی مسائل الاسلام والایمان گویا اسی کا دوسرا حصہ ہے جسکے اس نام کی کوئی وجہ معلوم نہیں، اسمیں فقہ کے ابواب بیع و معاملات و فرائض و جنایات وغیرہ کے مسائل درج ہیں، فقہ شافعی پر اردو میں کم کتابیں ملتی ہیں، مبتدی عربی خوان طلبہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، رسالوں کی زبان قدیم وضع کی ہے، اور ان کی ترتیب اور طرز کتابت وغیرہ میں بھی قدیم شان نمایاں ہے،

"ر"